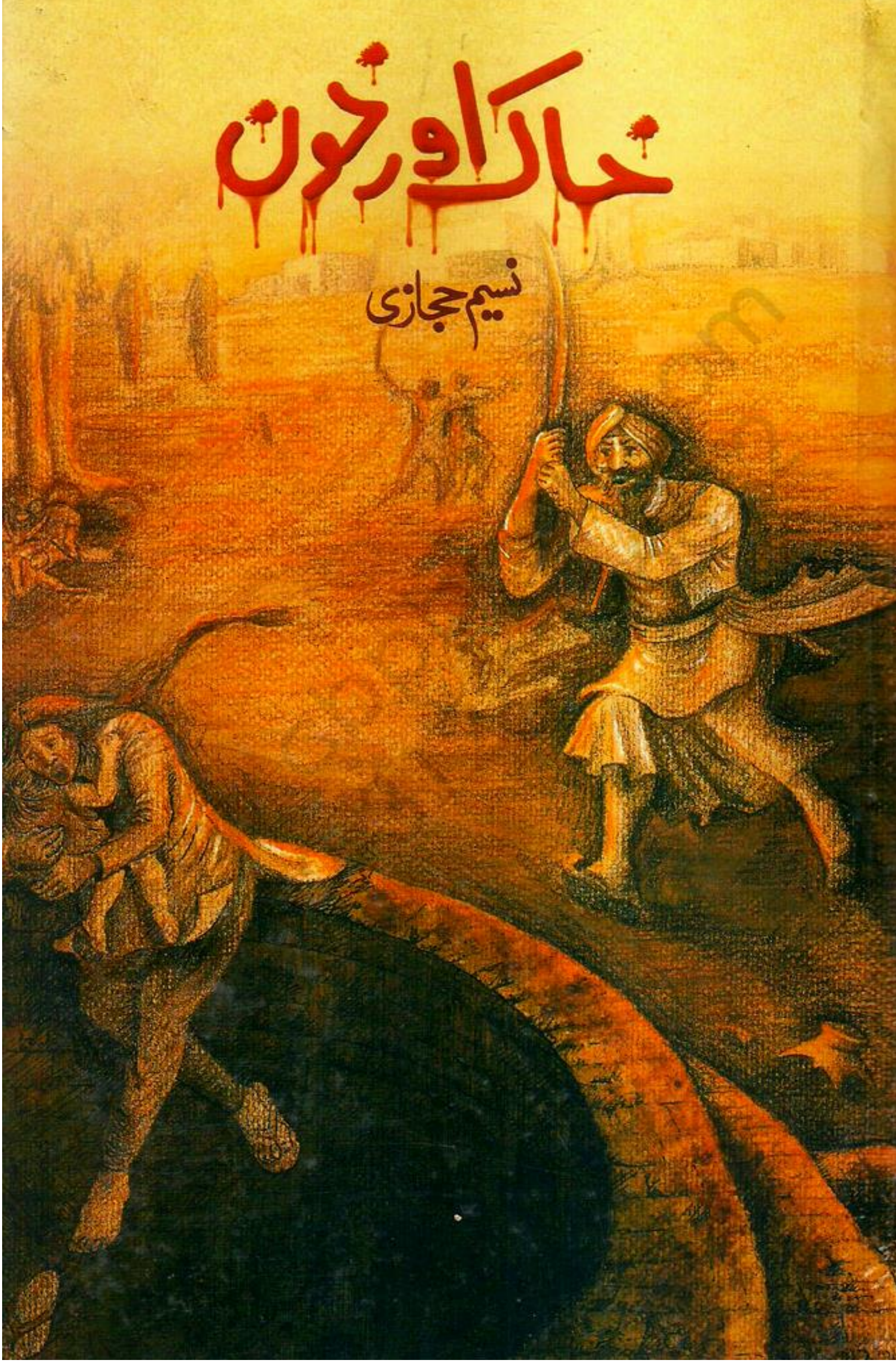
خاک اور خون
نسیم حجازی

خاک اور خُون

نسیم حجازی

فہرست

دیباچہ.. ۷

تعارف.. ۱۱

مسکراہٹیں.. ۱۵

دھڑکنیں.. ۳۱۸

سُرخ لکیر.. ۵۲۶

اے قوم!.. ۹۰۴

دیباچہ

اس بوڑھے درخت کے نام جو قریباً ایک صدی سے میرے گاؤں کی زندگی کا مرکز تھا۔ گاؤں کے بچے اس درخت کی شاخوں پر جھولا ڈالا کرتے تھے۔ گاؤں کے جوان اور بوڑھے اس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر پرانے وقتوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور عورتیں اس کے نیچے جمع ہو کر نئی دلہنوں کا استقبال کیا کرتی تھیں۔ یہ درخت گاؤں کے کئی بچوں کی جوانی اور جوانوں کا بڑھاپا دیکھ چکا تھا۔

شاہراہِ حیات پر میری زندگی کے نقوش اس درخت کے نیچے پہنچ کر ماضی کے دُھندلکوں میں روپوش ہو جاتے تھے۔ میں ایک ایسے سمندر کے کنارے رُک جاتا ہوں جس کی سطح پر لہروں کی شکنیں نہیں ہیں۔ لیکن

اس کی گہرائیوں سے ہلکے میٹھے اور نہ ختم ہونے والے نغمے بیدار ہوتے ہیں۔ میں ایسی فضاؤں میں کھو جاتا ہوں جن کی وسعتیں قوسِ قزح کے رنگوں سے لبریز ہیں۔

ان نغموں کی دل کشی اور رنگوں کی دل فریبی کا موہوم سا تصوّر لے کر تمام عالمِ شعور کی طرف لوٹتا ہوں۔ مجھے اس درخت کے پتّوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ میں اپنے ان ساتھیوں کو دیکھتا ہوں جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ زندگی کے چہرے کی خفیف مسکراہٹیں اچانک قہقہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔۔۔ میں اس درخت کے نیچے کھڑا ہوں اور اسے اپنی چھوٹی سی دنیا کی بُلند ترین شے سمجھتا ہوں۔ مجھ سے بڑے لڑکے اس کی ٹہنیوں پر چڑھ کر مسرّت کے قہقہے لگاتے ہیں اور میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ پھر میں ان دِنوں کا تصوّر کرتا ہوں جب کہ میں خود اس کی ٹہنی ٹہنی پر گھوم آیا کرتا تھا۔ اور مجھ سے چھوٹی عمر کے بچے میری طرف دیکھ کر پریشان ہوا کرتے تھے۔

ماضی حال کو اور حال مستقبل کی جنم دیتا ہے۔ اور بچپن کی مسکراہٹیں اور

قہقہے جوانی کی دھڑکنوں، ولولوں اور امنگوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر اچانک ایک دن زندگی کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس درخت کے پتوں سے پیدا ہونے والی دھیمی اور میٹھی راگنی ان لوگوں کی چیخوں میں دب کر رہ جاتی ہے جنہوں نے اس کی چھاؤں میں ہنسنا اور مُسکرانا سیکھا تھا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب کہ مشرقی پنجاب کی ہزاروں بستیاں "آگ اور خون" کا طوفان دیکھ رہی تھیں اس درخت کی جڑوں پر ان لوگوں کا خون بہہ رہا تھا جو اسے پانی دیا کرتے تھے۔ اس کے نیچے ان جوانوں کی لاشیں تڑپ رہی تھیں جو بچپن میں اس کی شاخوں پر جھولا ڈال کرتے تھے۔۔۔ یہ میرے ساتھی، میرے عزیز اور میرے بزرگ تھے۔ ان کی لاشیں اس درخت کے پاس ہی ایک گڑھے میں دفن ہیں۔

اب میں خواب میں اس محفل کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھا کرتا ہوں جو ہمیشہ کے لیے ویران ہو چکی ہے۔ میں ان مسکراہٹوں کو نہیں بھول سکتا جو زندگی کے معصوم چہرے سے ہمیشہ کے لیے چھین لی گئی ہیں۔ میرے کانوں میں اب بھی وہی قہقہے گونجتے ہیں، جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے

ہیں۔ یہ درخت آج بھی اپنی جگہ کھڑا ہے۔

اگر میں ایک مغنّی ہوتا اور اس درخت کی شاخ سے ایک بربط بنا سکتا تو میں فضائے بیکراں کو ان بے چین روحوں کی فریاد سے لبریز کر دیتا، جو اس درخت کے نیچے کسی قافلہ سالار کا انتظار کر رہی ہیں۔۔

نسیم حجازی

تعارف

بھارت نے تقسیم کے عمل اور پاکستان کے قیام کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ اس کے حکمرانوں کی اوّلین کوشش تھی کہ پاکستان کے لئے حالات اتنے ناساز گار بنا دیے جائیں کہ اس کی تعمیر کسی محکم بنا پر نہ ہو سکے۔ اور جونہی موقع ملے اسے نیست و نابود کیا جا سکے۔ خواہ فسادات کی آگ سے، خواہ اقتصادی حربوں سے، خواہ داخلی انتشار سے۔ خواہ فوجی کاروائی سے۔

چنانچہ اگست ۱۹۴۷ء میں ہی سے ہندو اور سکھ جتھوں نے اتنے وسیع

پیمانے پر مار دھاڑ اور آتش زنی کی کہ آناً فاناً سارا مشرقی پنجاب اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور پھر دہلی، اجمیر، یوپی کے شمالی اضلاع اور بھرت پور سے لے کر جموں و کشمیر تک کی تمام ریاستیں اس کی زد میں آ گئیں۔ وہ آبادیاں جو صدیوں سے امن کی زندگی بسر کر رہی تھیں اور جن کے تصوّر میں بھی یہ قیامت خیز مناظر نہ تھے تباہ ہو گئیں۔ سارا نظامِ معیشت درہم برہم ہو گیا۔ ہزاروں مرد عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ لاکھوں بے گھر ہوئے اور ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ انہیں کے خون اور آنسوؤں سے پاکستان کی تعمیر ہوئی۔

یہی وہ حکایاتِ خونچکاں ہیں جنہیں نسیم حجازی نے اپنے ناقابلِ فراموش ناول "خاک اور خون" میں پیش کیا ہے۔ ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے "خاک و خون" کی اہمیت یہی نہیں کہ یہ داستان ہمارے ماضی کے بنیادی رو سے تعلق رکھتی ہے اور اسے پڑھنے والے کے دلوں میں سے ۱۹۴۷ء کی ہولناکیوں کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ اور اس خطۂ زمین

کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکیں گے، جو ہم نے بے مثال قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ بلکہ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ نسیم حجازی کی بصیرت نے قوم کو جن خطرات سے خبر دار کیا تھا وہ پوری شدّت کے ساتھ ہمارے سامنے آچکے ہیں۔

تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد آج تک ہماری آزادی اور بقا کے دشمنوں کا نصب العین اکھنڈ بھارت ہے تاکہ عملاً سارے برِاعظم میں ہندو تہذیب و تمدّن کی برتری کا سِکّہ رائج ہو سکے اور وہ اس مقصد کی تکمیل کا کوئی موقع ضائع نہ کریں گے۔

پاکستان کے مسلمانوں کے اجتماعی احساس و شعور نے جنم دیا تاکہ وہ اپنے وطن میں اسلامی اقدار کی بنا پر ایک عادلانہ نظام بر قرار رکھ سکیں۔ ہم اپنے ماضی کے ان بلند حوصلوں کے امین بن کر ہی اپنے مال اور مستقبل کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں جن کی بدولت ۱۹۴۷ء میں آگ اور خون کے طوفان سے سر خرو ہو کر نکلے تھے۔ اس لئے ہمارے ماضی کی

یہ داستان ہمارے مستقبل کے لئے ایک مستقل پیغام بھی ہے۔

محمد علی

(سابق وزیرِ اعظم پاکستان)

۳۰ مارچ ۱۹۷۴ء

مسکراہٹیں

اسماعیل رہٹ کے قریب آم کے درخت کے نیچے بیٹھا حقّے کے کش لگا رہا تھا۔ اس کا بڑا بھائی غلام حیدر باغ کے کونے سے نمودار ہوا اور کدال زمین پر رکھ کر اس کے قریب بیٹھے ہوئے بولا۔ ”اسماعیل ذرا بیلوں کو ہانکتے رہو، ابھی آدھا کھیت باقی ہے۔ اور اس کے بعد باغ کو بھی پانی دینا ہے۔“

اسماعیل نے حقّے کی نَے غلام حیدر کی طرف پھیر دی اور اُٹھ کر سُست رفتار بیلوں کو دو چار سانٹے رسید کیے اور پھر وہیں آ کر بیٹھ گیا۔

غلام حیدر نے چند کش لگانے کے بعد کہا۔ ”تھوڑی دیر بعد کیاری بھی دیکھ آنا۔“

اسماعیل نے سوال کیا۔ ”تم کہاں جارہے ہو؟“

”میں ذرا مجید کا پتا کر آؤں۔ کل ماسٹر نے پٹواری کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ وہ دو دن سے پھر غیر حاضر ہے۔ آج میں نے اسے بہت پیٹا تھا۔“

اسماعیل نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ”پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میرے خیال میں تم اس کے ساتھ ہی مدرسے میں داخل ہو جاؤ۔۔۔ آج بھائی جان آئیں تو میں ان سے کہوں گا کہ اگر مجید کو پڑھانا ہے تو اس کی رکھوالی کے لئے اس کے باپ کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔“

”بھائی جان آج آئیں گے، تمہیں کس نے بتایا؟“

”ان کا نوکر ابھی آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شام تک آجائیں گے۔ یہ اچھا ہو گا شاید سلیم کے ساتھ مجید کو بھی پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے۔“

”لیکن سلیم بھی بہت چھوٹا ہے، اور میں نے سنا ہے کہ یہ ماسٹر بہت مارتا

ہے۔"

غلام حیدر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ قریب کے ایک کھیت میں ہل چلانے والے کسان نے آواز دی۔ "غلام حیدر شاید تمہارا برخوردار آرہا ہے۔"

غلام حیدر اُٹھ کھڑا ہوا، اور اسماعیل نے اس کی تقلید کی، اور دونوں سرسبز کھیتوں کے درمیان دوسرے گاؤں کو جانے والی پگڈنڈی کو دیکھنے لگے۔

پانچ چھ لڑکے گدھوں کو سرپٹ دوڑاتے چلے آرہے تھے۔ یہ سوار لکھنے کی تختیوں سے چابک کا کام لے رہے تھے۔ مجید سب سے آگے تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اُٹھ اُٹھ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ گدھوں کا مالک اُن کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ وہ آج خلافِ معمول غضب ناک تھا۔ اور انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ اور زمین سے ڈھیلے اُٹھا اُٹھا کر اُن کی طرف پھینک رہا تھا۔

غلام حیدر کے چہرے پر غصّے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اسماعیل کا قہقہہ سُن کر وہ بھی ہنس پڑا۔

رہٹ کے قریب پہنچ کر مجید گدھے سے کود پڑا، اور دوسرے بچوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ سب گدھوں سے اُترتے ہی اپنے گھروں کو بھاگ گئے لیکن باپ اور چچا کو دیکھ کر مجید نے بھاگنے کی جرأت نہ کی۔ ان گدھوں کے مالک خیر دین کی اس وقت سب سے بڑی خواہش تھی کہ ان شریر بچّوں کے والدین جہاں بھی ہوں، اس کی گالیاں سنیں۔ لیکن یہ اس کی انتہائی بد قسمتی تھی کہ سانس تیز اور گلا خشک ہونے کے بعد اس کی آواز دور تک سنائی نہ دیتی تھی۔ اس کی پگڑی سر سے کھسک کر گلے کا ہار بن چکی تھی۔ رہٹ سے تھوڑی دور پہلے وہ کانٹوں کی بار میں الجھا، پھر پانی کی نالی میں گرا۔ غرض اس کے لئے وہ تمام اسباب پورے ہو چکے تھے جنہیں مہذب سوسائٹی میں خودکُشی کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ ایک گدھے نے آسمان کی طرف مُنہ اٹھا کر اپنی قومی ترانہ شروع کیا۔ لیکن خیر دین اس کی زندہ دلی کی داد دینے کی بجائے اس پر بے تحاشا لاٹھیاں برسانے گا۔ لاٹھی ٹوٹ گئی اور خیر دین کا غصّہ آدھا جاتا رہا۔

اسماعیل ہنسی ضبط کرتے ہوئے آگے بڑھا اور بولا۔ ”خیر و آج میں ان

سب کی خبر لوں گا۔ یہ تمہیں بہت تنگ کرتے ہیں۔"

غلام حیدر سونٹا ہاتھ میں لیے ہوئے مجید کی طرف بڑھا، لیکن اسماعیل نے بھاگ کر اسے روک لیا۔ اور مجید کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "مجید تم کان پکڑو۔" اور مجید نے جھٹ کان پکڑ لیے۔

غلام حیدر اور اسماعیل کے سامنے خیر دین کا غصّہ اور کم ہو چکا تھا۔ وہ پگڑی کو گردن سے اتار کر سر پر لپیٹتے ہوئے بولا۔ "چودھری جی میں نے انہیں کبھی منع نہیں کیا۔ جب مجھے کام نہیں ہوتا تو میں پروا نہیں کرتا لیکن آج میں نے پورن ماشی کے میلے میں برتن لے جانے تھے۔ پچھلے دو تین ہفتے کام کی وجہ سے میں نے ان کا داؤ نہیں جانے دیا۔ جب انہیں مدرسے سے چھوٹی ہوتی ہے تو میں گدھوں کی رکھوالی کیا کرتا ہوں لیکن آج یہ چھٹی سے پہلے آ گئے۔ میں آنگن میں بھٹی سے برتن نکال رہا تھا کہ یہ گدھوں کو لے اُڑے۔ پہلے انہوں نے گاؤں کے گرد چکر لگائے۔ پھر شہر کا رُخ کیا۔ جب یہ واپس آ رہے تھے تو میرا خیال تھا کہ اب یہ میرے حال پر رحم کریں گے۔ میں ان کا راستہ روکنے کے لئے بھاگا لیکن یہ مجھے دیکھ کر کترا کر

اس طرف نکل آئے۔

اسماعیل نے کہا۔ ”اچھا خیرو! آئندہ انہوں نے ایسی حرکت کی تو سیدھا میرے پاس آنا۔ اب تم وہ درانتی اُٹھاؤ اور اپنے گدھوں کے لئے اس کھیت میں سے چارہ کاٹ لو۔“

خیر دین اب غصّے کی بجائے تشکّر کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اس نے درانتی اٹھانے سے پہلے آگے بڑھ کر مجید کو اٹھایا اور کہا۔ ”دیکھو بھئی آج تم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ جب تمہیں سواری کا شوق ہو تو میرے پاس آجایا کرو لیکن خدا کے لئے اسکول کے تمام بچوں کو لے کر نہ آیا کرو۔“

مجید تذبذب کی حالت میں باپ اور چچا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے باغ کے دوسرے سرے سے آواز دی۔

”مجید!او مجید!!“

مجید اجازت طلب نظروں سے اپنے باپ اور چچا کی طرف دیکھنے لگا۔

اسماعیل نے کہا۔ ”جاؤ نالائق!“

مجید جلدی سے تختی اور بستہ اُٹھا کر گاؤں کی طرف بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک کم سن لڑکا ٹٹّو کی ننگی پیٹھ پر سوار باغ کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ مجید کے قریب پہنچ کر اس نے ٹٹّو کو روکا۔

اسماعیل نے کہا۔ ”سلیم اترو نیچے میں نے تمہیں کئی بار منع کیا ہے۔“

سلیم نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے جلدی سے باگ موڑ کر ٹٹّو کو ایڑ لگا دی۔ ٹٹّو نے جست لگا کر پانی کی کھائی عبور کی اور سرپٹ بھاگنے لگا۔

اسماعیل چلّایا۔ ”سلیم اسے روکو۔ بیوقوف! گِر پڑو گے۔“ لیکن سلیم نے رفتار اور تیز کر دی۔۔۔ جب ٹٹّو نے کھیت کی باڑ کے اُوپر سے چھلانگ لگائی تو وہ گرتے گِرتے بچا۔ اسماعیل اور غلام حیدر دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی دو فرلانگ دور جا کر اس نے باگ موڑ لی۔ مجید بھاگتا ہوا پگڈنڈی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ واپسی پر بھی ٹٹّو کی رفتار وہی

تھی۔

مجید کو رستے میں دیکھ کر سلیم نے ٹٹّو کو روکا۔ اسے کھیت کی منڈیر کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ ”مجید جلدی سے میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ آج میں تمہیں بہت عجیب چیز دکھاؤں گا۔“

مجید مینڈیر پر پاؤں رکھ کر اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔ دور سے غلام حیدر نے آواز دی۔ ”سلیم اب نہ بھگانا اسے، تم دونوں گر پڑو گے۔“

”نہیں بھگاتا چچا۔“ اس نے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

گاؤں کی دوسری طرف ایک جوہڑ کے کنارے چند جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر سلیم اور مجید ٹٹّو سے اُترے۔ مجید نے لگام ایک ٹہنی کے ساتھ باندھ دی۔ اور سلیم سے پوچھا۔ ”یہاں کیا دکھاؤ گے مجھے؟“

سلیم نے کہا۔ ”پہلے وعدہ کرو کہ تم انہیں مارو گے نہیں!“

"کسے؟"

"یہ پھر بتاؤں گا۔ پہلے وعدہ کرو۔"

"اچھا میں انہیں نہیں ماروں گا۔"

"یہ بھی وعدہ کرو کہ تم انہیں اُٹھا کر گھر نہیں لے جاؤ گے۔"

"اچھا!"

سلیم نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا "نہیں میں تمہیں نہیں دکھاؤں گا، تم دوسرے لڑکوں کو بتا دو گے۔"

"نہیں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"اچھا آؤ۔"

مجید سلیم کے پیچھے ہو لیا۔ سلیم ایک جھاڑی کے قریب رُکا اور ٹہنیوں کے درمیان ایک چھوٹے سے گھونسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ دیکھو فاختہ بیٹھی ہے۔"

مجید نے کہا۔ ”واہ جی یہ کون سی عجیب بات ہے۔ ہمارے باغ میں بہت سی فاختائیں ہوں گی۔“

سلیم نے کہا۔ ”تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا، ارے اس نے بچّے نکالے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دو بچّے۔“

سلیم آگے بڑھا، فاختہ اُڑ گئی۔ اس نے آہستہ سے ایک بچّہ اُٹھایا اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر مجید سے کہا۔ ”پرسوں تک یہ دونوں انڈوں میں تھے۔ چند دِنوں تک ان کے پَر نکل آئیں گے۔ پھر اپنی ماں کے ساتھ اُڑا کریں گے۔“

مجید نے کہا۔ ”واہ جی میں نے جیسے پہلے کبھی فاختہ کے بچّے نہیں دیکھے۔ میں سمجھتا تھا ہم نے کوئی عجیب شے دیکھی ہے۔ چلو گھر چلیں۔“

مجید کی اس بے اعتنائی پر سلیم پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے بچّے کو گھونسلے میں رکھ دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

یہ بچے جب واپس گاؤں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ سلیم نے باہر کی حویلی میں داخل ہو کر ٹٹّو کو نوکر کے حوالے کیا۔ نوکر نے ٹٹّو کی پیٹھ تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”سلیم جی تمہارے چچا مجھ پر بہت خفا ہوئے ہیں۔ اگر تم گِر پڑتے تو میری شامت آجاتی۔ آئندہ میں تمہارے چچا کی اجازت کے بغیر اس ٹٹّو کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔“

سلیم کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے اچانک حویلی میں ایک خوب صورت گھوڑا دکھائی دیا اور وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ ”مجید ابّا جان آگئے۔ وہ دیکھو ان کا گھوڑا!“ وہ یہ کہتا ہوا حویلی کی طرف بھاگا۔ گھوڑے نے اسے دیکھتے ہی کان کھڑے کر لیے۔ اس کے نتھنوں کی آواز کہہ رہی تھی کہ میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ سلیم قریب پہنچا تو گھوڑے نے گردن ذرا نیچے کر لی۔ اور وہ اس کی پیشانی اور نتھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجید چند قدم دور کھڑا رہا۔

سلیم نے کہا۔ ”مجید تم اس سے ڈرتے ہو؟“

مجید نے کہا۔ ”یہ مجھے کاٹتا ہے۔“

سلیم کی وہ پریشانی جس کا باعث فاختہ کے بچّے کے متعلق مجید کی بے توجہی تھی، اب دور ہو چکی تھی۔ اب اسے اس بات کا خطرہ نہ تھا کہ مجید گھر جا کر دوسرے بہن بھائیوں کے سامنے اس کا مذاق اڑائے گا۔ اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ’’اس سے گاؤں کے سب بچے ڈرتے ہیں۔ میں نہیں ڈرتا۔‘‘

’’تم اس لیے نہیں ڈرتے کہ یہ تمھیں کاٹتا نہیں۔‘‘

’’تم جانتے ہو کہ یہ مجھے کیوں نہیں کاٹتا؟‘‘

مجید نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ’’اچھا بتاؤ، تمھیں کیوں نہیں کاٹتا؟‘‘

’’میں اسے چنے اور گُڑ کھلایا کرتا ہوں۔‘‘

’’میں بھی اسے چنے اور گُڑ کھلایا کروں گا۔ سلیم تم کہتے تھے کہ تمھارے ابّا جان گیند لائیں گے؟‘‘

’’ہاں وہ گیند لائیں ہوں گے۔ چلو گھر چلیں!‘‘ اس حویلی میں مویشیوں کے باندھنے کے کمرے اور بھُوسے اور اناج کے گودام تھے۔ اس کے علاوہ کاشت کاری کا سامان بھی یہاں رکھا جاتا تھا۔ ایک کونے میں چھپّر کے نیچے

چارا کاٹنے کی مشین تھی۔ صحن کے وسط میں آم کے دو درختوں کے درمیان گنّے کا رس نکالنے کی مشین تھی۔ دو طرف کی دیواروں کے ساتھ مویشیوں کے لیے کھرلیاں بنی تھیں۔ ایک کونے میں گُڑ بنانے کی بھٹی تھی۔

باہر کے پھاٹک کی مقابل کی دیوار کے درمیان کی اینٹوں سے بنی ہوئی ڈیوڑھی اور اس کے ساتھ بیٹھک تھی۔ بیٹھک اور ڈیوڑھی کے دائیں بائیں کچّے برآمدے تھے۔ ڈیوڑھی سے آگے دوسری حویلی تھی۔ جس میں پکّی اینٹوں کے بنے ہوئے مختصر مگر صاف سُتھرے رہائشی مکان تھے۔ بیٹھک کا ایک دروازہ گھر کے صحن اور دوسرا ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔

مجید اور سلیم جب ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو بیٹھک سے گھر کے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ مجید نے رُک کر کہا۔ ”تم جاؤ۔ میں گھر جاتا ہوں۔“

سلیم نے دروازے میں کھڑے ہو کر اندر جھانکا، بیٹھک میں لیمپ جل رہا تھا۔ اور چارپائیوں پر اس کے دادا کے علاوہ گھر کے آٹھ، دس آدمی بیٹھے

تھے۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا، سلیم جھک کر ایک چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ اور رینگتا ہوا اس چارپائی کے نیچے جا پہنچا، جس پر اس کے ابّا اور دادا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی کمر کے ساتھ چارپائی کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی، اور پھر دُبک کر لیٹ گیا۔ چارپائی اگرچہ ہل نہ سکی تاہم سلیم کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ اس کا دادا کہہ رہا تھا۔ ”علی اکبر ذرا چارپائی کے نیچے دیکھنا، شاید کوئی کتّا اندر آگیا ہے۔“

سلیم بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔ علی اکبر نے نیچے جھانک کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”کتّا نہیں ریچھ ہے جی۔“

سلیم اب پوری طاقت سے چارپائی اُوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دادا نے کہا۔ ”یہ ریچھ نہیں شیر ہے۔ علی اکبر پھر دیکھنا۔“

سلیم قہقہہ لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ علی اکبر نے اسے پکڑ کر گود میں بٹھا لیا۔ دادا نے کہا علی اکبر بھی اپنے بیٹے کو ساتھ ہی لے جایا کرو۔ یہ ہمیں بہت ستاتا ہے۔

علی اکبر نے کہا۔ ”میاں جی اب یہ چھ برس کا ہو گیا ہے۔ گزشتہ سال آپ نہیں مانتے تھے۔ لیکن اب اسے اسکول بھیج دینا چاہیئے۔ ورنہ یہ آوارہ ہو جائے گا۔ میں خود جا کر اسے اسکول چھوڑ آؤں گا۔“

سلیم کے قہقہے حلق میں اٹک کر رہ گئے اور جب اس کے دادا نے یہ کہہ دیا۔ ”پچھلے سال یہ اس قابل نہیں تھا۔ لیکن اب میں تمہیں منع نہیں کرتا۔“تو سلیم نے محسوس کیا کہ اب اس فیصلے پر آخری مہر لگ چکی ہے۔

سلیم نے اسکول کے متعلق اب تک یہی سُنا تھا کہ وہاں بچّوں کو بُری طرح مارا پیٹا جاتا ہے۔ اس کے چچا حمید اور اسماعیل نے متواتر چار سال ماسٹروں کی مار کھائی تھی۔ گاؤں کے لوگ جب گرمیوں کی دوپہروں میں درختوں کی چھاؤں میں اور سردیوں میں آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھ کر جب پرانے وقتوں کی باتیں کرتے تو چچا اسماعیل اور غلام حیدر کی طالبِ علمی کے زمانے کا ذکر بھی آجاتا تھا۔ وہ خود اس بات کی تصدیق کیا کرتے تھے کہ ماسٹر کان پکڑوا کر اُن کی پیٹھ پر اینٹیں رکھ دیا کرتا تھا۔ وہ گنّے کے کھیتوں میں چھپا کرتے تھے۔ لیکن خاندان کے بزرگوں کی طرح شاید گاؤں کے

باقی لوگوں کو بھی ان سے دشمنی تھی۔ وہ انہیں پکڑ کر ماسٹر جی کے حوالے کر آیا کرتے تھے۔ اس کا چچازاد بھائی مجید اور دوسرے لڑکے بھی اسے اسکول سے واپس آکر بہت کچھ بتایا کرتے تھے۔ مجید دو سال سے پہلی جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ وہ سلیم کے بڑے چچا غلام حیدر کا بیٹا تھا۔ وہ درخت پر چڑھنے، پانی میں تیرنے اور کھیل کود میں گاؤں کے تمام لڑکوں سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس میں سینکڑوں خوبیاں تھیں لیکن سلیم حیران تھا کہ اس کے باوجود ماسٹر اس پر رحم نہیں کرتا تھا۔ سلیم نے کئی بار اپنی آنکھوں سے اس کی پیٹھ پر ڈنڈوں کے نشان دیکھے تھے۔ اگر چچا غلام حیدر کا بس چلتا تو وہ اس کی مرضی کے خلاف اسے اسکول جانے پر مجبور نہ کرتا لیکن سلیم کا والد اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اور وہ خاندان کے بچّوں کی تعلیم کے بارے میں بہت سخت تھا۔ دادا کے بعد خاندان میں سب سے زیادہ اسی کا حکم مانا جاتا تھا۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد نائب تحصیل دار بن چکا تھا۔

اسکول جانا اور ماسٹر سے مار کھانا ورنہ گھر سے مار کھانا بے چارے مجید کے

لئے ایک مجبوری تھی۔ اور سلیم کو اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی مجبوری کا باعث اس کے اپنے ابا جان ہیں۔

سلیم نے جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانی سنی تھیں لیکن اسکول ماسٹر اس کے لئے سب سے زیادہ خوف ناک شے کا نام تھا۔ اس نے سُنا تھا کہ بادشاہ سب سے بڑا ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہے مارتا ہے۔ وہ ایک بادشاہ بننا چاہتا تھا۔

بچّوں کو ماسٹروں سے نجات دلانے کی یہی ایک صورت تھی۔ لیکن اب وہ خود اسکول جارہا تھا۔ جو کچھ ابّا نے بیٹھک میں کہا تھا۔ اب سارے گھر میں مشہور ہو چکا تھا۔ ماں نے اس کے لئے نئے کپڑے اور نئے بوٹ منگوا رکھے تھے۔ اس کی چچیاں، پھوپھیاں اور بہنیں سب خوش تھیں۔ اور خاندان میں صرف ایک دادی تھی، جس کو اس کے ساتھ ہمدردی تھی۔ صرف اس نے ماسٹر کے متعلّق تشویش کا اظہار کیا تھا۔ صرف اس نے کہا تھا۔ ”بیٹا تم فکر نہ کرو۔ ماسٹر تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“

گاؤں کے بچّے باہر کھیل رہے تھے۔ وہ اسے بلانے کے لئے آئے۔ لیکن

اس نے جانے سے انکار کر دیا لیکن وہ اسے کھینچ کر لے گئے۔ جب وہ ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو ماں نے آواز دی۔ "بیٹا سلیم جلدی آ جانا، صبح تمہیں اسکول جانا ہے۔" سلیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے ساتھی باہر نکلتے ہی شور مچانے لگے کہ سلیم کا اسکول جا رہا ہے۔ اب باقی بچے بھی کھیل کا خیال چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کیوں سلیم؟ کیا یہ سچ ہے۔ کیا سچ مچ تم اسکول جا رہے ہو۔ اور پھر جب ان کی تسلّی ہوئی تو انہوں نے مجید کی تجویز پر آنکھ مچولی، کبڈی یا چور اور کوتوال کی بجائے ماسٹر اور لڑکوں کا کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ مجید ماسٹر بن گیا۔ اس نے بچّوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے کان پکڑنے کا حکم دیا۔

اسکول کے تربیت یافتہ بچّوں نے فوراً کان پکڑ لیے۔ اور دوسروں کو مجید نے اپنے گرد جمع کر کے اس فن کی مشق کرائی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "دیکھو میری طرف۔ اس طرح جھکو، پھر گردن نیچی کرو۔ پھر ہاتھوں کو اس طرح لے جاؤ اور کان پکڑ لو۔ پیٹھ اُونچی رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ ڈنڈے پڑیں گے۔ باتیں مت کرو۔ اور دھوبی کے لڑکے یہ مدرسہ ہے کہ تیرے

باپ کا گھر ہے۔ ہنسو نہیں، ورنہ دانت توڑ دوں گا۔“

تمام بچّے کان پکڑ چکے تھے۔ لیکن سلیم کھڑا تھا۔ مجید نے کہا۔ ”اب تم نے کان نہیں پکڑنے۔۔۔۔؟“

سلیم نے غصّے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”میں کان نہیں پکڑوں گا۔“ اور بیشتر اس کے کہ مجید کچھ کہتا، وہ گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔

گھر پہنچ کر سلیم کسی سے بات کیے بغیر لیٹ گیا۔ امینہ اُس کی چچازاد بہن جو اس کی ہم عمر تھی، اس کے پاس آ بیٹھی۔ اور اس نے کہا۔ ”سلیم چلو دادی جان سے کہانی سنیں۔“

”نہیں۔“ اس نے بے رُخی سے جواب دیا۔

وہ سلیم کو بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔ سلیم نے جھلا کر کہا۔ ”جاؤ چڑیل ورنہ بال نوچ ڈالوں گا۔“

امینہ مایوس ہو کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سلیم کی ماں آئی اور بولی۔ ”سلیم تُم یہاں ہو، میں سمجھتی تھی کہ تمام بچّوں کے ساتھ کھیل رہے ہو

گے۔ تم نے آج دودھ نہیں پیا۔ میں لاتی ہوں۔"

وہ دودھ کا گلاس لے آئی۔ لیکن سلیم نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ ماں نے اصرار کیا تو وہ بستر سے اُٹھ کر بھاگتا ہوا مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ وہ کچھ دیر چھت کی منڈیر پر بیٹھا رہا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چل دیا۔

حویلی کے تمام مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ وہ ان پر سے گزرتا ہوا ایک کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ پچھواڑے میں آم اور جامن کے پیچھے درخت تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ان میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ چاند کی روشنی میں چھت پر اُن کے سائے بھی ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گاؤں کے کتّے کوٹھے پر چڑھ کر بھونک رہے تھے۔ اور کھیتوں سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد سلیم چند کمروں کی چھت پر سے گزرتا ہوا اس کونے میں جا کھڑا ہوا جہاں رہائشی مکانوں کی چھت مویشیوں کی حویلی کے برآمدے کے ساتھ ملتی تھی۔ یہاں سے وہ جوہڑ دکھائی دے رہا تھا جس کا کنارہ باہر کی حویلی کی دیوار سے ملتا تھا۔ اس جوہڑ کے

دوسرے سِرے پر شیشم کے درخت تھے۔ اور جوہڑ کے پانی میں اُن کا عکس نظر آتا تھا۔ اچانک اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔

"سلیم، سلیم!"

اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا باپ مکان کی چھت کے دوسرے سِرے پر کھڑا تھا۔ "آیا ابّا جان!" یہ کہہ کر وہ بھاگتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

باپ نے کہا۔ "سلیم بیٹے یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں ابّا جان۔"

"تمہاری ماں کہتی ہے کہ تم اسکول ماسٹر سے بہت ڈرتے ہو؟"

سلیم خاموش رہا۔

علی اکبر نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تمہیں کسی نے یونہی ڈرا دیا ہے۔ ماسٹر اچھے بچّوں کو نہیں مارا کرتے۔ صرف وہی بچّے پٹتے ہیں، جو کام

نہیں کرتے۔ میں بھی اسی سکول میں پڑھا کرتا تھا لیکن میں نے ایک دن بھی مار نہیں کھائی۔ استاد اچھّے لڑکوں کو تو پیار کرتے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم دل لگا کر پڑھو۔ تم ساری عمر کھیل کود میں نہیں گزار سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بڑے آدمی بنو۔ اب میں تمہیں سارا دن گاؤں کے بچّوں کے ساتھ آوارہ گردی کی اجازت نہیں دوں گا۔ تمہیں دنیا میں نام پیدا کرنا ہے۔ اس اسکول کے بعد تم شہر کے بڑے اسکول میں جاؤ گے۔ پھر کالج جاؤ گے۔ پھر تمہیں بہت دور ولایت جانا پڑے گا۔"

جب سلیم نیچے اُتر کر بستر پر لیٹ گیا تو اس کی ماں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اسے تسلّی دینے آئی۔ اس نے کہا۔ "بیٹا ماسٹر تمہیں نہیں مارے گا۔ میں تمہیں روز کا سبق یاد کرو دوں گی۔ تمہیں وقت پر اسکول بھیج دیا کروں گی، تمہیں صاف سُتھرے کپڑے پہنایا کروں گی۔ اس کے باوجود بھی اگر اس نے تمہیں پیٹا تو تمہارا باپ اس کی مرمّت کرے گا۔"

سلیم کو اپنے مستقبل کے متعلّق کافی اطمینان ہو چکا تھا۔ تاہم اسے دیر تک نیند نہ آئی۔ بار بار اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب

میں گاؤں کے بچّوں کے ساتھ نہیں کھیل سکوں گا۔ ابّا جان کہتے ہیں کہ میں بڑا آدمی بنوں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بڑا آدمی کیا ہوتا ہے؟ وہ کیا مجبوری ہے کہ پہلے اسے ساتھ والے گاؤں کے اسکول، پھر اس سے دور شہر کے اسکول اور اس کے بعد کہیں بہت دور جانا پڑے گا۔ اب تک وہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ سب چیزیں جن کی وہ خواہش کر سکتا ہے اس کے گاؤں میں موجود ہیں۔ اس کے گاؤں میں سر سبز درخت جھومتے تھے۔ پھول کھلتے تھے۔ ہوائیں چلتی تھیں۔ بادل آتے تھے۔ سر سبز کھیت لہلہاتے تھے۔ پرندے اُڑتے تھے۔ چڑیاں چہچہاتی تھیں۔

یہاں آم، انار، نارنگی، امرود اور ناشپاتی کے باغات تھے۔ زمین پر اس کی ندیاں تھیں۔ اس کی جھیلیں تھیں۔ یہاں سے وہ ان پہاڑوں کو دیکھ سکتا تھا جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ اور آسمان پر اس کا سورج تھا۔ اس کا چاند اور تارے تھے۔ اسے کسی سے یہ سُننا گوارانہ تھا کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ وہ تمام عمر اپنی دنیا کو ایک بچّے کی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے زندگی اس وقت کتنی مکمل تھی، جب وہ اپنے مکان کی

چھت سے چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد یہ محسوس کرتا تھا کہ زمین ایک گول دائرہ ہے جس کا کنارہ حدِّ نظر سے آگے آسمان کے گُنبد سے جا ملتا ہے۔ اور اس کا گھر اس گول دائرے کا مرکز ہے۔ یہ دنیا اس وقت کتنی مختصر اور حسین تھی۔ جب وہ اپنے بازو پھیلا کر کہتا تھا کہ سورج اتنا بڑا ہے۔ چاند صرف اتنا ہے۔ اور ستارے اس قدر چھوٹے ہیں۔ وہ اپنی معلومات پر کس قدر مطمئن تھا۔ جب وہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچّوں کو سمجھایا کرتا تھا کہ چاند، سورج اور ستارے بھی ہماری طرح آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ شام کے وقت سورج آسمان سے اتر کر زمین کے کسی جنگل میں روپوش ہو جاتا ہے۔ چاند اور ستارے اسے ساری رات تلاش کرتے ہیں لیکن وہ درختوں کی آڑ لیا ہوا زمین کی دوسری طرف پہاڑوں میں پہنچ جاتا ہے۔ صبح کے وقت کوئی ہوشیار ستارہ اسے چھو لیتا ہے۔ پھر ستارے کہیں چھُپ جاتے ہیں، اور سورج دن بھر انہیں تلاش کرتا ہے۔

وہ کس قدر مسرور تھا۔ جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ بادل آسمان کے وہ گھوڑے، اونٹ ہیں جن پر فرشتے سواری کرتے ہیں۔ اور پہاڑ ان عجیب و غریب

جانوروں کی چراگاہیں ہیں لیکن بڑوں کی باتوں نے اسے اپنے خیالات تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اس کے لئے چاند اور ستارے وہ کھلونے نہ تھے۔ جن کی طرف وہ ماں کی گود میں بیٹھ کر ہاتھ بڑھایا کرتا تھا۔ بادل وہ عجیب و غریب جانور نہ تھے، جن پر سواری کرنے کی تمنّا اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتی تھیں، وہ محسوس کرتا تھا کہ جوں جوں وہ بڑا ہوتا جائے گا، کائنات کے حسین اور دل فریب چہرے سے نقاب اترتے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

ماسٹر جی حقّہ پیا کرتے تھے، کھانسا کرتے تھے اور بچّوں کو پیٹا کرتے تھے۔ انہیں زندگی کی ہر تلخی گوارا تھی لیکن بچّوں کا ہنسنا اور بولنا اور اِدھر اُدھر دیکھنا اُن کی قوّتِ برداشت سے باہر تھا۔ محکمہ تعلیم کی بیس سالہ خدمت نے انہیں اس دنیا میں مُسکرانے اور ہنسنے والی انسانی صورتوں سے نفرت کرنا سیکھا دیا تھا۔ انہیں پندرہ یا بیس روپے ماہوار پر ملازمت ملتی تھی۔ اور انہیں ایک روپیہ فی سال کے حساب سے ترقّی مل رہی تھی لیکن اس ترقّی

کے مقابلے میں ان کا جسمانی اور ذہنی انحطاط کہیں زیادہ تیز تھا۔

جب انہوں نے ملازمت شروع کی تھی تو وہ تنہا تھے۔ اس کے بعد اُن کی شادی ہوئی۔ اور اب وہ چھ بچّوں کے باپ تھے۔ اور پھر ان سے چند ایسی غلطیاں بھی ہوئیں، جن کی سزا ہر شریف آدمی کو ملتی ہے۔ ایک دفعہ انسپکٹر صاحب معائنہ کے لیے تشریف لائے تو ماسٹر جی نے انہیں مرغی کھلانے کی بجائے دال پیش کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال تک ان کی ترقّی رُکی رہی۔ اس کے بعد ایک اور انسپکٹر ان سے خفا ہوا تو اس نے بھی ایک سال کے لئے ان کی ترقّی روک دی۔ غرض اس طرح بیس سال کی ملازمت کے دوران تین سال تک ان کی ترقّی بند رہی۔

ماسٹر جی سے ایک گناہ اور بھی ہوا تھا کہ انہوں نے اپنی مستقل رہائش کے لئے اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا مکان بنوایا تھا۔ کسی طرح انسپکٹر صاحب کو اس بات کا علم ہو گیا۔ اور انہوں نے جھٹ اُن کی تبدیلی کا حکم صادر فرما دیا۔ اب گاؤں میں کوئی مکان کا خریدار نہ تھا۔ ماسٹر جی نے منّت وزاری کی لیکن انسپکٹر صاحب نہ مانے۔ جب انہوں نے آنسو اور آہیں بے کار

دیکھیں تو مرغیوں، گھی اور انڈوں سے کام کیا۔

یہ انسپکٹر صاحب تبدیل ہوتے اور جاتے جاتے اپنے جانشین کو ماسٹر کی زندگی کے اس کمزور پہلو کا پتہ دے گئے۔ چنانچہ ماسٹر جی کا اندازہ تھا کہ اگر وہ ساٹھ سال کی عمر تک وفات نہ پاگئے تو اس مکان کی قیمت کے برابر مرغیاں اور انڈے انسپکٹروں اور کلرکوں کو بطور ٹیکس دینا پڑیں گے۔ ان کی ملازمت کی زندگی کے دوران صرف دو تین ایسے انسپکٹر آئے جو ماسٹروں کے گھر سے دودھ کا گلاس پینا بھی حرام سمجھتے تھے۔ لیکن ماسٹر جی کو یہ گلہ تھا کہ ایسے نیک لوگوں کا جلد ہی ٹرانسفر کر دیا جاتا تھا۔

سلیم کا باپ اسے اسکول میں داخل کرنے کے لئے آیا تو اس نے جاتے وقت مصافحہ کرتے ہوئے دس روپے کا نوٹ ماسٹر جی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ماسٹر جی نے کہا۔ ”نہیں نہیں چوہدری صاحب۔ آپ کی بڑی مہربانی لیکن۔۔۔“

علی اکبر نے انہیں اپنا فقرہ پورا کرنے کا موقع نہ دیا اور کہا۔ ”ماسٹر جی استاد کا حق کوئی نہیں دے سکتا۔ آپ دُعا کریں خدا سلیم کو آپ کی خدمت کے

قابل بنائے۔"

☆☆☆☆☆

یہ گاؤں جس میں پرائمری سکول تھا سلیم کے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اِرد گرد کے پانچ، چھ دیہات کے لڑکے یہاں تعلیم پاتے تھے اور ان کی مجموعی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ مجید اگرچہ دوسری جماعت میں تھا لیکن وہ تین سال سے سکول میں داخل تھا۔ عمر کے لحاظ سے صرف چھ سات لڑکے اس سے عمر میں بڑے تھے لیکن داؤد کے سوا سب لڑکے اس سے خوف کھاتے تھے۔ داؤد دوسرے گاؤں کے تیلی کا لڑکا تھا۔ اور اس کے باپ نے اسے اس وقت تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کی تھی جب وہ دس برس کا ہو چکا تھا۔ اب وہ چوتھی جماعت میں تھا۔ اور ماسٹر کی غیر حاضری میں سب بچّوں پر تھانے داری کرتا تھا۔ عمر کے علاوہ قد و قامت میں بھی وہ سب بچّوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ چہرے کے مقابلے میں اس کا سر قدرے چھوٹا نظر آتا تھا۔ شاید اسے اس لیے قینچی کی بجائے نائی کا استرا زیادہ پسند تھا۔ منڈے ہوئے سر پر تیل پالش کا کام

دیتا تھا۔ اس کی چھوٹی سے پگڑی اکثر اس کے سر سے کھِسک جایا کرتی تھی۔ اگر کوئی اور لڑکا اس طرح سر منڈا کر آتا تو اس کی شامت آ جاتی تھی لیکن کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ داؤد کے سر کو چھُو سکے۔ یہ وہ بلند مقام تھا جہاں صرف ماسٹر صاحب کا ہاتھ پہنچ سکتا تھا۔

داؤد جتنا بڑا تھا اسی قدر کُند ذہن بھی تھا۔ چوتھی جماعت میں دو بار فیل ہو چکا تھا لیکن ماسٹر جی کو خوش کرنے کے لئے وہ گاؤں سے اُن کے لئے اُپلے لاتا، اُن کے گھر میں پانی بھرتا، اُن کا حقّہ تازہ کرتا اور کبھی کبھی اُن کی گائے کے لیے چارا بھی لے آتا تھا۔ یہ اسکول اردگرد کے دیہات کے لئے پوسٹ آفس کا کام بھی دیتا تھا۔ ہر گاؤں کی ڈاک وہاں کے بچّوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ماسٹر جی نے چٹھیوں پر مہریں لگانے، ڈاک کی تھیلیاں کھولنے اور بند کرنے کا کام داؤد کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اسکول میں ماسٹر جی کا نائب تھا۔ لیکن اسکول میں صرف دو لڑکے ایسے تھے، جن کے معاملات میں وہ دخل دینے سے پرہیز کرتا تھا۔ یہ مجید اور موہن سنگھ تھے۔ مجید پہلا لڑکا تھا، جس نے داؤد کے خلاف بغاوت کا

جھنڈا بُلند کیا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت ماسٹر جی گھر گئے ہوئے تھے۔ اور داؤد لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ اس کی پگڑی سر سے کھِسک کر اُس کی گود میں پڑی تھی۔ لڑکے اپنی پگڑیوں کے کوڑے بنا کر کھیلنے لگے۔ مجید اس دن ٹوپی پہن کر آیا تھا۔ اس نے چُپکے سے داؤد کی پگڑی اُٹھائی اور کوڑا بنا کر بچّوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہو گیا۔

جب داؤد کی آنکھ کھلی تو تمام لڑکے دُبک کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے لیکن مجید کو اسکول میں داخل ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اور مدرسے میں اُسے داؤد کے اختیارات کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر بے پرواہی سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اُس نے کوڑا داؤد کی طرف پھینک دیا اور کہا۔ ”یہ لو اپنی پگڑی۔“

”میری پگڑی؟“ اور یہ کہتے ہوئے اٹھا اور کوڑا اُٹھا کر مجید کو مارنے لگا۔ چند کوڑے کھانے کے بعد مجید نے اس کا دوسرا اِسرا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ داؤد نے دو تین معمولی جھٹکوں کے بعد اپنے مدِّ مقابل کی طاقت کا اندازہ لگاتے

ہوئے پوری قوّت کے ساتھ کوڑا کھینچنا، مجید نے اچانک کوڑا چھوڑ دیا۔ داؤد اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کی ٹانگیں ایک لڑکے کے ساتھ ٹکرائیں اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔ لیکن پھر جلد ہی غضب ناک ہو کر اُٹھا اور اپنی پوری طاقت سے مجید پر جھپٹ پڑا۔ اب دونوں کی کشتی دیکھنے کے قابل تھی۔ مجید اس کی کمر کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ اور داؤد اس کی پیٹھ پر مکّے مار رہا تھا۔ مجید نے اچانک اسے اپنی ٹانگ سے اڑنگا دے کر فرش پر گرا دیا۔ اب وہ نیچے تھا اور مجید اوپر لیکن تھوڑی دیر بعد پھر داؤد کا پلّہ بھاری تھا۔ مجید کا کرتا پھٹ چکا تھا۔ اس کے گال مکّوں اور طمانچوں سے سُرخ ہو چکے تھے اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ہار ماننے کے لئے تیّار نہ تھا۔ وہ مار کھاتا، گرتا، اور پھر اپنے مدّ ِمقابل کے ساتھ گتھم گتھا ہو جاتا۔ داؤد کا غصّہ اب پریشانی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت اس کے سامنے اپنے وقار کو بچانے یا مدّ ِمقابل پر اپنی جسمانی برتری ثابت کرنے کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ سوال یہ تھا کہ لڑائی کس طرح ختم کی جائے۔ وہ اب مجید کو مارنے یا گرانے کی بجائے اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”دیکھو! اب بیٹھ جاؤ۔ ورنہ بہت ماروں گا۔ میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں،

تم نے میری پگڑی کا کوڑا کیوں بنایا تھا؟"

"تم باز نہیں آتے، دیکھو ابھی ماسٹر صاحب آ جائیں گے۔" داؤد بار بار یہ الفاظ دُہرا رہا تھا۔ لیکن مجید اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیّار نہ تھا۔

بالآخر داؤد نے اُسے زور سے دھکّا دے کر گِرا دیا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مجید کے سر اور پیٹھ پر کافی چوٹ آئی لیکن وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ داؤد اب چند قدم دور کھڑا کہہ رہا تھا۔ "اب آرام سے بیٹھ جاؤ، اب میں تمہارا لحاظ نہیں کروں گا۔"

مجید نے ایک لمحہ کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ایک تختی اُٹھائی اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "اب کہاں جاؤ گے۔"

داؤد نے اپنے ہاتھوں پر اس کا وار روکنے کی کوشش کی لیکن تختی کا کنارہ اس کی کلائی پر لگا۔ داؤد اس کے دوسرے وار کی زد سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹا لیکن مجید نے نیچے جھک کر اُس کے گھٹنوں اور ٹخنوں پر دو تین وار کیے۔ وہ کبھی ایک اور کبھی دوسری ٹانگ پر ناچ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ

تختی چھیننا چاہی لیکن پھر چوٹ کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بھاگ کر دوسری تختی اٹھانے کی کوشش کی لیکن ابھی وہ جھکا ہی تھا کہ مجید نے اس کی کمر پر اتنے زور سے تختی ماری کہ وہ بِلبِلا اُٹھا۔ داؤد میدان چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ لیکن مجید اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

اب تقریباً تمام لڑکے مجید کی حمایت پر تھے۔ داؤد کی ہوا اُکھڑ چکی تھی اور وہ بدحواس ہو کر مجید کے آگے آگے اسکول کی چار دیواری کے اندر بھاگ رہا تھا۔

اِدھر لڑکوں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ اتنے میں باہر کے دروازے پر کسی لڑکے نے آواز دی، ”ماسٹر جی آ گئے۔“ لڑکے بھاگ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ مجید ماسٹر جی کو دیکھ کر آخری ضرب لگاتے لگاتے رُک گیا۔

ماسٹر جی نے آتے ہی گرج کر کہا۔ ”مجھے گھر میں تمہارا شور سنائی دے رہا تھا۔ داؤد انہیں چُپ نہیں کراتے۔ میں نے تمہیں مانیٹر کِس لیے بنایا تھا۔“

پیشتر اس کے کہ داؤد کوئی جواب دیتا، ماسٹر جی کی نگاہ مجید پر پڑی اور انہوں نے دوسرا سوال کر دیا کہ اس کا کرتا کس نے پھاڑا ہے۔

مجید اس سوال کے جواب میں خاموش رہا۔

ماسٹر جی نے جھلّا کر کہا۔ ”میں پوچھتا ہوں اس کا کرتا کس نے پھاڑا ہے۔ اور اس کے گال بھی سُرخ ہیں۔ اسے کِس نے مارا ہے۔ بتاتے کیوں نہیں؟“ ایک لڑکے نے ہمّت کر کے کہا۔ ”ماسٹر جی مجید اور داؤد آپس میں لڑ رہے تھے۔“

ماسٹر جی نے کچھ اور پوچھے بغیر دو، تین چھڑیاں داؤد کے رسید کر دیں۔ ”تیلی کے بچّے تجھے بچّوں کے ساتھ لڑتے شرم نہیں آتی؟“

ماسٹر جی کی غلط فہمی نے داؤد کو دنیا کا مظلوم ترین آدمی بنا دیا تھا۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ ”ماسٹر جی ان لڑکوں سے پوچھئے، میں نے اس کا بہت لحاظ کیا ہے لیکن اس نے مجھے تختی سے مارا ہے۔“

”تمہیں مجید نے مارا ہے؟“

داؤد نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے پاجامے کے پائنچے اُوپر اُٹھا کر پنڈلیوں پر ضربوں کے نشان دکھائے۔

ماسٹر جی نے کہا۔ ''آخر تیلی نکلے نا۔''

مجید نے کہا۔ ''ماسٹر جی میں نے اس کا لحاظ کیا ہے۔''

داؤد کے زخم مجید کی قمیص کی تلافی کرنے کے لئے کافی تھے۔ ماسٹر جی نے دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد داؤد اور مجید ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے۔

اسکول میں دوسرا لڑکا جس سے مجید مرعوب ہو چکا تھا موہن سنگھ تھا۔ موہن سنگھ کا باپ نہ صرف ایک گاؤں کا زمین دار تھا۔ بلکہ ارد گرد کے بہت سے دیہاتوں میں بھی اس کی زمینیں تھیں۔ گاؤں میں اس کا قلعہ نما مکان تھا۔ موہن سنگھ آٹھ سال کی عمر میں بھی نوکر کے کندھے پر سوار ہو کر اسکول آتا تھا۔ وہ گاؤں کے ہر لڑکے کو گالیاں دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے داؤد کو بھی گالی دی۔ داؤد نے موہن

سنگھ کو چپت رسید کی۔ ماسٹر جی کہیں گئے ہوئے تھے۔ موہن سنگھ روتا ہوا گھر پہنچا اور اپنے باپ کے دو نوکر ساتھ لے گیا۔ وہ داؤد کو پکڑ کر اسکول سے باہر لے گئے اور بُری طرح پیٹا۔

داؤد کا باپ سردار جی کے پاس شکایت لے کر گیا کہ آپ کے نوکروں نے میرے بیٹے کو پیٹا ہے۔ سردار صاحب اس وقت نشے میں تھے، ان کے لئے صرف یہ جاننا کافی تھا کہ شخص داؤد کا باپ ہے۔ اور داؤد نے ان کے فرزند ارجمند کو گالی کا جواب تھپٹر سے دیا تھا۔ چنانچہ اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ جوتوں سے اس کی مرمّت کرو۔ اس کے بعد داؤد کو زندگی کی ان مجبوریوں کا احساس ہوا، جو ہر شخص کو گالی کا جواب تھپڑ سے دینے کی اجازت نہیں دیتیں۔

☆☆☆☆☆

چند دنوں میں سلیم اسکول کے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ اس کے لئے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ ماسٹر جی بچّوں کو بلاوجہ نہیں مارتے تھے۔ بلکہ وہ شور مچانے، سبق یاد نہ کرنے والے اور غیر حاضر رہنے والے بچّوں

کو مارتے تھے اور سزا دیتے تھے۔

اسکول سے باہر زندگی کی ہزاروں دلچسپیاں تھیں جو ماسٹر جی کی مار پیٹ کے باوجود بہت سے لڑکوں کو غیر حاضر رہنے پر آمادہ کر دیتی تھیں۔ اسکول سے باہر سرسبز کھیت اور باغات تھے۔ کھلی فضا میں پرندوں کے غول اُڑتے تھے۔ جھیلیں تھیں جن میں کنول کھلتے تھے۔ وہ ندیاں اور نالے تھے جن میں برسات کا پانی بہتا تھا۔ اسکول سے باہر فلک بوس پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ اسکول سے باہر ہنسنے کھیلنے اور بولنے کی آزادی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں اسکول کی ایک محدود چار دیواری تھی جس کے اندر دو کمرے تھے، ان کے آگے برآمدہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا جس کے غلیظ پانی میں لڑکے تختیاں دھویا کرتے تھے۔ اسکول میں لکھنے کے لے قلمیں، دواتیں اور تختیاں تھیں۔ پڑھنے کے لئے کتابیں تھیں۔

سلیم چھت کی کڑیوں سے لے کر اسکول کی ہر چیز کا معائنہ کر چکا تھا۔ دیوار پر چند بوسیدہ نقشے اور پرانی تصویریں تھیں۔ اور یہ سب سلیم کے دل

پر نقش ہو چکی تھیں۔ وہ بیٹھنے کی چٹائیوں پر سیاہی کے دھبّوں کے نشان اور چھت پر مکڑی کے جالے گِن چکا تھا۔ دو تین ہفتوں کے بعد اسکول کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس کی توجّہ جذب کر سکتی۔ اب اسکول اس کے لئے ایک نئی دنیا نہ تھا۔ بلکہ ایک چھوٹا سا قید خانہ تھا۔

جس کمرے میں وہ بیٹھا کرتا تھا اس کی ایک کھڑکی شمال کو کھلتی تھی۔ وہ اس کھڑکی کے قریب بیٹھ جاتا۔ جہاں اسے باہر کے ہرے بھرے کھیت دکھائی دیتے تھے۔ اور دور افق پر کانگڑہ کے پہاڑ دکھائی دیتے تھے جنہیں قریب جا کر دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ یہ کھڑکی وہ چھوٹی سی گزرگاہ تھی جس کے راستے وہ اس تنگ ماحول سے فرار ہو کر سپنوں کی حسین دنیا میں پہنچ جاتا۔ وہ پہاڑ کی گود میں سونے والے بادلوں کو نیند سے جگاتا اور اُن پر سوار ہو کر آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں اُڑتا۔ اچانک ماسٹر جی کی آواز سنائی دیتی۔ ”سلیم! تم کیا دیکھ رہے ہو؟“ اور اس کی رنگین دنیا درہم برہم ہو جاتی۔ وہ چونک کر کہتا۔ ”جی کچھ نہیں۔“

”سبق یاد کیا تم نے؟“

'"جی ہاں!"

"اچھا تختی لکھو!"

سبق یاد کرنا اور تختی لکھنا اس کے لیے معمولی بات تھی لیکن دن کے چھ سات گھنٹے اس تنگ ماحول میں سر جھکا کر بیٹھنا اس کے لئے ایک بہت بڑی سزا تھی۔

☆☆☆☆☆

سلیم عام بچّوں سے بہت زیادہ ذہین تھا۔ چھ ماہ میں اس نے پہلی جماعت پاس کر لی اور ماسٹر جی نے اسے دوسری جماعت کے بچّوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ ابتدا میں اس نے مجید کی ترغیب پر چند دن غیر حاضر رہنے کی کوشش کی لیکن ماسٹر جی بڑی جماعت کے لڑکوں کو اُن کے گاؤں بھیج دیا کرتے تھے اور گھر کے آدمی انہیں کسی کھیت یا باغ سے تلاش کر کے اسکول میں چھوڑ آیا کرتے تھے۔ تلاش کے بعد سلیم کو چھوٹا سمجھ کر معمولی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد معاف کر دیا جاتا لیکن مجید کی خوب مرمّت کی جاتی۔ مجید کا

باپ انہیں ماسٹر جی کے سپرد کرتے ہوئے کہتا۔ ”ماسٹر جی، سلیم ابھی بچّہ ہے، یہ سارا قصور مجید کا ہے۔“

غیر حاضر رہنے کی چند ناکام کوششوں کے بعد سلیم نے مجید کے مشوروں پر عمل کرنا ترک کر دیا۔ جس دن مجید کی نیّت بگڑتی وہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ چل پڑتا۔ سلیم کے داخل ہونے سے پہلے گاؤں کے دوسرے لڑکوں پر مجید کی حکومت تھی۔ جب اس کی نیّت خراب ہوئی تھی تو وہ ان سب کو روک لیا کرتا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے اُن کے دِلوں میں نہر یا جھیل میں نہانے کا شوق پیدا کر دیا کرتا تھا اور جب وہ اس کا ساتھ دینے سے پس و پیش کرتے تو وہ انہیں مار پیٹ کر اپنی قیادت تسلیم کروالیا کرتا تھا۔ لیکن جب سلیم نے یہ تہیّہ کر لیا کہ وہ غیر حاضر نہیں رہے گا تو مجید نے محسوس کیا کہ وہ ایک نئی صورتِحال کا سامنا کر رہا ہے۔ سلیم کو ورغلانے میں اس کی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوتی۔ پہلے دن جب سلیم نے اس سے کہا ”اچھا تم نہ جاؤ میں تو ضرور جاؤں گا“ تو مجید نے اُسے راستے میں دھوبی کے کتّے سے ڈرانے کی کوشش کی۔ سلیم اس پر بھی متاثر نہ ہوا تو

مجید نے اسے مور کے انڈے دکھانے کا لالچ دیا لیکن سلیم اس لالچ میں بھی نہ آیا۔

جب مجید نے یہ دیکھا کہ وہ کسی صورت میں بھی اپنا ارادہ تبدیل نہیں کرتا تو اس نے دوسرے لڑکوں کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے محسوس کے کہ وہ سلیم کو اپنا لیڈر بنا چکے ہیں۔ غصّے میں آ کر اس نے ایک لڑکے کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن سلیم اس کے آگے کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو مجید! اگر تم نے کسی کو مارا تو میں تم سے لڑوں گا۔ تم نے دادا جان کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ آئندہ تم غیر حاضر نہیں رہو گے۔"

"تم مجھ سے لڑو گے؟" مجید نے یہ کہہ کر اس کے مُنہ پر ہلکا سا چپت رسید کر دیا۔ سلیم چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ پہلا چپت تھا جو اس نے مجید کے ہاتھ سے کھایا تھا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور اس کی نگاہیں مجید کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ سلیم اچانک مڑا اور کسی سے بات کیے بغیر اسکول کی طرف چل دیا۔ گاؤں کے دوسرے لڑکے جلال، بشیر، رام لال اور

گلاب سنگھ اس کے پیچھے چل دیے۔

مجید کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس کا غصّہ ندامت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ اس کی اور سلیم کی پہلی لڑائی تھی۔ اس نے سلیم کو گاؤں کے دوسرے لڑکوں سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں۔ جلال نے ایک دفعہ اسے گالی دی تھی اور اس نے اپنی تختی سے اس کا سر پھوڑ دیا تھا لیکن اس کا یہ طرزِ عمل مجید کے لیے ایک معمّا تھا۔ اسے ان ہاتھوں سے شکایت تھی جو اس کی چپت کے جواب میں اس کا گریبان پھاڑنے کے لیے نہ اُٹھے۔ اسے ان آنکھوں سے گلہ تھا جن میں غصّے یا نفرت سے زیادہ مروّت تھی۔

سلیم اور اس کے ساتھی تین چار کھیت آگے جا چکے تھے۔ مجید ''سلیم سلیم'' کہتا ہوا اُن کے پیچھے بھاگا۔ سلیم کے ساتھی اُس کی طرف مُڑ مُڑ کر دیکھ رہے تھے لیکن سلیم نے اس کی طرف کوئی توجّہ نہ دی۔ مجید کا خیال تھا کہ وہ اس کی آواز سُن کر بھاگ نکلے گا۔ اسکول پہنچنے سے پہلے وہ اسے پکڑ لے گا اور پھر دونوں کھکھلا کر ہنس پڑیں گے لیکن سلیم اپنی معمولی

رفتار سے چلتا رہا۔

اس نے قریب پہنچ کر پھر آواز دی۔ ”سلیم ٹھہرو! میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

سلیم نے اس کی طرف مُڑ کر دیکھا اور کہا۔ ”تم میرے ڈر سے اسکول مت جاؤ۔ میں داداجان اور چچا جان سے تمہاری شکایت نہیں کروں گا۔“

سلیم آگے چل پڑا۔ مجید مایوسی اور پریشانی کی حالت میں سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ سارا راستہ وہ سلیم کو منانے کی مختلف ترکیبیں سوچتا رہا۔ اسکول کے قریب پہنچ کر اس نے کہا۔ ”سلیم! تم مجھ سے صلح نہیں کرو گے؟“

سلیم نے جواب دینے کی بجائے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مجید نے کہا: ”اچھا یونہی سہی۔ میں چھٹی کے دن تمہارے ساتھ نہر پر نہیں جاؤں گا!“

سلیم نے اس پر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ مجید نے پھر کہا۔ ”میں چھٹّی کے بعد واپس آکر مور کے انڈے توڑ ڈالوں گا۔ میں تمہارے بگلے کے بچّے

بھی مار ڈالوں گا۔ میں ان کے گلے میں رسی ڈال کر درخت سے لٹکا دوں گا۔"

سلیم کی رفتار سست ہو گی اور وہ مُڑ مُڑ کر مجید کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کی وہ مجید کی باتوں کو مذاق نہیں سمجھتا۔

مجید نے کہا۔ "اور میں تمہاری بلّی کے بچّوں کو اُٹھا کر درخت کی چوٹی پر رکھ آؤں گا۔ کنوئیں کے پاس جامن کے سب سے اونچے درخت کی چوٹی پر۔ پھر تم انہیں اُتار نہیں سکو گے۔"

سلیم کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ اچانک اپنا بستہ اور تختی ایک طرف پھینک کر زمین پر بیٹھ گیا اور منہ بسورنے لگا۔

مجید اور باقی لڑکے اس کے اِرد گرد کھڑے ہو گئے۔ جلال نے کہا۔ "چلو سلیم! دیر ہو رہی ہے!"

سلیم نے زمین سے گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔"

مجید ہنستا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کا مُنہ چڑانے لگا۔ سلیم اچانک غضب ناک ہو کر اُٹھا اور مجید پر پل پڑا۔ کچھ دیر سلیم کو مکّے مارنے اور بال نوچنے کا موقع دینے کے بعد مجید اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے سلیم کی دونوں کلائیاں اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیں۔ سلیم کا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔ وہ مجید کو ٹھڈّے مار رہا تھا لیکن مجید ہنس رہا تھا۔

جلال نے آگے بڑھ کر نہیں چھڑانے کی کوشش کی لیکن مجید نے اسے دھکا دے کر پیچھے گراتے ہوئے کہا۔ ”تم دور رہو، سلیم کو اپنا غصّہ نکال لینے دو۔“

سلیم موقع ملتے ہی کھیت سے مٹّی کے ڈھیلے اُٹھا کر اُسے مارنے لگا۔ مجید اِدھر اُدھر بھاگ کر اپنے آپ کو بچاتا رہا۔ ایک ڈھیلا مجید کے سر پر لگا اور وہ اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔ سلیم ایک اور ڈھیلا اُٹھا کر قدرے تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجید آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ سلیم نے اپنا ہاتھ بلند کیا لیکن وہ ادھر اُدھر بھاگنے کی بجائے ڈٹ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”مارتے کیوں نہیں؟“ اس نے کہا۔ سلیم نے

ڈھیلا زمین پر پھینک دیا۔

مجید نے زمین سے سلیم کی ٹوپی اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دی۔ پھر دونوں نے اپنے اپنے بستے اٹھا لیے اور خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مجید مسکرا رہا تھا اور سلیم اپنی مُسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجید نے کہا۔ ”لاؤ میں تمہارے کپڑے جھاڑ دوں۔“ اور سلیم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ سب ہنس رہے تھے۔

جلال نے کہا۔ ”سلیم! مجید بگلے کے اور بلّی کے بچوں کو نہیں مارے گا۔ یہ تمہیں یونہی ڈرا رہا تھا۔“

”میں جانتا ہوں۔“ سلیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔

مجید نے کہا۔ ”لیکن جلال کے بچّے، تمہاری مرغی نے بچّے نکالے ہیں اور میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں انہیں سلیم کی بلّی کے آگے ڈال دوں گا۔ وہ مرغی کے بچّوں کو کھا لیتی ہے۔“

جلال کو اب سکول سے زیادہ اپنی مرغی کے بچوں کی فکر تھی۔ وہ سوچ رہا

تھا کاش میں ان کی باتوں میں دخل نہ دیتا!

سلیم نے اسے مغموم دیکھ کر اس کے کان میں کہا۔ ”جلال! مجید تمہیں یونہی ڈرارہا ہے۔“

جب یہ بچّے اسکول میں داخل ہوئے تو داؤد گھنٹی بجارہا تھا۔ اس نے مجید کو دیکھتے ہی کہا۔ ”مجید میں نے آج ایک درخت پر طوطے کے بچّے دیکھے ہیں۔ آج چھٹی کے بعد وہاں چلیں گے۔“

سلیم نے کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“

داؤد نے کہا۔ ”وہاں بہت سے بچّے ہیں۔ میں تمہیں بھی ایک دوں گا۔“
جلالی نے کہا۔ ”اور مجھے؟“

داؤد نے کہا۔ ”میں تم سب کو ایک ایک بچّہ اُتار دوں گا لیکن بولنے والا طوطا میرا ہوگا!“

سلیم نے کہا۔ ”بولنے والا کیسا ہوتا ہے؟“

"اس کے گلے میں دھاری ہوتی ہے!"

☆☆☆☆☆

تیسرے پہر اسکول میں چھٹی ہوئی اور داؤد کی رہنمائی میں لڑکے طوطے کے بچّوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ سلیم نے اسے ایک آنہ دیا اور جلال نے اسے ایک پیسے کی مونگ پھلی خرید دی تھی۔ گلاب سنگھ اور بشیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کل اسے اپنے گھروں سے گڑ لا دیں گے اور داؤد اس کے عوض انہیں طوطے کا ایک ایک بچّہ دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔ مجید سے اس نے کوئی قیمت نہیں مانگی تھی۔ تاہم وہ داؤد کے بعد دوسرا بہترین طوطا حاصل کرنے کے لیے اسے مور کا ایک انڈا دینے کا لالچ دے چکا تھا۔ دو لڑکے داؤد کے اپنے گاؤں کے تھے اور اس نے پہلے ہی اُن سے شرائط طے کر رکھی تھیں۔

راستے میں مجید نے داؤد سے پوچھا۔ "اگر بچّے تھوڑے ہوئے تو؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "نہیں اس درخت پر کئی گھونسلے ہیں۔ صرف چڑھنا

ذرا مشکل ہے۔" مجید نے کہا۔ "تم کہتے تھے کہ بولنے والا طوطا تم کسی کو نہیں دو گے؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "اگر دو ہوئے تو میں ایک تمہیں دے دوں گا۔"

سلیم نے کہا۔ "اور مجھے نہیں دو گے؟"

"اگر زیادہ ہو تو تمہیں بھی دوں گا۔"

سلیم نے کہا۔ "داؤد! درخت پر چڑھ کر تمام گھونسلے اچھی طرح دیکھنا۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "دیکھوں گا لیکن وہ طوطے جن کے گلے میں دھاری ہوتے ہے، زیادہ نہیں ہوتے۔"

سلیم نے کہا۔ "دیکھو داؤد مجھے دھاری والا طوطا چاہیے۔ میں کل تمہیں ایک آنہ اور لا دوں گا۔"

مجید کو بھی یہ باپ پسند نہ تھی کہ سلیم اُس کی موجودگی میں کسی اور کی منّت کرے۔ اس نے کہا۔ "سلیم! اگر اس نے تمہیں دھاری والا طوطا نہ

دیا تو میں خود درخت پر چڑھ کر تمہیں طوطا اتار دُوں گا۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں شرط لگاتا ہوں تم اس درخت پر نہیں چڑھ سکتے۔ اس کا تنا بہت موٹا ہے۔ صرف ایک ٹہنی ہے جسے پکڑ کر اُوپر چڑھا جا سکتا ہے لیکن تم میں سے کسی کے ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس ٹہنی کو پکڑنے کے لیے مجھے بھی تمہارا سہارا لینا پڑے گا۔“

مجید نے کہا۔ ”سلیم! اگر تمہیں دھاری والا طوطا نہ ملا تو میں تمہیں اپنا طوطا دے دوں گا۔ میں دوسرا لے لوں گا۔“ پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ کر لڑکوں نے اپنے بستے زمین پر رکھ دیے۔ مجید اور جلال نے داؤد کو سہارا دینے کے لیے ایک دوسرے کی کلائیاں پکڑ لیں۔ ایک لڑکا ان کے قریب زمین پر ہاتھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ داؤد نے ایک پاؤں اس کی پیٹھ پر رکھا اور دوسرا پاؤں مجید اور جلال کی کلائیوں پر رکھ دیا۔ پھر اس نے دونوں پاؤں ان کی کلائیوں پر رکھ دیے۔ بوجھ سے جلال کی کمر جھک رہی تھی لیکن مجید نے اس کی کلائیاں پکڑ رکھی تھیں۔

جلال کہہ رہا تھا۔ ”داؤد جلدی کرو!“

داؤد نے مجید اور جلال کے سروں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن ابھی اس نے درخت کی شاخ پر ہاتھ نہیں ڈالے تھے کہ جلال اپنی جگہ سے ہل گیا۔

"جلال کے بچّے تم۔۔۔۔" داؤد اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا اور پیٹھ کے بل گِرا لیکن گرتے ہی اُٹھ بیٹھا۔ لڑکے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہے تھے۔ داؤد نے اپنی پگڑی جو اب ڈھیلی ہو چکی تھی، اتار کر پھینک دی اور بھاگ کر دونوں ہاتھوں سے جلال کے کان پکڑ لیے۔

مجید نے جلدی سے آگے بڑھ کر جلال کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "داؤد یہ تمہارا قصور ہے۔ تمہیں اتنی دیر نہیں لگانی چاہتی تھی۔ اب ہم پھر تمہیں سہارا دیتے ہیں۔ اب کے زیادہ بوجھ مجھ پر رکھنا۔"

داؤد دوبارہ ہمّت آزمائی کے لیے تیّار ہو گیا۔ تاہم اس نے کہا۔ "جلال کے بچّے۔ اگر اب کی بار تم نے مجھے گِرایا تو تمہیں طوطا نہیں ملے گا۔" اس مرتبہ جلال میں ذمہ داری کا احساس نسبتاً زیادہ تھا اور داؤد مزید کسی حادثہ کے بغیر درخت پر چڑھ گیا۔

درخت کا درمیانی تنا جس میں داؤد کے اندازے کے مطابق جابجا طوطوں کے گھونسلے تھے، بہت موٹا تھا لیکن اس کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ داؤد ان شاخوں سے سیڑھیوں کا کام لے کر تنے کے گرد چکر لگاتا ہوا اُوپر چڑھ رہا تھا۔

ایک سوراخ سے دو طوطے اُڑے داؤد نے خوش ہو کر اندر ہاتھ ڈالا اور تھوڑی دیر تلاش کرنے کے بعد کہا۔ ”اس کے اندر کچھ بھی نہیں۔ میرے خیال میں بچّے بڑے ہو کر اُڑ گئے ہیں۔“

لڑکوں کو مایوسی ہوئی۔ سلیم نے کہا۔ ”داؤد اُوپر بہت سے سوراخ ہیں، ان میں بچّے ضرور ہوں گے۔ تم اچھی طرح دیکھو۔“

مجید نے جواب دیا۔ ”تم فکر نہ کرو۔“

ایک اور سوراخ سے طوطا اڑا اور داؤد اندر ہاتھ ڈال کر چلّا اٹھا۔ ”مل گئے! مل گئے! دو نہیں تین۔“ اس کے بعد تین بچّے نکال کر ٹہنی پر رکھ دیے اور انہیں غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”ان میں سے کسی کے گلے میں بھی

دھاری نہیں اور یہ بہت چھوٹے ہیں۔ ان کے پر ابھی اچھی طرح نہیں نکلے۔"

چند لڑکے انہیں حاصل کرنا ہی اپنے لیے کافی سمجھتے تھے لیکن سلیم نے نیچے سے آواز دی۔ "دیکھو! داؤد انہیں وہیں رہنے دو۔ یہ بہت چھوٹے ہیں۔ مر جائیں گے!"

داؤد نے تینوں بچّے گھونسلے میں رکھ دیے اور کہا۔ "میں اور اُوپر دیکھتا ہوں۔" ایک اور گھونسلے سے داؤد کو دو بچّے ملے لیکن اُسے کسی کے گلے میں دھاری نظر نہ آئی۔ تاہم یہ کافی بڑے تھے۔ نیچے لڑکے اپنی جھولیاں تانے کھڑے تھے لیکن داؤد نے کہا۔ "میں واپسی پر انہیں اپنی جھولی میں ڈال لاؤں گا۔ ابھی اوپر اور گھونسلے ہیں۔"

چوٹی کے قریب پہنچ کر داؤد کو ایک اور گھونسلا دکھائی دیا اور وہ چلّایا "مجید اوپر دیکھو چوٹی پر کسی بڑے جانور کا گھونسلا ہے۔"

مجید نے تھوڑی دیر غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ "یار یہ بہت بڑا گھونسلا

ہے۔ کہیں چیل کا تو نہیں ؟"

جلال نے کہا۔ "داؤد میری ماں کہتی تھی کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے۔"

مجید نے کہا۔ "تم بکتے ہو۔ بھلا چیل سونا کہاں سے لاتی ہے۔"

جلال نے کہا۔ "سچ کہتا ہوں مجید! ماں کہتی تھی کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے۔"

مجید نے کہا۔ "اگر نہ ہوا تو؟"

جلال کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا لیکن سلیم نے کہا۔ "ہاں مجید! جلال جھوٹ نہیں کہتا۔ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے۔ تمہیں وہ کہانی یاد نہیں؟ ایک رانی نہا رہی تھی، اس نے اپنا ہار اُتار کر مکان کی چھت پر رکھ دیا اور چیل اُسے لے کر اُڑ گئی۔ ایک آدمی جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گیا تو اسے چیل کے گھونسلے سے سونے کا ہار مل گیا۔ وہ ہار اُٹھا کر راجہ کے پاس لے گیا اور راجہ نے اسے بہت سا انعام دیا۔"

جلال نے کہا۔ ”دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے۔“

مجید نے داؤد کو آواز دی۔ ”دیکھ لو داؤد۔ شاید تمہیں بھی ہار مل جائے۔“

لیکن داؤد سلیم کی کہانی سُن چکا تھا۔ اسے اب کسی مشورے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تیزی سے چوٹی کی طرف چڑھ رہا تھا۔ اب اس کی نگاہ میں دھاری والے طوطے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔۔۔۔ داؤد سونے کے ہار کے لیے ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیّار تھا لیکن جونہی اس نے گھونسلے کے قریب پہنچ کر ہاتھ بلند کیا، گھونسلے میں پھڑپھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور ایک چیل اس کے سر پر جھپٹا مار کر ایک طرف اُڑ گئی۔ داؤد نے زندگی میں پہلی بار سر کے بالوں کی ضرورت محسوس کی۔ وہ ابھی اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ چیل نے دوسری بار فضا میں غوطہ لگایا اور اس کے سر میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی۔ داؤد نے زور سے ہاتھ مار کر اسے پھر اڑادیا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا لیکن چیل اس پر بار بار جھپٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں داؤد چوٹی کی پتلی اور خطرناک ٹہنیوں سے اُتر کر قدرے مضبوط شاخوں پر پاؤں رکھ چکا

تھا۔ لیکن اتنی دیر میں مادہ چیل کی چیخیں سُن کر نر بھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا تھا اور وہ دونوں یکّے بعد دیگرے اس پر جھپٹ رہے تھے اور ان کے ٹھونگوں اور پنجوں کا ہدف داؤد کی اُسترے سے منڈی ہوئی چمکدار کھوپڑی تھی۔ اس کے ساتھی قہقہے لگا رہے تھے اور وہ اوپر سے چلّا رہا تھا۔

”جلال کے بچّے تمہاری ماں نے چیل کے گھونسلے میں سونا۔۔۔“

چیل نے اس کے سر پر جھپٹا مارا اور وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔

مجید بار بار کہتا۔ ”آئی، آئی! چیل آئی!!“

اور داؤد اپنے ایک ہاتھ سے ٹہنی پکڑ کر دوسرے ہاتھ اور بازو کو اپنے سر اور آنکھوں کے لیے ڈھال بنا لیتا۔ پھر وہ تیزی سے چند قدم نیچے آ جاتا۔ مجید پھر چلّایا۔ ”اب دوسری آئی۔“

داؤد نے گرتے، سنبھلتے، چیختے، چِلّاتے درخت کی نچلی ٹہنی پر پہنچ کر زمین پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے سر میں چیلوں کے پنجوں اور ٹھونگوں کے نشان تھے اور کہیں کہیں سے خون بھی رِس رہا تھا۔ لڑکوں کے قہقہے اب بند ہو

چکے تھے۔ داؤد تھوڑی دیر بے حس و حرکت زمین پر بیٹھا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”جلال کے بچّے تم بھی ہنستے تھے!“

جواب نہ پا کر اس نے مُڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ جلال وہاں نہ تھا، رام لال نے ایک طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ارے جلال وہ جا رہا ہے!“

'”کہاں؟“ داؤد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھو!“

داؤد چلّایا۔ ”ٹھہرو! جلال کے بچّے!“

لیکن جلال بغل میں بستے دبائے سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا اور اس کی رفتار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے گاؤں میں پہنچے بغیر پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھے گا۔

☆☆☆☆☆

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ لڑکے مدرسے کے صحن میں کھڑے اُوپر بادلوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مغرب سے اُٹھنے والی گھٹا کی رفتار

کافی تیز تھی۔ تاہم بچّوں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر ماسٹر جی کی آمد سے پہلے بارش شروع نہ ہوئی تو انہیں چھٹّی نہیں ملے گی۔ سیاہ رنگ کے بادل ابھی تک سورج سے کچھ دور تھے۔ گزشتہ شب کافی مینہ برس چکا تھا اور دن کے وقت بھی بارش کے آثار دیکھ کر دوسرے دیہات سے آنے والے بہت سے لڑکے غیر حاضر تھے۔

سلیم، مجید اور اُن کے گاؤں کے دوسرے لڑکے اب شاذ و نادر ہی غیر حاضر رہا کرتے تھے لیکن ایسے دنوں میں آم اور جامن کے درختوں کے نیچے یا جھیلوں اور برساتی ندیوں کے کنارے اُن کے لیے دلچسپی کے ہزاروں سامان تھے۔ جب رات کے وقت بارش ہو رہی تھی تو انہیں سو فیصدی یقین تھا کہ انہیں اسکول نہیں جانا پڑے گا اور وہ سارے دن کے لیے کھیلنے کودنے، تیرنے اور نہانے کے پروگرام بنا چکے تھے۔ لیکن علی الصبح بارش تھم گئی اور مشرق کی طرف آسمان کے کونے پر بادلوں نے اِدھر اُدھر سمٹ کر سورج کے لیے جگہ خالی کر دی۔ انہیں مایوسی ہوئی تاہم جب وہ گاؤں سے نکلے تو جنوب مغرب کے کونے سے کالی گھٹا اُٹھ

رہی تھی۔ وہ اس اُمّید پر چلتے رہے کہ یہ گھٹا ان کے اسکول پہنچنے سے پہلے برس پڑے گی اور وہ ہنستے، اچھلتے اور کودتے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ انہوں نے یہ فاصلہ کافی سُست رفتار سے طے کیا لیکن بارش نہ ہوئی۔

مدرسے کی چار دیواری کے قریب پہنچ کر مجید نے کہا۔ ”آج بہت کم لڑکے آئے ہوں گئے، ابھی تک گھنٹی نہیں بجی۔ اگر آدھے لڑکے غیر حاضر ہوئے تو ماسٹر جی چھٹّی دے دیں گے۔ اگر تھوڑی دیر گھنٹی نہیں بجی تو بارش شروع ہو جائے گی۔ ماسٹر جی پھر بھی چھٹّی دے دیں گے۔“

اسکول پہنچ کر وہ باقی لڑکوں کی طرح بے قراری سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بادل اب آسمان کے مشرقی کونے میں پہنچ چکے تھے اور سورج چھُپ چکا تھا۔ اُودے اُودے کالے رنگ کے بادل ایک دوسرے میں گھُل مِل جانے کے بعد ایک دھندلے رنگ کے نقاب میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اسکول کی ایک طرف ایک جوہڑ میں مینڈکوں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا اور دوسری طرف آم کے درخت پر پپیہا بول رہا تھا۔

داؤد ماسٹر جی کا حقّہ اُٹھائے اندر داخل ہوا اور لڑکوں کے چہروں پر مایوسی

چھا گئی۔

داؤد نے اندر جا کر حقّہ ماسٹر جی کے چبوترے پر رکھ دیا اور باہر نکل کر گھنٹی بجا دی۔ لڑکے قطاریں باندھ کر صحن میں کھڑے ہو گئے اور داؤد کے حکم سے ترانہ شروع ہوا۔

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

لیکن کم سن بچّوں کو یہ معلوم تھا کہ شمع کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ وہ صرف آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے دِلوں میں تو ایک ہی تمنّا تھی اور وہ یہ کہ بارش ہو جائے اور ماسٹر جی گھر سے حقّے کا پیچھا نہ کریں۔

لیکن ماسٹر جی آ گئے۔ وہ پٹواری کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ دونوں پھاٹک پر رُک گئے۔ وہ کسی اہم موضوع پر بحث کر رہے تھے اور عام حالات میں اُن کی بحث بہت طویل ہوا کرتی تھی۔

باتیں کرتے کرتے پٹواری نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ماسٹر جی یہ بادل ضرور برسے گا۔ رات بھی خوب بارش ہوئی ہے۔“

ماسٹر جی نے بھی آسمان کی طرف دیکھا اور پھر صحن میں لڑکوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”آج بہت سے لڑکے غیر حاضر ہیں۔“

دُعا ختم ہوئی۔ ماسٹر جی کے حکم سے داؤد اندر سے حاضری کا رجسٹر اٹھا لایا۔ عام حالات میں ماسٹر جی چبوترے پر بیٹھ کر حقّے کے دو چار کش لگانے کے بعد حاضری لگایا کرتے تھے لیکن آج انہوں نے صحن میں کھڑے کھڑے حاضری لی۔ پٹواری اُن کے قریب کھڑا رہا۔ ماسٹر جی نے حاضری لیتے لیتے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک دو بوندیں اُن کے رجسٹر پر گریں اور انہوں نے جلدی سے حاضری ختم کر کے رجسٹر داؤد کے ہاتھ میں دے دیا۔

پٹواری نے کہا۔ ”ماسٹر جی! آج چھٹّی کریں۔“

ماسٹر جی نے جواب دینے کی بجائے آسمان کی طرف دیکھا۔ مجید نے سلیم

کے بازو پر چُٹکی لی اور اُس نے ایک لڑکے کے پیچھے منہ چھپا کر بلند آواز میں کہا۔ ''چھٹّی ! چھٹّی !!''

دوسرے کونے سے کسی اور لڑکے نے اس کی تائید کی اور تمام لڑکے نعرے لگانے لگے۔ ''چھٹّی، چھٹّی، چھٹّی !''

اگر ماسٹر جی کے دماغ پر موسم کے خوشگوار اثرات نہ ہوتے تو وہ شاید ڈنڈا اٹھا لیتے یا انہیں کان پکڑنے کا حکم صادر فرماتے لیکن اُن کے چہرے پر مُسکراہٹ آ گئی اور اس کے ساتھ ہی لڑکوں کے نعرے اور زیادہ بُلند ہو گئے۔ ماسٹر جی نے پٹواری کی طرف دیکھا۔

پٹواری نے کہا۔ ''ماسٹر جی آج آم کھانے کا دِن ہے۔''

ماسٹر جی نے پھر لڑکوں کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''بہت نالائق ہو تم۔ اچھا جاؤ لیکن کل کوئی غیر حاضر نہ رہے۔''

☆☆☆☆☆

لڑکے اسکول سے نکل کر گاؤں سے باہر ایک جوہڑ کے کنارے جمع ہو

گئے۔ گدلے پانی کا یہ جوہڑ ایک چھوٹے سے برساتی نالے کے شفاف پانی سے بھر چکا تھا۔ تھوڑی دیر پانی میں تیرنے اور غوطے لگانے کے بعد لڑکوں نے کبڈی کھیلنی شروع کر دی۔ اسکول والے گاؤں کے لڑکے تعداد میں زیادہ تھے اور باہر کے دیہات سے آنے والے لڑکوں کی تعداد تھوڑی تھی، اس لیے فریقین کی تعداد برابر کرنے کے لیے اسکول والے گاؤں کے چند لڑکے باہر سے آنے والے لڑکوں کی طرف ہو گئے۔

داؤد اور مجید کو کھیل میں شریک کرنے سے تمام لڑکے گھبراتے تھے، اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ مجید ایک طرف ہو گا اور داؤد اس کے مخالف کھیلے گا اور وہ چھوٹے بچّوں کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ایک طرف سے اگر مجید کبڈی کے لیے آئے گا تو اُس کا مقابلہ صرف داؤد کے ساتھ ہو گا۔ اس طرح داؤد کا مُقابلہ صرف مجید کرے گا۔ کھیت کے درمیان دو بستے رکھ کر لکیر کھینچ دی گئی لیکن کھیل شروع ہونے والا تھا کہ مجید کو جوہر کے کنارے خیر دین کے گدھے نظر آ گئے اور وہ داؤد کو اپنے ساتھ لے کر اُس طرف چل دیا۔

سلیم نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو مجید؟“

اس نے کہا۔ ”تم کھیلو سلیم۔ ہم بھی آتے ہیں۔“

مجید کی غیر حاضری میں سلیم اپنی طرف کے کھلاڑیوں کا لیڈر تھا۔ دوسری طرف اس کا مدِّ مُقابل موہن سنگھ تھا۔ کبڈی کی ابتدا موہن سنگھ نے کی۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی مخالف ٹیم کے ایک لڑکے کو ہاتھ لگا کر پچھاڑ گیا۔ اس کے جواب میں سلیم کی طرف سے گلاب سنگھ کبڈی کے لیے نکلا اور ایک لڑکے کو پچھاڑ آیا۔ موہن سنگھ دوبارہ ایک لڑکے کو چھُو گیا۔ پھر سلیم کی باری آئی اور وہ اپنے مدِّ مقابل کو پچھاڑ کر توازن پورا کر آیا لیکن تھوڑی دیر میں سلیم نے محسوس کیا کہ جب موہن سنگھ کبڈی کے لیے آتا ہے تو اُس کے اپنے گاؤں کے لڑکوں میں سے کوئی اسے پکڑنے کی جرأت نہیں کرتا۔ گلاب سنگھ نے سلیم کے کان میں کہا۔ ”سلیم لڑکے موہن سنگھ سے ڈرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مقابلہ کیا تو اُس کے باپ کے نوکر انہیں اُن کے گھروں میں جا کر پیٹ آئیں گے۔ انہوں نے ہمارے آدھے ساتھیوں کو بٹھا دیا ہے، یہ جلال، رام لال اور بشیر بھی

ڈرتے ہیں۔“

سلیم نے کہا۔ ”ابے جلال! تم موہن سنگھ سے ڈرتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”جب میں کبڈی کے لیے جاتا ہوں تو وہ مجھے گالیاں دیتا ہے۔“

”اچھا اب کی بار میں اُس کی خبر لوں گا؟“ سلیم کو یوں بھی اس سے نفرت تھی جب سے اُس نے یہ سُنا تھا کہ موہن سنگھ نے داؤد کو اپنے نوکروں سے پٹوایا تھا اور اپنے باپ سے داؤد کے باپ کی بے عزّتی کروائی تھی۔ وہ اسے بہت حقیر سمجھتا تھا۔

جب موہن سنگھ کبڈی کے لیے آیا تو سلیم آگے بڑھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ موہن سنگھ نے پوری طاقت سے اس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ اس کے جواب میں سلیم کا ہاتھ اس کی گردن پر لگا۔ اس نے اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن سلیم نے آگے بڑھ کر اُس کے سینے پر دوہتڑ ماری اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔ موہن سنگھ نے گِرتے ہی ”کبڈی کبڈی“

کی بجائے گالیوں کی گردان شروع کر دی۔ یہ دونوں کے لیے نیا تجربہ تھا۔ موہن سنگھ کے ساتھ کھیل کود میں کسی نے آج تک اپنی جسمانی قوّت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہیں کی تھی اور سلیم کو کسی نے گالی نہیں دی تھی۔ دونوں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ موہن سنگھ نیچے گِر کر بھی گالیاں دے رہا تھا اور سلیم ہر گالی کے جواب میں اسے ایک مکّار سید کر دیتا تھا۔ ایسی حالت میں زمیندار کے صاحبزادے کی مدد کرنا اس کے گاؤں کے غریب لڑکوں کے لیے ایک مجبوری تھی۔ پانچ چھ لڑکے سلیم پر پل پڑے لیکن گلاب سنگھ اور بشیر نے بھاگ کر اپنی تختیاں اُٹھالیں۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ تھی۔ باہر کے دیہات کے تین اور لڑکے سلیم، گلاب سنگھ، اور بشیر کے طرف دار بن گئے اور باقی غیر جانبدار ہو گئے۔ جلال حسبِ عادت اپنا بستہ اُٹھا کر پوری رفتار سے اپنے گاؤں کا رُخ کر رہا تھا۔

سلیم نے کھیت کی چکنی مٹّی اُٹھا کر موہن سنگھ کے منہ پر تھوپ دی اور اسے چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔

موہن سنگھ سلیم کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی اپنے ساتھیوں کی طرف

متوجّہ ہوا۔ ”دیکھو! اب یہ بھاگ نہ جائیں، انہیں گھیر لو؟“

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ اتنی دیر میں رام لال جوہڑ کے دوسرے کنارے پہنچ کر دُہائی دے رہا تھا۔ ”داؤد! مجید! لڑائی ہو گئ! دوڑو، دوڑو!“

وہ گدھوں پر ڈنڈے برساتے چلے آرہے تھے اور خیر دین حسبِ معمول اُن کے پیچھے تھا۔ موہن سنگھ کے ساتھی اس کے حکم کے مطابق کھیت کے چاروں طرف گھیر اڈال چکے تھے۔

سلیم اور اس کے ساتھی مشورہ کرنے کے بعد اچانک اس طرف ٹوٹ پڑے جدھر موہن سنگھ کھڑا تھا۔ گلاب سنگھ کی تختی ایک لڑکے کے بازو پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگ نکلا۔ بشیر نے دوسرے کے گھٹنے پر ضرب لگائی اور اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ باقی اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ سلیم کا رُخ موہن سنگھ کی طرف تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کٹ چکا تھا۔ اس نے بھاگ کر اُن تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن سلیم نے اُس کا راستہ روک لیا۔ مجبوراً اُس نے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ سلیم نے اُس کی پیٹھ پر

ایک تختی رسید کی اور اُس کی رفتار تیز ہو گئی۔ دھوبی کے گھر تک سلیم نے اُس کا پیچھا کیا لیکن جب دھوبی کا کتّا گھر سے نکل کر بھونکتا ہوا موہن سنگھ کے پیچھے ہو لیا تو سلیم ہنستا ہوا واپس آ گیا۔ اتنی دیر میں مجید اور داؤد پہنچ چکے تھے اور موہن سنگھ کے باقی ساتھیوں کو کان پکڑنے کا حکم دے چکے تھے۔ سلیم نے کہا۔ ”داؤد ان کا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے ہمیں کچھ نہیں کہا۔ یہ موہن سنگھ کے خوف سے ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے تیّار ہو گئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ موہن سنگھ اپنے نوکروں سے پِٹوائے گا۔“

داؤد نے کہا۔ ”اچھا چھوڑ دو کان۔“

ایک لڑکے نے کہا۔ ”سلیم! اب تم بھاگ جاؤ موہن سنگھ تم سے مار کھا کر گیا ہے۔ وہ اپنے باپو اور نوکروں کو لے آئے گا!“

”بھاگنے والے ڈرپوک ہوتے ہیں۔“ اس نے غصّے سے لال پیلا ہو کر جواب دیا۔ مجید نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو داؤد! میرا بھائی ہے نا آخر!“

داؤد نے کہا۔ ”دیکھو مجید! اس کے باپ یا نوکروں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے تمہارا ساتھ دینا پڑے گا اور تم جانتے ہو کہ انہوں نے ایک دفعہ مجھے پیٹا تھا اور میرے باپ کی بے عزّتی کی تھی۔“

مجید نے تن کر کہا۔ ”آج اگر وہ آئے تو ہم تمہارا بدلہ لیں گے۔“

”لیکن مجھے اس کی سزا ضرور ملے گی۔ وہ کہیں گے یہ سب میری شرارت ہے۔“

سلیم نے کہا۔ ”دیکھو داؤد! تم چلے جاؤ۔ ہم نہیں جائیں گے۔“

داؤد نے مُڑ کر کہا۔ ”چلا جاؤں۔ تمہیں اور مجید کو چھوڑ کر۔ نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ زیادہ سے زیادہ میرے باپ کی بے عزّتی کریں گے لیکن اس کے بدلے میں موہن سنگھ کے سر کا ایک بال نہیں چھوڑوں گا۔“

اسکول والے گاؤں کے لڑکوں کو ایک طرف اس بات کا احساس تھا کہ موہن سنگھ اپنے باپ اور نوکروں کو لے کر ضرور آئے گا۔ دوسری

طرف وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ مجید، سلیم اور اُن کے ساتھی بھاگنے کی بجائے اُن کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں، اس لیے وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ ان میں سے بعض دور سے تماشا دیکھنے کے شوق میں قریب ہی ایک بڑ کے درخت پر چڑھ گئے۔ داؤد اور مجید کے آ جانے سے باہر کے دیہات کے وہ لڑکے جو پہلی لڑائی میں غیر جانبدار رہے تھے اب ان کے ساتھ ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

مجید کے مشورے پر لڑکوں نے اپنے بستے اُٹھا کر پاس ہی گنّے کے ایک کھیت میں چھپا دیے اور جوہڑ کے کنارے بیٹھ گئے۔

مجید نے کہا۔ ”دیکھو! جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی نہ اُٹھے، جب کوئی آئے گا میں خود اس کے ساتھ بات کروں گا۔“

مجید نے اپنی پگڑی اُتار کر اسے دوہرا کیا اور پھر کوئی دو سیر گیلی مٹّی لے کر اس کا گولہ بنایا اور ایک سِرے میں باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ اُٹھا اور ایک

طرف ہو کر بولا۔ ”داؤد جانتے ہو یہ کیا ہے؟“

داؤد کی خاموشی پر اس نے خود ہی جواب دیا۔ ”یہ ایک ہتھیار ہے۔ میں نے یہ چچا افضل سے سیکھا ہے۔ چچا افضل نے ایک دفعہ اس کے ساتھ ایک ڈاکو کو اس کے گھوڑے سمیت گرالیا تھا۔“

”کیسے؟“ داؤد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

مجید نے پگڑی کا ایک سِرا دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اسے اپنے سر سے اُوپر گھماتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو! اب یہ لاٹھی سے زیادہ خطرناک ہے۔ اگر کوئی اس کی لپیٹ میں آ جائے تو وہیں گر پڑے گا۔“ مجید نے عملی ثبوت دینے کے لیے پگڑی کو تیزی سے گھماتے ہوئے مٹّی والا سِرا زمین پر دے مارا۔ اس سے گیلی اور نرم زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا پڑ گیا۔ مجید لڑکوں کے قریب آ بیٹھا اور اُن کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

داؤد نے جلدی سے اپنی پگڑی اُتاری اور دونوں ہاتھوں سے مٹّی کھودتے

ہوئے کہا۔ ”ارے یہ تو بہت اچھا ہتھیار ہے لیکن۔۔۔۔۔ یہ مٹّی نرم ہے۔ اگر اس کی بجائے!“ وہ اپنا فقرہ پورا کیے بغیر اُٹھ کر ایک کنوئیں کی طرف بھاگا اور ٹوٹی ہوئی منڈیر سے دو اینٹیں اُٹھالایا۔ اس نے ایک اینٹ اپنی پگڑی کے ساتھ باندھ لی اور دوسری مجید کو دیتے ہوئے کہا۔ ”مٹّی کی بجائے یہ ٹھیک ہے مجید!“

باقی لڑکے بھی اپنے اپنے لیے اینٹیں اُٹھالائے۔ تھوڑی دیر میں وہ سب اس جدید قسم کے ہتھیار سے مسلح ہو چکے تھے لیکن سلیم کو اِس بات کا افسوس تھا کہ وہ پگڑی جیسی کار آمد چیز کی بجائے اپنے سر پر ٹوپی پہن کر آیا ہے۔

اچانک اس کی نگاہ جوہڑ کے دوسرے کنارے پر پڑی۔ خیر دین کمہار گدھوں کے پیچھے بھاگنے کے بعد تازہ دم ہونے کے لیے جوہڑ میں نہا رہا تھا۔ اس کے کپڑے کنارے پر پڑے ہوئے تھے۔ عام حالات میں سلیم شاید ایسی حرکت نہ کرتا لیکن معاملہ نازک تھا، بھاگتے ہوئے دوسرے کنارے پہنچ کر خیر دین کی پگڑی اُٹھالی۔ خیر دین دوسری طرف مُنہ کر

کے ڈبکیاں لگا رہا تھا اس لیے اس کی نگاہ سلیم پر نہ پڑی۔

جب سلیم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو موہن سنگھ اور اس کے تیس نوکر گاؤں سے نکل کر جوہڑ کا رُخ کر رہے تھے۔ اب اینٹ مہیّا کرنا مشکل تھا۔ اس لیے سلیم کو مٹّی پر اِکتفا کرنا پڑا۔

موہن سنگھ کے ہاتھ میں ہاکی تھی اور اُس کے نوکروں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ داؤد نے کہا۔ ”مجید اس کالی پگڑی والے نے میرے باپ کو جوتے مارے تھے۔ اس کے ساتھ میں نپٹوں گا۔“

مجید نے کہا۔ ”لیکن جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی نہ اُٹھے۔“

جب وہ قریب آ گئے تو مجید اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نوکروں نے جب دیکھا کہ ان بچّوں کے پاس ان لاٹھیوں کا کوئی جواب نہیں تو اطمینان سے اُن کے قریب کھڑے ہو گئے۔

ایک آدمی نے کہا۔ ”موہن سنگھ کو کس نے مارا ہے؟“

موہن سنگھ سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلّایا۔ ”مجھے اِس نے مارا

ہے۔“

مجید نے کہا۔ ”تم انہیں کیوں لائے ہو اپنے باپ کو ساتھ کیوں نہیں لائے ؟“

موہن نوکروں کی طرف دیکھ کر پھر چلّایا۔ ”یہ سلیم کا بھائی ہے اور یہ تمام لڑکے اس کے ساتھی ہیں، ان سب کو پکڑ لو!“

نوکر نے کہا۔ ”تم سب ہمارے ساتھ سردار جی کے پاس چلو۔“

مجید نے بے پروائی سے کہا۔ ”ارے دیکھے ہیں تمہارے سردار جی! نہیں جاتے ہم اس کے پاس۔“

نوکر کو اس غیر متوقع جواب نے ایک لمحہ کے لیے پریشان کر دیا۔ وہ مُڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کالی پگڑی والا پست قامت آدمی کچھ دیر غور سے داؤد کی طرف دیکھنے کے بعد اچانک چلّا اُٹھا۔ ”ارے یہ نور دین تیلی کا لڑکا ہے۔ ابے تیلی کے بچّے تمہیں وہ مار بھول گئی ؟“

سلیم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”داؤد پر تمہیں اس لیے غصّہ آتا ہے کہ

اس کا باپ غریب ہے۔ موہن سنگھ کو میں نے مارا ہے اور جب بھی دکھائی دے گا میں اسے ماروں گا۔“

نوکر نے سلیم کو ڈرانے کی نیّت سے لاٹھی اُٹھائی لیکن اس سے قبل مجید کے ہاتھ حرکت میں آ چکے تھے۔ پگڑی کے ساتھ تیزی سے گھومتی ہوئی اینٹ اس کو پسلی پر لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹ کر زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ پسلی پر رکھ کر کراہنے لگا۔ اس کے ساتھی حیرت زدہ ہو کر اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجید نے اچانک اُس کی لاٹھی اُٹھالی۔ ایک آدمی نے مجید کو لاٹھی مارنے کی کوشش کی لیکن وہ جست لگا کر ایک طرف ہو گیا۔ اتنی دیر میں مجید کے باقی ساتھ میدان میں آ چکے تھے مجید کے مدّ ِمقابل نے اس پر دوسرا وار کرنے کے لیے لاٹھی بُلند کی لیکن پیچھے سے گلاب سنگھ کی پگڑی کے ساتھ گھومتی ہوئی اینٹ اُس کی گردن پر لگی اور اُس کے ساتھ ہی مجید نے اُس کی ٹانگ پر کئی بار لاٹھی مار دی۔ مجید نے دوسری بار لاٹھی اُٹھائی تو وہ بھاگ نکلا۔

وہ آدمی جس نے سب سے پہلے مجید سے چوٹ کھائی تھی اب اُٹھنے کی

کوشش کر رہا تھا لیکن چار لڑکے اُس کے گرد کھڑے تھے۔ ایک اینٹ اُس کے سر پر گی اور وہ مُنہ کے بل لیٹ گیا۔

موہن سنگھ نے شکست کے آثار دیکھ کر چند قدم دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سلیم آنکھ بچا کر ایک لمبا چکّر کاٹنے کے بعد اُس کے قریب جا پہنچا۔ موہن سنگھ اس وقت خبر دار ہوا جب وہ سلیم کی زد میں آ چکا تھا۔ جست لگانے سے پہلے اُس کی ٹانگیں پگڑی کی لپیٹ میں آ گئیں اور وہ مُنہ کے بل گر پڑا۔ سلیم کے دو چار گھونسے کھانے کے بعد وہ اُٹھا اور اپنی پگڑی اور آدھی قمیص سلیم کے ہاتھوں میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

سلیم بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا تو لڑائی کا آخری حصّہ ایک دلچسپ مشغلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کالی پگڑی والے ٹھنگنے قد کے آدمی پر داؤد نے قسمت آزمائی کی تھی، وہ اینٹ کی ضرب سے تو بچ گیا لیکن داؤد کی پگڑی اُس کی گردن کے گرد لپٹ چکی تھی۔ داؤد نے پگڑی کو زور سے جھٹکا دیا اور وہ زمین پر آ رہا۔ داؤد اُسے گھسیٹ رہا تھا اور اُس نے گلا گھُٹ جانے کے خوف سے پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ داؤد کا کھیل

دلچسپ سمجھ کر باقی لڑکے بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔

موہن سنگھ کا دوسرا نوکر جو زمین پر لیٹا ہوا اپنے چاروں طرف گھومنے والی پگڑیوں کو لاٹھیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ رہا تھا، اپنے پہریداروں کی توجّہ دوسری طرف مبذول ہوتی دیکھ کر اُٹھا اور کسی توقف کے بغیر گاؤں کی طرف بھاگ نکلا اور مجید نے جاتے جاتے اُس کی پُشت پر ایک لاٹھی رسید کر دی۔

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ دُشمن میدان چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔ فتح حاصل کرنے والوں کو مالِ غنیمت میں دو لاٹھیاں، دو جوتے، ایک پگڑی اور پھٹی ہوئی قمیص کا ایک ٹکڑا ہاتھ لگا۔ اس کے علاوہ ایک قیدی بھی تھا جسے داؤد نے زندہ گرفتار کر لیا تھا۔ کالی پگڑی والا ٹھگنے قد کا آدمی اپنی زندگی میں پہلی محسوس کر رہا تھا کہ پگڑی جیسی بے ضرر چیز کا اگر غلط استعمال کیا جائے تو یہ ایک خوفناک ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اُسے اس بات کا عملی تجربہ ہو رہا تھا کہ لڑکے خاص کر اسکولوں کے لڑکے غصّے کی نسبت خوشی کی حالت میں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ ان سے جان

چھڑانے کے لیے زمین پر ناک کے ساتھ لکیریں نکال چکا تھا لیکن اُس کے بعد کسی نے کہہ دیا کہ اِس کی پگڑی کالی ہے، اس کا مُنہ بھی کالا کر دو۔ چنانچہ آٹھ دس دواتوں کی سیاہی اس کے مُنہ پر مل دی گئی۔ پھر کسی نے قہقہہ لگایا اور وہ سمجھ گیا کہ اب کوئی نئ مصیبت آئے گی چنانچہ قہقہے لگانے والے نے یہ کہہ کر خدشات پورے کر دیے کہ اب اِسے جوتے لگاؤ اور اس کے سر پر جوتوں کی بارش ہوئی۔

پھر کسی نے کہا۔ "چلو اسے اپنے گاؤں لے چلیں۔ بچّے اُسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔" اس کا دل بیٹھ گیا۔ مکّے، گھونسے، لاتیں اور جوتے کھانے کے بعد اُس میں بچّوں کے کسی نئے گروہ کے لیے دلچسپی کا سامان مہیّا کرنے کی سکت نہ تھی۔ داؤد نے کہا۔ "اچھا قسم کھاؤ کہ تم پھر اسکول کے کسی لڑکے سے نہیں لڑو گے؟"

اس نے کہا۔ "میں قسم کھاتا ہوں۔"

"اچھا کہو کہ تم ایک بندر ہو۔"

اس نے کہا۔ ”میں ایک بندر ہوں۔“

”اور میں بندر کی طرح ناچ سکتا ہوں۔“

”اور میں بندر کی طرح ناچ سکتا ہوں۔“

مجید نے اُس کی پگڑی اُس کے گلے میں باندھ دی اور کہا۔ ”شاباش! میرے بندر اب ناچ کر دکھاؤ!“ وہ بے بسی کی حالت میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکے شور مچانے لگے۔ ”اسے ناچنا نہیں آتا، اس نے جھوٹ بولا ہے۔ماسٹر بھی جھوٹ بولنے والوں کے کان پکڑواتے ہیں۔“

داؤد نے کہا۔ ”اچھا کان پکڑو!“

اس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کان پکڑ لیے۔ لڑکے اب مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

مجید نے کہا۔ ”ارے بندر، یوں نہیں۔ گُلاب سنگھ تُم اِسے کان پکڑ کے دِکھاؤ۔“ گلاب سنگھ نے اُس کے سامنے نمونہ پیش کر کے اُسے اِس سیدھے سادھے مسئلے کی پیچیدگیوں کا احساس دلایا۔“ وہ کان پکڑے سوچ

رہا تھا کہ اب اس کے ساتھی سردار جی کے پاس پہنچ گئے ہوں گے۔ وہ تھوڑی دیر میں آدمیوں کا نیا جتھہ لے کر پہنچ جائیں گے۔ جب اُسے بہت زیادہ کوفت ہونے لگی تو وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی اور لڑکے بھاگ جائیں گے۔ جب تکلیف نا قابلِ برداشت ہوئی تو وہ چلا اٹھا۔ ”مجھے چھوڑ دو، سردار جی تھوڑی دیر میں گاؤں کے تمام آدمیوں کو لے کر آ جائیں گے۔ تم بھاگ جاؤ۔“

لڑکے اچانک سنجیدہ ہو گئے۔

داؤد نے کہا۔ ”چلو مجید! گاؤں کے آدمیوں سے ہم نہیں لڑ سکتے، اگر تم لڑائی کرنا چاہتے ہو تو ایک لڑکے کو اپنے گاؤں بھیج دو۔“

کسی نے پیچھے سے بارُعب آواز میں کہا۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

اور لڑکے اِدھر اُدھر ہٹ گئے اور کان پکڑنے والا اس آواز کو تائیدِ غیبی سمجھ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ سلیم کا چچا افضل تھا اور اُس کے ساتھ گلاب سنگھ کا باپ شیر سنگھ تھا۔ ان

کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور لڑکوں کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ انہیں جلال نے بھیجا ہے۔

افضل اور شیر سنگھ نے جنگی قیدی کے چہرے پر سیاہی دیکھ کر قہقہہ لگایا اور بچّوں کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

اس کے جواب میں سلیم نے ساری سرگزشت سنا دی۔ افضل اور شیر سنگھ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شیر سنگھ نے کہا "چرن سنگھ بڑا کمینہ ہے۔ یہ دوسروں کے بچّوں کو کیا سمجھتا ہے۔ چلو اُس کے پاس چلیں۔"

افضل نے کہا۔ "یہیں ٹھہرو! اب وہ زیادہ آدمی لے کر آئے گا۔"

سلیم نے کہا۔ "چچا جی اس سے پہلے اس نے داؤد اور اُس کے باپ کو اپنے نوکروں سے پٹوایا تھا، آج داؤد نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ اگر آپ نے اُسے نہ روکا تو وہ پھر اِس کے باپ کی بے عزّتی کرے گا۔"

"ہم اسے ٹھیک کر دیں گے۔" یہ کہہ کر افضل سردار کے نوکر کی طرف متوجّہ ہوا۔ "کیوں بدمعاش تمہیں لڑکوں کے مقابلے میں لاٹھیاں اُٹھا کر

آتے ہوئے شرم نہ آئی؟“

اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”چودھری جی! ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ آپ کے بچّے ہیں۔“

”دیکھو بدمعاش! بچّے سب ایک جیسے ہیں۔ آئندہ اگر تُم نے کسی لڑکے پر ہاتھ اُٹھایا تو تمہاری خیر نہیں!“

”نہیں چودھری جی!“

”اچھا جاؤ۔ جا کر اپنا حُلیہ ٹھیک کرو۔“

نوکر چند قدم دُور جا کر جوہڑ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ گاؤں سے آدمیوں کا شور و غوغا سُن کر افضل اور شیر سنگھ چند قدم دور ایک جھاڑی کے پیچھے چھُپ کر بیٹھ گئے۔ افضل اور شیر سنگھ کی موجودگی میں لڑکوں کو کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ

اطمینان سے کبڈی کھیل رہے تھے۔ موہن سنگھ کا باپ چرن سنگھ تقریباً دس آدمیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ چیختے چلّاتے اور گالیاں دیتے چلے آ رہے تھے۔ چرن سنگھ کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو یہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سب کو پکڑ لو۔“

اس کے ساتھی لڑکوں کو پکڑنے یا مارنے سے زیادہ انہیں بھگانے کے خواہش مند تھے۔ گاؤں سے نکلتے وقت اُن کی زبانیں کافی جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر لڑکے پہلے ہی بھاگ نہیں گئے تو انہیں دیکھ کر بھاگ جائیں گے۔ لیکن وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ کبڈی کھیل رہے تھے اور گاؤں کے آدمیوں کا جوش و خروش پریشانی میں تبدیل ہو رہا تھا۔

چرن سنگھ یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ گُستاخ لڑکے اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ انہوں نے اُس کے لڑکے پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔ اس کے نوکروں کے ہاتھوں مار کھانے کی بجائے اُلٹا انہیں پیٹ ڈالا تھا۔ وہ ایک ہزار ایکڑ کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے دس جنگجو آدمی تھے۔ وہ گلا

پھاڑ کر اپنے خوفناک عزائم کا اظہار کر رہا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ لڑکے کبڈی کھیل رہے تھے۔ صرف اس کے گاؤں کی حدود میں ہی نہیں بلکہ اُس کے اپنے کھیت میں، ان کی بے پروائی اور بے توجہی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس گاؤں کے مالک ہیں۔ یہ زمین اُن کی ہے اور انہیں گالیاں اور دھمکیاں دینے والے کسی اور ملک کے باشندے ہیں اور وہ ان پر حملہ کرنے کی بجائے یونہی شور مچاتے ہوئے اُن کے قریب سے گُزر جائیں گے۔ چرن سنگھ کے نوکر جو تھوڑی دیر پہلے شکست کھا کر گئے تھے، اُسے بتا چکے تھے کہ ان کی پگڑیاں لاٹھیوں سے زیادہ خطرناک ہیں لیکن اب وہ خالی ہاتھ کھیل رہے تھے۔ حملہ آور جوں جوں محاذِ جنگ سے قریب آرہے تھے، ان کی رفتار اور گُفتار میں سنجیدگی آرہی تھی۔

جب وہ کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھے تو افضل اور شیر سنگھ جھاڑی کے عقب سے نکلے اور چند قدم آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔

حملہ آوروں پر اچانک ایک سکوت طاری ہو گیا۔ ان کی بجائے اب لڑکے چلّارہے تھے۔

افضل نے لڑکوں کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور چرن سنگھ اس حرکت کو ایک اچھا شگون سمجھ کر چند قدم آگے بڑھا۔ اس نے کہا۔ ”چودھری افضل! ان لڑکوں نے میرے لڑکے اور میرے نوکروں کو مارا ہے۔“

افضل نے جواب دیا۔ ”مگر تمہارے لڑکے اور نوکروں نے ان لڑکوں کو اس قسم کی گالیاں دی تھیں جیسی تم ابھی دے رہے ہو تو انہوں نے بہت اچھا کیا ہے۔“

شیر سنگھ نے کہا۔ ”چرن سنگھ ہمارا خیال تھا کہ تم اپنے گاؤں کے سارے آدمی لے کر آؤ گے۔ تمہارے بال سفید ہو گئے لیکن عقل نہ آئی۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے لڑکے کے سوا باقی تمام بچّے لاوارث ہیں تو ان میں سے کسی کو ہاتھ لگا کر دیکھو!“

چرن سنگھ نے فدویانہ انداز میں کہا۔ ”شیر سنگھ تمہارے ساتھ میری کوئی لڑائی نہیں لیکن ان لڑکوں نے میرے لڑکے کو بہت مارا ہے۔“

شیر سنگھ نے کہا۔ ”تمہارے لڑکے کو صرف دو لڑکوں نے مارا ہے۔ ان

میں سے ایک میرا لڑکا ہے اور دوسرا افضل کا بھتیجا ہے۔ ہم نے اپنے بچّوں کو گالیاں نہیں سکھائیں لیکن گالیوں کا جواب دینا ضرور سکھایا ہے۔ تمہارے لڑکے نے انہیں گالیاں دی تھیں، اب تمہیں اس بات کا افسوس نہیں ہونا چاہیے کہ اسے گالیوں کا جواب دیا گیا ہے۔ اگر تمہاری تسلّی نہیں ہوئی تو ہمّت کرو، تمہارے ساتھ دس آدمی ہیں، ہم صرف دو ہیں۔ اگر تم کہو تو ہم اپنی لاٹھیاں بھی پھینک دیتے ہیں لیکن یہ فوج جو تم اپنے ساتھ لے کر آئے ہو لڑنے والی نظر نہیں آتی۔"

افضل نے کہا۔ "چرن سنگھ کو صرف بچّوں پر غصّہ آتا ہے۔ سلیم! گلاب! مجید! ذرا آگے ہو جاؤ۔ سردار جی اپنا غصّہ نکال لیں۔"

یہ تینوں لڑکے آگے بڑھ کر چرن سنگھ کے قریب کھڑے ہو گئے۔ چرن سنگھ انتہائی پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اگر اس کے سامنے کوئی اور ہوتا تو وہ کب کا آپے سے باہر ہو گیا ہوتا لیکن افضل اور شیر سنگھ کا معاملہ مختلف تھا۔ بالآخر جہاں طاقت نے جواب دے دیا وہاں عقل کام آئی۔ اس نے کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ موہن سنگھ نے

تمہارے بچّوں کو گالیاں دی ہیں تو میں خود اُس کی مرمّت کرتا۔"

افضل نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر کہا۔ "بچّے اپنے باپ اور نوکروں سے گالیاں سیکھتے ہیں۔ اب جاؤ سردار جی ہم تمہارے ساتھ لڑنے نہیں آئے تھے۔ یہ بچّوں کا معاملہ تھا کل یہ پھر ایک ہو جائیں گے۔ بڑوں کو ان کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم اپنے لڑکے کے کہنے پر لوگوں کے ساتھ لڑتے پھروگے تو اپنی عزّت خراب کروگے۔"

اس کے بعد فریقین میں تھوڑی دیر تک مصالحانہ باتیں ہوتی رہیں۔ سردار چرن سنگھ، افضل اور شیر سنگھ کو اپنے گھر کا پانی پلانے اور اپنے باغ کے آم کھلانے پر اصرار کر رہا تھا اور وہ معذرت کر رہے تھے۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ اپنے گاؤں کا رُخ کرنے والے تھے کہ جوہڑ کے دوسرے کنارے کسی کی چیخ وپکار نے انہیں اس طرف متوجّہ کر دیا۔ پنڈت رام پرشاد چلّا رہا تھا۔ "خیرو کے بچّے! یہ بے زبان ہے، ارے پاپی اسے نہ مارو؟" اور خیرو بے تحاشا اس کی گائے پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔ گائے بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی اور خیرو اسے گھیر

گھیر کر مار رہا تھا۔

لوگوں نے بارہا گدھوں پر خیرو کا عتاب دیکھا تھا لیکن پرائی گائے کے ساتھ اُس کا یہ سلوک اُن کے لیے ایک معمّا تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ سب جوہڑ کے دوسرے کنارے پہنچ کر خیرو کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے اور خیرو کہہ رہا تھا "سردار جی! چودھری جی! میری بھی سنو۔ یہ گائے میری پگڑی نگل گئی ہے۔ غضب خدا کا سات گز کی پگڑی۔ بالکل نئی، بہاری لال سے پوچھو۔ میں نے پچھلے مہینے اُس سے خریدی تھی۔ مجھے پگڑی کا اتنا افسوس نہیں لیکن اس کے ساتھ ایک تعویذ بندھا ہوا تھا اور میں نے اُس کے لیے پیر ولایت شاہ کو پانچ روپے دیے تھے۔"

افضل نے کہا۔ "ارے تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ گائے تمہاری پگڑی کیسے نکل گئی؟" اس نے کہا۔ "چودھری جی خُدا کی قسم میری پگڑی گائے نے کھائی ہے۔ میں کپڑے اُتار کر نہا رہا تھا۔۔۔۔ اور گائے کے سوا کوئی یہاں نہیں تھا۔"

چرن سنگھ نے کہا۔ ”ارے نہیں پانی میں گر گئی ہو گی۔“

”سردار جی، میں کنارے کے ساتھ ساتھ پانی میں بھی تلاش کر چکا ہوں۔“

افضل نے کہا۔ ”تو پھر کسی اور جگہ رہ گئی ہو گی۔ جاؤ جا کر گھر میں تلاش کرو۔“

”جی میں گھر میں بھی دیکھ آیا ہوں۔ میں آس پاس کے کھیتوں میں بھی تلاش کر چکا ہوں۔۔۔۔۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید میری پگڑی پانی میں گِر گئی ہے۔ میں دوبارہ کپڑے اُتار کر پانی میں تلاش کر رہا تھا تو یہ گائے آ کر میری چادر کا کونہ چبا رہی تھی۔۔۔۔ دیکھو!“ اس نے کنارے پر پڑی ہوئی چادر اُٹھا کر ایک کونہ انہیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں فوراً نہ چھڑا لیتا تو وہ اِسے بھی نِگل جاتی۔“

سلیم خیرو کی پگڑی بغل میں دبائے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے مجید کے کان میں کچھ کہا۔ مجید نے داؤد سے سرگوشی کی اور اس نے سلیم سے پگڑی

لے کر اپنی قمیص کے دامن میں چھپالی اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد چُپکے سے جوہڑ کے کنارے رکھ دی۔

سکول کے لڑکے ایک دوسرے کے ساتھ کانا پھوسی کرنے کے بعد ہنس رہے تھے۔ اچانک خیرو کے گاؤں کے ایک آدمی نے کہا۔ ”ارے وہ کیا ہے؟“

”ابے خیرو کے بچّے اندھے تو نہیں ہوگے تم۔“ دوسرے آدمی نے آگے بڑھ کر خیرو کی پگڑی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ کیچڑ اور مٹّی سے خیرو کی پگڑی کا حلیہ بہت حد تک بدل چکا تھا لیکن اُس کے ساتھ بندھا ہوا تعویذ دیکھ کر اسے تسلیم کرنا پڑا کہ یہ پگڑی میری ہے۔ تاہم وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ اِس سے پہلے پگڑی یہاں سے غائب تھی۔ پنڈت رام پرشاد جس نے انتہائی صبر سے گزشتہ صورتِ حال کا سامنا کیا تھا اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

بارش کی رفتار نے لوگوں کو زیادہ دیر ہنسنے کا موقع نہ دیا۔ جب وہ رُخصت ہو رہے تھے تو سلیم نے آگے بڑھ کر دبی زبان میں افضل سے کہا۔ ”چچا یہ داؤ پر غصّہ اُتاریں گے۔“

"بیٹا! تم فکر نہ کرو۔" یہ کہہ کر افضل آگے بڑھا اور چرن سنگھ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ کچھ دیر دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ جب افضل اور شیر سنگھ بچّوں کو لے کر اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے تو داؤد بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور جا کر افضل نے کہا "داؤد! بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ۔ میں نے تمہارے متعلّق اُس کے کان کھول دیے ہیں۔ اگر وہ اب بھی تمہیں کچھ کہے تو میرے پاس چلے آنا۔"

اگلے دِن لڑکوں نے موہن سنگھ کے ردِّعمل میں ایک غیر متوقع تبدیلی محسوس کی اور لڑکے اُسے کل کے واقعات سُنا سُنا کر چھیڑ رہے تھے اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے پڑوس کے لڑکوں نے بتایا کہ اس کے باپ نے گھر پہنچ کر سارا غصّہ اُس پر نکالا تھا۔

☆☆☆☆☆

افضل اور شیر سنگھ کے سامنے چرن سنگھ کا احساسِ مرعوبیت بِلا وجہ نہ تھا۔ علاقے میں کسی کو بھی اُن کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ ان کی دوستی اور بہادری کی داستانیں دُور دُور تک مشہور تھیں۔ دونوں چھ فٹ

کے تنو مند اور خوش شکل جوان تھے۔ دونوں کو کشتی لڑنے، گتکا کھیلے اور گھوڑوں پر سواری کرنے کا شوق تھا۔

افضل اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ جب سے اس کا بڑا بھائی علی اکبر تحصیل دار ہوا تھا اُس نے اپنی جیب سے افضل کی خاطر دو نوکر رکھ دیے تھے اور افضل کو کھیتی باڑی کے کاموں سے بہت حد تک چھٹّی مل گئی تھی۔

شیر سنگھ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور اس کے چھوٹے بھائی اُسے کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔

افضل نے پرائمری تک تعلیم پائی تھی اور وہ ہیر وارث شاہ پڑھ لیتا تھا۔ شیر سنگھ نے دوسری جماعت سے اسکول چھوڑ دیا تھا اور اُسے الف آم، ب بکری اور ت تختی کے سوا سب کچھ بھول چکا تھا۔

تاہم افضل کی زبان سے بار بار سُننے کی وجہ سے اُسے بھی ہیر وارث شاہ کے کئی اشعار زبانی یاد ہو گئے تھے۔ لوگوں پر رُعب ڈالنے کے لیے وہ

کوئی نہ کوئی کتاب کھول کر اپنے سامنے رکھ لیتا اور افضل سے سیکھی ہوئی لَے میں وارث شاہ کے شعر سُنانے لگتا۔ اس کے لیے ہر کتاب وارث شاہ کی ہی تھی۔ ایک دفعہ سلیم نے اُس کے ہاتھ میں دوسری جماعت کی کتاب دیتے ہوئے کہا۔ ''چچا پڑھ کر سناؤ'' اور شیر سنگھ نے یونہی کتاب کھول کر ہیر کے پندرہ بیس شعر سُنا دیے۔ علاقے کے دیہاتی میلے افضل اور شیر سنگھ کے بغیر بے رونق سمجھے جاتے، وہ میلوں میں جاتے، کُشتی لڑتے، کبڈی کھیلتے اور اگر کوئی مجبوری پیش آجاتی تو لٹھ بازی بھی کر لیتے۔ دیہاتی میلے کبھی کبھی لڑائی کا اکھاڑا بھی بن جاتے تھے۔ مشہور و معروف ڈاکو اپنے خزانوں کے ساتھ طاقت آزمائی کے لیے میلوں میں آتے، ایک شراب کے نشے میں لاٹھی بُلند کر کے پکارتا کہ فلاں کہاں ہے؟ دوسری طرف سے اُس کے چیلنج کا جواب ملتا۔ پھر دونوں گروہ ایک دوسرے کی طرف بڑھتے، لاٹھیاں آپس میں ٹکراتیں، سر پھٹتے، دکانداروں کی چھابڑیاں اُلٹ جاتیں۔ کمزور آدمی پیروں کے نیچے مسلے جاتے۔ ایک گروہ اپنے لیڈر سمیت بھاگ نکلتا۔ دوسرا اُس کا پیچھا کرتا۔ پھر جب معاملہ ٹھنڈا ہو جاتا تو پولیس پہنچ جاتی اور چند آدمیوں کو ہتھکڑیاں لگ جاتیں۔

لیکن جب سے افضل اور شیر سنگھ نے میلوں میں آنا شروع کیا تھا اِس قسم کی وارداتیں بہت کم ہو گئی تھیں۔ وہ لڑنے والوں کے بیچ میں کود پڑتے لیکن جب مصالحانہ کوششیں کامیاب نہ ہوتیں تو وہ لاٹھیاں اُٹھا لیتے اور وہ نوجوان جو کُشتی لڑنے یا کبڈی کھیلنے کی نیّت سے میلے میں آتے تھے اُن کا ساتھ دیتے۔

افضل اور شیر سنگھ کے خاندانوں میں تین پُشتوں سے دُشمنی چلی آتی تھی لیکن ان دو نوجوانوں کی دوستی نے اُن کے خاندانوں کی پُرانی رنجشیں مٹا دیں۔

ان کی دوستی کی ابتدا بھی عجیب تھی۔

☆☆☆☆☆

گاؤں میں مشہور تھا کہ افضل کی گھوڑی علاقے کی تمام گھوڑیوں سے تیز بھاگتی ہے۔ شیر سنگھ کے پاس معمولی گھوڑی تھی۔ ایک دن شیر سنگھ اپنے بھائیوں اور باپ کے ساتھ کھیت میں چارا کاٹ رہا تھا کہ افضل اپنی گھوڑی

بھگاتا ہوا قریب سے گزرا۔ شیر سنگھ اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر گھوڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بھائی بھی کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

شیر سنگھ کے باپ اِندر سنگھ نے کہا۔ ”کیا دیکھتے ہو شیر سنگھ! تم نے گھوڑی کبھی نہیں دیکھی۔“

شیر سنگھ نے کہا۔ ”باپو، گھوڑی بڑی اچھی ہے۔“

اِندر سنگھ نے کہا۔ ”افضل کو اِس گھوڑی پر بڑا گھمنڈ ہے۔ اس نے تمھیں دِکھانے کے لیے گھوڑی کو تیز کیا تھا۔“

شیر سنگھ نے کہا۔ ”باپو ایک دن میں اپنے گھوڑے پر شہر کی طرف جا رہا تھا، افضل میرے پاس سے گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گُزر گیا۔ وہ میری طرف مُڑ مُڑ کر دیکھتا اور ہنستا تھا۔“

اِندر سنگھ درانتی زمین پر پھینک کر کھڑا ہو گیا اور پھر اپنی چادر اُٹھا کر کندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”شیر سنگھ افضل کا بھائی اگر تحصیل دار ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ میں تمھیں ایسی دس گھوڑیاں خرید کر دے سکتا ہوں۔

میں آج ہی رقم کا بندوبست کرتا ہوں۔"

چوتھے دن اِندر سنگھ اپنے بیٹے کے لیے ایک نئی گھوڑی خرید کر لے آیا۔ گاؤں میں پہلے ہی مشہور ہو چکا تھا کہ اِندر سنگھ نئی گھوڑی خریدنے کے لیے گیا ہے اور اس کا بیٹا اُسے افضل کی گھوڑی کے ساتھ بھگائے گا۔ چنانچہ گاؤں سے باہر کھیتوں میں ان دو گھوڑیوں کا مقابلہ ہوا۔ شیر سنگھ کا باپ اور اس کے بھائی بڑی اُمّیدوں کے ساتھ مقابلہ دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ گاؤں کے جہاندیدہ لوگوں اور خاص کر چودھری رمضان نے شیر سنگھ کو یقین دلایا تھا کہ تمہاری گھوڑی عربی نسل کی ہے اور مقابلے میں افضل کی گھوڑی سے آگے نکل جائے گی، لیکن جب دوڑ شروع ہوئی تو شیر سنگھ کی گھوڑی نے لوگوں کا شور و غوغا سُن کر آگے بڑھنے کی بجائے اُلٹے پاؤں پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ شیر سنگھ نے اُسے چھڑی ماری تو وہ سیخ پا ہو گئی۔ لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ شیر سنگھ نے اور دو تین چھڑیاں رسید کیں اور گھوڑی نے پچھلی ٹانگیں آسمان کی طرف اُٹھا کر ہوائی دلتیاں چلانی شروع کر دیں۔

اتنی دیر میں افضل کوئی آدھ میل کا چکّر لگا کر واپس آ چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ لوگوں کا شور سُن کر شیر سنگھ کی گھوڑی گھبرا گئی ہے۔“

چودھری رمضان اپنا حقّہ اُٹھائے آگے بڑھا اور بولا۔ ”افضل ٹھیک کہتا ہے۔ تم لوگ شور مچاتے ہو ورنہ یہ گھوڑی خالص عربی نسل کی ہے۔ شیر سنگھ ذرا اسے تھپکی دے کر ٹھنڈا کرو۔ افضل تم بھی اپنی گھوڑی کو دم لینے دو، پھر مقابلہ ہو گا۔“

افضل اپنی گھوڑی سے اُتر کر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور چودھری رمضان اسی طرح حقّہ ہاتھ میں لیے شیر سنگھ کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو شیر سنگھ! بھگاتے وقت اِس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینا۔ چھڑی اُس وقت تک نہ مارنا جب تک یہ بھاگنا نہ شروع کر دے۔ اب اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے رہو۔ عربی نسل کے جانور میں غصّہ زیادہ ہوتا ہے۔“

چودھری رمضان نے آگے بڑھ کر گھوڑی کو چمکارتے ہوئے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی لیکن اُس کی حقّے کی چِلم کا ڈھکنا اور ایک چھوٹا

سا چمٹا جو لوہے کی باریک زنجیر کے ساتھ چِلم سے بندھے ہوئے تھے، آپس میں ٹکرا کر کوئی ایسی آواز پیدا کر رہے تھے جو شاید اس کا تجربہ کار جانور کے لیے بارِ گوش ثابت ہو رہی تھی۔ جونہی چودھری رمضان نے گھوڑی کی پشت کی طرف ہاتھ بڑھایا، گھوڑی نے پچھلی ٹانگیں اُٹھا کر چِلم کے ڈھکنے اور چمٹے کی آواز کا خیر مقدم کیا۔ چودھری رمضان بال بال بچ گیا لیکن حقّہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چند قدم دور جا پڑا۔ چودھری رمضان انتہائی بدحواسی کی حالت میں لوگوں کے قہقہے سُن رہا تھا۔

افضل کے بڑے بھائی اسماعیل نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر کہا۔ ”کیوں چودھری رمضان! گھوڑی عربی ہے نا؟“

شیر سنگھ کے باپ کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اُس نے غصّے سے کانپتے ہوئے بھاگ کر یکّے بعد دیگرے دو تین لاٹھیاں گھوڑی کی ٹانگوں پر رسید کر دیں اور گھوڑی اُچھلنے کودنے اور سیخ پا ہونے کے بعد ایک طرف بھاگ نکلی۔ افضل جلدی سے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اُس کے پیچھے ہو لیا لیکن کوئی تین سو گز بھاگنے کے بعد شیر سنگھ کی گھوڑی

اچانک کھڑی ہو گئی اور جب افضل کی گھوڑی قریب پہنچی تو اُس نے اس کی طرف دلتیاں اُٹھالیں۔ افضل نے اپنی گھوڑی کو ایک طرف ہٹایا لیکن شیر سنگھ کی گھوڑی اندھا دُھند فضا میں دلتیاں چلاتی رہی۔ اِندر سنگھ پھر غضبناک ہو کر آگے بڑھا لیکن اسماعیل نے بھاگ کر اُس کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ ”چچا جانے دو، تمہاری گھوڑی الھڑ ہے، افضل اُسے ٹھیک کر دے گا۔“

اِندر سنگھ نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو چھُڑاتے ہوئے کہا۔ ”اگر افضل گھوڑے کی سواری جانتا ہے تو میرے بیٹے نے گدھے پر سواری نہیں کی۔ میں اسے دوسری گھوڑی لا کر دوں گا۔۔۔ پھر دیکھوں گا شیر سنگھ سے کون جیتتا ہے؟“

اسماعیل نے کہا۔ ”لیکن عربی گھوڑا نہ لے کر آنا چچا!“

اِندر سنگھ نے اگلے دن اپنا ایک کھیت گروی رکھا اور اُس گھوڑی کو بیچنے اور نئی گھوڑی کو خریدنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

پندرہ دن کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے نیچے بادامی رنگ کا ایک خوبصورت گھوڑا تھا جس کے عوض اُس نے اپنی گھوڑی اور تین سو روپے نقد دیے تھے۔ گاؤں میں پہنچتے ہی اُس نے چودھری رمضان کو چودھری رحمت علی کے پاس یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ چار دن کے بعد دوڑ ہو گی، اگر ہمّت ہے تو اپنی گھوڑی شرط بد کر دوڑالو۔

چوتھے دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ گھُڑدوڑ دیکھنے کے لیے اُس گاؤں کے علاوہ دوسرے دیہات کے بہت سے لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ دوڑ شروع ہونے سے پہلے اِندر سنگھ نے کہا۔ ”چودھری رحمت علی! خالی گھوڑے دوڑانے سے کیا فائدہ۔ کوئی شرط لگاؤ!“

رحمت علی نے جواب دیا۔ ”اب ہم دونوں کے بال سفید ہو گئے ہیں اِندر سنگھ! شرط لگانا عقل کی بات نہیں۔“

”بس چودھری گھبرا گئے۔“

اسماعیل نے کہا۔ ”اگر شرط کا شوق ہے تو شیر سنگھ سے کہو افضل کے ساتھ

شرط باندھ لے۔"

اِندر سنگھ نے کہا۔ "شیر سنگھ! لگاؤ افضل کے ساتھ پگڑی پگڑی کی شرط!"

افضل نے کہا۔ "تم گھاٹے میں رہو گے۔ میں شیر سنگھ کی پگڑی کے عوض اپنی گھوڑی کی شرط لگاتا ہوں۔"

اِندر سنگھ نے کہا۔ "اگر ہار گئے تو؟"

افضل نے کہا۔ "اگر ہار گیا تو گھوڑی تمہاری۔"

اِندر سنگھ نے کہا۔ "اپنے باپ سے پوچھ لو۔"

رحمت علی نے کہا۔ "مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، گھوڑی افضل کی ہے، اسے اس کے بھائی نے لے کر دی ہے۔ ہار جائے گا تو اور لے دے گا۔"

گھُڑ دوڑ شروع ہوئی۔ سواروں نے ایک میل کے فاصلے پر پیپل کے درخت کے اُوپر سے چکّر کاٹ کر آنا تھا۔ دوسری طرف گاؤں کے چند عمر

رسیدہ آدمی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ درخت تک پہنچنے میں شیر سنگھ کا گھوڑا آگے رہا لیکن واپسی پر افضل اُس سے آ ملا۔ چودھری رمضان پہلے کی طرح اب بھی یہ پیش گوئی کر چکا تھا کہ شیر سنگھ کا گھوڑا جیتے گا۔ ہری سنگھ لوہار اور کاکو عیسائی نے بھی اپنی اپنی پگڑی کی شرط لگائی تھی۔ کاکو عیسائی نے دعویٰ کیا تھا کہ افضل کی گھوڑی جیتے گی اور ہری سنگھ لوہار نے دعویٰ کیا تھا کہ شیر سنگھ کا گھوڑا جیتے گا۔

درخت کی طرف جاتے ہوئے جب شیر سنگھ کا گھوڑا آگے نکل گیا تو ہری سنگھ لوہار چلّایا۔ ”او کاکو کے بچّے لاؤ پگڑی۔“

کاکو نے چُپکے سے اپنی پگڑی اُتار کر اُس کے ہاتھ میں دے دی لیکن جب واپسی پر دونوں برابر ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد افضل کی گھوڑی آگے نکلنے لگی تو کاکو نے کہا۔ ”او ہری سنگھ جلدی کر، اپنی پگڑی اُتار!“

ہری سنگھ نے کہا۔ ”ارے ابھی وہ پانچ چھ کھیت دور ہیں۔ شیر سنگھ ضرور آگے نکلے گا۔“

”تونے دوڑ ختم ہونے کا انتظار کرنے سے پہلے میری پگڑی اُتروالی تھی، اب اُتار اپنی پگڑی ورنہ میں خود اُتارلُوں گا؟“

کاکو نے ہری سنگھ کے جواب کا انتظار نہ کیا اس نے ایک ہاتھ سے اپنی پگڑی دیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ہری سنگھ کی پگڑی اُتار لی۔ ایسے معاملات میں ہری سنگھ کو کاکو کی جسمانی طاقت کالحاظ کرنا پڑتا تھا۔

دوڑ ختم کرنے سے پہلے افضل شیر سنگھ سے ایک کھیت آگے نکل چکا تھا۔ اِندر سنگھ غصّے اور ندامت کی حالت میں اُٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ شیر سنگھ کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اس نے افضل کے قریب پُہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور اپنی پگڑی اُتارنے کے لیے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن افضل نے کہا ”شیر سنگھ اپنی اپنے سر پر رہنے دو۔ کسی کی پگڑی اُتروانا بہادروں کا کام نہیں۔“

چودھری رحمت علی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے بیٹا! اپنی پگڑی نہ اتارو۔ تمہارے باپ نے مجبور کیا تھاورنہ شرط لگانا عقل مندوں کا کام نہیں۔“

لیکن شیر سنگھ نے اپنی پگڑی اُتار کر افضل کی طرف پھینک دی اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔

اسماعیل نے آگے بڑھ کر چودھری رمضان کی چِلّم اُتاری اور اسے اطمینان سے زمین پر رکھ کر لاٹھی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ”چودھری رمضان! میں نے اپنے دل میں ایک شرط لگائی تھی اور وہ یہ کہ اگر شیر سنگھ کا گھوڑا آگے نکل گیا تو میں تمہارا حقّہ توڑ ڈالوں گا اور اگر ہماری گھوڑی آگے نکل گئی تو صرف تمہارے حقّے کی چِلّم توڑ دوں گا۔ خدا کا شکر کرو کہ تم بڑے نقصان سے بچ گئے ہو۔“

رمضان چلّایا۔ ”ارے ایسا نہ کرنا، میں کل ہی لایا تھا۔“

اس نے آگے بڑھ کر چِلّم چھیننے کی کوشش کی لیکن اسماعیل کی لاٹھی اپنا کام کر چکی تھی۔ ہری سنگھ لوہار کے لیے اس گھُڑ دوڑ کا نتیجہ کچھ کم پریشانی کا باعث نہ تھا۔ کاکو عیسائی اپنے سر پر اُس کی پگڑی باندھ کر لوگوں کو دِکھا رہا تھا۔ مردوں کی تو خیر اور بات تھی لیکن تھوڑی دیر میں یہ معاملہ گاؤں کی عورتوں تک پہنچنے والا تھا۔ ہری سنگھ کو اس بات میں ذرّہ بھر شُبہ نہ تھا کہ

کا کو لڑکوں کا جلوس اپنے پیچھے لگا کر سارے گاؤں میں پھِرے گا۔

وہ اپنی زندگی کے اس دن کو بہت منحوس سمجھتا تھا جب اس نے کا کو کے ساتھ مذاق شروع کیا تھا۔ کا کو نے اسے بار بار نیچا دکھایا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے تنگ آ کر اپنے کتّے کا نام کا کو رکھ دیا تھا۔ جب کا کو اُس کی بھٹّی کے سامنے سے گزرتا تو وہ اپنے کتّے کو آواز دیتا "کا کو! کا کو! کا کو! توئے! توئے توئے۔"

ہری سنگھ کے باپ کا نام سنتو تھا اور کا کو نے ایک بھینسا پال رکھا تھا۔ اس نے چند دن کے غور و فکر کے بعد اس بھینسے کا نام سنتو رکھ دیا۔ جب بھی ہری سنگھ اُس کے پاس سے گُزرتا تو وہ فوراً اُٹھ کر اپنے بھینسے کو ڈنڈے سے مارتے ہوئے کہتا "او سنتو! تو مر جائیں۔ تینوں پو چڑ والے لے جان۔ او سنتو۔" اور وہ سنتو کو ایسی گالیاں دیتا جو ہری سنگھ کے لیے نا قابلِ برداشت ہوتیں۔ ہری سنگھ نے اُس کے گھر کے قریب سے گزرنا ترک کر دیا لیکن کا کو اُس کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیّار نہ تھا۔ وہ دن میں ایک آدھ بار کسی نہ کسی بہانے اپنے بھینسے کا رسّا پکڑ کر اُس کی بھٹی کے سامنے

سے گزرتا اور اسے سنتو کے نام سے نئی نئی گالیاں دیتا۔

گاؤں کے لڑکے اُس کے گِرد جمع ہو کر پوچھتے۔ ”کاکو سنتو کو آج کہاں لے جا رہے ہو؟“

اور وہ جواب دیتا۔ ”بوچڑ خانے لے جا رہا ہوں۔“ ہری سنگھ دانت پیس کر رہ جاتا۔

بالآخر ہری سنگھ نے کتّے کو گھر سے نکال دیا اور کاکو نے اپنے بھینسے کا نام تبدیل کر لیا۔

☆☆☆☆☆

گھُڑ دوڑ سے چند روز بعد ایک دن ہری سنگھ ہل کی پھالی بنا رہا تھا۔ شیر سنگھ اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا افضل آیا اور اُس نے کہا۔ ”ہری سنگھ! کل میں نے اپنی گھوڑی کی زنجیر کی چابی اس کے قفل میں ہی رہنے دی۔۔۔۔۔ شاید کسی بچّے نے گُم کر دی ہے۔ میں تمھیں زنجیر لا دیتا ہوں، اس کے لیے نئی چابی بنا دو۔“

”اچھا بنا دیتا ہوں لیکن چابی کا خیال رکھا کرو۔ کسی بُرے آدمی کے ہاتھ لگ گئی تو کہیں گھوڑی نہ لے اُڑے۔ پرسوں سردار چرن سنگھ کی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ اس کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی لیکن چور نے چابی لگا کر کھول لی۔“

افضل نے کہا۔ ”اس زنجیر کے تالے بھی کچھ اچھے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کسی دن شہر جا کر کوئی مضبوط زنجیر لے آؤں لیکن ابھی تم اِس کی چابی بنا دو۔“

افضل چلا گیا تو تھوڑی دیر بعد کاکو وہاں سے گزرا، اس کے سر پر وہی پگڑی تھی جو اُس نے ہری سنگھ سے شرط میں جیتی تھی۔

ہری سنگھ نے شیر سنگھ سے کہا۔ ”میں نے سُنا ہے کہ افضل نے تمہاری پگڑی تمہارے گھر بھیج دی ہے۔ لیکن یہ کاکو بڑا بد معاش ہے۔ یہ روز میری پگڑی دکھانے کے لیے اِدھر سے گزرتا ہے۔“

شیر سنگھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ہری سنگھ اگر تم بیس روپے کمانا

چاہتے ہو تو میرے ساتھ ایک سودا کرلو۔"

بیس روپے کا نام سُن کر ہری سنگھ کا ہتھوڑا رُک گیا۔ اُس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اگر تم میری گائے خریدنا چاہتے ہو تو میں تیس سے ایک کوڑی کم نہیں لوں گا۔"

شیر سنگھ نے کہا۔ "نہیں بیس روپے میں تمہیں ایسی چیز کے دوں گا جس کی قیمت دو پیسے سے زیادہ نہیں ہو گی۔"

"تم مذاق کرتے ہو؟"

"میں مذاق نہیں کرتا۔"

'"اچھا بتاؤ کیا چیز ہے وہ؟"

"پہلے قسم کھاؤ تم کسی سے اِس بات کا ذکر نہیں کرو گے!"

"میں باپو کی قسم کھاتا ہوں۔"

"نہیں گورو گرنتھ کی قسم کھاؤ!"

ہری سنگھ نے دو پیسے کی چیز بیس روپے کے عوض فروخت کرنے کے لالچ میں قسم کھالی تو شیر سنگھ نے کہا۔ ”افضل کی گھوڑی کی زنجیر کی ایک چابی مجھے بنادو۔“

ہری سنگھ تھوڑی دیر کے لیے سکتے میں آگیا۔ اس نے کہا۔ ”تم۔۔۔۔؟“

”ہاں! میں اُس گھوڑی کو دریا کے پار پہنچانا چاہتا ہوں۔“

ہری سنگھ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”لیکن اگر تم پکڑے گئے تو میں بھی تمہارے ساتھ پھنس جاؤں گا۔“

شیر سنگھ نے کہا۔ ”میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارا نام کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“

ہری سنگھ نے کہا۔ ”چوری پاپ ہے۔“

”تمہیں اس سے کیا۔ تم مجھے چابی بنادو۔“

ہری سنگھ نے کسی طرح اپنی ضمیر کی رضامندی حاصل کر لی۔ تاہم اس

نے کہا۔ ”جب تم گھوڑی لے کر کہیں جاؤ گے تو تمہیں گاؤں میں نہ پا کر وہ تم پر شک کریں گے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میرا کام گھوڑی کو اُن کی حویلی سے باہر نکالنا ہو گا۔ اسے لے جانے والے یہاں موجود ہوں گے۔“

”اچھا تم جاؤ۔ افضل تمہیں میرے پاس بیٹھا دیکھ کر شک کرے گا۔ میں پھالی کے ساتھ چابی بھی تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔“

”لیکن چابی صرف مجھے دینا۔ میرے باپو کو بھی نہ بتانا۔“

”اور پیسے کب ملیں گے؟“

شیر سنگھ نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”جس دِن گھوڑی نکل جائے گی۔“

☆☆☆☆☆

رات کے دو بجے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ شیر سنگھ بیرونی دیوار پھاند کر حویلی کے اندر داخل ہوا۔ اس نے دبے پاؤں پھاٹک کی طرف جاتے

ہوئے اپنی جیب سے چابیوں کا ایک گُچھّا نکالا اور کنڈی ٹٹولنے لگا۔ وہ بھی تاریکی میں ہاتھ مار رہا تھا کہ بجلی چمکی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کنڈی میں تالا نہیں تھا۔

دو دن پہلے بھی اُس نے قسمت آزمائی کی تھی لیکن پھاٹک کے اندر کی طرف کنڈی میں تالا لگا ہوا تھا اور اسے مایوس ہو کر لوٹنا پڑا تھا۔ آج ہری سنگھ لوہار اور امر سنگھ ڈاکو نے اُسے پندرہ بیس چابیاں مہیّا کر دی تھیں لیکن کنڈی کا تالا غائب تھا۔ اس نے سوچا شاید گھر کے آدمی تالا لگانا بھول گئے ہوں اور اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کنڈی کھول دی لیکن دروازے کو اُسی طرح بند رہنے دیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا مویشی خانے میں داخل ہوا۔ بجلی کی چمک میں وہ حویلی کے دوسرے سِرے پر برآمدے میں سونے والے آدمیوں کی چارپائیاں دیکھ چکا تھا لیکن بارش کی تیزی کے باعث اُسے اطمینان تھا کہ وہاں اگر کوئی جاگ بھی رہا ہو تو صحن کے دوسرے سِرے پر معمولی آہٹ اُس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ تاہم اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔

کچھ دیر تذبذب کی حالت میں مویشی خانے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ اس نے اپنی لاٹھی دروازے کے ساتھ لگا کر رکھ دی، جیب میں ہاتھ ڈال کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر کی چابی نکالی اور چابیوں کا بڑا گچھا وہیں ڈال دیا۔

بجلی کی ایک اور چمک کے بعد وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کھونٹے سے گھوڑی کی گردن کا رسّا کھولنے کے بعد وہ بیٹھ کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر کھولنے لگا۔ اندھیرے میں اُس نے انگلیوں سے ٹٹول کر تالے کا سوراخ تلاش کیا۔ اس کے دل کی دھڑکن لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بارش کے باعث موسم میں کافی حد تک اعتدال آچکا تھا تاہم اُسے پسینہ آرہا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک طرف کا تالا کھولا۔ گھوڑی کے دوسرے پاؤں تک ہاتھ لے جانے کے لیے وہ دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر آگے بڑھا۔ وہ دوسرے تالے کا سوراخ ٹٹول رہا تھا کہ گھوڑی نے اچانک گردن ہلائی اور ایک سُم زمین پر مارتے ہوئے نتھنوں سے کھر رکھر رکی

آواز نکالنے لگی۔

شیر سنگھ نے گھوڑی کے گلے کا رسّہ اپنی بغل میں لے لیا اور اسے چمکارنے اور اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے کے بعد پھر اسی طرح بیٹھ کر تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ چابی تالے کے سوراخ میں ڈال کر گھما رہا تھا کہ اُسے اپنے قریب ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی چادر کا ایک کونا گھوڑی کے پاؤں کے نیچے آ چکا تھا۔ اس نے گھوڑی کو پیچھے ہٹا کر اُس کے سُم کے نیچے سے اپنی چادر نکالنے کی کوشش کی لیکن کِسی کا ایک ہاتھ اُس کی گردن پر تھا اور دوسرا ہاتھ اُس کے بازو پر۔ شیر سنگھ کے بدن میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ ایک ثانیہ کے بعد اُس نے اپنی بدحواسی پر قابو پا کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی گرفت سے آزاد ہونا ممکن نہیں۔ پہلا خیال جو اُس کے دماغ میں آیا، یہ تھا کہ حملہ آور افضل کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ حملہ آور نے اچانک اُس کی گردن چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اُس کی کلائی پکڑ لی اور مروڑ کر اس کی پیٹھ کے ساتھ لگا دی۔ شیر سنگھ نے محسوس کیا کہ

اگر اس نے ذرا اور زور دیا تو اُس کا بازو ٹوٹ کر اُس کے کندھے سے الگ ہو جائے گا۔ پکڑنے والے نے اپنی جسمانی برتری کا ایک ثبوت دینے کے لیے اُس کی کلائی چھوڑ دی اور اچانک اُس کی کمر میں بازو ڈال کر اُسے اوپر اٹھایا اور اچھال کر کھرلی میں پھینک دیا اور پیشتر اِس کے کہ شیر سنگھ اُٹھ کر بیٹھتا۔ حملہ آور اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔

”میں تمہارا دو راتوں سے انتظار کر رہا تھا۔ تم اب نہیں جا سکتے!“ یہ افضل کی آواز تھی جس میں غصّے یا اضطراب سے کہیں زیادہ خود اعتمادی تھی۔ وہ خود اعتمادی جس کی بدولت مرد شیر کے گلے میں دستار ڈال دیتے ہیں۔

شیر سنگھ کو پہلی بار بزرگوں کے اس قول کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ چور کے پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر افضل کے سامنے اُس کی حیثیت ایک چور کی نہ ہوتی تو وہ اس قدر بودا ثابت نہ ہوتا۔ وہ اپنی قوّتِ مدافعت کو اس حویلی کی چار دیواری سے باہر چھوڑ آیا تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر افضل دو راتوں سے اُس کا انتظار کر رہا تھا تو اس کے تمام انتظامات مکمل ہوں گے۔ اس لیے جدوجہد فضول ہے اور

افضل جیسے اُس کے دل کی آواز سُن رہا تھا وہ بولا۔ ”اگر بھاگنے کی کوشش کرو گے تو تم دیکھو گے کہ میرے ہاتھ بہت بے رحم ہیں لیکن تم میں تھوڑی بہت سمجھ ضرور ہو گی۔ اچھا بتاؤ تم ہو کون؟“

شیر سنگھ خاموش رہا۔ ”افضل نے اُس کی پگڑی اُتار کر اُس کی ٹانگیں باندھ دیں اور پھر اُسے الٹا کر کے اُس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ گھوڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے جھک کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر ٹٹولی اور بولا۔ ”اوہو! تم تو اپنا کام ختم کر چکے تھے۔ خیر اب یہ زنجیر تمہارے کام آئے گی۔“

افضل نے زنجیر اُٹھا کر اُس کے پاؤں میں ڈال دی اور اسے کھُرلی میں سیدھا لِٹاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میں شور مچا کر گھر کے آدمیوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اب سیدھی طرح میری باتوں کا جواب دو۔ تم کس گاؤں سے آئے ہو اور تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟“

شیر سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔

افضل نے پھر کہا۔ ”میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم اکیلے یہاں تک نہیں پہنچے۔ ہمارے گاؤں سے کوئی تمہیں راستہ دکھانے والا ضرور ہے۔ میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنے گاؤں کے بدمعاش کو نہیں چھوڑوں گا۔ اگر وہ کسی جگہ باہر تمہارا انتظار کر رہا ہے تو مجھے بتاؤ!“

شیر سنگھ نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔

باہر بجلی چمکی، دروازے کے راستے آنے والی روشنی میں افضل کو شیر سنگھ کے چہرے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی اور وہ چلّا اُٹھا۔ ”شیر سنگھ!“

چور اس پر بھی خاموش رہا۔ افضل بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ چند لمحے وہ خاموشی کی حالت میں شیر سنگھ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لالٹین دیوار کے ساتھ لٹکا دی اور کھُرلی پر ایک پاؤں رکھ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ شیر سنگھ بدترین سزا کے لیے تیّار ہو چکا تھا، لیکن افضل کی خاموشی اُس کے لیے صبر آزما تھی۔

بالآخر افضل بولا۔ ”تو پرسوں بھی تم ہی نے ہماری دیوار پھاندی تھی۔ اگر میں دیوار پر اُکھڑی ہوئی مٹّی اور نیچے دونوں طرف پاؤں کے نشان نہ دیکھتا تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔ اس دن شاید تم پھاٹک کی کنڈی میں تالا دیکھ کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے کل رات تالا اُتار لیا تھا۔ لیکن کل تم نہ آئے۔ میں سمجھ گیا تھا چور ایک رات جاگنے کے بعد اگلی رات کو آرام کرتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔ لیکن مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ گھُڑ دوڑ میں ہار جانا اس قدر شرمناک بات تھی کہ تم چوری پر اُتر آتے۔ تمہاری صورت چوروں جیسی نہیں۔ اگر آج تم چوری کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو کل کسی کے گھر ڈاکہ ڈالتے، اس کے بعد کسی کو قتل کرتے اور کسی دن دنیا تمہیں پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھتی۔ شیر سنگھ تمہارا باپ ہمارا دشمن ہے لیکن وہ بہادر ہے اور ایک بہادر آدمی یہ سُننا پسند نہیں کرے گا کہ اس کا بیٹا چور ہے۔“

الفاظ کے یہ میٹھے مگر جگر دوز نشتر شیر سنگھ کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ اس نے کہا۔ ”افضل! اب باتوں سے اپنے دل کی بھڑاس نہ نکالو۔

دروازے کے پاس میری لاٹھی پڑی ہوئی ہے۔ وہ اُٹھالو اب اگر تم مجھے مار بھی ڈالو تو پولیس والے تمہیں نہیں پکڑیں گے۔ میں تمہارا چور ہوں۔ اگر تم میں لاٹھی اُٹھانے کی ہمّت نہیں تو اپنے آدمیوں کو بُلاؤ۔ تمہاری آواز سُن کر گاؤں جمع ہو جائے گا اور اگر میرا باپو مجھے اِس حال میں دیکھیے تو وہ بھی یہی کہے گا کہ اس نے میرے منہ پر سیاہی ملی ہے، اِسے مار ڈالو۔"

افضل نے کہا۔ "آہستہ بات کرو۔ سامنے بر آمدے میں میرے بھائی اور نوکر سو رہے ہیں۔"

"تو تم مجھے ترسا ترسا کر مارنا چاہتے ہو۔ اگر تم انہیں نہیں بُلاؤ گے تو میں انہیں آواز دوں گا۔"

افضل نے کہا۔ "شیر سنگھ تم میرے ہاتھ دیکھ چکے ہو۔ میں آسانی سے تمہارا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ میری مرضی کے بغیر تمہاری آواز تمہارے ہونٹوں سے باہر نہیں آسکتی۔"

افضل نے یہ الفاظ کچھ اس انداز سے کہے کہ شیر سنگھ نے اپنے جسم میں

ایک کپکپی سی محسوس کی۔

دونوں تھوڑی دیر خاموشی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ افضل اچانک تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھوں میں گھوڑی کی زین اور لگام تھی۔ اُس نے اطمینان سے گھوڑی کی پیٹھ پر زین رکھ کر اُسے لگام دی اور پھر زین کستے ہوئے بولا۔ ”شیر سنگھ تم نے کسی آدمی کو پھانسی پر لٹکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں نے بھی نہیں دیکھا لیکن بھائی کے ساتھ جا کر دلاور علی ڈاکو کی لاش دیکھی تھی۔ پھانسی کے بعد اُس کی زبان منہ سے بالشت بھر باہر آچکی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی باہر آچکی تھیں، اور اُس کی گردن! توبہ میری توبہ! میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں ڈرا لیکن اُسے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ پہلے چوری کرنے کے جرم میں ایک سال کے لیے قید ہوا تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ ڈاکو بن گیا۔ پھر اُسے سات سال کی سزا ہوئی۔ دوسری بار رہا ہونے کے بعد اُس کا دل بڑھ چکا تھا اور اس نے تین آدمیوں کو قتل کر دیا۔ پھِر اُسے پھانسی کی سزا ہوئی۔“

افضل زین کسنے کے بعد گھوڑی کا رسا کھول کر اُس کی گردن کے ساتھ لپیٹ رہا تھا۔

شیر سنگھ نے کہا۔ ’’تم تھانے جارہے ہو؟‘‘

افضل نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ ’’نہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ دلاور علی کی طرح تمہاری گردن بھی کسی دن پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے۔ میں نے اس کی ماں اور بیوی کو روتے دیکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ میں تمہارے ماں باپ کو بھی اُسی طرح روتا ہوا دیکھوں۔ میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ میں تمہارے دونوں بازو توڑ ڈالوں، تاکہ تم پھر کسی کی دیوار نہ پھاند سکو لیکن میں نے سُنا ہے کہ اگلے مہینے تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ شیر سنگھ! اگر میں تمہیں آج چھوڑ دوں تو پھر بھی تم چوری کرو گے؟‘‘

شیر سنگھ کی خاموشی پر افضل نے مُسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ’’تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا۔ ٹھہرو!‘‘ یہ کہتے ہوئے افضل نے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیر اور پگڑی کی گرفت سے آزاد کر دیے۔ شیر سنگھ

حیرت زدہ ہو کر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

افضل نے کہا۔ ”اُٹھو!“

وہ غیر ارادی طور پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ افضل نے پھر کہا تم اس گھوڑی کے لیے آئے تھے، یہ اب تمہاری ہے۔ اب تم اس پر سوار ہو کر جاؤ گے لیکن اس شرط پر کہ یہ گھوڑی تم اپنے پاس رکھو گے، کسی ڈاکو کے حوالے نہیں کرو گے۔“

شیر سنگھ کو یقین تھا کہ اب اچانک افضل ایک قہقہہ لگائے گا اور اُس کی چھاتی پر چڑھ جائے گا۔

افضل نے کہا۔ ”تم سوچ رہے ہو کہ جب تم باہر نکلو گے تو میرے آدمی تُم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تم شاید یہ بھی سوچتے ہو گے کہ ابّا کی اجازت کے بغیر میں تمہیں یہ گھوڑی نہیں دے سکتا۔ تم بہت بے وقوف ہو، شیر سنگھ یہ گھوڑی میری ہے اور میں تم جیسے نوجوان کو پھانسی سے بچانے کے لیے یہ گھوڑی دے سکتا ہوں۔ میں کہوں گا کہ میں نے اسے تمہارے ہاتھ بیچ دیا

ہے۔ اپنی پگڑی باندھو اور میرے ساتھ آؤ۔ صبح ہونے والی ہے۔ جلدی کرو!"

شیر سنگھ جلدی سے پگڑی اپنے سر پر لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ افضل نے ایک ہاتھ سے گھوڑی کی باگ پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے شیر سنگھ کا بازو پکڑ کر باہر نکل آیا۔ بارش کا زور اُسی طرح تھا اور صحن پانی سے بھرا ہوا تھا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر افضل نے اُس کا بازو چھوڑ دیا اور کہا۔ "دروازہ کھولو!"

شیر سنگھ نے قدرے تذبذب کے بعد دروازہ کھول دیا۔ پھاٹک سے باہر نکل کر افضل نے گھوڑی کی باگ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو اب سوار ہو جاؤ!"

بجلی چمکی، شیر سنگھ نے افضل کا چہرہ دیکھا، مُسکراتا ہوا دلفریب چہرہ، اس کے توہمات مٹ چکے تھے۔ افضل سچ مُچ۔"

شیر سنگھ کی آواز اُس کے حلق میں دب کر رہ گئی۔۔۔۔۔ وہ افضل کے

پاؤں پر ِگر پڑا۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا، ایک بچّے کی طرح۔
"افضل! افضل! مجھے معاف کر دو۔ نہیں نہیں، مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو!"

افضل نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور کہا۔ "میں تمہیں معاف کر چکا ہوں شیر سنگھ اور اس کے ثبوت میں میں تمہیں یہ گھوڑی دے رہا ہوں۔"

"بھگوان کے لیے اِس گھوڑی کا نام نہ لو۔ اس سے پہلے میں انسان نہیں تھا لیکن حیوان بھی نہیں ہوں۔ مجھے ایک بدمعاش نے ورغلایا تھا۔ وہ روز میرے پاس آتا تھا۔"

افضل نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"امر سنگھ ڈاکو۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"وہ ہماری حویلی کے دروازے پر میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

افضل نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”نہیں، یہ میرا اور اُس کا معاملہ ہے؟“ یہ کہہ کر شیر سنگھ افضل کے جواب کا انتظار کے بغیر بھاگ گیا۔

☆☆☆☆☆

افضل نے گھوڑی کو پھر اصطبل میں باندھ دیا اور پانی میں بھیگے ہوئے کپڑے بدل کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ اونگھ رہا تھا کہ گاؤں کے دوسرے سرے پر لوگوں کی چیخ وپُکار سنائی دی۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور حویلی سے باہر نکل آیا۔ اب بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جب افضل شیر سنگھ کی حویلی کے قریب پہنچا تو اُسے چودھری رمضان واپس آتا ہوا ملا۔

افضل نے سوال کیا۔ ”کیا ہوا چودھری؟“

”حد ہو گئی۔“ رمضان نے جواب دیا۔

”کیا ہوا آخر؟“

"چودھری افضل! اِندر سنگھ کے لڑکے نے حد کر دی۔"

"ارے بتا بھی؟"

"تم نے پار والے امر سنگھ ڈاکو کا نام سُنا ہے؟"

"ہاں! کیا ہوا اسے؟"

"شیر سنگھ نے اُس کے دونوں بازو توڑ دیے ہیں۔"

"سچ!"

"خدا کی قسم! شیر سنگھ سورما ہے۔ پتہ ہے اُس نے امر سنگھ کے بازو کس طرح توڑے ہیں؟"

"کس طرح توڑے ہیں؟"

"مروڑ کر۔ لوگوں نے بڑی مُشکل سے اُس نے جان چھڑائی ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا اس نے کچھ دِنوں سے اِندر سنگھ کے گھر میں ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی واردات ضرور ہو گی لیکن اب وہ اس گاؤں کا رُخ نہیں

کرے گا۔“

رمضان اور افضل باتیں کر رہے تھے کہ شیر سنگھ کی حویلی میں پھر شور سنائی دیا۔

افضل نے کہا۔ ”اب کیا ہو رہا ہے؟“

رمضان نے جواب دیا۔ ”اب لوگ یونہی شور مچا رہے ہیں۔ امر سنگھ تو بازو تڑوا کر جا چکا ہے۔“

”نہیں، شاید کسی کو مار پڑ رہی ہے۔“

رمضان نے کہا۔ ”نہیں وہ ہنس رہے ہیں۔ چلو مجھے تو بارش میں سردی لگ رہی ہے۔“

افضل اور رمضان وہاں سے کھسکنے کو تھے کہ کاکو عیسائی بھاگتا ہوا آیا۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

”کیا ہے کاکو؟“ افضل نے سوال کیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”چودھری جی

آج مزا آ گیا۔ سالا ہری سنگھ بھی کیا یاد کرے گا۔"

"آخر کیا ہوا؟"

شیر سنگھ نے ہری سنگھ کے سر پر گِن کے بیس جوتے مارے ہیں۔"

"ارے وہ کیوں؟"

"پتہ نہیں۔ اس کی قسمت ہی ایسی ہے۔ لوگ اس کی حویلی میں جمع ہو رہے تھے۔ وہ بھی معتبری دکھانے کے لیے وہاں آ گیا۔ شیر سنگھ کو اس کی شکل دیکھتے ہی غصّہ آ گیا۔ اس نے کہا ہریا! آؤ تمہیں بیس روپے دوں۔ یہ کہتے ہی اُس نے جوتا اُتارا اور ہری سنگھ کو بالوں سے پکڑ کر کیچڑ میں بٹھا لیا۔ اس نے بہتیرا شور مچایا۔ لوگوں نے بھی چھڑانے کی کوشش کی لیکن اُس نے بیس جوتے لگا کر ہی چھوڑا اور خدا کی قسم بارش اور کیچڑ کی وجہ سے اُس کے جوتے کا وزن دو سیر سے کم نہ تھا۔"

☆☆☆☆☆

جو کچھ افضل کی حویلی میں ہوا تھا، اس کا دو آدمیوں کے سوا کسی کو علم نہ

تھا۔ لیکن شیر سنگھ کے ہاتھوں علاقے کے مشہور و معروف ڈاکو کا پٹنا اور ہری سنگھ کا جوتے کھانا گاؤں کے لوگوں کے لیے معمولی واقعات نہ تھے۔ ایسے حادثات کے بعد گاؤں کے لوگ بھگت رام کی دوکان یا چودھری رحمت علی کی حویلی کے سامنے بڑ کے درخت کے نیچے جمع ہو کر تبصرے اور قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے۔ کوئی درخت کے نیچے چبوترے پر اپنی چادر بچھا کر بیٹھ جاتا اور کوئی اپنی چارپائی اُٹھالاتا۔ سردیوں کے دِنوں میں ایسی محفلیں سائیں اللہ رکھا کے تکیے میں منعقد ہوتیں۔ گاؤں کی محفل اسماعیل کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی۔ اگر وہ خاموش ہو جاتا تو لوگ سمجھتے کہ اُسے کوئی نئی تدبیر سوجھ رہی ہے اور جب وہ اچانک گردن اُٹھا کر کسی کی طرف دیکھ کر مُسکراتا تو لوگ سمجھ جاتے کہ اب کسی کی شامت آنے والی ہے۔ اِدھر اُس کی زبان ہلتی، اُدھر لوگوں کے قہقہے بُلند ہونے لگتے۔ لچھمن سنگھ کو ذرا اُونچا سُنائی دیتا تھا۔ وہ عام طور پر اُس کے قریب بیٹھتا لیکن اس کے باوجود جب بھی اسماعیل کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچی تو وہ بھی قہقہہ لگانے میں دریغ نہ کرتا۔ جب لوگ خاموش ہو جاتے تو وہ کسی سے سرگوشی کے انداز میں کہتا۔ ”کیا کہا اسماعیل نے؟“ لوگ اسے بُلند

آواز میں سمجھاتے اور اسے دوسرا قہقہہ لگانا پڑتا۔

اسماعیل گاؤں کے لیے ایک دائمی مُسکراہٹ اور ایک مسلسل قہقہہ تھا لیکن چودھری رمضان اُس سے بے حد نالاں تھے۔ جب اسماعیل کو کوئی نہ سوجھتی تو اُس کی توجّہ چودھری رمضان پر مبذول ہو جاتی۔ وہ ایسے موقعوں پر انتہائی دانشمندی سے بولتا۔ لیکن اُس کے منہ سے جو بھی بات نکلتی، اسماعیل اُسے اہلِ محفل کے قہقہوں کا موضوع بنا دیتا۔ بار ہا چودھری رمضان نے اپنے دل میں عہد کیا کہ وہ اسماعیل کے قریب نہیں بیٹھے گا لیکن لوگوں کے قہقہے اس کے لیے صبر آزما ثابت ہوتے اور اُسے اپنے ارادوں کے خلاف گھر سے نکل کر محفل میں شریک ہونا پڑتا۔ کبھی کبھی وہ گھر میں بیٹھ کر حقّے سے دل بہلانے کی کوشش کرتا لیکن لوگ اپنی محفل میں اُس کی کمی محسوس کرتے اور کوئی نہ کوئی اُسے بُلانے کے لیے آ جاتا۔ آج اگر بارش کا زور نہ ہوتا تو گاؤں کے بڑے بوڑھے یقیناً بڑ کے بڑے درخت کے نیچے جمع ہو جاتے اور اسماعیل اپنے مخصوص انداز میں یہ معمّا حل کرتا کہ شیر سنگھ نے ہری سنگھ کے سر پر بیس جوتے کیوں

مارے۔ رمضان اور کا کو کسی نہ کسی بہانے ہری سنگھ کو اُٹھا کر محفل میں لے آتے۔ لیکن بارش جو صبح کے وقت قدرے کم ہو گئی تھی، اب پھر زوروں پر تھی۔ گاؤں کے ایک جوہڑ کا پانی بڑ کے درخت کے نیچے مٹی کے چبوترے تک اور دوسرے جوہڑ کا پانی عیسائیوں کے گھروں تک پہنچ چکا تھا۔ چودھری رمضان کا صحن پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی حویلی کی ایک دیوار گِر گئی اور اُس کا ایک بھینسا نیچے دب گیا اور وہ چلّا رہا تھا کہ کچھمن سنگھ اور اُس کے ساتھی دیوار کو پیچھے سے دھکا دے کر گِرا گئے ہیں۔

لوگوں کو اپنے گھروں اور کھیتوں کی فکر تھی اس لیے وہ سب کسی جگہ جمع ہو کر تازہ واقعات پر اسماعیل کا تبصرہ نہ سُن سکے۔

صرف آٹھ دس آدمی مویشیوں والی حویلی کے برآمدے میں اسماعیل کے گرد جمع ہو کر گپّیں ہانک رہے تھے۔ بارش کی رفتار کے ساتھ سیلاب کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔ اسماعیل حسبِ معمول قہقہے لگا رہا تھا۔ آج اس کے ساتھ افضل بھی ہنس رہا تھا لیکن اس کی ہنسی کی وجہ کچھ اور تھی۔

چودھری رحمت علی سر پر چھتری تانے گھر کی ڈیوڑھی سے نکل کر

برآمدے میں داخل ہوا اور بولا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اگر سیلاب کے پانی کے کھیتوں کا رُخ کر لیا تو مکئی اور ماش کی فصل تباہ ہو جائے گی۔ جاؤ دیکھو کوئی نالے کا بند ہی نہ توڑ دے!“

غلام حیدر نے کہا۔ ”میں ابھی چکر لگا کر آیا ہوں۔“

چودھری رمضان شور مچاتا ہوا حویلی میں داخل ہوا۔ صحن میں اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ کیچڑ اور پانی میں لت پت ہو گیا۔ اسماعیل نے قہقہہ لگایا اور باقی سب نے اس کی تقلید کی۔

چودھری رحمت علی نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”بہت بے شرم ہو تم، تمہیں بڑوں کا ذرا بھی لحاظ نہیں۔“

چودھری رمضان نے اُٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”چودھری جی یہاں بیٹھے دانت نکال رہے ہیں اور اِندر سنگھ اپنے محلّے کے سارے آدمیوں کو لے کر نالے کا بند توڑنے جا رہا ہے۔ میں نے اُن کی باتیں سُنی ہیں، وہ لڑائی کے لیے تیّار ہو کر گئے ہیں اور اُن کے ساتھ دوسرے گاؤں

کے چھ سات بد معاش بھی ہیں۔ چودھری جی اگر انہیں نہ روکا گیا تو آپ کے ساتھ میری فصل بھی برباد ہو جائے گی۔"

رحمت علی نے کہا۔ "اچھا اِندر سنگھ شرارت سے باز نہیں آتا، پچھلے سال انہوں نے اپنی زمین کی حفاظت کے لیے بند نہیں لگایا تھا۔ اب پانی آ گیا ہے تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے ساتھ ہماری فصل بھی برباد ہو جائے۔"

رمضان نے کہا۔ "ان کا خیال ہے کہ اگر آپ کا بند توڑ دیا جائے تو اُن کے کھیتوں کی طرف نالے کے پانی کا زور کم ہو جائے گا۔ آج گاؤں کے تمام سکھ اُس کے ساتھ ہیں اور وہ سب شراب سے بد مست ہو کر گئے ہیں۔ اُن کے پاس لاٹھیاں اور برچھیاں ہیں اور شاید پستول بھی ہو۔"

"ہم نے کئی بار اُن کی بہادری دیکھی ہے، غلام حیدر! جاؤ نور محمد اور علی محمد کو خبر دو۔۔۔۔۔۔۔اور اسماعیل تم باقی آدمیوں کو بُلا لاؤ!"

نور محمد اور علی محمد چودھری رحمت کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی حویلیاں اور رہائشی مکانات گاؤں سے باہر تھے۔ نور محمد کے پانچ اور علی محمد کے

تین بیٹے تھے۔

آن کی آن میں رحمت کی حویلی کے اندر پچیس آدمی جمع ہو گئے۔

چودھری رمضان ایسے معاملات میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا کرتا تھا لیکن اِندر سنگھ کے محلّے سے آنے والے چند اور آدمیوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ آج اِندر سنگھ کی نیّت ٹھیک نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

گاؤں سے باہر برساتی نالے کے کنارے فریقین ایک دوسرے کے سامنے کدالیں، لاٹھیاں اور برچھیاں اُٹھائے کھڑے تھے۔ مصالحانہ گفتگو ختم ہو چکی تھی۔ اِندر سنگھ بند توڑنے پر بضد تھا۔

گاؤں کے پانچ سکھوں کے سوا جو چودھری رحمت علی کی طرفداری کا اعلان کر چکے تھے، باقی سب اِندر سنگھ کے ساتھ تھے۔ پڑوس کے گاؤں کے چھ نوجوان بھی اُس کے ساتھ تھے لیکن اِندر سنگھ کا یا شیر سنگھ جسے وہ مدّت سے اس دن کے لیے تیّار کر رہا تھا، کہیں غائب تھا۔ اس کے ساتھی

دوسری طرف افضل کو دیکھ کر گھبراتے تھے اور وہ انہیں تسلّی دے رہا تھا کہ افضل کے لیے شیر سنگھ کافی ہے، وہ آہی رہا ہو گا۔

چودھری رمضان نے زبانی جنگ میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا لیکن جب فریقین جسمانی قوّت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے قراری ظاہر کرنے لگے تو اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ نالے کے کنارے سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں چھُپ گیا۔

فریقین کے درمیان حدِّ فاصل کم ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے پر پل پڑیں، اچانک شیر سنگھ جھاڑیوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور اُن کے درمیان کھڑا ہو کر چلّایا۔ ”ٹھہرو! ٹھہرو!! یہ لڑائی نہیں ہو گی!“

لوگوں پر ایک لمحہ کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔

شیر سنگھ نے اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”باپو میں نے گھر میں آپ کو منع کیا تھا۔ جب آپ نے میری بات نہ مانی تو میں اِن لوگوں کے آنے سے پہلے بند کی حفاظت کے لیے یہاں چلا آیا۔“

اِندر سنگھ کا دوسرا لڑکا چلّایا۔ ”باپو! شیر سنگھ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

شیر سنگھ نے کہا۔ ”کل تک میرا دماغ خراب تھا لیکن آج نہیں۔ تم میرے دودھ کے بھائی ہو لیکن افضل میرا دھرم کا بھائی ہے جو لاٹھی افضل کی طرف اُٹھے گی، میں اُسے اپنے سر پر روکوں گا!“

گاؤں میں کسی نے برسوں سے شیر سنگھ اور افضل کو ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلّفی سے اُٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ حیران تھے۔

اِندر سنگھ غصّے سے کانپتا اور گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھا اور اُس نے شیر سنگھ کو ایک لاٹھی مار دی۔ لاٹھی شیر سنگھ کی ران پر لگی لیکن وہ چٹان کی طرح کھڑا رہا۔ اِندر سنگھ نے دوسری بار بھی لاٹھی اٹھائی لیکن اِتنی دیر میں افضل نے بھاگ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اِندر سنگھ اس کی آہنی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔

شیر سنگھ نے کہا۔ ”افضل! یہ میرا باپ ہے۔ تم اس کے ہاتھ نہ پکڑو۔ اسے اپنا غصّہ نکال لینے دو۔ چھوڑ دو افضل، باپ کی لاٹھیوں سے کوئی مرا نہیں

کرتا۔“

افضل نے قدرے تذبذب کے بعد اِندر سنگھ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اِندر سنگھ نے دوبارہ لاٹھی اُٹھائی لیکن اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ بیٹے نے اپنی پگڑی اُتار کر اُس کے آگے سر جھکا دیا اور باپ کے ہاتھوں سے لاٹھی گر پڑی۔ ایک لمحہ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اِندر سنگھ گاؤں کی طرف چل دیا۔ اس کی رفتار ہر قدم پر تیز ہو رہی تھی، یہاں تک کہ وہ بھاگ رہا تھا۔ اِندر سنگھ کے دونوں چھوٹے بیٹے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیے۔

افضل نے کہا۔ ”شیر سنگھ! جاؤ اپنے باپ کو تسلّی دو۔“

شیر سنگھ نے پگڑی اپنے سر پر رکھی اور چُپکے سے گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہ لوگ جو اِندر سنگھ کی حمایت پر لڑنے کے لیے آئے تھے، حیران و ششدر کھڑے تھے۔

چودھری رحمت علی آگے بڑھ کر اُن کی طرف متوجہ ہوا۔ ”دیکھو بھئی!

خدا کی یہ مرضی نہ تھی کہ ہمارے درمیان لڑائی ہو۔ اس میں سب کی بھلائی ہے۔ ہم نے پچھلے سال بند باندھ دیا تھا۔ تم آرام سے گھروں میں بیٹھے رہے۔ اب اگر تمہارے کھیتوں میں پانی چڑھ آیا ہے تو یہ ہمارا قصور نہیں۔ اب اگر بند توڑ دیا جائے تو ہمارا نقصان ضرور ہو گا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا بھی نقصان نہ ہو اور تم بھی بچ جاؤ۔ اس وقت یہاں ساٹھ سے زیادہ آدمی ہیں۔ اگر تم سب مل کر ہمّت کرو تو تمہارے کھیتوں کو بچانا مشکل نہیں۔ ہم سب تمہاری مدد کرتے ہیں۔ اگر ابھی بند باندھ دیا جائے تو تھوڑی دیر میں کھیتوں سے پانی اُتر جائے گا اور فصل بچ جائے گی۔ تم کام شروع کرو، میں جا کر گاؤں کے باقی آدمیوں کو گھروں سے نکالتا ہوں۔"

لوگ حیران تھے کہ یہ بات اُن سے پہلے کیوں نہ کہی گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ مٹّی کا بند تیّار کر رہے تھے۔ پڑوس کے گاؤں کے وہ چھ آدمی جو لڑائی میں اِندر سنگھ کی مدد کرنے کے لیے آئے تھے، بھاگتے ہوئے اپنے گاؤں میں پہنچے اور وہاں سے تیس چالیس آدمی لے آئے۔ شام سے کچھ دیر پہلے بند تیّار ہو چکا تھا اور بارش تھم چکی تھی

لیکن اس دوران میں چودھری رمضان کا کچھ پتا نہ تھا۔

بند باندھنے کے بعد لوگوں کو ایک اور مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ کسی کو پانی سے بھرے ہوئے کھیت میں ایک مچھلی تیرتی نظر آ گئی اور اُس نے شور مچایا۔ لوگ لاٹھیاں اُٹھا کر مچھلی کے پیچھے ہو لیے۔ مچھلی کافی بڑی تھی اور پانی کی گہرائی کم تھی۔ لوگ شور مچا رہے تھے۔ ”مارو! پکڑو! گہرے پانی میں نہ جانے دو۔ نکل گئی۔ مارو!“

بالآخر لوگوں نے مچھلی کو لاٹھیوں کی ضربوں سے نڈھال کر کے پکڑ لیا۔

اب یہ فیصلہ کرنا مشکل تھی کہ اِسے کون لے جائے۔ بالآخر تھوڑی سی تکرار کے بعد لوگوں نے اِس بات کا فیصلہ اسماعیل کے سپرد کر دیا۔

اسماعیل نے کہا۔ ”دیکھو بھئی! اگر تم میں سے کوئی یہ بتا دے کہ اِس وقت چودھری رمضان کہاں ہے تو مچھلی اُس کی۔“

اب چودھری رمضان کی کسی کو خبر نہ تھی۔ لوگوں نے اُس کے متعلق مختلف اندازے لگائے لیکن اسماعیل نے سب کے دعوے رد کر دیے۔

بالآخر لچھمن سنگھ نے کہا۔ ”دیکھو اسماعیل! ہمیں پتہ ہے کہ تم یہ مچھلی نہیں چھوڑو گے۔ اچھا بتاؤ کہاں ہے چودھری رمضان؟“

اسماعیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جب ہم لڑنے کے لیے تیّار تھے تو وہ اُدھر سرکنڈوں میں چھُپ گیا تھا۔ جب اِندر سنگھ نے شیر سنگھ کو لاٹھی ماری تھی تو اُس نے سمجھا کہ لڑائی شروع ہو گئی ہے اور وہ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا اُس گنّے کے کھیت میں پہنچا اور پھر ہماری مکئی کے کھیت سے گزر کر لال سنگھ کے گنّے کے کھیتوں میں سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ لیکن اتنی دیر میں ابّا جی بند بندھوانے کے لیے گاؤں سے باقی آدمی لے کر آ رہے تھے۔ اس نے اُن کا شور سُن کر یہ خیال کیا کہ وہ اُس کی تلاش میں آ رہے ہیں۔ وہ الٹے پاؤں بھاگا اور گنّے کے کھیتوں میں چھپتا ہوا چچا علی محمد کے جوار کے کھیت میں جا پہنچا۔ اتنی دیر میں گاؤں کے دوسرے آدمی مدد کے لیے آ رہے تھے۔ چودھری رمضان نے جوار کا کھیت بھی اپنے لیے محفوظ نہ سمجھا، وہ وہاں سے بھاگ کر گنّے کے کھیتوں میں آ گیا۔ اب اسے یہ پتا نہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔ پانی کی کھائی میں چلتا ہوا وہ پھر اُس

طرف آ نکلا، تم بند باندھ رہے تھے لیکن اس نے یہ سمجھا کہ تم لڑائی میں مارے جانے والوں کی لاشیں دبا رہے ہو۔ وہ الٹے پاؤں لوٹا اور اب وہ ہمارے گنّے کے کھیت میں بیٹھا ہوا ہے!"

لچھمن سنگھ نے سوال کیا۔ "لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ تمہارے کھیت میں بیٹھا ہے؟"

اسماعیل نے جواب دیا۔ "بھئی میں ہی تو اُسے وہاں بٹھا کر آیا ہوں۔"

"کب؟"

"زیادہ دیر نہیں ہوئی۔"

غلام حیدر نے کہا۔ "لیکن تمہیں اُس کی ساری بھاگ دوڑ کا کیسے پتہ چلا؟"

"میں سارا دن اس کا پیچھا کرتا رہا ہوں۔ جب وہ تھک کر بیٹھ جاتا تھا، میں اُسے شور مچا کر اُٹھا دیتا تھا۔ جب وہ سرکنڈے میں چھُپ رہا تھا میں نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ جب وہ جھاڑیوں میں سے گزر کر گنّے کے کھیت میں داخل ہوا تھا تو میری نظر اُس پر تھی۔ اس کے بعد میں اُس کے پیچھے تھا۔

اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو جا کر دیکھ لو سرکنڈوں میں اُس کی لاٹھی پڑی ہوئی ہے۔ اس کے پاس ہی جھاڑی کے کانٹوں میں اُس کی پگڑی لٹک رہی ہے اور ہمارے گنّے کے کھیتوں میں بھاگنے سے اس کا مُنہ اور پاؤں چھلنی ہو چکے ہیں۔“

لچھمن سنگھ نے کہا۔ ”لیکن وہ ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا ہو گا؟“

اسماعیل نے کہا۔ ”اگر میں اُسے بُلانے نہ جاؤں تو وہ دو دن اور وہیں بیٹھا رہے گا۔ اُسے یقین ہے کہ لڑائی میں بہت سے آدمی مارے جا چکے ہیں، پولیس پہنچ چکی ہے اور اُس کی تلاش ہو رہی ہے۔ لوگ قہقہے لگاتے ہوئے چودھری رمضان کی تلاش میں چل دیے اور اسماعیل نے مچھلی اٹھالی۔

☆☆☆☆☆

رات کے وقت مطلع صاف ہو چکا تھا۔ چودھری رحمت علی عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو دروازے پر اِندر سنگھ کھڑا تھا۔

اس نے کہا۔ ”چودھری رحمت علی! میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا

ہوں۔“

”کون ؟اِندر سنگھ ؟“

”ہاں چودھری میں ہوں۔ مجھے شیر سنگھ نے ابھی بتایا ہے اور میں اپنی زندگی میں پہلی بار تمہارے پاس سر جھکا کر آیا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں اِندر سنگھ ! ایک جگہ دو برتن بھی آپس میں کھڑک جاتے ہیں اور ہم تو آدمی ہیں۔ہاں شیر سنگھ نے تمہیں کیا بتایا؟“

”چودھری سچ کہو۔ تم کچھ نہیں جانتے ؟“

”کس کے متعلّق ؟“

اِندر سنگھ نے کہا۔ ”کل رات کے واقعے سے متعلّق افضل نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“

رحمت علی نے جواب دیا۔ ”رات کے متعلّق افضل نے مُجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ کیا ہوا کل رات ؟“

اِندر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ افضل مسجد کے دروازے سے نِکل کر بولا۔ ”ابّا جی! کل رات شیر سنگھ مجھ سے ملا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمارے خاندانوں میں صلح ہو جائے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کو راضی کر لوں گا۔“

اِندر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مسجد سے کچھ آدمی نِکل کر اُن کے قریب کھڑے ہو گئے۔ اِندر سنگھ خاموشی سے افضل کی طرف دیکھتا رہا۔

رحمت علی نے اِندر سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”چلو بیٹھیں۔“

اِندر سنگھ کوئی بات کیے بغیر اُن کے ساتھ چل دیا۔ باہر کی حویلی کے پھاٹک سے گزرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”بھگوان کے کھیل نیارے ہیں۔ کل تک میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ میں یا میری نسل سے کوئی اس دروازے کے قریب پاؤں رکھے گا لیکن آج میں بِن بُلائے تمہارے پاس آیا ہوں۔“

رحمت علی نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ ایسے نیک کام میں مَیں نے خود پہل کیوں نہ کی۔ ہم دونوں کے بال سفید ہو گئے۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ آدمی مر جاتا ہے لیکن اُس کی بات رہ جاتی ہے۔“

صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ رحمت علی اور اِندر سنگھ ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ افضل اُن کے سامنے دوسری کھٹیا پر بیٹھ گیا۔ اِندر سنگھ رات کے واقعہ کے متعلّق اپنی شرم وندامت کا اظہار کرنے آیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ افضل اپنے باپ اور بھائیوں کو سب کچھ بتا چکا ہو گا لیکن جب رحمت علی نے لاعلمی کا اظہار کیا اور افضل نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی تو اُسے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ افضل اُس کے خاندان کو رسوا نہیں کرے گا۔ اگر اُس نے اپنے باپ سے بھی اِس بات کا ذکر نہیں کیا تو کسی اور کو بھی نہیں بتائے گا۔

شیر سنگھ کی شادی ہونے والی تھی اور اُسے ڈر تھا کہ اگر ایسی بات مشہور ہوئی تو اُس کے سسرال والوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن اب اس کے خدشات دور ہو چکے تھے اور وہ تشکّر اور احسان مندی کے جذبات سے

مغلوب ہو کر افضل کی طرف دیکھے جا رہا تھا اور چاند کی روشنی میں افضل کی خاموش نگاہیں اُسے کہہ رہی تھیں ”میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ یہ راز میرے دل میں رہے گا۔“

تھوڑی دیر میں باقی چارپائیاں بھی آدمیوں سے بھر چکی تھیں۔ اسماعیل بھی آ گیا۔ عام طور پر رحمت علی نوجوانوں کو کھل کر ہنسنے کا موقع دینے کے لیے اُٹھ کر گھر چلا جایا کرتا تھا لیکن آج جب اسماعیل آیا تو اُس نے کہا ”اسماعیل! اِندر سنگھ کو چودھری رمضان کا قصّہ سُناؤ۔“

اسماعیل نے قدرے ہچکچاہٹ ظاہر کی لیکن باپ کے اصرار پر اُس نے چودھری رمضان کی سرگزشت دہرا دی۔ سُننے والوں کے قہقہوں نے اِرد گرد کے گھروں کے باقی لوگوں کو بھی اس طرف متوجّہ کر دیا۔ وہ حویلی کا رُخ کرنے لگے۔ لچھمن سنگھ چودھری رمضان کو اُس کے گھر سے اُٹھا لایا۔ کاکو عیسائی اور پیراں دتہ چوکیدار ہری سنگھ کو پکڑ لائے۔

رحمت علی نے کہا۔ ”افضل جاؤ شیر سنگھ کو بُلا لاؤ!“

تھوڑی دیر میں افضل شیر سنگھ کو لے کر آ گیا۔

برسات کے ایّام کسانوں کے لیے فراغت کے دن ہوتے ہیں اور یوں بھی دیہات میں وقت کی پیمائش منٹوں سیکنڈوں کے پیمانے سے نہیں کی جاتی۔ یہ محفل رات کے تیسرے پہر تک گرم رہی۔ اسماعیل نے اپنے چودھری رمضان کی زندگی کے اہم ترین واقعات پر تبصرہ کیا اور اُس کے بعد ہری سنگھ کی باری آئی جب کوئی نیند کا غلبہ محسوس کر کے اُٹھتا تو دوسرے اُسے پکڑ کر بٹھا لیتے اور کہتے: ”ارے یار! کیوں بھاگ رہے ہو۔ کل سارا دن سونے کے لیے ہے۔“

بالآخر اسماعیل نے کہا۔ ”اچھا جی میں تھک گیا ہوں۔ تمہیں بھی نیند آ رہی ہو گی۔ اب تم چودھری رمضان سے کہو کہ اپنی مُرغی کا قصّہ سُنائے۔“

چودھری نے یہ سُنتے ہی اپنا حقّہ سنبھال کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن چھمن سنگھ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ”نہیں چودھری سُنا کر جاؤ!“

رمضان نے جل کر کہا۔ ”میری کم بختی تھی جو یہاں آ گیا، آئندہ

تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لچھمن سنگھا اُدھیڑ عمر ہونے کے باوجود آٹھ روٹیاں کھاتا تھا۔ چودھری رمضان مجبوراً بیٹھ گیا لیکن اُن لوگوں کے اصرار کے باوجود مُرغی کا قصّہ سُنانے کے لیے تیّار نہ ہوا۔

اسماعیل نے کہا۔ "اچھا چودھری۔ اگر تم مُرغی والا واقعہ نہیں سُناؤ گے تو میں منڈی کا قصّہ سُنادوں گا۔"

چودھری رمضان منڈی کا قصّہ چھپانے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لیے تیّار تھا۔ اس نے کہا۔ "اچھا سُناتا ہوں۔ بات یہ تھی کہ ہمارا بیلن چل رہا تھا۔ جلال گنّے اُٹھا رہا تھا، میں گنڈیال[1] میں بیٹھا ہوا تھا کہ بلّی مرغیوں کے ڈربے میں گھس گئی اور جلال کی ماں نے شور مچا دیا۔"

رمضان یہاں تک کہہ کر رُک گیا۔ لوگوں نے کہا۔ "پھر کیا ہوا چودھری؟"

[1] وہ کمرہ جس کے اندر گُڑ بنانے کی بھٹّی ہوتی ہے۔

رمضان قدرے تذبذب کے بعد بولا۔ ”مرغیاں ڈربے میں چیخ رہی تھیں۔ میں نے بلّی کو ڈرایا لیکن وہ سہم کر ایک کونے کے ساتھ لگ گئی۔ میں نے ڈربے کی کھڑکی۔ میں سر دے کے اندر جھانکا لیکن وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے جلال کی ماں کو کہا دیا لاؤ۔ وہ دیا لائی تو میں نے کہا تم مجھے ڈربے کے اندر روشنی دکھاؤ اور میں بلّی کو پکڑ کر اُس کا گلا گھونٹا ہوں۔ اُس نے جھک کر چراغ آگے کر دیا۔“

کاکو نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا چودھری؟“

”پھر وہی ہوا جس پر تم سب دانت نکالا کرتے ہو۔۔۔۔۔۔ میں نے جلال کی ماں سے کہا چراغ اور آگے لاؤ۔ اُس نے چراغ اور آگے کر دیا، میں نے ذرا اُوپر کرنے کو کہا اور اُس نے اُوپر کر دیا، میری پگڑی کے قریب۔ میرا خیال بلّی کی طرف تھا اور میری پگڑی سُلگ رہی تھی۔ ڈربے کی ایک جانب میرے سر کا سایہ پڑ رہا تھا۔ میں نے جلال کی ماں سے کہا چراغ نیچے کر دو۔ اس نے نیچے کر دیا، بالکل میری داڑھی کے نیچے۔۔۔۔۔ داڑھی کے بالوں کی آگ تو میں نے ہاتھ مار کر بجھائی لیکن پگڑی کی آگ کا مُجھے

اُس وقت بھی علم نہ ہوا جبکہ سارے ڈربے میں دھواں بھر چکا تھا۔ بلّی نے پنجے مار مار کر میرا مُنہ نوچ لیا۔ میں نے جلدی سے سر باہر نکالا۔ بلّی بھاگ گئی۔ جلال کی ماں چِلاّئی تمہارے سر میں آگ لگی ہوئی ہے اور اُس نے میری پگڑی اُتار کر پھینک دی۔ میں نے پگڑی کو پاؤں سے مسل کر آگ بجھائی۔ دوبارہ ڈربے کو اچھی طرح دیکھا تو معلوم ہوا کہ بلّی دو مُرغیوں کا گلا چبا چکی ہے۔ یہ ہنسنے کی بات نہیں۔ بعض دن بڑے منحوس ہوتے ہیں۔ اس کے بعد گنڈیال کے اندر گیا تو بھٹّی پر کڑاہی میں گُڑ جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔۔۔" محفل قہقہوں سے گونج اُٹھی۔ لوگ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ چودھری رمضان گھبرا کر اُٹھا اور لوگوں کو پھلانگتا گِرتا پڑتا گھر کی طرف بھاگ گیا۔

رمضان کے چلے جانے کے بعد اسماعیل نے اِندر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "چچا ایک بات اور سُنو۔ چودھری رمضان کے باپ کی گھوڑی نے بچھیری دی اور چودھری رمضان کو اِس بات کا شوق ہوا کہ اُس کی شادی تک سواری کے قابل ہو جائے، اِس لیے یہ گھر والوں سے چوری

اُسے بھینس کا دودھ پلایا کرتا تھا۔ جب اُس کی برات گئی تو وہ اپنی بچھیری پر جو اب گھوڑی بن چکی تھی سوار تھا۔ راستہ میں ہم نے گھوڑیاں بھگائیں لیکن اُس کی گھوڑی پر بھینس کا اثر تھا، وہ گرمی کی تاب نہ لا سکی۔ چنانچہ جب ہم اُس کی سُسرال کے گاؤں میں پہنچے تو گھوڑی دولہا سمیت گندے پانی کے جوہڑ میں گھُس گئی۔۔۔"

اِندر سنگھ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ رات زیادہ گزر چکی تھی۔ اسماعیل کو نیند آ رہی تھی، وہ اُٹھا اور اُس کے ساتھ ہی لوگ ایک ایک دو دو کر کے جانے لگے۔

جب محفل برخاست ہوئی تو اِندر سنگھ نے اُٹھتے ہوئے کہا:

"چودھری رحمت علی! میں جس کام کے لیے آیا تھا، وہ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اگلے چاند کی دس تاریخ کو شیر سنگھ کی شادی ہے اور آپ سب کو برات میں جانا پڑے گا۔ تحصیلدار کو بھی لکھ دیں کہ وہ دو دن کی چھٹّی لے آئے۔"

رحمت علی نے کہا۔ ''کیوں نہیں، شیر سنگھ کی شادی پر تو ہم ضرور جائیں گے۔ ہاں روپے پیسے کی ضرورت ہو تو کسی ساہوکار کے پاس نہ جایئے گا۔ ہم انتظام کرلیں گے۔''

اِندر سنگھ نے جواب دیا۔ ''چودھری جی آپ کی بڑی مہربانی لیکن میں سارا انتظام کر چکا ہوں۔ سیٹھ رام چند گھر آ کر مجھے آٹھ سو روپیہ دے گیا تھا۔''

رحمت علی نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''بھائی لڑکوں پر قرضے کا بوجھ نہ ڈالو۔ میں نے سُنا ہے کہ پہلے بھی تم رام چندر کے مقروض ہو۔''

اِندر سنگھ نے کہا۔ ''معمولی قرضہ ہے، اُتر جائے گا چودھری جی۔ ہاں برات کے لیے گھوڑوں کا بندوبست آپ کو کرنا پڑے گا!''

''گھوڑوں کی تُم فکر نہ کرو۔۔۔۔ اور کوئی ضرورت بھی ہو تو حاضر ہوں۔''

دو خاندانوں کے نئے تعلقات اور دو نوجوانوں کی دوستی کا پہلا دن تھا۔

☆☆☆☆☆

سلیم، مجید، رام لال اور گلاب سنگھ نے چوتھی جماعت کا امتحان ایک ساتھ پاس کیا اور وہ گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر شہر کے ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ پرائمری سکول والے گاؤں سے موہن سنگھ، معراج الدّین اور ماسٹر کا لڑکا علی احمد بھی اُن کے ساتھ ہی ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ داؤد دو سال قبل پرائمری کی تعلیم ختم کر کے اسکول چھوڑ چکا تھا اور شہر کے کارخانے میں مزدور بھرتی ہو گیا تھا۔ جلال اور بشیر بھی اسکول چھوڑ کر مویشی چرایا کرتے تھے۔

سلیم کے گاؤں اور شہر کے درمیان ایک گاؤں اور تھا جہاں سے چند لڑکے اسکول جایا کرتے تھے۔ اُن میں سے دو لڑکے بلونت سنگھ اور مہندر سنگھ سلیم کے ساتھ بہت جلد مانوس ہو گئے۔ بلونت سنگھ، سلیم اور مجید کے ساتھ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور مہندر سنگھ جو بلونت سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا، پرائمری کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ بلونت سنگھ اور مہندر کا باپ شہر کے کارخانے میں ہیڈ کلرک تھا۔ اس گاؤں سے سلیم کا ایک اور ہم جماعت کُندن لال تھا۔ اس کا باپ رام چند علاقہ کا مشہور ساہوکار تھا۔

وہ ارد گرد کے دیہات کے کسانوں کو بیاہ شادی کے موقعوں پر قرضے دیا کرتا تھا۔ کسان اُس کے بہی کھاتہ پر انگوٹھا لگا کر روپیہ لے لیتے اور دھوم دھام سے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی رچاتے اور سیٹھ رام چند ان کے بیٹوں اور پوتوں سے سود در سود وصول کرتا۔ جس سال شادیاں کم ہوتیں اُس سال وہ کسانوں کی لڑائیاں کروا دیتا۔ پولیس آتی اور لڑنے والوں کو دھمکیاں لگا لیتی اور سیٹھ رام چند اپنا بہی کھاتہ اور روپیہ لے کر اُن کی مدد کو پہنچ جاتا۔ موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر کسان جتنے روپے لیتے اُس سے دوگنی رقم کی رسید لکھ دیتے۔ پھر وہ کہتا "دیکھو بھئی، تھانیدار بہت سخت ہے۔ میں تمہارے طرف سے یہ روپے لے کر اُس کے پاس جاتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ میری بے عزّتی نہ کر ڈالے۔" لوگ اسے دعائیں دیتے۔ اگر دو سو روپیہ ہوتا تو وہ سو اپنے پاس رکھ لیتا اور باقی سو تھانیدار کو پیش کر کے کہتا۔ "تھانیدار صاحب! ان بے چاروں کے پاس کچھ نہ تھا لیکن آپ کی خاطر میں نے انہیں یہ ایک سو روپیہ قرض دیا ہے۔ انہوں نے میرے پہلے قرضے بھی ادا نہیں کیے۔ مجھے کسی دن آپ کی مدد لینی پڑے گی۔"

اور جب پھر اُن کی ہتھکڑیاں کھول دی جاتیں تو وہ کسانوں سے کہتا دیکھو۔ ”دیکھو بھئی! تھانیدار نہیں مانتا تھا، اس نے دو سو روپیہ میرے مُنہ پر دے مارا۔ پھر میں نے منّت کی تو وہ بڑی مُشکل سے مانا۔ اب ادائیگی میں سُستی نہ کرنا!“ اس طرح رام چند کی جیب سے روپیہ نکلتا اور کسان سود در سود کے ساتھ چار سو کی قسطیں ادا کرتے۔

اگر تھانے دار ایمان دار ہوتا تو رام چند کسانوں کو دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں مقدمہ لڑنے کی ترغیب دیتا اور وہ اس سے قرض لے کر وکیلوں کی فیس ادا کرتے۔ ان سب باتوں کے باوجود رام چندر کے دیوتا اس پر بہت خوش تھے اور انہیں خوش رکھنے کے لیے وہ اتوار کے دن پوجا پاٹ کے بعد چیونٹیوں اور مکوڑوں کے بِلوں کے سامنے اناج کی چند مُٹھّیاں بکھیر آیا کرتا تھا۔

☆☆☆☆☆

گاؤں سے اسکول جاتے ہوئے سلیم اپنے ساتھیوں کو ایک کہانی سُنا رہا تھا۔ گلاب سنگھ اور رام لال حسبِ معمول اس کی کہانی بڑی توجہ سے سُن رہے

تھے۔ مجید کے ہاتھ میں ربڑ کی غلیل تھی اور وہ چلتے چلتے مُختلف چیزوں پر نشانے کی مشق کر رہا تھا۔ ایک درخت پر چڑیا بیٹھی تھی۔ مجید نے اپنے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کے لیے کہا۔ ”دیکھو میں ابھی چڑیا کو گراتا ہوں۔“ لیکن گلاب سنگھ اور رام لال کہانی سُننے میں اِس قدر محو تھے کہ انہوں نے اُس کی طرف مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ مجید نے چڑیا کا خیال چھوڑ دیا اور تیزی سے اُن کے قریب پہنچے ہوئے کہا۔ ”سلیم کی کہانی بالکل غلط ہے۔ میں اِسے جانتا ہوں۔ یہ ساری باتیں گھر بیٹھ کر گھڑ تا ہے۔“ سلیم خاموش ہو گیا لیکن گلاب سنگھ نے کہا۔ ”اگر تمہیں پسند نہیں تو نہ سنو، ہم تو ضرور سُنیں گے۔۔۔۔۔ سناؤ سلیم!“

مجید نے کہا۔ ”بس میں نہیں سُننے دوں گا!“

”اچھا نہ سُننے دو۔ ہم اتوار کے دن تمہارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے نہیں جائیں گے۔ تمہارے ساتھ نہر پر نہانے بھی نہیں جایا کریں گے اور تمہارے ساتھ کھیلیں گے بھی نہیں۔ کیوں رام لال؟“

رام لال نے سر ہلا کر گلاب سنگھ کی تائید اور مجید نے اپنے ساتھیوں کو

بغاوت پر آمادہ دیکھ کر کہا۔ ”اچھا سلیم سناؤ انہیں کہانی۔“

سلیم نے بگڑ کر کہا۔ ”بس میں نہیں سناؤ گا۔“

مجید نے کہا۔ ”ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تمہاری کہانی تو بالکل سچّی تھی۔“

سلیم نے کہا۔ ”سچی ہو یا جھوٹی، میں نہیں سُناؤں گا۔“

مجید، رام لال اور گلاب سنگھ اسے منا رہے تھے کہ سامنے سے کِسی کی آواز آئی۔ ”سلیم! سلیم! میں کب سے یہاں کھڑا ہوں جلدی آؤ نا!“

یہ پٹواری کا لڑکا معراج الدّین تھا۔ وہ حسبِ معمول اُس جگہ کھڑا تھا جہاں اس کے گاؤں سے شہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی اُن کے راستے کے ساتھ آملتی تھی۔

یہ قریب پہنچے تو معراج الدّین نے کہا۔ ”اچھا اب کہانی سناؤ!“

معراج الدّین کے اصرار پر سلیم کہانی سُنانے کے لیے تیّار ہو گیا۔ اُس نے

کہا۔ ”جب شہزادے کو بھوکے شیر کے پنجرے میں ڈالا گیا تو۔۔۔!“ لیکن معراج الدّین نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”لیکن شہزادے کو بھُوکے شیر کے پنجرے میں کیوں ڈالا گیا؟“

سلیم نے جواب میں کہا۔ ”یہ میں اِنہیں بتا چکا ہوں۔“

معراج الدّین نے کہا۔ ”لیکن میں نے نہیں سُنا۔ مجھے شروع سے سُناؤ!“

گلاب سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں، شروع سے نہیں۔“

اب گلاب سنگھ اور رام لال یہ سُننے کے لیے بے قرار تھے کہ جب شہزادہ بھُوکے شیر کے پنجرے میں ڈالا گیا تو کیا ہوا اور معراج الدّین کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ بے چارے شہزادے کو بھُوکے شیر کے پنجرے میں کیوں ڈالا گیا۔

اس بحث سے مجید کو بھی کہانی کے ساتھ دلچسپی ہو گئی اور اُس نے کہا۔ ”سلیم شروع سے سُنا تو میں بھی سُنوں گا۔“

سلیم کو دوبارہ ابتدا کرنا پڑی۔ لیکن وہ ابھی بھوکے شیر کے پنجرے تک

نہیں پہنچا تھا کہ بلونت کا گاؤں آ گیا۔ بلونت سنگھ، مہندر سنگھ اور کندن لال راستے میں کھڑے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی یہ کہانی شروع سے سُننے پر اصرار کیا۔ ان لڑکوں کے ساتھ سلیم کی نئ نئ دوستی ہوئی تھی اس لیے اُن کا مطالبہ رد کرنا اُس کے لیے آسان نہ تھا لیکن مجید کہہ رہا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

جب بلونت سنگھ نے اصرار کیا تو گلاب سنگھ اس کے ساتھ لڑنے کے لیے تیّار ہو گیا۔ "جاؤ، سلیم دوسرے گاؤں کے لڑکوں کو کہانی نہیں سُناتا۔"

بلونت سنگھ اور کندن لال ناراض ہو کر چل دیے لیکن مہندر سنگھ جو سب سے چھوٹا تھا اور جسے کہانیوں کے ساتھ سب سے زیادہ دلچسپی تھی، مُنہ بسور کر سلیم کی طرف دیکھتا رہا، جب سلیم اور باقی لڑکے اُس کی طرف توجّہ کیے بغیر چل دیے تو وہ بستہ ایک طرف پھینک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

سلیم ایک لمحہ کے لیے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن مجید نے اُس کا بازو پکڑ کر آگے جھیلتے ہوئے کہا۔ "چلو سلیم دیر ہو رہی ہے!"

سلیم بادل نخواستہ چل پڑا بلونت سنگھ نے ایک کھیت آگے جا کر پیچھے دیکھا اور مہندر سنگھ کو آواز دی۔ مہندر سنگھ کے بچّے دیر ہو رہی ہے!" لیکن مہندر سنگھ ٹس سے مس نہ ہوا۔

بلونت سنگھ چند آوازیں دینے کے بعد برہم ہو کر چل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ کچھ دُور آگے نکل جائیں گے تو وہ خود بخود بھاگتا ہوا آجائے گا۔ باقی لڑکوں کا بھی یہی خیال تھا لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ وہ دو کھیت آگے نکل گئے لیکن مہندر سنگھ نے اُن کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

کندن لال نے بلونت سنگھ سے کہا۔ "ارے یار تم اسے دو چار تھپّڑ کیوں نہیں لگاتے!"

بلونت سنگھ ایسی نصیحت پر عمل کرنے کے لیے ہر وقت تیّار رہتا تھا۔ اس نے جلدی سے بستہ زمین پر رکھا اور بھاگ کر مہندر سنگھ کے قریب پہنچے ہوئے اسے دو مکّے رسید کر دیے۔ مہندر سنگھ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا وہ زمین پر لیٹ کر چلّانے لگا۔ بلونت سنگھ اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھا رہا تھا لیکن وہ

زمین پر بچھا جا رہا تھا۔ سلیم اپنا بستہ رام لال کے حوالے کر کے بھاگتا ہوا اُن کے قریب پہنچا اور بولا۔ "بلونت! تم بہت ظالم ہو، اِسے مارتے ہو۔"

بلونت سنگھ نے شکست خوردہ سا ہو کر کہا۔ "اس سے پوچھو کہ یہ بیٹھ کیوں گیا ہے۔ مجھے اسکول جانے میں دیر ہو رہی ہے۔"

سلیم نے کہا۔ "چلو مہندر! دیر ہو رہی ہے!"

مہندر سنگھ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "تم جاؤ میں نہیں جاؤں گا۔"

سلیم نے اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو مہندر، تم مجھ سے ناراض ہو گئے؟"

مہندر نے اُس کی طرف دیکھا اور بھولے پن سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا اب اٹھو میں تمہیں شروع سے کہانی سناؤں گا۔"

مہندر کو اپنے بھائی کی مار بھول گئی اور اُس نے کہا۔ "ساری سُناؤ گے نا؟"

"ہاں، ساری سناؤں گا۔"

"کل بھی سناؤ گے نا؟"

"ہاں کل بھی سُناؤں گا۔"

مہندر نے جلدی سے بستہ اُٹھایا لیکن کچھ سوچ کر بولا۔ "میرے بغیر کسی اور کو تو نہیں سُناؤ گے؟"

"نہیں تمہارے بغیر کسی اور کو نہیں سُناؤں گا۔"

☆☆☆☆☆

مجید کا چچازاد بھائی اور ایک تحصیل دار کا لڑکا ہونے کے باعث سلیم اپنے ہم مکتبوں میں کافی احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ لڑکوں پر اُس کی ذہانت کا رُعب بھی تھا۔ اسکول میں صرف وہی لڑکا ایسا تھا جس نے کبھی ماسٹر جی سے مار نہیں کھائی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ساتھیوں کو عجیب و غریب کہانیاں سُنایا کرتا تھا اور اُس کی کہانیاں بھی ختم نہیں ہوا کرتی تھیں۔ چھٹّی کے بعد بہت سے لڑکے صرف اُس کی کہانی سُننے کے شوق میں اُس کے گاؤں تک جایا کرتے تھے۔ جب وہ سناتے سناتے رُک جاتا تو لڑکے بے قراری سے

پوچھتے۔ ”پھر کیا ہوا سلیم؟“

وہ جواب دیتا۔ ”باقی کل سناؤں گا۔“

لڑکے مایوس ہو کر چلے جاتے اور سلیم رات کے وقت اپنے بستر پر لیٹ کر کہانی کا باقی حصّہ سوچ لیتا۔ اگلے دن پھر وہ اپنی طویل کہانی کا نیا حصّہ کسی ایسے واقعے کی تمہید سے ختم کرتا کہ سُننے والے اختتام کے لیے بے قرار رہتے۔ سلیم کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اُس کے خاندان کی عورتوں اور بچّوں کو بھی علم تھا لیکن ایک واقعہ سے اُس خاندان کے بزرگ بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ برخوردار لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے عجیب و غریب کہانیاں ایجاد کرنے میں کافی مہارت پیدا کر چکا ہے۔

بات یہ ہوئی کہ پٹواری کے لڑکے معراج الدّین کو سلیم نے ایک کہانی سُنائی تھی اور حسبِ معمول اُسے ایک عجیب و غریب اُلجھن میں ڈالنے کے بعد باقی حصّہ اگلے دن سُنانے کا وعدہ کر کے گھر چلا گیا تھا۔ معراج الدّین کی توجّہ کہانی میں اس قدر جذب ہو چکی تھی کہ اُسے یہ بات یاد نہ رہی کہ اگلے دن اتوار ہے اور اس کے بعد عید کی دو چھٹیاں ہیں۔

عید کے دن سلیم گاؤں سے باہر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اُس کے چچانے آکر کہا۔ "سلیم گھر جاؤ، بھابی جان تمھیں بُلاتی ہیں۔"

سلیم گھر پہنچا تو خاندان کی عورتوں کے درمیان ایک ساٹھ سالہ بُڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں دو بچّے تھے۔ ایک معراج الدّین تھا اور ایک لڑکی تھی جس کا سفید رنگ اور بھورے بال اِس بات کی شہادت دیتے تھے کہ وہ معراج الدّین کی بہن ہے۔

سلیم کی ماں نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "لو ماں جی! سلیم آگیا!"

بڑھیا نے کہا۔ "بیٹا آؤ میں تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی ہوں۔"

سلیم کی چچا زاد بہن امینہ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ دوسری لڑکیوں اور عورتوں نے بھی بڑی مُشکل سے ہنسی ضبط کی۔ سلیم کی دادی نے امینہ کو ڈانٹ کر محفل سے اُٹھا دیا، تاہم وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر قہقہے لگاتی رہی۔

سلیم پریشانی کی حالت میں کھڑا تھا۔ اس کی ماں نے کہا۔ "سلیم یہ تمہارے

دوست کی دادی ہیں۔ آگے بڑھ کر سلام کرو!"

سلیم ہچکچاتا ہوا آگے بڑھا۔ بڑھیا نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ بیٹا! میں تمہارے لیے عید کے دن اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔" عورتیں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کر رہی تھیں۔ سلیم نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اُسے اپنی مرضی کے خلاف بڑھیا کے قریب بیٹھنا پڑا۔

معراج الدّین کی دادی نے کہا۔ "بیٹا! معراج الدّین دو راتوں سے خواب میں بڑبڑاتا رہا ہے۔ اِس نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آج عید کے دِن اِس نے اِس شرط پر نئے کپڑے پہنے تھے کہ میں اِسے سلیم کے گھر لے جاؤں گی۔ اور یہ سکینہ بھی دو دن سے میری جان کھاتی رہی ہے۔ میں خود یہ چاہتی تھی کہ عید کے بعد جب اسکول کھلے، میں معراج کے ابّا کو بھیج کر تمہیں گھر بُلواؤں اور تم سے باقی کہانی سنوں لیکن جب اِنھوں نے تنگ کیا تو مجھے تمہارے گھر آنا ہی پڑا۔ ہاں بیٹا پھر کیا ہوا؟"

سلیم اب سوچ رہا تھا کہ اُس نے کہانی کہاں ختم کی تھی۔ معراج الدّین کی

دادی نے کہا۔ ”بیٹا! اب میں سُنے بغیر نہ جاؤں گی۔ ہاں بتاؤ بادشاہ اژدھے کے پیٹ سے کیسے نکلا؟“

کواڑ کے پیچھے سلیم کی دوسری چچازاد بہن صغریٰ اور اُس کی چھوٹی بہن زبیدہ بھی امینہ کے قریب پہنچ کر اُس کے قہقہوں میں شریک ہو چکی تھیں لیکن سلیم کو اُن کے قہقہوں سے زیادہ بڑی عمر کی خواتین کی زیرِ لب مُسکراہٹیں پریشان کر رہی تھیں۔ وہ اس صورت حال کی تمام ذمہ داری معراج الدّین پر عائد کر رہا تھا اور یہ فیصلہ بھی کر چکا تھا کہ اپنی زندگی کا یہ نازک مرحلہ عبور کرنے کے بعد معراج الدّین کو کبھی کہانی نہیں سُنائے گا۔ اس کے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اُس کی ماں، اُس کی دادی اور گھر کی دوسری عورتیں اُس کی پسلیوں میں اُنگلیاں چبھو رہی تھیں۔ دو دن کھیل کود میں مصروف رہنے کے باعث اُسے کہانی کا نیا حصّہ تیّار کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر صرف معراج الدّین کا سوال ہوتا تو وہ دماغ پر بوجھ دیے بغیر بھی اژدھے کے پیٹ میں پھنسے ہوئے بادشاہ کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا لیکن بڑھیا کے چہرے کی جھرّیاں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ

پھنسے ہوئے بادشاہ کو نکالنے کے لیے اُس کی کسی بے معنی ترکیب کو پسند نہیں کرے گی۔

سلیم کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے اُس کی ماں نے بڑھیا سے کہہ دیا۔ ”ماں جی! شاید سلیم کو کہانی کا پچھلا حصّہ بھول گیا ہے، آپ اُسے یاد دِلا دیں۔“

بڑھیا پُر امید ہو کر بولی۔ ”ہاں بیٹا! میں تمھیں یاد دِلاتی ہوں۔ بادشاہ دوسرے ملک کی شہزادی کے ساتھ شادی کرنے کے لیے اُس کی بہت سی شرطیں پوری کر چُکا تھا، اب صرف ایک شرط باقی تھی کہ وہ پہاڑوں سے سونے کے سینگوں والے ہرن کو پڑ کر لائے۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ کئی دن سونے کے سینگوں والے ہرن کا پیچھا کرتا رہا۔ ایک دن وہ ہرن ایک بہت بڑے پہاڑ کے غار میں غائب ہو گیا۔ بادشاہ اور اُس کی فوج اُس کے پیچھے غار میں داخل ہو گئی لیکن یہ پہاڑ نہ تھا، یہ ایک بہت بڑا اژدھا تھا اور وہ غار اُس اژدھے کا مُنہ تھا۔ جب بادشاہ اور اُس کی فوج اندر داخل ہوئی تو اژدہے نے اپنا مُنہ بند کر لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا بیٹا؟“ اب تمام عورتیں

سنجیدگی سے سلیم کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ امینہ اور صغریٰ بھی اُس کے قریب آکر بیٹھی تھیں۔

معراج الدّین نے کہا۔ ”دادی جان آپ نے یہ نہیں بتایا کہ بادشاہ کی فوج کے ساتھ اُس کے گھوڑے ہاتھی اور کتّے بھی اژدھے کے پیٹ میں داخل ہو چکے تھے!“

معراج الدّین کی یادداشت نے سلیم کی مُشکلات میں اور اضافہ کر دیا۔ انسانوں کو نکالنے کے لیے پیٹ میں جس معمولی سی سُرنگ کی ضرورت تھی، وہ شاید چاقوؤں اور تلواروں کے ساتھ تیّار ہو جاتی لیکن اب آدمیوں کے ساتھ ہاتھی گھوڑے بھی آ پھنسے تھے اور انہیں نکالنے کے لیے ایک کشادہ گزر گاہ کی ضرورت تھی۔ مسئلہ جس قدر اہم تھا، اسی قدر نازک تھا اور تمام عورتیں محسوس کر رہی تھیں کہ بڑھیا بے چاری بلا وجہ نہیں آئی۔

بڑھیا نے کہا۔ ”جب معراج الدّین اور سکینہ نے مجھے تنگ کیا تو میں نے ان کے باپ کو کہانی کا باقی حصّہ سُنانے پر مجبور کیا۔ وہ کہتا تھا کہ اُس نے یہ

کہانی نہیں سُنی لیکن اگر سچ مُچ اژدھا اتنا بڑا تھا اور مُنہ بند ہو چکا تھا تو بادشاہ اور اُس کے ساتھی دم گھُٹ کر مر گئے ہوں گے۔ لیکن سلیم معراج کو یہ بتا چکا ہے کہ بادشاہ باقی تمام مصیبتوں کی طرح اس مصیبت سے بھی بچ کر آئے گا۔ میں اِن بچّوں کو لے کر ماسٹر کے گھر بھی گئی تھی لیکن وہ بھی میں کہتا تھا کہ بادشاہ مر جائے گا۔ سلیم کی ماں! اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ بادشاہ شہزادی کے ساتھ شادی کرنے سے پہلے نہیں مرتا۔ جس طرح اس نے باقی شرطیں پوری کی ہیں، اسی طرح یہ ساتویں شرط بھی پوری کرے گا۔ لیکن وہ نکلے گا کیسے ؟“

جب بڑھیا یہ باتیں کر رہی تھی سلیم غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے نچلے جبڑے میں درمیان سے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور باتیں کرتے وقت اُس کی زبان بھی نظر آتی تھی۔ سلیم نے سوچا کہ اگر ان اکھڑے ہوئے دانتوں کی جگہ وہ اپنی انگلی رکھ دے تو بڑھیا کوشش کے باوجود بھی اُسے نہیں کاٹ سکتی۔ بڑھیا کے باقی دانت بھی باتیں کرتے وقت ہلتے تھے۔ سلیم جانتا تھا کہ بڑھاپے میں لوگوں کے

دانت ہلتے ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں اور اچانک اُسے ایک خیال آیا اور اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے گردن اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ اہلِ محفل کی سنجیدگی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ اگر یہ معمّا حل نہ ہوا تو نہ صرف اس کی توہین ہو گی، بلکہ سارے خاندان کے وقار کو صدمہ پہنچے گا۔

سلیم نے کہا۔ "اچھا سُناتا ہوں۔"

بڑھیا نے کہا۔ "شاباش بیٹا!"

سلیم شاباش سے بے نیاز تھا۔ وہ صرف جان چھڑانا چاہتا تھا۔ وہ بولا۔ "بادشاہ نے سینگوں والے ہرن کو گھیر کر پکڑ لیا لیکن اُس کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ وہ غار کی بجائے اژدھے کے پیٹ میں ہے، جس کا مُنہ بند ہو چکا تھا۔ اس کے دانت جو ہماری حویلی کے پھاٹک سے بھی بڑے تھے آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن اژدھا بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اُس کا ایک دانت ہلتا تھا۔ بادشاہ نے تمام گھوڑوں اور ہاتھیوں کے رسّے جمع کر کے ایک بہت موٹا اور مضبوط رسا بنوایا اور اُس کا ایک سِرا اژدھے کے دانت سے

باندھ دیا اور دوسرے سِرے کے ساتھ سارے ہاتھی اور گھوڑے جوت دیے۔ وہ دو دِن زور لگاتے رہے تھے، تیسرے دن دانت اُکھڑ گیا۔ دانت نکل جانے سے اژدھے کے مُنہ میں بہت بڑا دروازہ بن گیا اور بادشاہ، فوج، ہاتھی، گھوڑے کتّے سب باہر نکل آئے۔ وہ اژدھا اتنا بڑا تھا کہ اُسے معلوم بھی نہ ہوا۔"

سلیم نے یہاں تک کہہ کر اپنے اردگرد فاتحانہ انداز سے دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن بڑھیا کی تشفی ابھی باقی تھی۔ اُس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلیم کے بازو پکڑ لیے اور کہا۔ "پھر کیا ہوا بیٹا! مجھے ساری کہانی سُنا کر جاؤ!" سلیم نے کھڑے کھڑے بات ختم کر دی۔ "بادشاہ سونے کے سینگوں والا ہرن لے کر شہزادی کے پاس پہنچ گیا۔ شہزادی کی ساتوں شرطیں پوری ہو چکی تھیں، اس لیے ان کا بیاہ ہو گیا۔ بس!"

جب معراج الدّین کی دادی سلیم کے گھر سے نکلی تو وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس کی کوفت رائیگاں نہیں گئی۔ معراج الدّین فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ "دیکھا دادی جان! آپ کہتی تھیں کہ بادشاہ مر جائے گا۔"

بڑھیا نے گرج کر کہا۔ ”میں کب کہتی تھی تمہارا باپ اور ماسٹر دونوں بدھو ہیں۔“

اور شام کے وقت سلیم کی ماں اسے کہہ رہی تھی۔ ”سلیم! تم بہت شریر ہو گئے ہو، بڑوں سے مذاق نہ کیا کرو!“

اس نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے کس سے مذاق کیا ہے امّی جان؟“

”ادھر آؤ!“

سلیم آگے بڑھ کر ماں کے قریب کھڑا ہو گیا اور اُس نے اپنی مُسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”سچ کہو، تم نے اُس بوڑھی عورت کے دانت دیکھ کر وہ بات نہیں گھڑی تھی؟“

سلیم اس کے جواب میں سر جھُکا کر مُسکرا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

سلیم کے لیے گاؤں کے پرائمری اسکول سے شہر کے ہائی اسکول کا ماحول بہت مختلف تھا۔ یہاں تقریباً پانچ سو لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ اُستادوں کی تعداد بھی بارہ سے اُوپر تھی۔ کوئی انگریزی پڑھاتا تھا، کوئی حساب، کوئی اُردُو، کوئی سائنس، کوئی تاریخ اور کوئی جغرافیہ اور کوئی عربی اور فارسی، لیکن طالب علموں کے نزدیک اُن اُستادوں کی صرف تین قسمیں تھیں۔ کم مارنے والے، زیادہ مارنے اور بہت ہی زیادہ مارنے والے۔

سلیم دلچسپی کے بغیر کوئی کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ اُردُو اور انگریزی کی کتابوں میں کہانیاں تھیں، اِس لیے وہ اُنہیں شوق سے پڑھتا تھا۔ اُسے تاریخ اور جغرافیہ سے بھی اُنس تھا، لیکن اُستادوں کی مخصوص زبان میں سوالوں کے جواب رٹنا اُس کی قوّتِ برداشت سے باہر تھا۔ حساب کے ہندسوں اور جیومیٹری کی لکیروں سے بھی اُسے نفرت تھی لیکن حساب کا ماسٹر بہت جابر تھا اور بدقسمتی سے سلیم کے والد کا دوست بھی تھا۔ وہ سب سے پہلے سلیم سے پوچھا کرتا تھا۔ ”کیوں سلیم گھر کا کام کیا؟“

دو تین مرتبہ بنچ پر کھڑا ہونے کے بعد سلیم نے یہ تہیّہ کر لیا کہ وہ آئندہ

ماسٹر جی کو خفا ہونے کا موقع نہیں دے گا۔ باقی ماسٹروں کی بھی یہی خواہش ہوا کرتی تھی کہ لڑکے روز کا سبق روز رٹ کر آئیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کے ماسٹر اپنے ہر سوال کا جواب درسی کتابوں کی مخصوص زبان میں سُننا پسند کرتے تھے۔ گزشتہ چند برس کی ملازمت کے دوران میں اُن مضامین کی درسی کتابوں کی عبارت ان کے دل پر نقش ہو چکی تھی، لڑکوں سے سوال پوچھنے سے پہلے وہ اپنی چھڑی اُٹھا لیتے۔ اگر کوئی لڑکا ایک آدھ فقرہ بھول جاتا یا چند الفاظ ہی آگے پیچھے کر دیتا تو اُس کی شامت آجاتی۔ انگریزی کا ماسٹر بہت نرم دل تھا، پڑھاتے وقت وہ بچّوں کی طرف گھور کر دیکھنے کا عادی نہ تھا، اس لیے وہ لڑکے جو گھروں سے تاریخ اور جغرافیہ رٹ کر نہیں آتے تھے، انگریزی کے گھنٹے میں پچھلے ڈیسکوں پر بیٹھ کر تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں کھول لیتے۔ اسی طرح حساب کے ماسٹر کے مقابلے میں اُردُو کا ماسٹر قدرے نرم دل تھا، اس لیے بعض لڑکے اُردُو کے گھنٹے میں اپنی ساتھیوں کی کاپیوں سے حساب کے سوال نقل کر لیتے اور غالباً یہ وجہ تھی کہ انسپکٹر صاحبان ہر سال تاریخ اور حساب کے ماسٹروں کی کارگزاری پر اظہار اطمینان فرمایا کرتے تھے۔

اسکول کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے گاؤں کے ماحول سے سلیم کی دلچسپیاں کم نہ ہو سکیں۔ وہ گھر پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے اپنا بستہ کھولتا اور اسکول کا کام کرتا، مجید اس کی کاپی سے حل کئے ہوئے سوال نقل کر لیتا۔ پھر دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر گاؤں سے باہر نکل جاتے۔ غروبِ آفتاب کے وقت وہ گھر آتے، دادا کا حکم تھا کہ وہ نماز کے لیے مسجد میں آیا کریں۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ کھانا کھاتے اور پھر وہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ باہر نکل جاتے اور کھیتوں کی نرم مٹّی پر کبڈی کھیلتے۔ کبھی کبھی گاؤں کے نوجوان بھی چاندنی راتوں میں کبڈی کیا کرتے تھے اور بڑی عمر کے لوگ انہیں دیکھنے کے لیے آجایا کرتے تھے۔ یہ گاؤں افضل اور شیر سنگھ کی بدولت دیہاتی کھیلوں میں کافی نام پیدا کر چکا تھا۔ کبھی کبھی پڑوس کے دیہات کے نوجوان بھی کھیل میں حصّہ لینے کے لیے آتے۔ تماشائیوں کی نگاہیں ایسے اجتماعات میں اسماعیل کو تلاش کرتیں اور جب اسماعیل آجاتا تو چودھری رمضان کا وہاں ہونا اشد ضروری خیال کیا جاتا۔ کھیلنے والے کھیلتے، لیکن دیکھنے والوں کی زیادہ تر توجّہ اسماعیل پر مرکوز رہتی۔ جب کوئی قہقہہ بلند ہوتا تو کھیلنے والوں کی توجّہ بھی اسماعیل کی

طرف مبذول ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر چھوٹی عمر کے لڑکے الگ کھیلتے۔ سلیم، مجید کے گاؤں کے بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتا تھا اور اسے کبڈی کے ساتھ بے حد دلچسپی تھی لیکن جب اسماعیل آجاتا تو وہ کھیل کی بجائے قہقہوں میں شریک ہونے کے لیے اُس کے قریب آبیٹھا۔

کچھ عرصہ سے اپنے گھر کے ماحول کے ساتھ سلیم کی دلچسپی اور زیادہ ہو چکی تھی۔ چچا افضل کی گھوڑی کا دوسرا بچھیرا اب قد آور گھوڑا بن رہا تھا اور جب سلیم پرائمری سکول میں پڑھا کرتا تھا تو افضل نے اُس سے وعدہ کیا کہ میری گھوڑی نے بچھیرا دیا تو وہ تمہارا ہو گا۔ گھر میں سواری کے لیے اور گھوڑے بھی موجود تھے۔ لیکن اس بچھیرے کے ساتھ سلیم کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ گھر کے ہر آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اصطبل میں لے جاتا اور بچھیرے کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔ ”دیکھو! اس کا رنگ کیسا ہے، اس کے بال کیسے ہیں۔ دیکھو یہ میری آواز سُن کر کان کھڑے کر لیتا ہے۔“

چودھری رمضان کو عرب نسل کے گھوڑے پہچاننے میں خاص مہارت

تھی۔ سلیم بچھیرے کا رسّا پکڑ کر اُس کے گھر لے جاتا اور اُس سے کہتا۔ ”دیکھو چچا میرا گھوڑا عربی نسل کا ہے نا؟“ اور چودھری رمضان اپنی دانشمندی کا ثبوت دینے کے لیے اُٹھ کر بچھیرے کے گرد ایک چکّر لگاتا، پھر جھک کر اُس کے سم دیکھتا، پھر اس کے کان ٹٹولتا، اس کی پیٹھ پر دو چار تھپکیاں دیتا اور بالآخر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہتا۔ ”بھئی ہے تو عربی۔“ اور سلیم خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ جب واپس آتا تو چودھری رمضان اسے آواز دے کر ٹھہرا لیتا اور کہتا۔ ”دیکھو برخوردار! یہ بہت جلدی بڑھ رہا ہے۔ تم اسے کیا کھلایا کرتے ہو؟“

”چچا میں اِسے چنے کھلایا کرتا ہوں۔“

وہ کہتا۔ ”چنے اچھے ہوتے ہیں لیکن اِسے کہیں بھینس کا دودھ نہ پلا دینا!“

”بھینس کے دودھ سے کیا ہوتا ہے؟“

”بڑی بے عزّتی ہوتی ہے بیٹا! بھینس کے دودھ پینے والا گھوڑا کبھی کبھی سوار سمیت کیچڑ میں لیٹ جاتا ہے۔“

گھر کی عورتوں اور لڑکیوں کو ایک مذاق ہاتھ آگیا تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ دیتیں کہ سلیم تمہارے گھوڑے میں نقص ہے اور سلیم آپے سے باہر ہو جاتا۔ ایک دن وہ اسکول سے آیا۔ گھر کی چند عورتیں چرخہ کات رہی تھیں۔ اس کی چچی نے کہا۔ "سلیم میں نے سُنا ہے کہ تمہارے گھوڑے کے کان گدھے کی طرح بڑھتے جارہے ہیں۔ کہیں وہ بڑا ہو کر سچ مچ گدھا نہ بن جائے؟"

سلیم بستہ پھینک کر سیدھا مویشی خانے پہنچا۔ وہ بچھیرے کے کانوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ امینہ اس کے قریب پہنچ کر ہنسنے لگی۔ "امینہ کی بچّی ٹھہرو!" یہ کہہ کر وہ اس کی طرف بھاگا۔ امینہ چیختی چلّاتی دادی کے قریب جا پہنچی۔

سلیم کی چچی نے پھر ہنستے ہوئے کہا۔ "کیوں سلیم! دیکھے اُس کے کان؟" اور سلیم نے کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ کر اُس کے چرخے کا تکلا دوہرا کر دیا اور ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

اسکول جانے سے پہلے سلیم ہر روز امینہ سے کہا کرتا تھا۔ "دیکھو امینہ! اگر

رات کو مجھ سے کہانی سُننی ہے تو میرے گھوڑے کا خیال رکھنا۔“ اور امینہ کہانی سُننے کے شوق میں اِس بات کا خیال رکھتی کہ سلیم کے گھوڑے کی کھرلی میں گھاس کم نہ ہو اور اُس سامنے پانی کی بالٹی ہر وقت موجود رہے۔

یہ بچھیرا گھر کے آدمیوں اور بچّوں سے جس قدر مانوس تھا، اسی قدر باہر کے آدمیوں سے نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ اگر کوئی اجنبی اُسے دیکھنے کے لیے آتا تو وہ اُسے کاٹنے یا دولتی مارنے کی کوشش کرتا، تاہم افضل کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ اُس کی یہ عادت جاتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

ایک دن سلیم اور اُس کے ساتھی اسکول سے آرہے تھے۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر اس کا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ افضل اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر کھیت میں چکّر لگا رہا تھا اور چودھری رمضان اور گاؤں کے چند آدمی پاس کھڑے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سلیم یہ دیکھتے ہی بھاگا اور مجید اُس کے پیچھے ہو لیا۔ افضل کے قریب پہنچ کر

سلیم نے بُلند آواز میں کہا۔ ”چچا جان! چچا جان!“

افضل گھوڑا روک کر سلیم کی طرف متوجّہ ہوا اور مُسکرا کر کہنے لگا۔ ”ہم نے تمہارے گھوڑے کو لادو کر دیا ہے۔ جاؤ! بھابی جان سے کہو کہ ہمیں مٹھائی کھلائیں۔“

سلیم نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”چچا جان! آج میں بھی سواری کروں گا اس پر!“

افضل نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بیٹا! ابھی نہیں۔ ابھی یہ بہت سرکش ہے۔ میں چند دِنوں میں اِسے ٹھیک کر دوں گا۔ آج تو یہ مجھے بھی گِرا دینا چاہتا تھا!“

سلیم نے کہا۔ ”چچا جان۔ میں نہیں گروں گا۔“

چودھری رمضان نے کہا۔ ”برخوردار، افضل ٹھیک کہتا ہے۔ تم ضد نہ کرو۔“

سلیم نے مایوس ہو کر افضل کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ ”چچا جان! یہ

کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟“

”پندرہ بیس دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد تمہیں اِس پر چڑھنے کی اجازت ہو گی۔۔۔ اچھا بیٹا! اب تم اِسے گھر لے جاؤ!“

سلیم نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اپنا بستہ مجید کے ہاتھ میں دے دیا۔

راستے میں مجید نے کہا۔ ”سلیم مجھے بھی چڑھنے دیا کرو گے اپنے گھوڑے پر؟“

سلیم نے کہا۔ ”میں نے چچا سے اِسی لیے تو کہا ہے کہ ہم دونوں اس پر سواری کیا کریں۔“

مجید نے کہا۔ ”ہم کسی اور کو نہیں چڑھنے دیں گے۔ چچا افضل نے مجھ سے بھی وعدہ کیا ہے کہ اس سال اُن کی گھوڑی جو بچھڑا دے گی، وہ مجھے ملے گا۔“ ”لیکن اُسے بھینس کا دودھ نہ پلانا!“

”واہ جی، میں بھی کوئی چودھری رمضان ہوں۔“

سلیم نے کہا۔ ”مجید! میں چچا افضل سے ڈرتا ہوں ورنہ آج ہی اِس پر سواری کروں۔“

”نہیں نہیں! سلیم تم گِر جاؤ گے!“

”نہیں! یہ گھوڑا مجھے کبھی نہیں گرائے گا!“

”میں تمہیں آج نہیں چڑھنے دوں گا۔ اس پر چچا افضل مجھے بھی ماریں گے۔“

سلیم نے کہا۔ ”میں خود ہی آج اس پر سوار نہیں ہونا چاہتا ورنہ تم مجھے نہیں روک نہیں سکتے!“

”کیوں نہیں روک سکتا۔ میں تمہیں روکوں گا۔“

”بھلا تمہارا خیال ہے کہ مجھے گرا دے گا؟“

”ہاں!“

”اگر تم اس پر چڑھو تو تمہیں بھی گِرا دے گا یہ؟“

"یہ مجھے کیسے گِر سکتا ہے!"

سلیم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اگر میں اسے تیز نہ بھگاؤں تو بھی مجھے یہ گِرا دے گا؟"

مجید نے جواب دیا۔ "تم نہ بھگاؤ گے تو بھی یہ تیز بھاگے گا۔ جانور کو یہ عقل تو نہیں ہوتی کہ اس پر ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے!"

سلیم نے بگڑ کر کہا۔ "میں بچّہ نہیں ہوں۔"

مجید نے اطمینان سے جواب دیا۔ "چچا افضل نے تمہیں اسی لیے تو روکا ہے کہ تم ابھی بچّے ہو۔ تم اتنے بڑے گھوڑے کی لگام بھی نہیں کھینچ سکتے۔"

سلیم نے کوئی جواب نہ دیا اور مجید کو یقین ہو گیا کہ اب اگر اس نے زیادہ بات کی تو وہ اُس کے ساتھ لڑ پڑے گا اس لیے وہ خاموشی سے چلتا رہا۔

پانی کی کھائی کے کنارے سبز گھاس اُگی ہوئی تھی۔ گھوڑا سر جھکا کر گھاس کے تنکے نوچنے لگا، کھائی عبور کرنے کے بعد چند قدم آگے جا کر مجید نے مُڑ کر سلیم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آؤ سلیم!"

سلیم نے گھوڑے کی باگ کھینچ کر اُسے کھائی میں ڈال دیا اور اچانک کنارے پر سے کود کر اُس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

مجید چلّایا۔ "بے وقوف، تم گر پڑو گے!"

گھوڑا کود کر باہر نکلا اور چند بار اُچھلنے کودنے اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے بعد ایک طرف بھاگ نکلا۔ سلیم نے اُسے چمکارتے ہوئے باگ کھینچی۔ گھوڑا رُک گیا۔ سلیم نے اسے دوبارہ کھائی کے قریب لا کر کہا۔ "دیکھا مجید! میں بچّہ نہیں ہوں، میرے ہاتھ باگ کھینچ سکتے ہیں اور میں گروں کا بھی نہیں۔"

اور پیشتر اس کے کہ مجید کچھ کہتا، وہ گھوڑے کی باگ موڑ کر اُسے ایڑ لگا چکا تھا۔ گھوڑا سرپٹ بھاگا اور آن کی آن میں چند کھیت دُور نکل گیا۔ افضل نے دُور سے اُسے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لیے اُس کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے۔ وہ چلّایا۔ "سلیم اسے روکو! بے وقوف گر جاؤ گے۔۔۔۔!" لیکن سلیم بہت دُور جا چُکا تھا۔ کوئی دو میل دور جا کر سلیم نے گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ سلیم کو صحیح سلامت واپس آتا دیکھ کر افضل

کا غصّہ جا چکا تھا لیکن جب سلیم نے اُسے قریب آ کر گھوڑا روکنے کی بجائے اُس کی باگ دائیں طرف موڑ دی تو افضل اپنی پوری طاقت کے ساتھ چلّایا۔ ”گھوڑے کو بائیں طرف موڑ لو۔ آگے بہت بڑی کھائی ہے!“

کھائی میں نہر کا پانی بہتا تھا اور وہ تقریباً چھ فٹ چوڑی اور دو فٹ گہری تھی۔ کنارے ذرا اُونچے تھے، تاہم سلیم کو اُس کے اوپر کودنے میں کوئی خطرہ نظر نہ آیا۔ چچا افضل کی گھوڑی کو اُس نے کئی بار اس کھائی پر سے کودتے ہوئے دیکھا تھا اور مجید کی چھوٹے قد کی گھوڑی بھی اُسے پھاند جایا کرتی تھی۔ چنانچہ سلیم نے گھوڑے کو موڑنے یا روکنے کی بجائے اُس کی رفتار اور تیز کر دی۔

چودھری رمضان کا لڑکا جلال کھائی میں نہا رہا تھا۔ گھوڑے کی آہٹ سُن کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ بُلند کر کے شور مچانے لگا۔ گھوڑا اچانک بِدک کر ایک طرف مُڑا سلیم اُس کی ننگی پیٹھ پر توازن قائم نہ رکھ سکا اور لڑھک کر زمین پر آ رہا۔

گھوڑے سے گِرنا سلیم کے لیے ایک معمولی بات تھی۔ اس نے سواری

کے شوق میں اِس سے پہلے بھی کئی چوٹیں کھاتی تھیں اور وہ ہر بار ہنستا ہوا اُٹھا کرتا تھا لیکن اِس دفعہ چچا افضل نے اُسے اٹھایا تو وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ افضل شاید اسے غصّے کی حالت میں پیٹ ڈالتا لیکن سلیم کا چہرہ دیکھ کر اُس کا غصّہ تشویش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”چوٹ تو نہیں آئی تمھیں؟“

”نہیں چچا جان!“ سلیم نے اپنی کہنی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

افضل کو اب غصّہ آ رہا تھا۔ اس نے اپنا لہجہ بدل کر کہا۔ ”بہت بے وقوف ہو تم!“

گھوڑا تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ چودھری رمضان اسے پکڑنے کے لیے بھاگا لیکن گھوڑے نے اُس کی طرف دیکھتے ہی اپنے اگلے سم اٹھا لیے۔ رمضان بدحواس ہو کر اُلٹے پاؤں پیچھے بھاگا۔ افضل نے اطمینان سے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور دوبارہ سلیم کے پاس آ کر کہا۔ ”لو اب اس پر پھر سوار ہو جاؤ!“

سلیم نے ندامت سے گردن جھکالی۔ افضل نے کہا۔ ”بس ایک بار گرنے سے ڈر گئے؟ اب چڑھتے کیوں نہیں اس پر۔ گھوڑے کے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ اُس کا سوار بُزدل ہے۔“

افضل نے سلیم کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجّہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ درد سے کراہتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

افضل نے پریشان ہو کر کہا۔ ”تمہیں چوٹ آئی ہے سلیم؟“

سلیم نے جواب دیا ”چچا۔۔۔ میرا بازو۔۔۔۔!“

چودھری رمضان نے سلیم کے قریب بیٹھ کر اُس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہی فتویٰ دے دیا کہ بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔

اتنی دیر میں کئی اور آدمی جمع ہو چکے تھے۔ افضل نے گھوڑا کسی کے حوالے کیا اور سلیم کو اپنے بازوں میں اٹھانے کی کوشش کی۔ سلیم اگرچہ رمضان کا فتویٰ سُننے کے بعد بازو کی چوٹ کو زیادہ شدّت سے محسوس کر رہا تھا۔ تاہم اُس نے کہا۔ ”چچا! میں چل سکتا ہوں۔“

افضل نے اس کی بغل میں ہاتھ دے کر سہارا دیا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

گھر پہنچتے ہی سلیم کو بستر پر لٹایا گیا لیکن اپنے گرد خاندان اور پڑوس کی عورتوں کا ہجوم دیکھ کر وہ بار بار اُٹھنے کی کوشش کرتا۔ سلیم کی دادی ہاتھ میں دودھ کا کٹورا لیے اِلتجا کر رہی تھی۔ "بیٹا! اسے پی لو! میرے لعل اسے پی لو!" سلیم نے غصّے میں ہاتھ مار کر کٹورا اُس کے ہاتھ سے گرادیا لیکن وہ دوسرا کٹورا بھر لائی۔ سلیم نے مجبوراً چند گھونٹ پیئے لیکن وہ بھرا ہوا کٹورا پلانے پر مصر تھی۔

☆☆☆☆☆

چودھری رحمت علی نے آ کر کہا۔ "کیا شور مچا رکھا ہے تم نے۔ بچّوں کو چوٹیں لگا ہی کرتی ہیں۔ سلیم کے بازو پر معمولی چوٹ آئی ہے، میں نے اسماعیل کو فجّو پہلوان کے پاس بھیج دیا ہے۔ وہ آ کر ابھی ٹھیک کر دے گا۔"

لیکن دادی جان کو سُننا گوارا نہ تھا کہ سلیم کے جسم پر خراش آئے اور کوئی اسے معمولی بات کہہ کر ٹال دے۔ اس نے کہا۔ ”آپ دیکھتے نہیں، بچّے کا رنگ کس طرح پیلا ہو رہا ہے۔ میں اس منحوس گھوڑے کو گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔“

سلیم نے اچانک اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں دادی جان! گھوڑے کا کوئی قصور نہیں۔ وہ ڈر گیا تھا۔“

رحمت علی نے کہا۔ ”اگر مرد تم عورتوں کا کہا مانتے تو گھوڑے پر کوئی سواری نہ کرتا اور شاید بیلوں کو ہل میں جوتنے کی بجائے بھی وہ اپنے ہی گلے میں رسّا ڈال لیا کرتے۔“

اتنے میں رمضان کی بیوی آگئی اور بولی۔ ”ہائے میرے اللہ! یہ کیا ہو گیا! جلال کا باپ کہتا ہے کہ سلیم کے بازو کی ہڈّی بالکل ٹوٹ گئی ہے!“

یہ سُنتے ہی دادی امّاں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ پڑوس کی اور بہت سی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔

اسماعیل، فجّو پہلوان کو لے کر آ گیا۔ چودھری رمضان بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اور مصر تھا کہ بازو کی ہڈّی ٹوٹ چکی ہے اور اس کا علاج صرف شہر میں ہو سکے گا اور سلیم کی دادی اسے اپنے پوتے کا سب سے بڑا ہمدرد سمجھ رہی تھی۔

فجّو پہلوان نے اپنے سلیم کا بازو ٹٹول کر اُسے درد سے کراہنے پر مجبور کیا۔ پھر ہلا جُلا کر سلیم کی چیخیں نکالیں، اس کے بعد گرم تیل کی مالش کی اور روئی باندھ دی۔

چودھری رحمت علی نے پوچھا۔ ”کیوں فجّو کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟“

فجّو نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں چودھری جی! جوڑ ذرا ہل گیا ہے۔ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ میں صُبح پھر آؤں گا۔ اسے چند دن کے لیے چلنے پھرنے کی اجازت نہ دیں، ورنہ جوڑ پھر ہل جائے گا۔“

رات کے وقت سلیم کو معلوم ہوا کہ دادی امّاں نے نوکر کو حکم دے دیا ہے کہ وہ سلیم کے گھوڑے کے آگے چنے نہ ڈالے۔ جب ماں نے سلیم کے

آگے کھانا لا کر رکھا تو وہ روٹھ کر بیٹھ گیا۔ ماں نے مُسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور جھک کر آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ”میں نے تمہارے گھوڑے کے لیے چنے بھجوا دیے ہیں۔“

سلیم نے کہا۔ ”امّی! دادی جان کہتی ہیں کہ وہ گھوڑے کو گھر سے نکال دیں گی؟“

ماں نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بیٹا! جب تمہارا بازو ٹھیک ہو جائے گا تو اُن کا غصّہ بھی اُتر جائے گا۔“

☆☆☆☆☆

پیر ولایت شاہ کی اس علاقے میں بہت دھوم تھی۔ امارت اور ولایت اُن کے خاندان میں برسوں سے چلی آ رہی تھی۔ اُن کی زمینیں تھیں، باغات تھے لیکن لوگ جس بات پر بہت زیادہ مرعوب تھے، وہ اُن کے خاندان کا قبرستان تھا جس کی تمام قبریں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی تھیں۔ اُن کے جدِّ امجد کے مزار کا گنبد پانچ میل سے دِکھائی دیتا تھا۔

پیر ولایت شاہ چار بار میٹرک کے امتحان میں فیل ہوئے تھے تاہم اپنے باپ کی بے وقت وفات پر وہ روحانی کاروبار سنبھالنے پر مجبور نہ ہو جاتے تو یقیناً علم کے دریائے ناپید کنار میں چند برس اور غوطے لگاتے۔ اب مریدوں کو پُل صراط کے اُوپر سے بخیر و عافیت گزارنے کا کام اُن کے ذمّہ تھا اور پیر ولایت شاہ پوری تن دہی سے اپنے فرائض پورے کر رہے تھے۔ وہ فرزندانِ آدم کو ارضی و سماوی تکالیف سے نجات دلانے کے لیے تعویذ لکھا کرتے تھے اور اپنی فرصت کے لمحات کو خوشگوار بنانے کے لیے شطرنج کھیلا کرتے تھے، بھنگ پیا کرتے تھے، بٹیر لڑایا کرتے تھے، شادیاں کیا کرتے تھے اور شادیوں کے بعد طلاقیں دیا کرتے تھے۔

ان کے پاس آٹھ دس گھوڑے تھے۔ پانچ چھ خچر اور پندرہ بیس کتّے تھے۔ سال میں ایک بار وہ شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ دورے پر نکلا کرتے تھے۔ تیس چالیس پیدل اور سوار چیلے اُن کے ساتھ ہوتے۔ مُریدوں کا حلقہ اس قدر وسیع تھا کہ اُنہیں ایک ایک دن میں کئی کئی ضیافتیں کھانا پڑتیں۔ ہراول کی ایک ٹولی پہلے ہی مُریدوں کو خبر دار کر دیتی کہ پیر صاحب آج

تمہارے ہاں قیام کریں گے۔

پیر صاحب کا طعام تو خیر اتنی بڑی مُصیبت نہ تھی لیکن جس بدنصیب کے ہاں وہ ایک دو دن قیام کرتے اُس کا دیوالہ نکل جاتا۔ اس کی لہلہاتی گندم گھوڑوں کی نذر ہو جاتی۔ اس کے باغ کا کچّا پکّا پھل پیر صاحب کے چیلوں کے شکم کا ایندھن بن جاتا۔ رخصت کے وقت پیر صاحب نذرانہ وصول کرتے اور چیلے مرید کے گھر سے فالتو برتن اور کپڑے اُٹھا لیتے۔

جب پیر صاحب دوسری گاؤں کا رُخ کرتے تو مرید کسی بُلند ٹیلے پر کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھتا اور کہتا "یا پروردگار! آندھی آئے، طوفان آئے، زلزلہ آئے، سورج سوا نیزے پر آئے، لیکن پیر ولایت شام دوبارہ نہ آئے۔"

کچھ عرصہ سے علاقے کے سمجھ دار لوگوں میں پیر ولایت شاہ کے متعلّق عام بے چینی پائی جاتی تھی اور اِس سے چینی کی وجہ یہ تھی کہ پیر صاحب ایک لڑکی کو آسیب سے نجات دلا کر خود اُس کے لیے آسیب بن گئے تھے۔ تاہم دیہات کے اَن پڑھ لوگوں کی ایک بڑی تعداد پر ولایت شاہ

کے زیرِ اثر تھی۔ تکیوں میں بھنگ، پوست اور چرس پینے والے سائیں لوگ انہیں اپنا پیشوا مانتے تھے۔ ان لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ خدا نے ولایت شاہ کی زبان میں وہ تاثیر رکھی ہے کہ جسے وہ بد دُعا دیتا ہے، اس کے مویشی مر جاتے ہیں، فصل برباد ہو جاتی ہے، عورتیں بانجھ ہو جاتی ہیں اور بچّے طرح طرح کے امراض میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں نے ولایت شاہ کو جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ خدا کی یہ عجیب و غریب مخلوق جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتی، اُن کے اِشاروں پر ناچتی ہے۔ ایک جن اُن کے لیے رات کے وقت بلا ناغہ پھل اور مٹھائیاں لے کر آتا ہے۔ دوسرا اُن کا بستر بچھاتا ہے اور تیسرا اُن کے پاؤں دباتا ہے۔ جب ولایت شاہ جلال میں آتے ہیں تو ایک خوفناک جِن کو حکم دیتے ہیں کہ جاؤ فلاں شخص کا گلا گھونٹ آؤ اور وہ کسی حیل و حجّت کے بغیر اُن کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈہ اُن دیہات میں زیادہ مؤثر ہوا جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہوتی۔

مردوں کی نسبت دیہاتی عورتیں پیر ولایت شاہ سے کہیں زیادہ متاثر

تھیں۔ ولایت شاہ کے پاس قسم قسم کے تعویذ اور گنڈے تھے اور عورتوں کو ہمیشہ اِن چیزوں کی ضرورت رہتی تھی۔ بیمار بچّوں کی صحت کے لیے، آسیب زدہ لڑکیوں اور لڑکوں کی نجات کے لیے اور دوسری شادی کی خواہش کرنے والے خاوند کو راہِ راست پر لانے کے لیے ان تعویذوں اور گنڈوں کی ضرورت رہتی تھی۔

☆☆☆☆☆

سلیم کے گاؤں میں چند آدمی پیر ولایت شاہ کے مرید تھے۔ ان مُریدوں میں چودھری رمضان ان پر دل و جان سے فِدا تھا اور اُس کی عقیدت بِلا وجہ نہ تھی۔ وہ جِنوں، بھُوتوں اور چڑیلوں سے بہت پریشان رہتا تھا اور اُس پریشانی کو دُور کرنے کے لیے ولایت شاہ نے اُسے تعویذ دیا تھا۔ جِنوں اور بھُوتوں کے بعد وہ پولیس سے بہت ڈرتا تھا، چنانچہ اُس کے گھر سے پولیس کو دُور رکھنے کے لیے ولایت شاہ نے اُسے دو تعویذ دیے تھے۔ یہ دونوں تعویذ وہ ہمیشہ اپنے گلے میں باندھے رکھتا تھا۔

چودھری رمضان کے اِصرار پر ایک دفعہ پیر ولایت شاہ اُس گاؤں آئے

تھے اور اس کے بعد انہوں نے قسم کھالی تھی کہ وہ دوبارہ اِس گاؤں میں قدم نہیں رکھیں گے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دِنوں سلیم کا والد چودھری علی اکبر بھی چھٹّی پر آیا ہوا تھا۔ ولایت شاہ کو معلوم نہ تھا کہ سردیوں میں اس کی علی اکبر سے ملاقات ہو گی ورنہ وہ کبھی نہ آتا۔ علی اکبر اسے طالبِ علمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا۔ ”ارے ولایت! میں تو سمجھتا تھا کہ تم ابھی تک اسکول میں ہو گے۔۔۔۔ سناؤ اس سال کتنی شادیاں کی ہیں؟“

ایک دیرینہ واقف کار کی طرف سے یہ صرف ابتدا تھی۔ علی اکبر نے اسکول کی باتیں شروع کر دیں۔ لوگ ہنس رہے تھے لیکن مُرید انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ رمضان کو پیچ و تاب کھاتا دیکھ کر اسماعیل کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ اُس نے کہا۔ ”جنوں نے پیر صاحب کو پھل اور مٹھائیاں کھلا کر بہت موٹا کر دیا ہے۔ آج اِن کے گھوڑے کی کمر دُوہری ہو رہی تھی۔ ابھی خدا کے فضل سے یہ جوان ہیں لیکن خدا کے حضور پہنچتے پہنچتے ان کا وزن ڈیڑھ دو من اور زیادہ ہو جائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ

پُل صراط سے کیسے گزریں گے۔ اِن کا بوجھ اُٹھانے کے لیے تو مال گاڑی کی ضرورت پڑے گی!"

ولایت شاہ کے دماغ پر اگر بھنگ کا نشہ غالب نہ ہوتا تو وہ یقیناً جلال میں آ جاتے، تاہم چودھری رمضان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "اسماعیل تحصیل دار تو بھلا پیر جی کا لنگوٹیا ہے لیکن تمھیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ بزرگوں کے مُنہ سے کبھی بُری دُعا بھی نِکل جاتی ہے؟"

اتنی دیر میں چودھری رحمت علی رمضان کے صحن میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "اسماعیل! تم بڑے بے شرم ہو، ہر ایک سے مذاق شروع کر دیتے ہو۔"

علی اکبر نے کہا۔ "ابّا جی! اسماعیل تو اِن کے فائدے کی بات کہہ رہا تھا۔ پیر جی بہت زیادہ موٹے ہو گئے ہیں، اِن کو ورزش کرنی چاہیے۔"

رحمت علی کو بھی ولایت شاہ سے کوئی عقیدت نہ تھی تاہم وہ اُس کے بزرگوں سے مرغوب تھا اور اُسے یہ بات گوارا نہ تھی کہ اُس خاندان کا

گدّی نشین خواہ وہ برا ہی کیوں نہ ہو، اُس کے بچّوں کو بد دُعا دے کر جائے۔ اس نے اپنے لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے نکال دیا اور پیر جی سے کہا۔ ”شاہ جی! آپ غصّہ نہ کریں میرے دل میں آپ کے بزرگوں کی بڑی عزّت ہے۔“

شاہ جی نے غصّے کا اظہار تو نہ کیا لیکن دل میں یہ فیصلہ ضرور کر لیا کہ وہ آئندہ اس گاؤں میں نہیں آئیں گے۔۔۔ چند دنوں کے بعد چودھری رحمت علی کے دو بیل چوری ہو گئے تو رمضان یہ کہتا پھرتا تھا کہ یہ ولایت شاہ کی بد دعا کا نتیجہ ہے، دو دن کے بعد یہ بیل مل گئے تو رمضان نے یہ مشہور کر دیا کہ شاہ صاحب نے رحمت علی کے لڑکوں کا قصور معاف کر دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

عام حالات میں شاید ولایت شاہ دوبارہ اِس گاؤں میں تشریف نہ لاتے لیکن چند سال بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے باعث انہیں آنا ہی پڑا۔

جس دن سلیم گھوڑے سے گرا، اس سے تیسرے روز گاؤں کے لوگ ایک نئے موضوع پر تبصرے کر رہے تھے۔ چودھری رمضان اپنی زندگی کی سب سے بڑی پریشانی کا سامنا کر رہا تھا۔ عام طور پر گاؤں کے لوگ اس کی پریشانیوں پر قہقہے لگایا کرتے تھے لیکن اس دفعہ بعض لوگ اس غیر متوقع واقعہ پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔

بات یہ ہوئی کہ چودھری رمضان نے کچھ گندم دھوپ میں سُوکھنے کے لیے اپنے کوٹھے کی چھت پر ڈال دی تھی۔ اس کوٹھے کے پچھواڑے مان سنگھ کی حویلی تھی۔ لچھمن سنگھ کی حویلی کا جو کونا رمضان کے کوٹھے کے ساتھ ملتا تھا وہاں اس نے پیال کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ پیال کا یہ ڈھیر سال بھر میں بارشوں کی وجہ سے تھوڑا بہت دب جاتا تو لچھمن سنگھ اس پر اور پیال ڈال دیتا۔ لچھمن سنگھ اس ڈھیر سے کئی کام کیا کرتا تھا۔ سردیوں کی دھوپ میں وہ اس ڈھیر پر بیٹھ کر چارپائی کا بان بُنا کرتا تھا۔ برسات میں جب حویلی میں کیچڑ ہوتی تو وہ اپنی بکریوں کے لیے وہاں چارہ ڈال دیا کرتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب چودھری رمضان اپنے کوٹھے پر سویا کرتا تھا

تو وہ اس کے پاس پہنچ کر گپیں مارنے کے لیے پیال کے اس ڈھیر سے سیڑھی کا کام لیا کرتا تھا۔ گاؤں میں اگر کسی کو پیال کی ضرورت ہوتی تو بِلا تکلّف یہاں سے لے سکتا تھا۔ اس لیے لچھمن سنگھ کی کوشش ہوتی کہ اس ڈھیر کی سطح رمضان کے کوٹھے سے نیچے نہ ہونے پائے۔

جس دن رمضان نے کوٹھے پر گندم ڈالی، لچھمن سنگھ نے اپنی بکریاں باندھ لی تھیں لیکن اُس کا بھینسا کسی طرح کھُل گیا اور خُدا معلوم اُسے کیا سوجھی کہ وہ پیال کے ڈھیر پر سے گُزرتا ہوا چودھری رمضان کے کوٹھے پر جا پہنچا۔

چودھری رمضان اندر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا کہ اُوپر کھڑ کھڑاہٹ سُنائی دی۔ مٹّی گِری اور اُس کے ساتھ ہی چھت سے یکّے بعد دیگرے دو سیاہ ٹانگیں نمودار ہوئیں، بھینسے کی ٹانگیں۔

میاں بیوی سکتے کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ باہر سے جلال اور اُس کی بہن نے دہائی مچا دی۔ ”ماں! ماں! لچھمن سنگھ کا بھینسا کوٹھے پر چڑھ گیا۔“

رمضان کسی بہت خطرناک چیز کا تصوّر کر رہا تھا۔ وہ ہانپتا کانپتا اور لرزتا ہوا باہر نکلا۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد وہ کھڑکی کی سیڑھی سے اُوپر چڑھا۔ لچھمن سنگھ کے بھینسے کی گردن چھت کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اُس کی اگلی دو ٹانگیں پھنس گئی تھیں۔ پچھلی ٹانگیں ابھی تک پیال کے ڈھیر پر تھیں۔ بے کسی اور انکساری کا یہ پیکر مجسم اپنی خاموش نگاہوں سے چھوت کی ناپائیداری کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔

چودھری رمضان نے تھوڑی دیر میں سارا گاؤں اکٹھا کر لیا۔ بچّوں اور نوجوانوں نے قہقہے لگائے لیکن بڑوں کے لیے یہ انہونی بات تھی۔ بھینسے کو اِس مُصیبت سے نجات دلائی گئی۔ اس کے بعد سوال زیرِ بحث تھا کہ آدمؑ کے زمانے سے لے کر آج تک بھینسا کسی کوٹھے کی چھت پر نہیں چڑھا لیکن آج ایسا کیوں ہوا؟

گاؤں میں ایسے سوالات کا جواب صرف سائیں اللہ رکھا دیا کرتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”منگل کا دن ہے۔ بھینسا رمضان کے کوٹھے پر چڑھا ہے اور بھینسا لچھمن سنگھ کا ہے۔ اب خدا فضل کرے، مجھے ڈر ہے کہ اوّل تو سارے

گاؤں پر ورنہ اِن دو گھروں پر ضرور کوئی نہ کوئی مُصیبت ضرور آئے گی!“

رمضان اور لچھمن سنگھ سے پہلے اُن کی بیویوں نے اِس بات کی تائید کی۔ لچھمن سنگھ کی بیوی اُسے کہتی تھی کہ یہ بھینسا مُفت کسی کو دے دو اور رمضان کی بیوی اپنے شوہر سے کہتی تھی کہ تم ابھی ولایت شاہ کے پاس جاؤ!

رات کے وقت جلال کے پیٹ میں درد ہوا اور لچھمن سنگھ کے کوٹھے پر دو کتّے روتے رہے۔ چنانچہ پچھلے پہر رمضان نے گھر سے تیس روپے لیے اور لچھمن سنگھ نے اپنا بھینسا کھول لیا اور دونوں ولایت شاہ کی طرف چل دیے۔ لچھمن سنگھ کو راستے میں ایک خریدار مل گیا اور اُس نے تیس روپے کے عوض بھینسا اُس کے پاس فروخت کر دیا۔ ولایت شاہ کے پاس پہنچ کر رمضان نے بیس روپے اُن کے آگے رکھ دیے۔ لچھمن سنگھ اِس سے زیادہ فیس ادا کرنے کے لیے تیّار نہ تھا چنانچہ اُس نے بھی بیس دے دیے اور دس شراب کے لیے اپنے پاس رکھ لیے۔

دونوں نے ہاتھ باندھ کر اپنی مُصیبت کا حال سُنایا۔ ولایت شاہ اس وقت

بھنگ کے نشہ میں تھا۔ اُس نے کہا۔ ”اچھا بھئی! میں نے تو ارادہ کیا تھا کہ اس گاؤں میں دوبارہ پاؤں نہیں رکھوں گا، پر اب تُم آ گئے ہو تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔ وہ جِن جس نے بھینسا اُٹھا کر تمہاری چھت پر رکھ دیا تھا معمولی جِن نہیں۔۔۔ تم نے بہت اچھّا کیا، اس بھینسے کو بیچ دیا۔ اب وہ جس کے گھر جائے گا، اس کا ستیاناس ہو گا۔“

☆☆☆☆☆

شام کے چار بجے کے قریب جب چودھری رمضان اور لچھمن سنگھ پیر ولایت شاہ کو لے کر گاؤں کے قریب پہنچے تو افضل کھیتوں میں گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ پیر ولایت شاہ اپنا گھوڑا روک کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ چار مجاور تھے۔ انہوں نے بھی اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔

پیر ولایت شاہ نے رمضان سے پوچھا۔ ”یہ گھوڑے والا کون ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”یہ افضل ہے، چودھری رحمت علی کا لڑکا!“

”کتنے کا خریدا ہے یہ گھوڑا؟“

”پیر جی یہ اُن کے گھر کا بچھیرا ہے۔ خالص عرب نسل کا ہے۔ دیکھیے اب وہ کھائی پر سے چھلانگ لگائے گا۔“

جس جگہ سے افضل گھوڑے کو چھلانگ لگوا رہا تھا، وہاں سے کھائی کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ گھوڑے کی چند چھلانگیں دیکھنے کے بعد ولایت شاہ نے کہا۔ ”کیوں چودھری رمضان! وہ اس گھوڑے کو بیچتے ہیں یا نہیں؟“

رمضان نے جواب دیا۔ ”پیر جی! اگر آپ کو خریدنے کا شوق ہو تو شاید اُن کی دوسری گھوڑی کا سودا ہو جائے۔ وہ اسی بچھیرے کی بہن ہے۔ بہت تیز بھاگتی ہے۔ ہے یہ بھی بہت شریف۔ اس گھوڑے کو اُنہوں نے ابھی ابھی لگام دی ہے۔ ابھی تک یہ شوخ ہے۔ دو تین دن ہوئے اس نے تحصیل دار کے لڑکے کو گرا دیا تھا۔“

لیکن پیر صاحب فیل قامت ہونے کے باوجود سواری کے لیے شوخ جانور پسند کرتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”گھوڑیاں میرے پاس بہت ہیں۔ تم اِس گھوڑے کا سودا کروانے کی کوشش کرو!“

چودھری رمضان نے آگے بڑھ کر آواز دی۔ ”افضل! افضل! بھئی اِدھر آنا!“

لیکن افضل رمضان کی آواز سُننے سے پہلے کھائی پر سے کُود کر گھوڑے کی باگ گاؤں کی طرف موڑ چکا تھا۔

جب رمضان، ولایت شاہ کے گھوڑے کی باگ پڑے ہوئے اپنے گھر کا رُخ کر رہا تھا تو افضل گھوڑے کو اصطبل میں چھوڑ کر اپنی حویلی سے باہر نکالا۔

اس نے پیر صاحب کو دیکھ کر کہا۔ ”پیر صاحب! السّلام علیکم!“

پیر صاحب نے گرمجوشی سے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ ”بھئی چودھری ہم دیر تک تمہارا گھوڑا دیکھتے رہے۔ لیکن تم نے ہماری طرف توجّہ ہی نہ دی۔ بھئی گھوڑا بھی اچھا ہے اور سوار بھی اچھا ہے۔ چودھری علی اکبر یہیں ہے“

”نہیں جی، شاید اگلے مہینے آئیں۔“

"چودھری رحمت علی کہاں ہیں؟"

"وہ شہر گئے ہوئے ہیں، شام تک آجائیں گئے۔"

رمضان نے کہا۔ "پیر جی! بڑے چودھری لڑکوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ افضل جو بات کرے گا، انہیں منظور ہوگی۔"

افضل نے کہا۔ "کیا بات ہے چودھری رمضان؟"

پیر صاحب نے رمضان کو گھور کر دیکھا لیکن رمضان ایسے معاملات میں تمہید کا قائل نہ تھا۔ اس نے کہا۔ "بھئی بات یہ ہے کہ پیر صاحب کو تمہارا گھوڑا پسند آگیا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ لوگے کیا؟"

افضل کے لیے یہ ایک گالی تھی۔ تاہم اس نے پیر صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے بھتیجے کا ہے۔"

لچھمن سنگھ نے کہا۔ "بھئی اب پیر جی بچّے کے ساتھ بات تو نہیں کریں گے!"

افضل نے کہا۔ ’’پیر جی یہ گھوڑا آپ کے کام کا نہیں اور ہم اسے بیچنا بھی نہیں چاہتے۔‘‘

ولایت شاہ نے کہا۔ ’’بھئی ہم ادھار نہیں کرتے، نقد قیمت دیں گے!‘‘

افضل فطرتاً شرمیلا تھا۔ وہ پیر صاحب کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پیر صاحب قیمت چُکانے پر بضد تھے اور رمضان اور لچھمن سنگھ پیر جی کی وکالت کر رہے تھے۔ غلام حیدر اور اسماعیل بھی گھر سے نکل آئے اور گاؤں کے لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ سلیم کو مجید نے خبر دار کر دیا اور وہ اپنا بازو گلے کے ساتھ لٹکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

ولایت شاہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی پسند کی کسی شے پر دوسروں کا حق تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں یہ گھوڑا خوبصورت تھا لہٰذا اس کا صحیح مقام اُن کا اصطبل تھا۔ وہ یہ اعتراض سُننے کے لیے تیّار نہ تھے کہ اس کے ساتھ افضل کے بھتیجے کو دلچسپی ہے اور اگر یہ بیچ ڈالا گیا تو ایک معصوم لڑکے کا دل دُکھے گا۔ افضل اور اس کے بھائیوں کو اُس کی ضد پر غصّہ آرہا تھا لیکن وہ اُن کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ چودھری

رمضان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ پیر جی دوسری دفعہ اُس کے گاؤں سے ناراض ہو کر جائیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا کہ خدا کے لیے پیر جی کو ناراض نہ کرو!

سلیم حیران تھا کہ اس کے گھوڑے کے متعلّق بحث ہو رہی ہے لیکن اُس کی طرف کوئی توجّہ نہیں دیتا۔

جب ولایت شاہ کو ٹالنا بہت مشکل ہو گیا تو اسماعیل نے کہا۔ ”پیر جی! اگر اسی طرح کسی کو آپ کی گھوڑی پسند آ جائے تو آپ بیچ دیں گے؟“

پیر جی نے بگڑ کر کہا۔ ”اگر کوئی قیمت دینے والا ہو تو میں ابھی اپنی گھوڑی بیچنے کے لیے تیّار ہوں۔۔۔۔ یہ خریدنے والے کی ہمّت کی بات ہے اس کی قیمت چار سو روپیہ ہے۔“

اسماعیل نے کہا۔ ”اگر آپ کی گھوڑی کی قیمت چار سو روپیہ ہے تو ہمارے گھوڑے کی قیمت پانچ سو روپیہ ہے، اگر آپ میں ہمّت ہے تو خرید لیں!“

پیر صاحب کا جوش و خروش تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا تو اس نے

اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا۔ "اچھا تمہاری طرف سے پانچ سو روپے کی بات پکی ہوئی۔ اگر مجھے میں ہمّت ہوئی تو میں خرید لوں گا، ورنہ تمہارا گھوڑا تمہیں مبارک ہو۔ چلو چودھری رمضان!"

پیر صاحب نے رمضان کے گھر پہنچ کر اپنی مُٹھّی میں خشک مٹّی اُٹھائی، کچھ پڑھنے کے بعد اُس پر پھونک ماری اور رمضان سے کہا۔ "یہ مٹّی اپنے کوٹھے کی چھت پر بکھیر دو۔" پھر لچھمن سنگھ کو ایک تعویذ لکھ کر دیا اور کہا اِسے آدھی رات کے وقت اپنی حویلی میں دو بالشت گہرا گڑھا کھود کر دبا دینا۔" اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے بھنگ پی، افیون کھائی اور بستر پر لیٹ کر نے کی حقّے کی نَے مُنہ میں ٹھونس لی۔ چند کش لگانے کے بعد انہوں نے کہا۔ "رمضان تمہیں عربی نسل کے گھوڑے کی پہچان ہے؟"

رمضان نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا۔ "پیر جی! یہ گھوڑا تو واقعی عربی نسل کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیچنا نہیں چاہتے۔"

"لیکن اب تو وہ بیچنے پر تیّار ہو گئے ہیں۔"

"نہیں پیر جی، اُن کا خیال ہے کہ آپ قیمت سے ڈر جائیں گے۔ اس لیے انہوں نے پانچ سو سُنا دیا ہے۔"

پیر جی نے اچانک اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں پانچ سو روپیہ اپنے جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔"

"ہاں پیر جی، پانچ سو روپیہ آپ کے لیے کیا چیز ہے؟"

"اچھا جاؤ، اُن سے بات پکی کرو، میں صبح گھوڑے کو اچھی طرح دیکھوں گا، اگر اس میں کوئی نقص نہ ہوا تو میں کل ہی پانچ سو روپیہ ادا کر دوں گا۔"

☆☆☆☆☆

برگد کے درخت کے نیچے لوگ ابھی تک جمع تھے۔ رمضان کا پیر موضوعِ بحث تھا۔ اس کے موٹاپے، اس کی مونچھوں کی لمبائی اور اُس کی دستار کے طرّے پر خیالات کا اظہار ہو رہا تھا۔ چودھری رمضان بھاگتا ہوا آیا۔ "چودھری رحمت علی کہاں ہے؟" اس نے کہا۔

چودھری رحمت علی نے حویلی کے پھاٹک سے نکلتے ہوئے کہا۔ "کیوں

چودھری کیابات ہے؟"

رمضان نے کہا۔"مجھے پیر جی نے بھیجا ہے۔"

اسماعیل نے کہا۔"بھئی ہم نے پیر صاحب کو قیمت بتا دی ہے۔"

رحمت علی نے کہا۔"کس کی قیمت۔"

اسماعیل نے کہا۔"ابّا جی! رمضان کا پیر آیا ہے۔ وہ سلیم کا گھوڑا خریدنا چاہتا ہے۔ افضل نے اسے بہت ٹالا لیکن یہ بھنگ کا نشہ بہت بُرا ہوتا ہے۔ میں نے تنگ آکر کہا کہ اگر گھوڑا خریدنے کا شوق ہے تو لاؤ پانچ سو روپیہ! پیر جی یہ سُن کر چُپکے سے چل دیے۔ اب انہوں نے رمضان کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اور بھنگ پلا دی ہے۔"

رمضان نے اسماعیل کو جواب دینے کی بجائے رحمت علی کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔"چودھری جی! راجہ کے گھر موتیوں کا کال نہیں ہے۔ پیر جی کہتے ہیں کہ وہ صبح آکر گھوڑے کو دیکھیں گے اور اگر گھوڑے میں کوئی نقص نہ ہوا تو وہ کل ہی آپ کو پانچ سو روپیہ ادا کر دیں گے۔ انہیں خدا نے

بہت کچھ دیا ہے۔ پانچ سو روپیہ کیا چیز ہے!"

جس زمانے میں گندم ڈیڑھ روپے کی تھی، پانچ سو روپیہ معمولی بات نہ تھی۔ محفل پر تھوڑی دیر کے لیے سنّاٹا چھا گیا لیکن اسماعیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "چودھری رمضان! سچ کہو کتنی بھنگ پی ہے تمہارے پیر نے؟"

رحمت علی نے اسماعیل کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اسماعیل! تم ہر ایک کا مذاق نہ اُڑایا کرو۔" پھر وہ چودھری رمضان کی طرف متوجّہ ہوا۔ "جاؤ چودھری رمضان! اگر اسماعیل نے پانچ سو کے عوض گھوڑا بیچنے کا وعدہ کیا ہے تو صبح پیر صاحب کو لا کر دکھا دینا۔"

رحمت علی یہ کہہ کر مسجد کی طرف چلا گیا۔ سلیم دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کچھ دیر پہلے اُسے اِس بات کی تسلّی ہوئی تھی کہ بلا ٹل گئی لیکن رمضان کی باتیں سُن کر اُس کا چہرہ پھر مُرجھا گیا۔

افضل نے سلیم کی طرف دیکھا اور پھر اسماعیل کی طرف متوجّہ ہو کر کہا

"اسماعیل ولایت شاہ کے پاس پیسہ بہت ہے۔ اگر وہ ضد پر آ گیا تو یہ بری بات ہو گی۔ سلیم دو تین بار رو چکا ہے!"

اسماعیل نے کہا۔ "ارے یہ رمضان کی باتیں ہیں۔"

غلام حیدر نے کہا۔ "نہیں اسماعیل، سائیں اللہ رکھا کہتا ہے کہ پیر صاحب کا اگر کسی چیز پر دل آ جائے تو وہ پیسوں کی پروا نہیں کرتے۔ انہوں نے ایک کتّا ساٹھ روپے میں خرید لیا تھا۔"

اسماعیل نے اُٹھ کر سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! تم فکر نہ کرو۔ اوّل تو صبح تک پیر جی کا نشہ اُتر جائے گا اور اگر اُس نے یہ گھوڑا خرید ہی لیا تو میں پانچ سو روپے میں تمہارے لیے وہ گھوڑا لاؤں گا کہ دنیا دیکھے گی!"

سلیم نے اُس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں، میں اپنا گھوڑا نہیں دوں گا۔ میں اپنا گھوڑا نہیں دوں گا۔ یہ میرا ہے، یہ میرا ہے۔"

☆☆☆☆☆

رات کے وقت چونکہ دادا اور چچا یہ وعدہ نہ کر سکے کہ وہ پیر جی کو اصطبل کے قریب نہیں آنے دیں گے، اس لیے سلیم نے کھانا نا کھایا۔

دادی اماں جسے سلیم کو چوٹ لگانے کے بعد اُس گھوڑے سے بے حد نفرت ہو چکی تھی اب ”کالے منہ والے پیر“ اور رمضان کو بُرا بھلا کہنے کے بعد اسماعیل اور افضل کو کوس رہی تھی۔

چودھری رحمت علی اپنے فیصلوں کی بڑی سختی سے پابندی کیا کرتے تھے اور ان کا آخری فیصلہ یہی تھا کہ اگر ولایت شاہ نے خود اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا تو وہ گھوڑا فروخت کرنے پر مجبور ہوں گے۔

ماں، دادی اور چچیوں کے اصرار کے باوجود سلیم نے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ چپکے سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

پچھلے پہر جب گھر کی عورتیں چرخہ کاتنے اور دودھ بلونے کے لیے اُٹھیں تو سلیم کی ماں کو اس کا خالی بستر نظر آیا۔ وہ لالٹین ہاتھ میں لے کر اِدھر اُدھر تلاش کرنے گئی۔ سلیم کی چچی نے اسماعیل کو جگایا۔ اسماعیل لالٹین

پکڑ کر اُسے باہر کی حویلی میں تلاش کرنے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا۔ چلو تمہیں سلیم کو دکھاتا ہوں۔“

سلیم کی ماں نے پوچھا۔ ”افضل کے پاس ہو گا؟“

”نہیں۔“

”تو پھر کہاں ہے؟“

”چلو میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ رات اسے سردی نہ لگ گئی ہو!“

سلیم کی ماں اور چچیاں مزید سوالات پر پوچھے بغیر اسماعیل کے ساتھ چل پڑیں۔

اسماعیل نے مویشی خانے کے اندر داخل ہو کر انہیں لالٹین کی روشنی دکھائی۔ سلیم گھوڑے کے سامنے کھرلی میں بیٹھا پچھلی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ سلیم کی ماں مامتا سے مغلوب ہو کر آگے بڑھی لیکن گھوڑے کے تیور دیکھ کر اُسے پیچھے ہٹنا پڑا۔

اسماعیل نے کہا۔ ”بھابی جی، آپ آگے مت جائیں۔ اس وقت گھوڑا اپنے مالک کی رکھوالی کر رہا ہے۔ یہ مجھے بھی سلیم کے قریب نہیں جانے دیتا۔“

”سلیم! سلیم!“ ماں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا اور سلیم جیسے خواب میں بول رہا تھا۔ ”نہیں، نہیں، یہ میرا ہے، یہ میرا ہے۔“

”سلیم! سلیم!“ ماں کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

سلیم ابھی تک خواب کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا کہ افضل آ گیا۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ اس نے کہا۔

اسماعیل نے کہا۔ ”افضل آگے بڑھ کر سلیم کو اٹھاؤ۔ مجھے تو یہ گھوڑا اس کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔“

”ارے سلیم یہاں سو رہا ہے؟“

”سلیم شاید ساری رات یہاں رہا ہے۔“

افضل آگے بڑھا۔ گھوڑے نے نتھنوں سے کھرر کھرر کی آواز نکالی اور اُس کے جسم کے ساتھ رگڑنے لگا۔ افضل نے سلیم کو جھنجھوڑ کر جگایا اور اُٹھا کر گلے لگالیا۔

اس کے بعد ماں اور چچیاں اُسے یکّے بعد دیگرے سینے سے چمٹا رہی تھیں۔

جب یہ گھر میں داخل ہوئے تو دادی امّاں باہر نکلنے کے لیے اپنا جوتا تلاش کر رہی تھیں۔ سلیم کو دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔ ”ہے ہے ایسے پیر کو خدا غارت کرے، میرا بیٹا ساری رات سردی میں بیٹھا رہا ہے!“

اس کے بعد سلیم کو کم از کم اس بات کی تسلّی ہو چکی تھی کہ خاندان کی بھاری اکثریت اس کے ساتھ ہے۔

نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ سلیم کی ماں نے اُس سے کہا۔ ”بیٹا! اب وضو کر کے نماز پڑھو اور خُدا سے دُعا کرو۔“ اور سلیم نماز پڑھنے کے بعد انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ دُعا مانگ رہا تھا۔ ”یا اللہ! میرا گھوڑا نہ جائے یا اللہ رمضان کے پیر کی بھنگ کا نشہ اُتر جائے۔“

اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اسے نیند آ گئی۔ وہ سہانے اور میٹھے سپنے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور اسے گندم کے لہلہاتے کھیتوں سے گزرنے والی پگڈنڈیوں پر بھگا رہا تھا۔ اسکول کے لڑکے اُس کے گرد جمع تھے اور وہ انہیں کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو میرا گھوڑا!''

''سلیم اُٹھو! سلیم سلیم اُٹھو!'' اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ کھڑکی سے سورج کی روشن آ رہی تھی۔ مجید نے کہا۔ ''سلیم! جلدی چلو، رمضان کا پیر تمہارا گھوڑا دیکھنے آ رہا ہے۔ میں ابھی اُن کے گھر سے آ رہا ہوں۔''

سلیم اُس کے ساتھ ننگے پاؤں اصطبل کی طرف بھاگا۔ اتنی دیر میں ولایت شاہ حویلی کے پھاٹک میں کھڑا اُس کے دادا سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔وہ کہہ رہا تھا۔ ''چودھری میں نے آدمی روپے لانے کے لیے بھیج دیا ہے۔''

اسماعیل نے جھک کر سلیم کے کان میں کہا۔ ''بیٹا! فکر نہ کرو، میں نے پیر کا علاج سوچ لیا ہے۔ تم جا کر اِسی طرح آنکھیں بند کر کے گھر میں بیٹھ جاؤ!''

سلیم نے سراپا التجا بن کر کہا۔ ''پھر کیا ہو گا چچا؟''

"پھر کچھ نہیں ہو گا۔ انشاءاللہ پیر جی خالی ہاتھ جائیں گے۔ بس اب تم جلدی کرو!"

سلیم بھاگتا ہوا اصطبل میں چلا گیا۔

چودھری رحمت علی نے کہا۔ "چلیں بیٹھک میں بیٹھتے ہیں۔"

رمضان نے کہا۔ "پیر جی فوراً گھوڑا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

چودھری رحمت علی نے افضل کو آواز دی لیکن اسماعیل نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ابّا جی! افضل باہر چارہ کاٹنے کے لیے چلا گیا ہے۔۔۔۔ میں دکھا دیتا ہوں پیر جی کو گھوڑا۔۔۔ آؤ پیر جی!"

پیر جی رمضان کے ساتھ اصطبل میں داخل ہوئے۔ گھوڑے نے انہیں دیکھ کر کان کھڑے کر لیے۔ رمضان جس قدر گھوڑوں کی عرب نسل پہنچانے میں ماہر تھا اُسی قدر اُن سے دور رہنا پسند کرتا تھا اور اُس گھوڑے کے ساتھ اُس کی ویسے بھی نہیں بنتی تھی۔ اسماعیل دروازے سے آگے نہ بڑھا۔ رمضان نے کہا۔ "پیر جی گھوڑا ذرا خطرناک ہے۔"

پیر جی نے کہا۔ ”بھئی ہم نے بڑے بڑے خطرناک گھوڑے دیکھے ہیں، یہ کیا ہے؟“

پیر جی بے تکلّفی سے آگے بڑھے۔ معاً اُن کی نظر سلیم پر پڑی۔ وہ چچا کے اِرشاد کی تعمیل میں آنکھیں بند کیے کھرلی میں بیٹھا تھا۔ ”ارے یہ کون ہے؟“ پیر جی نے کہا۔

رمضان نے جواب دیا۔ ”یہ چودھری رحمت علی کا پوتا ہے اور یہ گھوڑا بھی اِسی کا ہے۔“

پیر جی نے کہا۔ ”ارے بھائی، یہ تو بچّوں کے ساتھ بھی ہلا ہوا ہے، اِسے کون خطرناک کہتا ہے۔“

پیر جی بے پروائی سے آگے بڑھے اور انہوں نے سلیم کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”کیوں برخوردار۔۔۔!“

پیر جی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکے۔ سلیم کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ گھوڑے نے اُن کے فربہ سینے کا فالتو گوشت جو چلتے وقت اُوپر نیچے اُچھلا کرتا تھا،

اپنے دانتوں کی گرفت میں لے لیا۔

ولایت شاہ کی کیفیّت اُس ہاتھی سے مختلف نہ تھی جس کی سونڈ شیر کے مُنہ میں آچکی ہو۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی پوری قوّت سے چلّا رہے تھے۔ گھوڑے کا یہ اقدام اسماعیل کی توقّع کے خلاف تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ گھوڑا صرف ڈرانے دھمکانے یا زیادہ سے زیادہ دولتی مارنے پر اکتفا کرے گا۔۔۔۔۔ سلیم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ رمضان اس دلگداز منظر کی تاب نا کر پوری قوّت سے دُہائی مچا رہا تھا۔

اسماعیل نے جب محسوس کیا کہ معاملہ مذاق کی حد سے آگے گُزر چکا ہے تو اُس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کے نتھنے پر مکّا مارا۔ گھوڑے کے دانتوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور ولایت شاہ بے ہوش ہو کر ِگر پڑا۔

تھوڑی دیر میں ساری حویلی گاؤں کے مردوں عورتوں اور بچّوں سے بھر گئی۔ پیر جی کو پانچ چھ آدمیوں نے بڑی مُشکل سے باہر نکال کر چارپائی پر ڈال دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پیر صاحب کو ہوش آیا اور اتنی دیر میں قریباً تمام لوگ یکے بعد دیگرے ان کے جسم کا زخم خوردہ حصّہ دیکھ چکے

تھے۔

درد کی شدّت اور آدمیوں کے ہجوم میں پیر جی نے اپنے آپ کو قریب المرگ سمجھ کر مریدوں اور مجاوروں سے وصیّت کی کہ اُس گاؤں میں میرا جنازہ خراب ہو گا، مجھے فوراً میرے گھر پہنچا دو۔ چنانچہ اُن کے حکم کی تعمیل کی گئی اور انہیں چارپائی پر ڈال کر اُن کے گاؤں پہنچا دیا گیا۔

ولایت شاہ کوئی ڈیڑھ مہینہ بستر پر پڑے رہے۔ اُن کے مرید اُن کی تیمار داری کے لیے جاتے تھے لیکن اُن کے مخالفین دور دراز سے چل کر سلیم کے گھوڑے کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے اور اسماعیل اُن کے سامنے اِس واقعہ کی چشم دید تفصیلات بیان کیا کرتا تھا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد فجّو پہلوان نے اِعلان کیا کہ سلیم کا بازو اب بالکل ٹھیک ہے اور اگلے دن سلیم گاؤں کے کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر گھوڑے کو بھگا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

شب برات کی آمد آمد تھی۔ سکول کے پاس ہی ایک دکاندار پھلجھڑیاں، پٹاخے، اور آتش بازی کا دوسرا سامان نمائش کے لیے رکھ دیا کرتا تھا۔ لڑکے آدھی چھٹّی کے وقت حلوائی کی دکان پر دھاوا بولنے کی بجائے پٹاخے وغیرہ خرید کر چلایا کرتے تھے۔ سلیم نے اپنے حصّے کے پیسے مجید کے حوالے کر دیے تھے اور وہ آدھی چھٹّی کے وقت پٹاخے چھچھوندریں وغیرہ خرید لایا تھا۔ آدھی چھٹی کے بعد اُردُو کا گھنٹہ تھا اور ماسٹر کی غیر حاضری میں لڑکے شور مچارہے تھے۔ مجید نے آتش بازی کا سامان اپنے بستے میں باندھ رکھا تھا لیکن سلیم اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ مجید بار بار اپنا بستہ اُس کے ہاتھ سے چھین کر ڈیسک کے اندر رکھتا لیکن وہ پھر نکال لیتا۔

سلیم کے بائیں ہاتھ کے ڈیسک پر ارشد بیٹھا کرتا تھا، اس نے اپنی جیب سے ایک پھلجھڑی نکالی اور اُسے آگ لگا کر تمام لڑکوں کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔

سلیم نے بھی اُس کی دیکھا دیکھی مجید کے بستے سے ایک پھلجھڑی نکال کر اُسے آگ لگا دی۔ ایک اور لڑکے نے اُن کی تقلید کی اور تھوڑی دیر میں

کمرے کے اندر کئی پھلجھڑیاں چلنے لگیں۔

ارشد نے سلیم کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”تمہارے بھائی نے بہت سی چھچھوندریں لی ہیں لیکن یہ کسی کام کی نہیں۔ میں کل ایک آنے کی لے گیا تھا، ان میں سے صرف دو چلیں۔ معلوم ہوتا ہے اِن کے اندر پسا ہوا کوئلہ بھرا ہے!“

سلیم کو افسوس ہوا کہ یہ بات اُسے پہلے کیوں نہیں بتائی گئی۔ تاہم اس نے ایک چھچھوندر نکال کر ارشد کو دِکھاتے ہوئے کہا۔ ”ان کے اندر کوئلہ نہیں ہے۔ میں نے کئی لڑکوں کو چلاتے دیکھا ہے!“

”لاؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں!“

سلیم نے چھچھوندر ارشد کے ہاتھ میں دے دی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کے ساتھ دیاسلائی جلائی اور اُس کے ایک سِرے کو آگ لگا دی۔ کمرے کے باہر ہیڈ ماسٹر صاحب اُردُو کے ماسٹر سے کہہ رہے تھے کہ آپ دیر سے آتے ہیں اور لڑکے سب سے زیادہ آپ کی گھنٹی پر شور مچاتے

ہیں۔

لڑکے واقعی بہت شور مچا رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر کی جھڑکی کے بعد اُردُو کے ماسٹر نے انتہائی غیض و غضب کی حالت میں کمرے کا رُخ کیا، لیکن جونہی اُنہوں نے کمرے میں پاؤں رکھا ارشد نے بدحواسی کی حالت میں چھچھوندر چھوڑ دی۔

چھچھوندر پہلے میز پر ِگری، پھر دروازے کا رُخ کیا اور اُس کے بعد ماسٹر صاحب کی ٹانگوں میں جا چھُپی۔ ماسٹر صاحب اُچھل اُچھل کر اپنی شلوار جھاڑنے لگے۔ یہ نظّارہ دیکھ کر لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے مُنہ چھُپا کر ہنسنے لگے۔

چھچھوندر سے چھٹکارا حاصل کرتے ہی ماسٹر صاحب اُلٹے پاؤں واپس مُڑے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو بُلا لائے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنا بید ہلاتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہ کس کی شرارت ہے؟“

کسی نے جواب نہ دیا۔

ہیڈ ماسٹر نے دوبارہ گرج کر کہا۔ ”بتاؤ! ورنہ سب کو سزا دوں گا!“

لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

آگے بیٹھنے والے لڑکوں کو معلوم نہ تھا کہ چھچھوندر کس نے چلائی ہے اور پیچھے بیٹھنے والے جن لڑکوں کو معلوم تھا، انہیں یہ تسلّی تھی کہ ہیڈ ماسٹر کا غصّہ اگلی قطار کے چند لڑکوں سے باز پُرس کے بعد ختم ہو جائے گا، اس لیے وہ خاموش رہے۔ ارشد نے ملتجی نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا اور سلیم کی مُسکراہٹ نے اُس کی تسلّی کرادی۔ مجید نے اپنا بستہ ڈیسک سے اُٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد آتش بازی کا سامان نکال کر ڈیسک کے اندر چھپا دیا۔

ہیڈ ماسٹر نے چند مرتبہ اپنا بید ہوا میں لہرایا، پھر لڑکوں کو کھڑا ہونے کا حکم دیا اور ایک سِرے سے مار پیٹ شروع کر دی۔

بلونت سنگھ اگلے ڈیک پر بیٹھا ہوا تھا، اِس لیے سب سے پہلے اُس کی باری

آئی۔ ہیڈ ماسٹر کے حکم پر اُس نے انتہائی بے کسی کی حالت میں اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ پہلا بید کھانے کے بعد وہ چلّانے لگا۔ ”نہیں جی، ماسٹر جی نہیں جی، میں نہیں نہیں چلائی۔“ لیکن ماسٹر صاحب اُس کی باتیں سُننے کے لیے تیّار نہ تھے۔ ”ہاتھ بڑھاؤ؟“ انہوں نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ بلونت سنگھ نے دوسرا ہاتھ بڑھا دیا لیکن جب سنسناتا ہوا بید آیا تو اُس نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ بید ڈیسک پر لگا اور لڑکے سہم کر رہ گئے۔

”ماسٹر جی میں نہیں چلائی، ان لڑکوں سے پوچھ لیجیے!“

”تو بتاؤ کس نے چلائی ہے؟“ ہیڈ ماسٹر صاحب کا بید پھر ایک بار ہوا میں سنسناہٹ پیدا کرنے لگا۔ ”ہاتھ بڑھاؤ ورنہ!“

بلونت سنگھ نے کانپتا ہوا ہاتھ پھِر آگے کر دیا لیکن جب بید آیا تو اُس کا ہاتھ خود بخود پیچھے ہٹ گیا۔ بید دوسری مرتبہ ڈیسک پر لگا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کا غصّہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔

ایک طرف سے سلیم کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ماسٹر جی میں۔۔۔

میں نے چھچھوندر۔۔۔۔"

"تم؟" ہیڈ ماسٹر نے چونک کر کہا۔

"جی!"

"اِدھر آؤ!"

ارشد کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ سلیم آگے بڑھ کر ہیڈ ماسٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے بید اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟"

سلیم نے جواب دینے کی بجائے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ یکّے بعد دیگرے چھ بید رسید کرنے کے بعد ہیڈ ماسٹر کا غصّہ پریشانی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سلیم نے باری باری ہاتھ آگے کرنے کی بجائے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ گردن جھکانے کی بجا ٹکٹکی باندھ کر ہیڈ ماسٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک گستاخی تھی، کم از کم اُردُو کا ماسٹر جو ہیڈ ماسٹر کے قریب کھڑا تھا، اسے بہت بڑی گستاخی سمجھتا تھا۔ اگر سلیم

ایک بار ”نہیں جی۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو جی۔“ کہہ دیتا تو یہ معاملہ ختم ہو جاتا لیکن اس کی ہمّت اور جرأت کو چیلنج سمجھا گیا۔

مجید، ارشد کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں، اگر اُس کے بس میں ہوتا تو ارشد پر بھُوکے شیر کی طرح حملہ کر دیتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے متعلّق مشہور تھا کہ اوّل تو وہ کسی کو مارتے ہی نہیں لیکن جب مارنے پر آتے ہیں تو آدھی درجن یا ایک درجن کے حساب سے بید رسید کرتے ہیں۔ ارشد کو یقین تھا کہ وہ سلیم جیسے لڑکے لیے آدھی درجن کافی سمجھیں گے لیکن جب ہیڈ ماسٹر نے آدھی درجن پوری کر کے قدرے توقّف کے بعد پھر بید اُٹھایا تو ارشد کی قوّتِ برداشت جواب دے گی۔ اُس نے مجید کی طرف دیکھا۔ مجید نے انتہائی حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ ”تم بزدل ہو“ اور ارشد کی رگ وپے میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ وہ چلّایا۔ ”ماسٹر جی! سلیم بے قصور ہے۔ چھچھوندر میں نے چلائی تھی۔“

ہیڈ ماسٹر صاحب کا بید رُک گیا اور ارشد آگے بڑھ کر سلیم کے قریب

کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر اور اُردُو کا ماسٹر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”تم جھوٹ کہتے ہو؟“ ہیڈ ماسٹر نے ارشد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سلیم کو معلوم ہے کہ چھچھوندر میں نے چلائی تھی، مجید کو بھی معلوم ہے۔ بہت سے لڑکوں کو معلوم ہے آپ پوچھ لیجیے۔ سلیم مجھے بچانے کے لیے۔۔۔“

ارشد کی آواز بیٹھ گئی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”کیوں مجید؟“ ہیڈ ماسٹر نے اُس کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔

”جی۔۔۔“ سلیم نے جلدی سے مُڑ کر مجید کی طرف دیکھا اور اُس کی نگاہوں نے مجید کے ہونٹوں پر مہر لگا دی۔

ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ ”بتاتے کیوں نہیں۔“

مجید کی خاموشی پر رام لال نے کہا۔ ”ماسٹر جی! ارشد نے چلائی تھی۔“

☆☆☆☆☆

لڑکوں کی توقع کے خلاف ہیڈ ماسٹر کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑے سلیم اور ارشد کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کے دل میں غصّے کی جگہ پریشانی نے لے لی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ”تم بہت نالائق ہو ارشد۔ اور سلیم تم۔۔۔ تم میرے ساتھ آؤ!“

سلیم ہیڈ ماسٹر کے پیچھے کمرے سے باہر نکلا اور صحن میں سے گُزرنے کے بعد دفتر میں داخل ہوا۔۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے رہے اور سلیم میز کی دوسری طرف اُن کے سامنے کھڑا رہا۔ بالآخر انہوں نے سلیم کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”سلیم تمہیں مار کھانے کا شوق تھا؟“

سلیم خاموش رہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر کہا۔ ”تم نے جھوٹ کیوں بولا؟“

سلیم نے جواب دیا۔ ”جی چھچھوندر میری تھی اور ارشد نے اُسے آگ

لگائی تھی، بلونت سنگ بے قصور تھا!"

"لیکن تم نے ارشد کو بچانے کی کوشش کیوں کی؟"

"ارشد نے جان بوجھ کر شرارت نہیں کی، اُس کا خیال تھا کہ چھچھوندر کے اندر مسالے کی بجائے پسا ہوا کوئلہ بھرا ہے۔"

"ادھر آؤ!" ماسٹر صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سلیم میز کے اُوپر سے چکّر کاٹ کر ہیڈ ماسٹر کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"اپنے ہاتھ دکھاؤ!"

سلیم نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب افسوس اور ندامت کے ساتھ اُس کے ہاتھوں پر بید کے نشان دیکھنے کے بعد بولے۔ "تم اچھے لڑکے دکھائی دیتے ہو، معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے تمہارے ہاتھ اچھے کاموں کے لیے بنائے ہیں۔ کبھی کبھی ایک اچھا کام کرتے وقت انسان کے ہاتھ زخمی بھی ہو جاتے ہیں۔ تمہیں آج کی مار کا افسوس تو نہیں؟"

سلیم خاموش رہا اور ہیڈ ماسٹر صاحب قدرے توقّف کے بعد بولے۔
”دیکھو بیٹا! اگر آج تم جرأت سے کام نہ لیتے تو شاید ارشد ہمیشہ کے لیے اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنے کا عادی ہو جاتا۔ تم نے اُسے بُزدل بننے سے بچا لیا ہے۔ مجھے اُمّید ہے کہ وہ اس سبق کو نہیں بھولے گا جو آج تم نے اسے دیا ہے۔ کسی دن تم اِس بات پر فخر کر سکو گے کہ ایک دفعہ جب تمہارے ایک ساتھی کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے، تم نے اُسے سہارا دیا تھا۔ اگر تم دوسروں کے سامنے اِسی طرح اچھی مثال پیش کرتے رہے تو کسی دن میں تم پر فخر کیا کروں گا۔ اچھا اب تم جاؤ۔“

☆☆☆☆☆

گرمیوں کے دنوں میں بعض لڑکے چھٹّی کے بعد گھروں کا رُخ کرنے کی بجائے نہر پر چلے جاتے، یہ نہر اسکول سے کوئی تین فرلانگ دور تھی۔ دونوں کناروں پر شیشم، جامن اور آم کے درخت تھے۔ لڑکے درختوں کی چھاؤں میں کبڈی کھیلتے اور جب اُس سے اُکتا جاتے تو نہر میں چھلانگیں لگا دیتے۔ ٹھنڈے پانی میں اچھی طرح ٹھٹھرنے کے بعد وہ باہر نکل کر پھر

کوئی کھیل شروع کر دیتے۔

کبھی کبھی تیرنے کا مقابلہ ہو جاتا۔ تمام لڑکے کنارے پر قطار باندھ کر ایک ساتھ پانی میں کودتے اور دوسرے کنارے کو چھُو کر واپس آنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

جب آم اور جامن پکنے کا موسم آتا، نہر کے کنارے رونق میں اضافہ ہو جاتا۔ آم بہت سستے بِکا کرتے تھے اور جامن ہر شخص مفت اُتار کر کھا سکتا تھا۔

پُل کے پاس نہر کی ایک چھوٹی سی شاخ نکلتی تھی۔ چونکہ اس کا پانی کم گہرا تھا اس لیے چھوٹی عمر کے لڑکوں کا اس جگہ ہجوم رہا کرتا تھا۔

ایک دن مجید درخت پر چڑھ کر جامن اُتار رہا تھا۔ کئی لڑکے جھولیاں تانے نیچے کھڑے تھے۔ جب وہ کسی شاخ کو جھٹکا دیتا تو لڑکے جھولیاں پھیلا کر ِگرتے ہوئے جامن دبوچنے کی کوشش کرتے۔ جو اُن کی جھولیوں سے باہر گر پڑتا اُسے وہی بیٹھ کر چُن لیتے۔

جامن کے دوسرے درختوں پر بھی چند لڑکے چڑھے ہوئے تھے اور ہر درخت کے نیچے بچّوں کی ٹولیاں موجود تھیں۔

سلیم چند لڑکوں کے ساتھ نہر میں نہا رہا تھا۔ مہندر تیرنا نہیں جانتا تھا اس لیے کبھی کبھی کنارے پر اُگی ہوئی گھاس پکڑ کر پانی میں چند ڈبکیاں لگا لیتا اور اس کے بعد کنارے پر کھڑا ہو کر دوسرے لڑکوں کی طرف دیکھنے لگتا۔

کندن لال نہر سے باہر نکل کر مہندر کے قریب کپڑے پہن رہا تھا کہ موہن سنگھ کو شرارت سوجھی۔ اُس نے پیچھے سے دبے پاؤں آ کر اُسے دھکا دے دیا۔ کندن لال نے سنبھلنے کے لیے مہندر کا سہارا لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے پانی میں آ رہے۔ کندن لال تیرنا جانتا تھا اس لیے وہ کسی حادثے کے بغیر باہر نکل آیا۔ مہندر سنگھ کو پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے اور غوطے کھاتے دیکھ کر لڑکے شور مچانے لگے۔ سلیم اس وقت کنارے سے پانچ چھ گز دور تھا اور وہ تیزی سے تیرتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ مہندر نے اسے قریب آتا دیکھ کر پانی کے ساتھ جدوجہد کا

ارادہ ترک کر دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ سلیم بر وقت اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکا اور وہ ایک لمحہ کے لیے پانی میں چھُپ گیا۔

"ڈوب گیا۔۔۔۔۔ ڈوب گیا۔۔۔۔۔۔ مہندر ڈوب گیا؟" لڑکے شور مچا رہے تھے۔ اچانک مہندر سنگھ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا پانی کی سطح پر ظاہر ہوا اور سلیم نے اُس کے سر کے بال پکڑ لیے۔ سلیم تیرنا جانتا تھا لیکن ڈوبتے کو بچانے کے لیے طاقت اور تجربے کی ضرورت تھی۔ مہندر نے بدحواسی کی حالت میں اپنے ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال دیے اور دونوں پانی میں ڈبکیاں کھانے لگے۔ چند غوطے کھانے کے بعد سلیم کا ہاتھ کنارے کی گھاس تک پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں مجید، بلونت سنگھ اور دوسرے لڑکے درختوں سے اُتر کر اُس طرف بھاگ رہے تھے۔ بلونت سنگھ نے اپنے بھائی کا نام سنتے ہی آٹھ دس فٹ اونچی ٹہنی سے چھلانگ لگا دی تھی لیکن اُن کے پہنچنے سے پہلے سلیم مہندر سنگھ کو خطرے کی زد سے باہر لا چکا تھا۔ پانی سے باہر نکل کر اپنے ہوش و حواس پر قابو پاتے ہی مہندر سنگھ نے کندن لال کی طرف دیکھا اور اسے گالیاں دینے لگا۔

مجید اور بلونت سنگھ کسی تمہید کے بغیر کندن لال پر پل پڑے۔ کچھ اور لڑکوں نے بھی اُن کی تقلید کی۔ اس پر ابتدائی حملہ اس قدر شدید تھا کہ کندن لال کو صفائی کا موقع ہی نہ ملا۔۔۔۔ اور جب لڑکوں کے ہاتھ ذرا سُست ہوئے تو اُس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔۔۔۔ سلیم نے لڑکوں کو اِدھر اُدھر دھکّے دے کر اُسے بچانے کی کوشش کی۔ وہ چلاتا رہا۔ ”ارے اسے کیوں مارتے ہو۔ دھکّا دینے والا تو موہن سنگھ تھا۔“ لیکن سلیم کی چیخ و پکار کو صرف اس وقت قابلِ توجّہ سمجھا گیا جب کُندن لال اچھی طرح پِٹ چکا تھا۔۔۔۔ پھر جب موہن سنگھ کی تلاش شروع ہوئی تو وہ غائب تھا۔

اگلے دن جب سلیم اسکول سے واپس آتے ہوئے مہندر کے گاؤں سے گزر رہا تھا تو اُس نے اپنے مکان کے قریب پہنچ کر سلیم کا بازو پکڑ لیا۔ ”چلو سلیم، ماں کہتی تھی کہ اُسے ضرور لانا۔“

سلیم نے تذبذب کی حالت میں مجید اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں مہندر، پھر کبھی سہی۔“

بلونت سنگھ نے سلیم کا دوسرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”چلو، سلیم ہمارے آم بہت بیٹھے ہیں۔ سچ کہتا ہوں میری ماں نے تمہارے لیے بہت سے آم رکھے ہوئے ہیں۔ مجید تم بھی چلو!“

مجید کچھ کہنے کو تھا کہ مہندر کی ماں دروازے میں نمودار ہوئی اور سلیم اور مجید کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ ”تم میں سے سلیم کون ہے؟“

پیشتر اس کے کہ سلیم جواب دیتا مہندر نے کہا۔ ”ماں یہ ہے سلیم۔ یہ ہمارے گھر نہیں آتا تھا۔“

مہندر کی ماں نے آگے بڑھ کر پیار سے دونوں ہاتھ سلیم کے سر پر رکھ دیئے اور کہا۔ ”بیٹا جیتے رہو۔ میں آج تمہارے گھر بھی گئی تھی۔ چلو تھوڑی دیر میرے گھر بیٹھو، پھر چلے جانا اور یہ؟“ اُس نے مجید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بھائی ہے نا، بیٹا تم بھی چلو۔۔۔ تم سب چلو!“

تھوڑی دیر بعد سلیم اور اس کے گاؤں کے باقی لڑکے مہندر کے مکان کے صحن میں جامن کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بے تکلّفی سے آم کھا رہے تھے۔ مہندر سنگھ کی بہن جو اُس سے دو سال چھوٹی تھی، چند قدم دور کھڑی اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دو تین آم کھانے کے بعد جب سلیم ٹوکری سے ہٹ کر دور بیٹھ گیا تو مہندر کی ماں نے آگے بڑھ کر ٹوکری سے ایک آم نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ کھاؤ بیٹا بہت میٹھا ہے، لو!“

سلیم نے اُس کے ہاتھ سے آم لے لیا۔ کم سن لڑکی نے آگے بڑھ کر ٹوکری سے ایک اور آم نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی بہت میٹھا ہے، لو!“

ساتھیوں کی ہنسی نے سلیم کو قدرے پریشان کر دیا۔ لڑکی نے تامّل کے بعد پھر کہا۔ ”لو نا! سچ کہتی ہوں، بہت میٹھا ہے۔“

لڑکی کی ماں نے کہا۔ ”لے لو بیٹا! یہ تمہاری بہن ہے۔“

سلیم نے لڑکی کے ہاتھ سے آم لے لیا اور وہ خوش ہو کر بولی۔ ”تمہارا نام

سلیم ہے نا!“

”ہاں!“ سلیم نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میرا نام بسنت ہے!“

سلیم خاموش رہا۔ لڑکی کچھ سوچ کر بولی۔ ”تم نے مہندر کو نہر سے نکالا تھا؟“

سلیم کی خاموشی پر مہندر نے جواب دیا۔ ”ہاں بسنتی! اس نے مجھے نکالا تھا۔ اسے میٹھے میٹھے آم دو نا!“

لڑکی نے جھٹ دو آم نکال کر سلیم کو پیش کر دیے ”بس میں بہت کھا چکا ہوں۔“ سلیم نے عذر پیش کیا۔

سلیم کے انکار پر بسنتی نے مایوس ہو کر آم پھر ٹوکری میں رکھ دیئے اور کچھ سوچنے کے بعد بھاگتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی۔ ”لو یہ لے لو۔“ اس نے گڑیا سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ لڑکے کھکھلا کر ہنس پڑے لیکن لڑکی اُن کی ہنسی سے لاپرواہو کر گڑیا دینے پر اصرار کر رہی تھی۔ اس کی ماں نے کہا۔ ”پگلی!

بھائیوں کو گڑیا نہیں دیا کرتے۔"

☆☆☆☆☆

جولائی کا مہینہ تھا۔ اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ ایک دن سلیم گاؤں کے باہر آم کے باغ میں چارپائی پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک کتاب اُس کے سرہانے پڑی ہوئی تھی، مجید بھاگتا ہوا آیا اور سلیم کے بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "ارے اٹھو!"

سلیم نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ جھٹک کر پھر آنکھیں بند کر "ارے پوستی۔ اُٹھتے ہو یا نہیں؟"

"مجید کے بچّے، مجھے تنگ نہ کرو!" سلیم کروٹ بدلتے ہوئے بڑبڑایا۔

"ارے اٹھتے ہو یا نہیں؟"

سلیم نے جواب دینے کی بجائے تکیے میں منہ چھپایا۔

مجید نے چارپائی کو ایک طرف سے اُٹھاتے ہوئے "ایک۔۔۔۔

دو۔۔۔ تین۔۔۔!" کہا اور سلیم لڑھکتا ہوا زمین پر آ رہا۔ وہ غضبناک ہو کر اُٹھا اور آس پاس کوئی اور کار آمد چیز نہ پا کر دونوں ہاتھوں میں آموں کی سوکھی ہوئی گٹھلیاں لے کر مجید کے پیچھے بھاگا۔ مجید کبھی ایک اور کبھی دوسرے درخت کی آڑ لے کر اپنے آپ کو بچا رہا تھا لیکن جب سلیم نے ایک درخت کے نیچے سے دو کچے آم اٹھا لیے تو وہ چلّایا۔ "ارے ٹھہرو! اُدھر دیکھو!!"

"اُدھر میں بعد میں دیکھوں گا۔" سلیم نے یہ کہتے ہوئے ایک آم اس کی طرف دے مارا۔ مجید نے درخت کی آڑ میں چھُپ کر اپنے آپ کو بچایا۔

"ارے، میں تمہارے دوست کو لے کر آیا ہوں۔" مجید نے پھر درخت کی اوٹ سے سر نکالتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"ارے تمہارے پیچھے ارشد کھڑا ہے۔ اُدھر دیکھو۔"

ارشد کا نام سُن کر سلیم نے جلدی سے پیچھے دیکھا اور اس کا غصّہ پریشانی اور مسرّت کے ملے جُلے جذبات میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ وہ آم اور گٹھلیاں

زمین پر پھینک کر اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا۔

"بھئی خوب سوتے ہو۔" ارشد نے آگے بڑھ کر مُسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرا خیال تھا کہ مجید بلا وجہ تنگ کر رہا ہے۔ اگر تم جگاتے تو میں شاید تمہاری آواز سن کر ہی اُٹھ بیٹھتا۔" یہ کہہ کر سلیم نے مالی کو آواز دی۔ "دیکھو مالی سیندوری اور گولے آم جھاڑ کر پانی میں ڈالو لیکن ٹھہرو پہلے ان کے لیے کھانا لے آؤ!"

ارشد نے کہا۔ "بھائی کھانا تو میں گھر سے کھا کر چلا تھا۔"

"اچھا پانی تو پیئو گے نا؟"

"پانی مجید نے پلا دیا ہے۔"

سلیم مالی کی طرف متوجّہ ہوا۔ "اچھا بھئی آم اتار دو!"

مالی نے جواب دیا۔ "جی گولے اور سیندوری آم تو میں نے صبح اُتار کر گھر بھیج دیے تھے، اب کسی اور درخت سے اُتار دیتا ہوں!"

"نہیں! ہم دوسرے باغ میں چلتے ہیں!"

مجید نے کہا۔ "سلیم! اگر ارشد کو بہت ہی اچھے آم کھلانا چاہتے ہو تو چلو سادھو کے باغ میں چلتے ہیں۔ اس کے آم ہمارے سیندوری اور گولے سے بھی اچھے ہیں۔"

مالی نے کہا۔ "ہاں جی! ویسے آم سارے علاقے میں کسی باغ سے نہیں۔"

سلیم نے کہا۔ "لیکن وہ دور ہے؟"

"ہم پیدل نہیں جائیں گے۔ گھوڑوں پر آدھ گھنٹے کا راستہ ہے۔"

سلیم نے پوچھا۔ "کیوں ارشد، گھوڑے پر سواری کرو گے؟"

"بھئی سچ پوچھو تو مجھے آموں سے زیادہ گھوڑے کی سواری کا شوق ہے۔ لیکن تمہارے ولایت شاہ والے گھوڑے سے ڈرتا ہوں!"

سلیم نے کہا۔ "اب میرا گھوڑا شرارت نہیں کرتا، پھر بھی تمہارے لیے مجید کی گھوڑی ٹھیک رہے گی۔ مجید تم چچا افضل کی گھوڑی لے لو!"

مجید بولا۔ ”بھئی چچا افضل سے تم کہو!“

”چلو!“

کڑاکے کی دھوپ اور اُس کے ساتھ غضب کی گھمس تھی۔ ارشد کے ساتھ گھر کا رُخ کرتے ہوئے سلیم اور مجید دونوں ہی محسوس کر رہے تھے کہ ایسی گرمی میں شاید افضل گھوڑی پر سواری کی اجازت نہ دے۔

چچا افضل حویلی کے دروازے کے سامنے بڑ کے درخت کے نیچے کھاٹ پر لیٹا ہیر پڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب دوسری چارپائی پر شیر سنگھ لیٹا ہوا تھا۔ چبوترے کے دوسری طرف اسماعیل کے گھر آٹھ دس آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر گفتگو کے لیے موزوں الفاظ سوچنے کے بعد سلیم افضل کے قریب جا کھڑا ہوا۔ افضل کسی لفظ پر رُکا اور سلیم نے جھک کر کتاب پر نگاہ ڈالتے ہوئے اُس کی اصلاح کر دی اور پھر اپنی کہانیوں کی کتاب شیر سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا: ”لو چچا تم بھی ہیر پڑھو!“

شیر سنگھ نے بے تکلّفی سے کتاب کھولی اور افضل کی طرف دیکھ کر

مُسکرانے لگا۔

سلیم نے کہا۔ ”چچا عینک لگالو نا!“

”نہیں بھئی گرمی ہے، مجھے ایسے ہی پڑھنے دو۔ پرسوں عینک سے آنکھیں دُکھنے لگی تھیں۔ تم نے خواہ مخواہ میرے دو روپے خرچ کرادیے؟“

”اچھا چچا پڑھو نا!“

اس نے پڑھنا شروع کیا۔ ”ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں۔۔۔“ اور ارشد جو ابھی تک چبوترے سے نیچے مجید کے قریب کھڑا تھا، اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلیم نے کہا۔ ”چچا یہ تو اُردُو کی کہانیوں کی کتاب ہے؟“

”کوئی بات نہیں؟“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

سلیم نے افضل کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”چچا جی! ذرا آپ کی گھوڑی باہر لے جاؤں؟“

”اس گرمی میں خبر دار اُسے ہاتھ لگایا تو۔ اپنے گھوڑے کو دن میں دو بار نہلاتے ہو اور میری گھوڑی میں جیسے جان ہی نہیں!“

”چچا! شہر سے میرا دوست آیا ہے۔ باغ میں اچھے آم مالی نے جھاڑ لیے ہیں اور ہم سادھو کے باغ میں جانا چاہتے ہیں۔“

دوست کے لفظ کا مفہوم افضل سے زیادہ کون سمجھتا تھا۔ اس کے لہجے میں اچانک ملامت آ گئی۔ ”کہاں ہے تمہارا دوست؟“ اس نے سوال کیا۔

”وہ کھڑا ہے۔“ سلیم نے ارشد کی طرف اشارہ کیا۔

”ارے پڑھے لکھے لوگ دوستوں کی آؤ بھگت اسی طرح کیا کرتے ہیں؟“

ارشد چبوترے پر چڑھ کر جھجکتا ہوا آگے بڑھا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا!“

ارشد شرماتے ہوئے افضل کے قریب بیٹھ گیا۔

”جاؤ سلیم شربت لاؤ!“

"جی میں نے پانی پی لیا ہے۔"

"بھئی آج کل پیاس جلدی لگ جاتی ہے۔ جاؤ سلیم!"

سلیم بھاگتا ہوا شربت لے آیا اور ارشد کو ایک گلاس پینا پڑا۔

افضل نے کہا۔ "کیوں برخوردار گھوڑے کی سواری آتی ہے تمہیں؟"

ارشد نے جواب دیا۔ "جی بہت معمولی کبھی کبھی کسی گاؤں کے مریض ابّا جی کے لیے گھوڑا بھیج دیتے ہیں تو میں سواری کر لیتا ہوں لیکن گھوڑا اگر شریر ہو تو میں اُس کے پاس نہیں جاتا۔ ابھی تک مجھے اچھی طرح سواری نہیں آتی۔"

"سلیم تمہیں سکھا دے گا لیکن پہلے دن ہماری چھوٹی گھوڑی پر سواری کرنا۔ تم ڈاکٹر شوکت کے لڑکے ہو نا؟"

"جی۔"

"وہ تو ہمارے بڑے مہربان اور بھائی جان کے دوست ہیں۔ سلیم! اپنے

دوست کے لیے گھوڑے کی زین اچھی طرح کسی دینا۔"

"بہت اچھا چچا جان!" سلیم اور مجید تھوڑی دیر میں گھوڑوں پر زینیں ڈال کر آئے۔

جب وہ سوار ہو رہے تھے تو افضل نے کہا۔ "دیکھو بھئی گھوڑوں کو تیز نہ بھگانا۔ تمہارا ساتھی انجان ہے اور آج گرمی بھی بہت زیادہ ہے۔ شام تک شاید آندھی یا بارش آئے، اس لیے جلدی آ جانا!"

"بہت اچھا چچا جان! ہم جلدی آئیں گئے۔"

باغ میں پہنچ کر سلیم، مجید اور ارشد نے گھوڑوں کی زینیں اُتار کر انہیں درختوں کے ساتھ باندھ دیا۔ مالی سے آم لے کر پانی کی بالٹی میں ڈال دیے اور خود نہر میں نہانے لگے۔ نہانے کے بعد انہوں نے نہر کے کنارے بیٹھ کر آم کھائے اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

مجید کو کئی دنوں کے بعد افضل کی گھوڑی پر سواری کا موقع ملا تھا۔ اس نے چپکے سے اُٹھ کر گھوڑی پر زین ڈالی اور اس پر سوار ہو گیا۔

"کہاں جارہے ہو؟" سلیم نے سوال کیا۔

"ذرا چکّر لگاتا ہوں آؤ تم بھی!"

سلیم نے جواب دیا۔ "نہیں بھئی میں گھوڑے کو نہیں بھگاؤں گا۔" لیکن جب مجید نے قریب ہی ایک کھیت میں گھوڑی کو بھگاتے ہوئے دو تین بار پانی کی کھائی کے اُوپر سے چھلانگ لگا کر ارشد سے داد حاصل کی تو سلیم اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا۔ اُس نے جھٹ سے اپنے گھوڑے کو لگام لگا دی اور زین کے بغیر اُس پر سوار ہو گیا۔

ارشد کے لیے دو سواروں کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ وہ حیرت زدہ ہو کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ باغ کے مالی نے اس کے قریب آکر کہا۔ "بھئی! تم بھی چڑھ جاؤ اپنی گھوڑی پر۔۔۔۔!"

ارشد نے بظاہر باغبان کی طرف توجّہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تاہم اس کے لیے تماشائی کی حیثیت میں کھڑا رہنا صبر آزما تھا۔ تھوڑی دیر بعد سلیم نے اُس کے قریب آکر کہا۔ "ارشد آؤ تم بھی! یہ گھوڑی سرکش

نہیں ہے۔ آج تم اِس کو بھگا کر دیکھو، آئندہ میں تمہیں اپنا گھوڑا دیا کروں گا۔“

ارشد نے جواب دیا۔ ”میں تمہاری طرح ننگی پیٹھ پر سواری نہیں کر سکوں گا۔“

”اچھا تو میں تمہیں زین ڈال دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے سلیم اپنے گھوڑے سے کُود پڑا اور اُس کی باگ ارشد کے ہاتھ میں دے کر گھوڑی پر زین ڈال دی۔

تھوڑی دیر میں یہ تینوں باغ سے کچھ فاصلے پر ایک کھلے میدان میں گھوڑے بھگا رہے تھے۔ ارشد کچھ دیر گھوڑی کو سرپیٹ دوڑانے سے گھبراتا رہا لیکن جلد ہی اُس کی جھجک دور ہو گئی۔ تاہم جب کوئی کھائی سامنے آتی تو اپنے ساتھیوں کی تقلید کرنے کی بجائے گھوڑی کو روک لیتا۔ ایک مرتبہ اُس کی گھوڑی اُس کی کوشش کے باوجود ایک چھوٹی سی کھائی پر سے کود گئی۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔

”سلیم! بھئی یہ گھوڑی تو بہت اچھی ہے۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”دیکھا! تم تو یونہی گھبراتے تھے۔“

شام کے قریب اگرچہ دھوپ کی تیزی کم ہو چکی تھی لیکن حبس پہلے سے بھی زیادہ تھا اور اُس کے ساتھ ہی مغرب کے افق پر آندھی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ سلیم نے گھوڑا روک کر کہا۔ ”مجید! اُدھر دیکھو، آج آندھی آئے گی۔ چلو اب گھر چلیں!“

مجید نے اُس کے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ ”ذرا گھوڑوں کا پسینہ سوکھ جائے تو چلتے ہیں ورنہ چچا افضل خفا ہو گا۔“

ارشد نے کہا۔ ”بھئی مجھے دیر ہو جائے گی، چلو!“

سلیم نے کہا۔ ”تم آج ہمارے پاس رہو نا؟“

”نہیں بھئی! میں گھر میں بتا کر نہیں آیا۔ ابّا جان خفا ہوں گے۔“

مجید نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو، سلیم تمہیں اپنے گھوڑے پر بٹھا کر چھوڑ آئے

گا۔"

سلیم نے اس بات کی تائید کی۔ "ہاں ارشد یہ گھوڑی ہم گاؤں میں چھوڑ دیں گے اور پھر میں تمہیں اپنے ساتھ بٹھا کر چھوڑ آؤں گا۔"

ارشد اس بات سے مطمئن ہو گیا۔ تھوڑی دیر نہر کے کنارے گھوڑوں کو تازہ دم ہونے کا موقع دینے کے بعد سلیم اور ارشد یک زبان ہو کر مجید کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اب تمہاری گھوڑی کا پسینہ سوکھ چکا ہے، اس لیے دیر نہ کرو اور مجید ہر بار انہیں یہ کہ کر ٹال رہا تھا کہ ابھی شام ہونے میں کافی دیر ہے۔ اتنی جلدی کیوں کرتے ہو۔۔۔ چونکہ مغرب کی طرف گھنے درختوں کی اوٹ تھی، اس لیے وہ افق پر اکٹھے ہونے والے گرد و غبار کی رفتار کا اندازہ نہ لگا سکے لیکن اچانک سورج چھُپ گیا اور باغبان نے آواز دے کر کہا:

"بھئی آندھی آگئی! تم اب جلدی گھر پہنچو!"

سلیم نے کہا۔ "چلو ارشد، ہم چلتے ہیں!"

سلیم اور ارشد جلدی سے سوار ہو گئے۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ مجید بھی سر پھٹ گھوڑی دوڑاتا ہوا اُن کے ساتھ آ ملا۔ کچی سڑک پر تقریباً ایک میل تینوں ایک ساتھ گھوڑے بھگاتے رہے۔ اس کے بعد جب وہ کھیتوں میں سے گزرنے والی پگڈنڈی پر اُترے تو سلیم نے اپنا گھوڑا آگے کرتے ہوئے ارشد سے کہا۔ ”تم میرے پیچھے رہو اور مجید تم اس کے پیچھے رہو۔“

پگڈنڈی پر وہ معمولی رفتار سے چلتے رہے۔ راستے میں جب کوئی کھائی آتی، سلیم ارشد کو خبردار کر دیتا۔ آندھی کے باعث فضا پر تاریکی مسلط ہو رہی تھی۔ مغرب کی سمت کے تمام گاؤں، درخت اور کھیت گرد و غبار کے بادلوں میں روپوش ہو رہے تھے۔

”ارشد ذرا سنبھل کر بیٹھو!“ سلیم نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور گھوڑے کی رفتار ذرا تیز کر دی۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ انہیں آندھی نے گھیرا۔ ابتدائی جھونکے زیادہ شدید نہ تھے لیکن گرد و غبار کی تاریکی میں اُن کے لیے راستہ دیکھنا مشکل ہو گیا۔ ارشد چلّا رہا تھا۔ ”بھائی

مجھے کچھ نظر نہیں آتا!"

مجید پیچھے سے اُسے تسلّی دے رہا تھا۔ "تم اطمینان سے گھوڑی پر بیٹھے رہو، یہ تمھیں سیدھی گھر لے جائے گی۔"

اچانک ہوا اس قدر تیز ہو گئی کہ ارشد اُڑتے ہوئے تنکوں سے بچنے کے لیے بار بار اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

تھوڑی دیر بعد بادل کی گرج سنائی دی اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ سلیم نے ایک بڑ کے درخت کے نیچے گھوڑا روک لیا اور اُس کے پیچھے آنے والی گھوڑیاں خود بخود رُک گئیں۔

"رُک کیوں گئے؟" مجید نے کہا۔

سلیم نے کہا۔ 'ذرا گرد بیٹھ جائے تو چلتے ہیں۔"

ارشد نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے ملتجی آواز میں کہا۔ "ہاں بھئی ذرا ٹھہر جاؤ! میری آنکھیں مٹّی سے بھر گئی ہیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا!"

بادل کی گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گرد تھوڑی دیر میں بیٹھ گئی لیکن ہوا اور بارش کی تیزی ہر لحظہ تیز ہوتی گئی۔

مجید نے کہا۔ ”بھئی اب رات ہو رہی ہے۔ یہاں بھیگنے سے کیا فائدہ چلو!“

ارشد کچھ کہنے کو تھا کہ اچانک پاس ہی آم کے ایک بلند درخت کا تنا ٹوٹ کر بڑ کے درخت کے اُوپر گِرا اور اس کی کئی ٹہنیاں اپنے ساتھ سمٹتا ہوا زمین پر آ رہا۔ گھوڑے ایک خوفناک آہٹ سے بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ سلیم اور مجید نے فوراً اپنے اپنے جانوروں پر قابو پایا لیکن ارشد کی گھوڑی چند قدم دور نکل گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنی بدحواسی پر قابو پا کر باگ کھینچتا، ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ سے اُس کا سر ٹکرا گیا۔

جب سلیم اور مجید اس کی مدد کو پہنچے وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ دونوں بیک وقت گھوڑوں سے کُود پڑے اور ارشد! ارشد!! کہتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئے۔ سلیم نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ بجلی کی چمک میں اُس نے دیکھا کہ ارشد کے ماتھے سے خون کا فوّارہ چھوٹ رہا ہے۔ اس کے خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ ایک ثانیہ کے بعد وہ پکارا ”ارشد!

ارشد!!" اور اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس نے انتہائی بے کسی کی حالت میں مجید کی طرف دیکھا۔ مجید نے جلدی سے اپنی پگڑی اُتاری اور کس کر اُس کے سر پر لپیٹ دی۔

"مجید!" سلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب۔۔۔۔۔!" اس بیان میں کئی سوالات اور کئی انتہاؤں کے ساتھ سلیم اپنے ان احساسات کی ترجمانی بھی کر چکا تھا کہ تم بڑے ہو، تم سب کچھ سمجھتے ہو۔ تم ہمّت بھی کر سکتے ہو، بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ بتاؤ اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟

اور مجید نے اس کے جواب میں جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تم میری گھوڑی کی باگ پکڑو، میں اسے اپنے ساتھ لاد کر گھر لے جاتا ہوں، تم یہاں سے سیدھے شہر جا کر ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ چھوٹی گھوڑی کو جانے دو، وہ خود بخود گھر پہنچ جائے گی۔"

سلیم نے اچانک محسوس کیا کہ اُس میں غیر معمولی قوّت آ چکی ہے۔ وہ جلدی سے مجید کی گھوڑی کو باگ سے پکڑ کر لے آیا۔ مجید نے ارشد کو اُٹھا کر گھوڑی پر ڈال دیا اور پھر سلیم کا سہارا لے کر اُس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ایسے

طوفان میں ایک بے ہوش ساتھی کو آگے بڑھا کر لے جانا آسان بات نہ تھی لیکن مجید کی جسمانی قوّت کام آئی۔ اس نے ارشد کے پیچھے بیٹھ کر ایک ہاتھ سے اسے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا، دوسرے ہاتھ میں باگ تھام لی اور کہا۔ ''سلیم! تم اگر وقت پر ڈاکٹر صاحب کو لے آئے تو تمہارے دوست کی جان بچ جائے گی۔''

سلیم نے بھاگ کر اپنے گھوڑے پر چھلانگ لگا دی لیکن چند قدم دور جا کر وہ مجید کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔ ''دیکھو مجید! یہ زخمی ہے، اسے احتیاط سے گھر پہنچانا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر ابھی آتا ہوں!''

مجید نے جواب دیا۔ ''ارشد میرا بھی دوست ہے۔ سلیم تم فکر نہ کرو، جلدی جاؤ!'' سلیم نے کسی توقّف کے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

گھوڑا آندھی اور بارش کے سامنے اپنی گردن جھکائے پوری قوّت کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔۔۔ تاریکی ہر لحظہ بڑھ رہی تھی۔ سلیم کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا رُخ شہر کی طرف تھا۔ وہ پگڈنڈی اور راستے سے بے نیاز ہو کر دھان اور مکئی کے کھیتوں کو عبور کر رہا تھا۔ جب گنّے کے کھیت

قریب آئے تو وہ کسی کھائی میں گھوڑا ڈال دیتا۔ قریباً ڈیڑھ میل اسی طرح طے کرنے کے بعد ہمیشہ کی طرف جانے والی کچی سڑک تک پہنچ گیا۔

☆☆☆☆☆

سلیم اپنی زندگی میں شاید پہلی بار انتہائی سنجیدگی، خلوص اور درد کے ساتھ ارض و سما کے اس مالک و مختار کے حضور میں التجائیں کر رہا تھا جو زندگی اور موت پر قادر ہے۔ ہر سانس کے ساتھ اس کے دل سے بد دعائیں نکل رہی تھیں۔ ”یا اللہ! ارشد کی جان بچا میرے مولیٰ اس پر رحم کر۔ یہ میری غلطی تھی، اسے اس کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔“ سلیم کو یقین تھا کہ خدا اپنے نیک بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے اس لیے وہ کہہ رہا تھا۔ ”یا اللہ! میں تیرا نیک بندہ بنوں گا۔ میں آئندہ نماز اور روزہ قضا نہیں کروں گا۔ میں ارشد کو بھی تیرا نیک بندہ بنانے پر مجبور کروں گا۔ یا اللہ! اس کے ماں باپ اُسے پیار کرتے ہیں اس کا چھوٹا بھائی اس کی ننھی بہنیں ہیں۔ اگر وہ۔۔۔؟“ سلیم کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ اسے بارش، آندھی، کیچڑ اور پانی کا احساس تک نہ تھا۔ گھوڑا گئی بار گرتے گرتے بچا لیکن سلیم

نے رفتار کم نہ کی۔

ارشد کے مکان کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اُترا۔ صحن کا پھاٹک اندر سے بند تھا۔ سلیم نے "ڈاکٹر جی !ڈاکٹر جی !!" کہہ کر چند آوازیں دیں لیکن اس نے محسوس کیا کہ بارش اور آندھی کے شور میں اُس کی آواز زیادہ دور نہیں جا سکتی۔ چند بار پھاٹک کو دھکا دینے کے بعد اُسے خیال آیا کہ وہ پھاٹک کی سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر اندر کی کنڈی کھول سکتا ہے۔ چنانچہ معمولی کوشش کے بعد اُس نے کُنڈی کھول لی اور اُس کے بعد پھاٹک ہوا کے زور سے خود بخود کھل گیا۔ سلیم گھوڑے کی باگ پکڑے صحن میں داخل ہوا۔ کمروں کے اندر بجلی کے لیمپ روشن تھے اور دریچوں اور دروازے کے شیشوں سے روشنی برآمدے میں آرہی تھی۔

"ڈاکٹر جی !ڈاکٹر جی !!" سلیم نے آوازیں دی۔

کمرے کا دروازہ کھُلا اور کسی نے باہر نکل کر برآمدے کی بتّی کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ "کون ہے ؟"

یہ ارشد کا نوکر تھا سلیم کو اس نے ارشد کے ساتھ کئی بار دیکھا لیکن آج ایک تو وہ بُری طرح کیچڑ میں لت پت تھا، دوسرے اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ سلیم نے کہا۔ ”ڈاکٹر جی کو بلاؤ!“

نوکر نے جواب دیا۔ ”ڈاکٹر جی یہاں نہیں؟“

”کہاں ہیں؟“ سلیم نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔

”وہ یہاں سے تین کوس دور ایک گاؤں میں مریض کو دیکھنے گئے ہیں۔“

”تو میں وہاں جاتا ہوں! گاؤں کا نام کیا ہے؟“

”گاؤں کا نام۔۔۔ بھی مجھے یاد نہیں آتا۔ ارشد کو یاد تھا لیکن وہ بھی کہیں غائب ہے۔ شاید وہ کہیں باہر سے ہی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چلا گیا ہے۔ گھر کے لوگ بہت پریشان ہیں!“

سلیم نے ارشد کا تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”گھر سے پتہ کرو انہیں معلوم ہو گا۔“

”بھئی اوّل تو گھر والوں کو معلوم نہیں ہو گا اور اگر انہیں معلوم ہو بھی تو تم ایسے طوفان میں وہاں کیسے پہنچو گے اور پھر ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ آندھی اور بارش میں کیسے چل پڑیں گے۔ تم اندر آ جاؤ۔ گھوڑے کو ستون کے ساتھ باندھ دو، شاید تھوڑی دیر میں مجھے وہ نام یاد آ جائے۔ بھلا سا نام ہے اُس گاؤں کا۔ وہاں چودھری رحیم بخش رہتا ہے۔ وہ اسی کے علاج کے لیے گئے ہیں۔“

”ننگل والا چودھری رحیم بخش؟“

”ارے ہاں بھئی ننگل۔ بڑا ننگل!“

”میں جاتا ہوں!“ سلیم نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔
”بھئی! میں نے تمہیں ارشد کے ساتھ کئی بار دیکھا ہے۔ دیکھو اگر تم ننگل جاؤ تو ڈاکٹر صاحب سے کہنا کہ اگر ارشد اُن کے ساتھ ہے تو وہ گھر میں کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دیں۔ گھر والے بہت پریشان ہیں!“

ارشد کی ماں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”کون ہے غلام علی!“

"جی ایک لڑکا ہے۔ ڈاکٹر جی کو بُلانے آیا تھا۔ اب اُن کے پیچھے جا رہا ہے۔ میں نے اُسے ارشد سے متعلق کہہ دیا ہے۔ اگر وہ وہاں ہوا تو ڈاکٹر صاحب ہمیں خبر کر دیں گے!"

ارشد کی ماں نے کہا۔ "ہاں بیٹا! یہ کام ضرور کرنا!"

"جی بہت اچھا!"

ارشد کی ماں نے ذرا آگے بڑھ کر بجلی کی روشنی میں غور سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! تمہیں ایسے طوفان میں ڈر نہیں لگا۔ گھر میں کوئی بڑا آدمی نہیں تھا؟"

سلیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ ارشد کی ماں نے کہا۔ "تمہارا کون بیمار ہے؟"

سلیم نے متذبذب ہو کر جواب دیا۔ "جی میرے بھائی کو گھوڑے سے گِر کر چوٹ آئی ہے؟"

"اچھا بیٹا جاؤ! خدا اسے تندرستی دے۔"

سلیم نے کہا۔ ”جی ارشد کے متعلّق آپ فکر نہ کریں۔ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نہ ہوا تو پاس ہی ایک اور گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں ہو گا۔ میں صبح ہونے سے پہلے آپ کو اس کے متعلّق اطلاع دوں گا!“

”تم ارشد کو جانتے ہو؟“

”جی وہ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔“ سلیم نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ کھیت، پگڈنڈیاں اور دیہاتی راستے پانی میں چھُپے ہوئے تھے۔ ہوا کی تیزی کسی حد تک کم ہو چکی تھی لیکن بارش اسی طرح تھی۔ سلیم کو راستہ تلاش کرنے میں زیادہ دقّت محسوس نہ ہوئی۔ اس علاقے کا کوئی درخت ایسا نہ تھا جس کی تصویر اس کے ذہن پر نقش نہ تھی۔ اس آٹھ دس میل کے رقبے میں وہ اپنے گھوڑے پر کئی بار چکّر لگا چکا تھا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو موسلا دھار بارش معمولی بوندا باندی میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ تاہم گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں۔ اس نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک کتاب بھونکنے لگا۔ آس پاس کے مکانوں میں پناہ لینے والے کتّوں نے اپنی اپنی جگہ سے اُس کی

ہاں میں ہاں ملائی۔ ادھیڑ عُمر کا ایک آدمی دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

سلیم نے اس کے سوال کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ’’چودھری رحیم بخش کا مکان کہاں ہے۔‘‘

’’اسی گلی کے موڑ پر پکّی ڈیوڑھی والا اسی کا مکان ہے!‘‘

’’بھئی ذرا میرے ساتھ چلو شہر سے ڈاکٹر صاحب ان کے گھر آئے ہوئے ہیں۔ میں اُن کی تلاش میں آیا ہوں!‘‘

’’چلو!‘‘ دیہاتی یہ کہہ کر سلیم کے آگے چل دیا۔ ڈیوڑھی کے سامنے پہنچ کر اُس نے کہا۔ ’’یہ ہے اُن کا مکان!‘‘ ڈیوڑھی میں ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔ دیہاتی نے اُس سے کہا۔ ’’بھئی فضل دین! ڈاکٹر صاحب یہیں ہیں نا؟‘‘

’’ڈاکٹر صاحب بیٹھک میں ہیں اور یہ گھوڑے پر کون ہے؟ آؤ بھئی! گھوڑا اندر لے آؤ! بارش میں کیوں کھڑے ہو!‘‘

سلیم نے کہا۔ ’’نہیں مجھے جلدی ہے۔ تم ذرا ڈاکٹر صاحب کو بلا دو!‘‘

"تم انہیں لینے آئے ہو؟"

"ہاں! ان کے لڑکے کو چوٹ آگئی ہے۔ تم جلدی سے بلاؤ انہیں!"

نوکر بھاگ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں لیمپ تھا اور اس کے پیچھے ڈاکٹر شوکت چلے آرہے تھے!

"کون ہے؟" ڈاکٹر نے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

سلیم نے کہا۔ "ڈاکٹر جی آپ جلدی سے میرے ساتھ چلیں، ارشد زخمی ہے!"

"ارشد زخمی ہے۔ لیکن تم کون ہو؟"

"جی میں سلیم ہوں! ارشد آج ہمارے گاؤں آیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا کہ اُس کا سر درخت سے ٹکرا گیا۔ میں شہر سے ہو کر آیا ہوں!"

"اب کہاں ہے ارشد؟"

”جی وہ ہمارے گھر میں ہے۔ آپ جلدی کیجیے۔“

ڈاکٹر نے نوکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”بھئی تم جلدی سے میرے لیے چودھری صاحب کا گھوڑا تیار کر دو!“

سلیم نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! گھوڑا تیّار کرنے میں دیر ہو جائے گی، آپ میرے پیچھے بیٹھ جائیں، ہم ایک پل میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ ارشد بے ہوش ہے۔“

ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا۔ ”ٹھہرو میں اپنا تھیلا لے آؤں!“

ڈاکٹر صاحب نوکر کے ہاتھ سے لیمپ چھین کر اندر بھاگے اور آن کی آن میں اپنا تھیلا اُٹھا لائے۔

”لایئے تھیلا مجھے دیجیے۔“ سلیم نے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ کہے بغیر تھیلا اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ سلیم نے گھوڑے کو ڈیوڑھی کی سیڑھی کے قریب لا کر کھڑا کر دیا اور ایک رکاب سے اپنا پاؤں نکالتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس رکاب میں پاؤں رکھ کر

میرے پیچھے بیٹھ جائیں!"

نوکر نے کہا۔ "بھئی تم ڈاکٹر صاحب کو آگے بیٹھنے دو اور خود پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

سلیم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب اس وقت رستہ نہیں پہچان سکیں گے۔"

ڈاکٹر سلیم کے پیچھے سوار ہو گیا اور سلیم نے گھوڑے کو موڑ کر ایڑ لگا دی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "بھئی! ذرا سنبھل کر چلو!"

"جی آپ فکر نہ کریں۔"

گاؤں سے نکلتے ہی ڈاکٹر صاحب کے مختلف سوالات کے جواب میں سلیم نے مختصراً ساری سرگزشت بیان کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا۔ "کیا تم ہمارے گھر میں یہ بتا آئے ہو کہ ارشد زخمی ہے؟"

"جی نہیں، اُن کا خیال تھا کہ ارشد آپ کے ساتھ ہے۔ اس لیے میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔"

"تم نے بہت اچھا کیا!"

بارش تھم چکی تھی اور بادلوں کی پھٹی ہوئی روا سے کہیں کہیں تارے جھانک رہے تھے۔ مینڈکوں اور جھینگروں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ تھکا ہوا گھوڑا گردن جھکا کر اپنی بے بسی کا اظہار کر رہا تھا۔ تاہم جب بھی سلیم سے ایڑ لگاتا، اس کی رفتار تیز ہو جاتی۔ گاؤں تک پہنچتے پہنچتے ڈاکٹر صاحب سلیم کی طرح کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔

افضل گھر کے چند اور آدمیوں کے ساتھ دروازے سے باہر کھڑا تھا۔ اس نے گھوڑے کی آہٹ سنتے ہی دُور سے آواز دی۔ "سلیم! ڈاکٹر صاحب کو لے آئے؟"

"لے آیا ہوں چچا!" اس نے بُلند آواز میں کہا۔

"بہت دیر لگائی تم نے؟"

"چچا یہ ننگل گئے ہوئے تھے۔ ارشد اب کیسا ہے؟"

"خدا کا شکر ہے کہ اُسے ہوش آ گیا ہے۔"

یہ ان سینکڑوں التجاؤں کا جواب تھا جو سلیم نے سارے راستے خدا سے کی تھیں۔ افضل نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تو ارشد بستر پر لیٹا ہوا تھا اور سلیم کی ماں اُس کا سر اپنی گود میں لے کر اسے پنکھے سے ہوا دے رہی تھی۔ گھر کی لڑکیاں اور عورتیں اس کے گرد جمع تھیں۔

افضل کے اشارے سے تمام عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ارشد نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور نادم سا ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے اُس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔ ”شہسوار بننا آسان نہیں بیٹا!“

جب ڈاکٹر صاحب ارشد کے سر پر پٹّی باندھ رہے تھے، سلیم نہانے کے بعد کپڑے بدل کر مسجد کا رُخ کر رہا تھا۔ نماز کے بعد جب وہ ارشد کے کمرے میں داخل ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف محبّت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! کہاں گئے تھے تم؟“

”جی میں نماز پڑھنے گیا تھا۔“

ڈاکٹر صاحب نے سلیم کے دادا کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”چودھری جی! آپ کا پوتا بہت بہادر ہے۔ جب اس نے کہا کہ میں شہر سے ہو کر آیا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا تھا۔“

”یہ افضل کا شاگرد ہے۔ گھوڑے کے سوا اسے کسی چیز سے اُنس نہیں۔ خدا آپ کے بچّے کو شفا دے، میں بہت پریشان تھا۔ اب کوئی خطرہ تو نہیں ڈاکٹر صاحب؟“

”نہیں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تاہم کل اور پرسوں کا دن اِسے آپ کا مہمان رہنا پڑے گا۔ تیسرے دن میں اِسے گھر لے جاؤں گا!“

”نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ بات نہیں ہو گی۔ آپ کا بچّہ تندرست ہونے تک ہمارے پاس رہے گا۔ سلیم کی دادی نے اُس کے تندرست ہونے پر ایک بکرے کی نیاز دینے کی منّت مانی ہے۔ آپ اپنے بال بچّوں کو یہیں منگوا لیں۔ ہم اپنے مکان کا ایک حصّہ اُن کے لیے خالی کر دیں گے، آپ کو کوئی

تکلیف نہیں ہو گی۔ اگر آپ کو اسپتال سے چھٹّی نہ ملے تو ہمارا ایک گھوڑا آپ کے پاس رہے گا۔ آپ اسے دن میں دو بار دیکھ جایا کریں۔"

افضل نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! ارشد سے متعلّق آپ کے گھر میں بہت پریشانی ہو گی۔ اگر آپ ان کی تسلّی کے لیے رقعہ لکھ دیں تو میں ابھی بھجوا دیتا ہوں!"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کا بھتیجا بہت سمجھدار ہے۔ اس نے وہاں ارشد کے زخمی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ بہر حال وہ اس کی غیر حاضری سے پریشان ہوں گے۔"

سلیم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں نے ارشد کی امّی سے وعدہ کیا تھا کہ میں سویرے انہیں اِس بات کا پتہ دوں گا کہ ارشد کہاں ہے۔ آپ اگر رقعہ لکھ دیں تو میں سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچا دوں گا!"

"تم تھک گئے ہو گے بیٹا!" ڈاکٹر صاحب نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

سلیم کی بجائے افضل نے جواب دیا۔ "جب دوست کی زندگی کا سوال ہو تو

تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔“

ڈاکٹر صاحب نے سلیم کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”اچھا بیٹا میں تمہیں رقعہ لکھ دیتا ہوں۔ میرے تھیلے میں کچھ دوائیاں ہیں جن کی یہاں ضرورت ہے۔ ارشد کی ماں تمہیں وہ تھیلا لا دے گی۔ اُسے احتیاط سے لے آنا۔ اگر ارشد کی ماں یہاں آنے پر ضد کرے تو اُسے کہنا کہ میں کوئی آٹھ نو بجے گھر پہنچ جاؤں گا اور شام کو انہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا!“

چودھری رحمت علی نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ سلیم کے ساتھ آجائیں گی۔ سلیم تم مجید کو بھی ساتھ لے جاؤ، اگر وہ تمہارے ساتھ تیّار ہو جائیں تو انہیں گھوڑوں پر بٹھالینا اور خود باگ پکڑ کر ساتھ آنا۔“

☆☆☆☆☆

چودھری رحمت علی کا قیاس سچ ثابت ہوا۔ علی الصبح ارشد کی ماں اپنے خاوند کا رقعہ پڑھنے اور سلیم اور مجید سے چند سوالات پوچھنے کے بعد بچوں سمیت اُن کے ساتھ آنے پر تیّار ہو گئی۔ ارشد کا چھوٹا بھائی امجد اپنی ماں

کے ساتھ مجید کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور باقی لڑکیاں عصمت اور راحت سلیم کے گھوڑے پر بیٹھ گئیں۔ سلیم اور مجید ان گھوڑوں کی باگیں پکڑ کر اُن کے آگے آگے چل پڑے اور نوکر دوا کا تھیلا اُٹھا کر اُن کے پیچھے ہو لیا۔

راستے میں ارشد کی ماں نے سلیم سے کہا۔ ”بیٹا تمہارا گھوڑا بہت خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ کہیں اس کی باگ نہ چھوڑ دینا!“

”جی آپ فکر نہ کریں۔ یہ گھوڑا مجھے چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔“

”بیٹا! پھر بھی اِس کی باگ احتیاط سے پکڑنا، جانور کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔“

”جی آپ فکر نہ کریں!“

کچھ دیر ارشد کی ماں مجید اور سلیم سے ارشاد کے متعلّق پوچھتی رہی۔ عصمت نے مُڑ کر راحت کے کان میں کچھ کہا اور اس نے ماں سے شکایت کی۔

"امی عصمت کہتی ہے یہ گھوڑا مجھے کھا جائے گا۔"

مجید اور سلیم ہنس پڑے۔ عصمت کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا اور اُس نے راحت کے بازو پر چٹکی لی۔ وہ چِلاّئی۔ "امی عصمت مارتی ہے۔"

"کیا کرتی ہو عصمت؟" ماں نے جھٹک کر کہا۔

عصمت کی عمر نو سال تھی۔ راحت اس سے تین سال چھوٹی تھی اور امجد نے ابھی چوتھے برس میں پاؤں رکھا ہی تھا۔ ماں سے جھڑکی کھانے کے بعد عصمت کچھ دیر خاموش رہی اور پھر راحت کے کان میں کہنے لگی۔ "ان کے گاؤں میں بھُوت ہوتے ہیں۔"

"تم جھوٹ کہتی ہو۔" راحت نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

راحت نے قدرے فکر مند ہو کر سوال کیا۔ "بھلا تمہارے گاؤں میں بھُوت ہوتے ہیں؟"

"نہیں۔" سلیم نے جواب دیا۔

"شیر ہوتے ہیں؟"

"شیر بھی نہیں ہوتے۔"

راحت نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔

"سانپ ہوتے ہیں؟"

عصمت نے دبی زبان سے کہا۔ "گاؤں میں بہت بڑے بڑے سانپ ہوتے ہیں جو بچّوں کو کھا جاتے ہیں!"

راحت نے پھر اپنی ماں سے فریاد کی۔ "امی آپا کہتی ہے، مجھے سانپ کھا جائے گا۔ میں گاؤں نہیں جاؤں گی!"

ماں نے عصمت کو ایک جھڑکی اور دی۔ سلیم نے راحت کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "سانپ گاؤں میں نہیں آتے!"

راستے میں برساتی نالہ آیا تو عصمت نے کہا۔ "اب تم ڈوب جاؤ گی!"

"بھلا میں ڈوب جاؤں گی؟" راحت نے فکر مند ہو کر سلیم سے سوال کیا۔

"نہیں، یہ پانی زیادہ گہرا نہیں۔ تمہاری بہن تمہیں یونہی ڈرا رہی ہے۔"

☆☆☆☆☆

ارشد کی والدہ اور بچّے سلیم کے گھر کے ماحول سے جلد ہی مانوس ہو گئے۔ سلیم کا چھوٹا بھائی یوسف، امجد کو اپنے ساتھ لے کر اپنی عمر کے بچّوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ عصمت اور راحت کو امینہ، صغریٰ اور زبیدہ جیسی سہیلیاں مل گئیں۔

ارشد کے متعلق ڈاکٹر صاحب کہہ چکے تھے کہ اس کی حالت تسلّی بخش ہے اور وہ دوپہر کے بعد واپس آنے کا وعدہ کر کے شہر چلے گئے۔

زبیدہ کے اصرار پر سلیم نے باہر کی حویلی میں درخت کے ساتھ جھولا ڈال دیا اور لڑکیاں وہاں جمع ہو گئیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت تھی کہ ارشد کے ساتھ زیادہ باتیں نہ کی جائیں، اس لیے سلیم کی ماں نے اس بات کا خیال رکھا کہ گاؤں کی عورتیں اس کے گرد جمع نہ ہوں۔ وہ خود ارشد کی ماں کے ساتھ سارا دن ارشد کے پاس بیٹھی رہی۔ سلیم کے لیے خاموش

رہنے کا حکم بہت صبر آزما تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتا اور تھوڑی دیر خاموش بیٹھ کر پھر باہر نکل جاتا۔ جتنی دیر وہ کمرے میں رہتا، ارشد کی نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز رہتیں۔

عصر کے وقت سلیم اُس کے کمرے سے نکل کر نماز کے لیے جا رہا تھا تو ارشد نے نحیف آواز میں کہا۔ ”سلیم!“

سلیم مُڑ کر اُس کے بستر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ارشد نے کہا۔ ”کہاں جا رہے ہو! بیٹھ جاؤ!“

سلیم نے اُس کے بستر پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”میں نماز کے لیے جا رہا تھا!“

ارشد نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔ ”میں اب بالکل ٹھیک ہوں، رات کو مجھے کہانی سناؤ گے؟“

سلیم اب کہانی سنانے کے مطالبہ پر چڑا کرتا تھا لیکن ارشد کی درخواست پر اُس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”سناؤں گا؟“

رات کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندیں گر

رہی تھیں۔ کمرے کے اندر حبس تھا، اس لیے ارشد کو برآمدے میں لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب جو شام کے وقت واپس آ گئے تھے، کھانا کھانے کے بعد گھر کے آدمیوں کے ساتھ باہر کی حویلی کے کشادہ برآمدے میں لیٹ گئے۔

سلیم نے عشاء کی نماز کے بعد ارشد کے قریب بیٹھ کر کہانی شروع کر دی۔ امینہ، صغریٰ، زبیدہ اور ارشد کی بہنیں برآمدے کے دوسرے سِرے پر چارپائیوں پر بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ اچانک زبیدہ کے کان میں سلیم کی آواز پڑی اور اُس نے کہا۔ ”امینہ، بھائی جان کہانی سُنا رہے ہیں!“

آن کی آن میں امینہ، صغریٰ اور زبیدہ سلیم کے گرد جمع ہو گئیں۔ رضیہ کہہ رہی تھی۔ ”بھائی جان ہم بھی سنیں گے، شروع سے سناؤ!“

صغریٰ نے کہا۔ ”آؤ عصمت تم بھی یہاں آ جاؤ۔ بھائی سلیم بڑی اچھی کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔“

سلیم نے کچھ دیر ٹال مٹول کی لیکن جب عصمت اور راحت بھی اُس کے قریب آ گئیں تو اُس سے انکار کرتے نہ بنی۔ اس نے کہا۔ ”اچھا تم میں سے کیا نے شور مچایا تو پیٹوں گا!“

راحت معصومانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے پیٹو گے تو میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔“

سلیم کی ماں اور چچیاں جو ارشد کے دوسری طرف چارپائیوں پر بیٹھی ہوئی آپس میں باتیں کر رہی تھیں، ہنس پڑیں۔

سلیم نے کہا۔ ”تمہیں نہیں پیٹوں گا۔ آؤ تم یہاں بیٹھ جاؤ!“

راحت بے تکلّفی سے سلیم کے قریب بیٹھ گئی۔ امینہ اچانک چارپائی گھسیٹ کر سلیم کے قریب لے آئی اور باقی لڑکیاں اس پر بیٹھ گئیں۔

سلیم نے کہانی شروع کی۔ کچھ عرصہ سے وہ مجبوری کی حالت میں کبھی کبھی اپنی بہنوں کو ٹالنے کے لیے مختصر سی کہانی سُنا دیا کرتا تھا۔ لیکن آج مدّت کے بعد وہ اُس کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔ شروع شروع میں اسے

اس بات کا احساس تھا کہ ارشد شاید اِس کہانی میں دلچسپی نہ لے، اس لیے اُس نے چند بار باقی اگلی شب سنانے کا وعدہ کر کے کہانی ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ارشد ہر مرتبہ کہہ دیتا۔ ”نہیں بھئی! ساری سناؤ!“

سلیم کا عصمت سے متعلّق بھی یہ خیال تھا کہ وہ اپنے بھائی کی طرح ذہین ہے۔ کہانی شروع کرنے سے پہلے وہ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز تبسّم دیکھ رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اُس کے چہرے کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ سب سے زیادہ متاثر ہے۔

سلیم کی کہانی کا شہزادہ کسی صحرا میں پیاس سے تڑپ رہا تھا اور لیمپ کی روشنی میں عصمت کی معصوم نگاہیں یہ کہتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں کہ کاش میں اُسے پانی پلا سکتی۔ سلیم کی کہانی کا خونخوار آدمی سوئے ہوئے شہزادے کو زنجیروں میں جکڑ رہا تھا اور عصمت کے چہرے کا حزن و ملال اِس احساس کی ترجمانی کر رہا تھا کہ کاش کوئی اُسے جگا دے اور جب کوئی نیک دل انسان شہزادے کی زنجیریں کھول رہا تھا تو اُس کا خوبصورت چہرہ مسرّتوں کا گہوارہ بن رہا تھا۔

کہانی کا جو اختتام سلیم کے ذہن میں تھا، وہ بہت دردناک تھا۔ شہزادہ شادی کے دان گھوڑے سے گِر کر مر جاتا تھا اور شہزادی اُس کا جنازہ دیکھ کر محل سے چھلانگ لگا دیتی تھی۔ لیکن سلیم کو عصمت کا لحاظ کرنا پڑا۔ شہزادہ گھوڑے سے گِرتے گِرتے سنبھل گیا اور شہزادی کو محل سے گِرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ سلیم نے کہانی ختم کی تو لڑکیوں نے ایک اور کہانی کا مطالبہ کیا لیکن سلیم کی ماں نے کہا۔ ''نہیں دوسری کہانی کل سُن لینا۔ اب ارشد کو آرام کرنے دو۔''

سلیم بالا خانے پر جا کر لیٹ گیا۔ باہر کی حویلی میں آدمیوں کی محفل گرم تھی اور چچا اسماعیل کے قہقہے سُنائی دے رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ مجید وہاں ہو گا، سلیم کے دل میں وہاں جانے کا خیال آیا لیکن تھکاوٹ کے احساس سے وہ بستر پر پڑا رہا۔ اسے جلد ہی نیند آگئی۔ تھوڑی دیر میں وہ سپنوں کی حسین وادی میں پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک شہزادہ تھا اور ایک حسین شہزادی کو درندوں کے نرغے سے چھڑا رہا تھا۔ شہزادی کو ایک خوفناک جن نے اُٹھا کر ایک ایسے پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا تھا جہاں پہنچنے کے تمام

راستے مسدود تھے اور وہ ہوا میں اُڑ کر وہاں پہنچ رہا تھا۔

وہ صحرا میں پیاس سے تڑپ رہا تھا اور شہزادی اُس کے لیے پانی لے کر آ رہی تھی اور اس شہزادی کی شکل و صورت اس لڑکی سے ملتی تھی جو رات کے وقت ہمہ تن گوش بن کر اُس سے کہانی سُن رہی تھی۔

صبح ہوئی تو اُس نے نیم خوابی کی حالت میں محسوس کیا کہ کوئی اُس کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا ہے۔ وہ چونک کر اُٹھا۔ امینہ پانی کا لوٹا لیے کھڑی تھی۔

"امینہ کی بچّی ٹھہرو۔۔۔۔۔!" وہ غضب ناک ہو کر اُٹھا لیکن اُس کے پیچھے زبیدہ اور عصمت کو دیکھ کر اُس کا غصّہ جاتا رہا۔

امینہ نے کہا۔ "واہ جی، نیکی کرو تو گالیاں ملتی ہیں۔ نماز کا وقت جا رہا تھا اور تم مزے سے خرّاٹے لے رہے تھے۔"

سلیم نے کچھ کہے بغیر اُس کے ہاتھ سے پانی کا لوٹا لے لیا۔ باہر جاتے جاتے اس نے ایک لمحہ کے لیے رُک کر عصمت کی طرف دیکھا اور اُسے اپنے

سپنوں کی شہزادی یاد آ گئی۔

چھ دن بعد ارشد کو اس کا باپ اپنے گھر لے گیا۔ ارشد کی ماں نے رُخصت ہوتے وقت سلیم کی ماں اور اُس کی چچیوں سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کبھی اُن کے گھر آیا کریں گی۔ امینہ، صغریٰ اور زبیدہ سے رُخصت ہوتے وقت عصمت اور راحت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سلیم کی دادی کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ ان کی سہیلیوں کو کبھی کبھی مجید اور سلیم کے ساتھ بھیج دیا کریں گی۔

اس کے بعد ارشد کی ماں دو تین ہفتوں میں ایک بار ضرور سلیم کے گھر آتی، اگر اسے دیر ہو جاتی تو سلیم کی ماں اور چچیاں لڑکیوں کے ساتھ شہر چلی جاتیں۔

ارشد کو اس کے باپ نے بائیسکل خرید دی تھی، اس لیے وہ قریباً ہر اتوار اُس کے گاؤں آ جاتا اور جب وہ نہ آتا، سلیم گھوڑے پر سوار ہو کر اُن کے گھر چلا جاتا۔

مجید چھٹّی کے دن گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کبڈی کھیلا کرتا تھا، کشتی لڑا کرتا تھا اور افضل سے گتکا سیکھا کرتا تھا۔ اسے سلیم کے مشاغل سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

☆☆☆☆☆

فروری کے آخری دن تھے۔ وہ درخت جنہیں خزاں نے سبز پتوں سے محروم کر دیا تھا سرخ کونپلوں کے زیور سے آراستہ ہو رہے تھے۔ آلوچہ، ناشپاتی اور آڑو کے درختوں کی شاخیں پھولوں میں چھُپ رہی تھیں۔ بیریوں کی شاخیں پھل کے بوجھ سے جھک رہی تھیں۔ کھیتوں میں گندم لہلہارہی تھی۔ سرسوں پھول رہی تھی، خالی کھیتوں میں انواع و اقسام کی گھاس، پودے اور بیلیں اُگ رہی تھیں۔ غرض کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو موسمِ بہار کے سبز لبادے سے محروم ہو۔ خودرو پودوں اور بیلوں میں رنگا رنگ کے پھول مُسکرا رہے تھے۔ ننھے ننھے سرخ پھول جن کی زندگی فقط ایک آفتاب کے طلوع و غروب تک محدود ہوتی ہے، جو گھاس کی سبز چادر پر یاقوت، زمرّد نیلم اور عقیق کے نگینے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مصورِ

فطرت کی وہ ننھی اور دلفریب تصویریں ہیں، جن کے رنگ اور مہک کی تخصیص کے لیے انسان نے ابھی تک جدا جدا الفاظ ایجاد نہیں کیے۔ ان میں ہر ایک دیکھنے والوں سے اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہے۔۔۔ ”میری طرف دیکھو، مجھے سونگھو، مجھے چُوم لو، تم کہاں بھٹک رہے ہو؟ تم کس کے متلاشی ہو؟ میری زندگی مختصر ہے لیکن تمہارے لیے میں ایک حقیقی ابدی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کسی نے رنگینی، رعنائی اور مہک عطا کی ہے۔ میں تمہارے سامنے کائنات کے اس خالقِ اکبر کا پیغام لے کر آیا ہوں جس کے حکم سے ہوائیں چلتی ہیں، بادل آتے ہیں، مینہ برستا ہے اور زمین اپنی گود میں چھُپے ہوئے خزانے اُگلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ان ہاتھوں کو پہچانو! انہوں نے مجھے زمین کی تاریک گود سے باہر نکالا ہے، جن کی لوریوں نے مجھے مُسکراہٹیں عطا کی ہیں۔ یہی ہاتھ ہیں جو رات کے وقت آسمان پر تاروں کی قندیلیں روشن کرتے ہیں اور صبح کے وقت سورج کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیتے ہیں۔ تم کہاں بھٹک رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ میری طرف دیکھو!“

یہ ایسا موسم تھا جب سلیم کی تمام دلچسپیاں اپنے گاؤں میں مرکوز ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ علی الصبح اُٹھتا اور نماز کے بعد سیر کے لیے باہر نکل جاتا۔ گاؤں سے باہر کسی کھیت میں کھڑا ہو کر وہ پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں کے عقب سے طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھتا۔ شبنم میں دُھلے ہوئے پھول توڑتا۔ فضا میں مُرغابیوں کی ڈاریں بیاس کے کنارے جھیلوں کا رُخ کرتی نظر آتیں۔ مور کھیتوں میں چگنے کے لیے گھنے باغات سے باہر نکل آتے۔ ان دلکش مناظر کی سیر کے بعد وہ اچھلتا کودتا اور بھاگتا ہوا گھر پہنچتا اور کھانا کھانے کے بعد اسکول روانہ ہو جاتا۔

ایک اتوار سلیم گھر پر ارشد کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ حسبِ وعدہ نہ آسکا۔ اگلے دن سلیم اسکول گیا تو ارشد اُسے فکر مند دکھائی دیا۔ اُس نے پوچھا۔ ”کیوں ارشد! تمہیں کسی نے پیٹا ہے؟“

ارشد کوئی جواب نہ دیا۔

”دیکھو بھئی! پچھلے اتوار تم ہمارے گاؤں نہیں آئے تھے، اس اتوار ضرور آنا!“

ارشد نے جواب دینے کی بجائے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ سلیم نے فکر مند ہو کر سوال کیا۔ "ارشد کیا بات ہے۔ گھر میں خیریت ہے!"

اس نے جواب دیا۔ "سلیم! ابّا جان کی تبدیلی ہو گئی ہے۔ ہم پرسوں جا رہے ہیں؟"

"کہاں؟" سلیم نے مُضطرب ہو کر سوال کیا۔ "امرتسر!"

سلیم دیر تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے کیا کہنا چاہیے۔ اتنے میں اسکول کی گھنٹی بج گئی اور دُعا کے بعد وہ کلاس روم میں چلے گئے۔ استاد آئے اور اپنا اپنا مضمون پڑھا کر چلے گئے لیکن سلیم کے ذہن میں بار بار امرتسر کا لفظ گھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی اس بات کا سہارا لے کر ارشد کی طرف دیکھتا کہ شاید اُس نے مذاق کیا ہو۔ لیکن ارشد کے چہرے کا حزن و ملال اس خیال کی تردید کر دیتا۔

جب چھٹی ہوئی اور لڑکے اپنے بستے اُٹھا کر باہر نکل گئے تو ارشد اور سلیم اپنا

اپنا بستہ باندھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مجید اور باقی ساتھی باہر کھڑے سلیم کا انتظار کر رہے تھے۔

مجید نے دروازے میں کھڑے ہو کر آواز دی۔ ”آؤ سلیم! نہیں تو ہم جاتے ہیں!“

”آتا ہوں!“ سلیم نے یہ کہہ کر بستہ اُٹھا لیا لیکن دو تین قدم چلنے کے بعد رُک کر ارشد کی طرف دیکھنے لگا۔

ارشد نے کہا۔ ”ہمارے گھر نہیں چلو گے؟ امّی جان نے تمہیں بُلایا ہے!“

”چلو!“

ارشد اور سلیم باہر آئے تو مجید نے کہا۔ ”تمہاری باتیں ہی ختم نہیں ہو تیں؟“

سلیم نے کہا۔ ”مجید میں ذرا ارشد کے گھر جا رہا ہوں!“

”مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔“ ارشد نے کہا۔ ”امی جان سلیم کے ہاتھ کوئی

پیغام بھیجنا چاہتی ہیں۔ چلو تم بھی!"

مجید نے گاؤں کے ایک کھیت میں تلیر پکڑنے کے لیے پھندا لگا رکھا تھا اور اُسے شام سے پہلے وہاں پہنچنے کی فکر تھی۔ اس نے کہا۔ "نہیں بھئی، ہم جاتے ہیں۔"

سلیم ارشد کے ساتھ اُس کے گھر کی طرف چل دیا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر ارشد نے کہا۔ "تم ٹھہرو! میں تمہیں تماشا دکھاتا ہوں۔"

سلیم دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ارشد مُسکراتا ہوا داخل ہوا۔ اُس کی ماں کرسی پر بیٹھی سوئیٹر بُن رہی تھی۔ اس نے ارشد کو دیکھتے ہی کہا۔ "بیٹا! میں نے تمہیں کہا تھا کہ سلیم کو ساتھ لے کر آنا؟"

"امی جان وہ نہیں آیا۔" ارشد نے مغموم چہرہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"تم نے اُسے بتایا نہیں کہ ہم جا رہے ہیں؟"

"بتایا تھا لیکن وہ نہیں آیا!"

عصمت نے جلدی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”امی، بھائی جان اسے کہتے تو وہ ضرور آتا۔ انہوں نے کہا ہی نہیں ہو گا!“

ارشد بولا۔ ”وہ کہتا تھا کہ عصمت چڑیل ہے، مجھے تنگ کرتی ہے۔ میں نہیں جاؤں گا!“

”آپا چڑیل! چڑیل!!“ راحت نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

”تم جھوٹ کہتے ہو، وہ مجھے چڑیل نہیں کہہ سکتا۔“

”اگر وہ تمہارے منہ پر کہہ دے کہ تم چڑیل ہو تو پھر مان لو گی؟“ ارشد کے چہرے پر مُسکراہٹ دیکھ کر عصمت پھاٹک کی طرف بھاگی۔ سلیم اُسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ عصمت مُنہ بسورنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

سلیم نے اپنا بستہ اُس کے سر پر رکھ دیا اور وہ منہ دوسری طرف پھیر کر ہنسی ضبط کر رہی تھی۔

”دیکھو کہیں گرا نہ دینا۔ میری سلیٹ ٹوٹ جائے گی۔“ سلیم نے یہ کہہ کر

اپنا ہاتھ اُٹھالیا۔ عصمت ایک ثانیے کے لیے بے حس و حرکت کھڑی رہی لیکن جب بستہ گِرنے لگا تو دونوں ہاتھوں سے اُسے تھام کر ہنسنے لگی۔

سلیم نے آگے بڑھ کر ارشد کی ماں کو سلام کیا۔

''جیتے رہو بیٹا! بیٹھ جاؤ!!'' ماں نے سرکنڈے کے مونڈھے کی طرف اشارہ کیا۔ سلیم بیٹھ گیا۔ راحت نے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجّہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپا چڑیل ہے نا؟''

سلیم نے جواب دیا۔ ''نہیں! چڑیل کے بال بکھرے رہتے ہیں اور وہ جوتا بھی نہیں پہنتی۔''

راحت نے پریشان ہو کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا اور ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

ماں نے کہا۔ ''عصمت جاؤ، سلیم کے لیے گاجر کا حلوہ لے آؤ!''

ارشد نے ایک کونے سے تپائی اُٹھا کر سلیم کے سامنے رکھ دی اور کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بیٹا چائے بنواؤں؟"

"نہیں جی!" سلیم نے جواب دیا۔

عصمت نے حلوے کی پلیٹ لا کر تپائی پر رکھ دی۔ "ماں بولی۔ "بیٹا! مجید کو بھی لے آتے!"

ارشد نے کہا۔ "میں نے تو کہا تھا لیکن وہ نہیں آیا!"

سلیم نے کہا۔ "اس نے تلیر پڑھنے کے لیے پھندا لگا رکھا ہے، شام کو بہت تلیر پھنستے ہیں۔ اس لیے اُسے وہاں پہنچنے کی فکر تھی۔"

امجد صحن میں اپنے ایک ہم عمر کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ وہ پہلی بار سلیم کی طرف متوجّہ ہوا۔ "مجھے بھی ایک تلیر لا دو گے نا؟"

"لا دوں گا۔" سلیم نے جواب دیا اور امجد پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گیا۔

ارشد کی ماں نے کہا۔ "بیٹا ارشد نے تمھیں بتایا ہو گا کہ اُس کے ابّا جان

امرتسر تبدیل ہو گئے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"انہوں نے دس دن کی چھٹّی لی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ جانے سے پہلے ہم سب دو تین دن تمہارے گاؤں رہیں گے۔ اس کے بعد میں تمہاری ماں اور چچیوں کو یہاں آنے کی دعوت دوں گی لیکن جلندھر میں ارشد کے ماموں کی شادی ہے اور ہم پرسوں وہاں جارہے ہیں۔ اب میں کل صبح تک تمہارے گاؤں آؤں گی اور شام کو واپس چلی آؤں گی!"

عصمت بولی۔ "امّی جان! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی!"

"ہم سب چلیں گے۔ ارشد کے ابّا سامان وغیرہ بندھوانے میں مصروف ہوں گے اس لیے شاید وہ نہ جاسکیں۔"

سلیم نے کہا۔ "میں گھوڑے لے آؤں گا۔"

"نہیں ہم ٹانگے پر آئیں گے، سڑک پر ہم ٹانگہ چھوڑ دیں گے اور وہاں سے پیدل چلیں گے۔ واپسی پر پھر سیر کرتے آئیں گے!"

شام کے قریب سلیم نے ارشد کی امّی سے اجازت لی اور اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔ مغربی اُفق پر سورج جھک کر زمین کے کنارے کو چھُو رہا تھا اور شفقت کی سُرخی کا عکس کانگڑہ کے پہاڑوں پر پھیل رہا تھا۔ چوٹیوں پر برف کے تودے سونے کے انبار نظر آتے تھے۔ چہچہاتے ہوئے پرندوں کے غول اپنے آشیانوں کا رُخ کر رہے تھے۔ مُرغابیاں، سُرخاب اور کونجیں علیحدہ علیحدہ قطاروں میں کسی نامعلوم منزل کی طرف پرواز کر رہی تھیں۔ موروں کی ٹولیاں گندم، چنے اور سرسوں کے کھیتوں سے نکل نکل کر درختوں پر جمع ہو رہی تھیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا لیکن اُس کی الوداعی مُسکراہٹیں ابھی تک برفانی پہاڑ کی چوٹیوں پر رقص کر رہی تھیں۔

سلیم نے راستے میں ایک رہٹ پر وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر بستہ اُٹھا کر چل دیا۔ پگڈنڈی پر ایک خرگوش اُسے دیکھ کر بھاگا لیکن اُس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ نالے کے کنارے سارس کا جوڑا مُنہ اُٹھائے کھڑا تھا لیکن اُس نے توجہ نہ کی۔ وہ پریشان تھا۔ ارشد جا رہا تھا، امجد جا رہا تھا، عصمت اور

راحت جا رہی تھیں۔ اس کی زندگی کی معصوم مُسکراہٹیں چھِن رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

اگلے دن وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑا تھا جب وہ ٹانگے کا انتظار کرتے کرتے اُکتا گیا تو سرسوں کے پھول توڑنے لگا۔ اس نے تین گلدستے بنائے۔ سب سے بڑا عصمت کے لیے، اُس سے چھوٹا راحت کے لیے اور سب سے چھوٹا امجد کے لیے پھر۔ کچھ سوچ کر سب سے بڑا گلدستہ اُٹھایا اور ننھی ننھی بیلوں اور پودوں سے مختلف رنگوں کے پھُول توڑ کر اُس میں اٹکانے شروع کر دیے۔ گلدستے زمین پر رکھ کر وہ پگڈنڈی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور جیب سے چاقو نکال کر زمین کھودنے لگا۔ کوئی ایک بالشت گہرا گڑھا کھودنے کے بعد اُس نے اسے پھر مٹّی سے بھر دیا اور اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند مسافر سڑک پر سے گزر رہے لیکن حد نگاہ تک تانگے کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ مایوس سا ہو کر پھر بیٹھ گیا اور چاقو کے ساتھ پگڈنڈی کی ہموار سطح پر اُلٹی سیدھی لکیریں

کھینچنے لگا۔ سرسوں کے پھولوں کی تازگی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن مختلف رنگوں کے وہ نرم اور نازک پھول جو اس نے عصمت کے گلدستے میں جمع کیے تھے۔ مرجھا رہے تھے۔ سلیم نے اپنے ارد گرد تمام جگہ لکیروں سے بھر دی۔ پھر ایک صاف جگہ منتخب کرکے بیٹھ گیا۔ اب وہ لکیریں کھینچنے اور دائرے بنانے کی بجائے مختلف نام لکھ رہا تھا۔ اپنے نام کے بعد اُس نے ارشد، مجید اور اسکول کے باقی دوستوں کے نام لکھ دیے۔ پھر اُسے پرائمری اسکول کے ساتھی یاد آ گئے اور وہ اُن کے نام لکھنے لگا۔ یہ جگہ بھر گئی تو وہ کھسک کر اور آگے ہو گیا۔ اس نے گلدستے میں چند مُرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھا اور زمین پر ایک اور نام لکھ دیا۔ وہ نام جس کی اہمیّت وہ پہلی بار شدّت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ ''عصمت'' کے الفاظ کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے معصوم مُسکراہٹیں رقص کر رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں لطیف قہقہے گونج رہے تھے۔ اچانک اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے وہ تمام دوست جن کے نام وہ پہلے لکھ چکا تھا اُس کی اِس حرکت پر ہنس رہے ہیں۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ پھیر کر ''عصمت'' کا نام مٹا دیا اور اُٹھ کر شہر کی طرف دیکھنے لگا۔ کوئی دو فرلانگ

کے فاصلے پر تانگہ آ رہا تھا اور وہ جلدی سے جھک کر باقی ناموں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ تانگہ قریب آ گیا تو اُس نے پھولوں کے گلدستے اُٹھا لیے لیکن پھر کچھ سوچ کر سب سے بڑا گلدستہ گندم کے پودوں میں چھپا دیا۔ تانگہ پگڈنڈی کے پاس آ کر رُکا۔ امجد اور راحت نے اُترتے ہی اُس کے ہاتھ سے گلدستے چھین لیے اور عصمت قدرے پریشان ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

راحت نے کہا۔ ”آپا کو بھی پھول توڑ دو نا!“

”میں پھول نہیں لوں گی۔“عصمت نے مُنہ بسورتے ہوئے کہا۔

ارشد کی ماں نے کہا۔ ”بیٹا تم کب سے یہاں کھڑے ہو؟“

”میں بہت دیر سے یہاں کھڑا ہوں!“

ارشد بولا۔ ”ہمیں دیر ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ تم گھوڑے پر شہر پہنچ جاؤ گے!“

سلیم نے کہا۔ ”اگر میں یہاں تک پیدل نہ آیا ہوتا تو شاید ایسا ہی کرتا!“

ارشد کی ماں نے کوچوان سے کہا۔ ”اب تم جاؤ! شام کو ہم پیدل آ جائیں گے!“

ارشد امجد کی انگلی پکڑ کر آگے آگے ہو لیا اور اس کی ماں، راحت اور عصمت اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ سلیم نے کھیت میں چھپایا ہوا گلدستہ اُٹھایا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر عصمت کے سر پر رکھ دیا۔ عصمت پہلے چونکی اس کے بعد اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرائی اور پھر گلدستے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر ہنسنے لگی۔

اب وہ راحت کو چِڑا رہی تھی۔ ”دیکھو تمہارا گلدستہ چھوٹا ہے اور میرا بڑا ہے، تمہارے ایک رنگ کے پھول ہیں اور میرے کئی رنگ کے ہیں!“

راحت کچھ دیر صبر کے ساتھ ہنستی رہی لیکن بالآخر اس کی قوّتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ گلدستہ پھینک کر پگڈنڈی پر بیٹھ گئی۔ ارشد اور اُس کی ماں ہنس رہے تھے اور سلیم اُسے منا رہا تھا۔ ”دیکھو بھئی آگے بہت پھول ہیں۔ میں تمہیں اِس سے بھی بڑا گُلدستہ بنادوں گا!“

"مجھے لال رنگ کے پھول بھی توڑ کے دو گے نا؟" راحت نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی توڑ دوں گا۔"

اب امجد کی باری تھی۔ اس نے بے پروائی سے اپنا گُلدستہ پھینکتے ہوئے کہا۔ "میں بھی لال رنگ کے پھول لوں گا!"

سلیم نے دونوں کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "اچھا گاؤں پہنچ کر میں تم سب کو پھُول لا دوں گا۔"

گاؤں پہنچ کر راحت اور عصمت، زبیدہ اور سلیم کی چچا زاد بہنوں کے ساتھ کھیلتی رہیں اور ارشد، سلیم، مجید، گلاب سنگھ اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیتوں میں گھومتا رہا۔ گھر کی تمام عورتوں کی خواہش تھی کہ ارشد کی ماں کم از کم ایک رات ضرور اُن کے ہاں ٹھہرے لیکن جب ارشد کی ماں نے کہا کہ وہ کل دس بجے کی گاڑی سے جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو انہوں نے اصرار نہ کیا۔

ارشد کی ماں نے سلیم کی ماں سے وعدہ کیا کہ وہ امرتسر سے خط لکھا کرے گی اور کبھی کبھی ملنے بھی آیا کرے گی۔ عصمت نے سلیم کی چھوٹی بہن، زبیدہ اور اس کی چچازاد بہنوں صغریٰ اور امینہ سے خط و کتابت جاری رکھنے کا وعدہ کیا۔ جب واپس جانے کی تیّاری کر رہے تھے تو ارشد نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا اور وہ سلیم کی والدہ سے مخاطب ہو کر بولی۔

”بہن سلیم کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دو، رات یہ ہمارے پاس رہے گا، جب ہم گاڑی پر سوار ہو جائیں گے اور یہ اسکول چلا جائے گا۔“

ماں نے خوشی سے سلیم کو اجازت دے دی۔

رات کے وقت ارشد، عصمت، راحت اور امجد اپنے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں سلیم کے گرد بیٹھ کر کہانی سُن رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں ڈاکٹر شوکت آرام کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ارشد کی ماں ان کے قریب بیٹھی سوئیٹر بُن رہی تھی۔ ”سلیم بہت ہونہار بچّہ ہے!“ ڈاکٹر نے اپنی بیوی کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔

”آج میں ارشد کا سرٹیفکیٹ لینے گیا تھا تو ہیڈ ماسٹر بھی اُس کی تعریف کرتا تھا!“

وہ مُسکرا کر بولی۔ ”میں نے آج اُس کی ماں سے کہا تھا کہ جب بہو تلاش کرنے کے لیے نکلو تو سب سے پہلے میرے گھر آنا اور وہ پھولی نہیں سمائی تھی۔ وہ عصمت کو گود میں لے کر پیار کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگی بہن! مجھے تو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے اپنی بہو ڈھونڈ لی ہے۔ کہو تو ابھی مٹھائی بانٹ دوں۔“

”بس وہی عورتوں والی بات، بچّہ ابھی گود میں ہوتا ہے اور شادی کی تیّاریاں شروع ہو جاتی ہیں!“

وہ بولی۔ ”ذرا دیکھو تو اُٹھ کر، یہ جوڑا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں دو تین برس کے بعد بات پکّی ہو جائے۔ آج کل اوّل تو اچھے خاندان نہیں ملتے اور اگر خاندان مل جائے تو لڑکے آوارہ ہوتے ہیں!“

ڈاکٹر صاحب نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ ”بھئی خاندان تو بہت اچھا ہے،

اب لڑکے کو اچھی تعلیم دلوائیں تو دیکھا جائے گا!"

"وہ کوئی نادار تھوڑے ہیں۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ ہم اپنے لڑکے کو اچھی تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں گے!"

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی اگر وہ ولایت سے ہو آیا تو پھر تم کوئی توقع نہ رکھنا۔ پھر وہ نہ اُن کا رہا نہ ہمارا۔"

"خدا کے لیے کوئی نیک دُعا کرو!" وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ اگلے دن سلیم اسٹیشن پر انہیں الوداع کہہ رہا تھا۔ گاڑی دھوئیں کے بادل اُڑاتی ہوئی آئی اور وہ سب سوار ہو گئے۔ ارشد اپنے باپ کے ساتھ مردانہ ڈبّے میں بیٹھا۔ عصمت، راحت اور احمد اپنی ماں کے ساتھ زنانہ ڈبّے میں سوار ہو گئے۔ ان کا نوکر علی الصبح ٹرک پر سامان لاد کر روانہ ہو چکا تھا۔

گاڑی نے سیٹی بجائی۔ ارشد کے باپ نے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے خدا حافظ کہا۔ سلیم نے مصافحہ کیا، پھر جلدی سے ارشد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ارشد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر

مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ زنانہ ڈبّے کی کھڑکی سے عصمت اور راحت اُس کی طرف جھانک رہی تھیں۔ گاڑی نے دوسری سیٹی بجائی اور انجن ''پھپ پھپ'' کرتا چل پڑا۔ عصمت اپنی اوڑھنی سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ گاڑی نکل گئی اور ساتھ ہی سلیم کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

''ارے تم رو رہے ہو؟'' کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مجید کی آواز پہچان کر اُس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور کوئی بات کیے بغیر اسکول کی طرف چل دیا۔

☆☆☆☆☆

دھڑکنیں

وقت گزرتا گیا، شاہراہِ حیات پر زندگی کے سادہ، رنگین اور دلفریب نقوش ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہوتے گئے۔ سلیم اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور کے ایک کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ مجید میٹرک کے امتحان میں فیل ہونے کے بعد فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔ سلیم کے گاؤں کے دو اور ساتھی گلاب سنگھ اور رام لال میٹرک سے پہلے ہی اسکول چھوڑ چکے تھے۔ رام لال کو شہر کے کارخانے میں مُنشی کی جگہ مل گئی تھی اور گلاب سنگھ کاشتکاری میں اپنے باپ اور چچوں کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

پڑوس کے گاؤں میں بلونت سنگھ اور کندن لال امرتسر کے کسی کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ پرائمری سکول والے گاؤں کے ماسٹر کا لڑکا اس ضلع

کے کسی دفتر کا کلرک اور پٹواری کا لڑکا معراج الدّین ریلوے میں بابو بن چکا تھا۔

ڈاکٹر شوکت کی تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ ارشد کے ساتھ سلیم کی خط و کتابت رہی۔ اس کے بعد سلیم کو چند خطوط کا جواب نہ آیا اور خط و کتابت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ زبیدہ، امینہ اور صغریٰ کے نام عصمت کے خطوط آتے رہے لیکن اُن کی طرف سے باقاعدہ جواب نہ جانے پر وہ بھی خاموش ہو گئی۔

کالج میں سلیم کی دلچسپیوں کے ہزاروں اسباب تھے۔ وہ اُن نوجوانوں میں سے تھا جنہیں ہر ماحول میں دوست اور قدردان مِل جاتے ہیں۔ ہوسٹل میں اُس کی شگفتگی اور زندہ دِلی مشہور تھی۔ طلبا کی کسی محفل میں کالج کے ذہین اور ہونہار لڑکوں کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتیں تو سلیم کا ذکر بھی ضرور آتا۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اس نے چند نظمیں اور کہانیاں لکھیں تھیں جنہیں وہ چھُپا کر رکھا کرتا تھا لیکن وہ خصائل جو قدرت کے عطا کردہ ہوں، دیر تک پوشیدہ نہیں رہتے۔ سلیم نے جھجکتے جھجکتے ایک

نظم کالج کے میگزین میں بھیج دی۔ ایڈیٹر نے صرف اُسے شائع کیا بلکہ اس کی تعریف میں ایک مختصر سا نوٹ بھی لکھا۔ یہ اس کی شہرت کا آغاز تھا۔ اس کے بعد اُس نے دیہاتی زندگی کے متعلّق ایک افسانہ لکھا جسے نظم سے کہیں زیادہ پسند کیا گیا۔

اسی افسانے کی بدولت وہ اختر کے ساتھ متعارف ہوا۔ اختر اس سے ایک جماعت آگے تھا اور اس کا شمار کالج کے ذہین ترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ کالج کے میگزین کے علاوہ دوسرے ادبی رسائل اور اخبارات کے لیے سیاسی مضامین لکھا کرتا تھا۔ وہ چھریرے بدن کا ایک مختصر انسان تھا لیکن اس کی کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھوں اور بھنچے ہوئے ہونٹوں میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ہوسٹل میں وہ بہت کم لڑکوں کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ کھانے کی میز پر لڑکے ایک دوسرے کی معمولی شرارتوں پر قہقہے لگاتے لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آتا۔ لڑکے کسی مسئلے پر بحث چھیڑ دیتے اور ہر ایک دوسرے کی سننے کی بجائے اپنی سنانے کے لیے زیادہ بے قراری ظاہر

کرتا۔ اختر کو اگر موضوع سے دلچسپی نہ ہوتی تو چُپکے سے کھانا ختم کر کے اپنے کمرے میں چلا جاتا لیکن جب بھی بولتا، سُننے والے یہ محسوس کرتے کہ وہ بحث میں حصّہ لینے کی بجائے اپنا فیصلہ سُنا رہا ہے۔ کبھی کبھی کالج میں علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات پر تقریریں ہوتیں تو اختر اُن میں بھی حصّہ لیتا اور موضوع کی موافقت اور مخالفت میں اس کی تقدیر فیصلہ کُن سمجھی جاتی۔

سلیم کے ساتھ اختر کی پہلی ملاقات بہت اچانک تھی۔ ایک دن وہ تیزی سے ہوٹل کی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا اور اختر اوپر آ رہا تھا۔ موڑ پر دونوں کی ٹکر ہو گئی۔ اختر کے ہاتھ سے کتابیں گِر پڑیں۔

''اوہو، معاف کیجیے!'' سلیم نے پریشان سا ہو کر کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

سلیم نے جلدی سے کتابیں اُٹھا کر اُسے پیش کیں اور تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اختر نے کہا۔ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں لیٹر بکس میں خط ڈالنے جا رہا ہوں۔“

”بھئی اگر تکلیف نہ ہو تو ایک خط میرا بھی لے جاؤ۔ میں نے کل سے لکھ رکھا ہے۔ باہر نکلتا ہوں تو یاد نہیں رہتا۔“

”بہت اچھا۔ لائیے!“ سلیم اختر کے پیچھے اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اختر نے میز سے خط اُٹھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ غالباً کالج میگزین میں ”آخری مسکراہٹ“ کے عنوان سے آپ ہی کا افسانہ شائع ہوا ہے!

”جی میں نے یونہی لکھ دیا تھا۔“

”مجھے آپ کی طرزِ تحریر بہت پسند آئی ہے۔ افسانے کا پلاٹ بھی بہت دل کش تھا، لیکن مجھے سب سے زیادہ اُس کے وہ حصّے پسند ہیں جن میں آپ نے گاؤں کے مناظر پیش کیے ہیں۔ شاید اس لیے کہ میں گاؤں کی زندگی سے قطعاً نا آشنا ہوں۔ دیہاتی زندگی سے متعلّق آپ نے اور بھی کچھ لکھا ہے؟“

سلیم نے کہا۔ ”گرمیوں کی چھٹیوں میں مَیں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کا عنوان ہے ’میرا گاؤں‘ جو کافی طویل ہے۔ آپ کو کبھی فرصت ہو تو میں دکھاؤں گا۔“

”بھئی میں ضرور پڑھوں گا۔ اگر آپ کے پاس ہے تو ابھی دے دیجئے۔ مجھے اس وقت کوئی کام نہیں!“

سلیم نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ اس میں بعض ایسے واقعات ہیں جنہیں پڑھ کر آپ ہنسیں گے۔“

اختر نے مُسکرا کر جواب دیا۔ ”پھر تو میں ضرور پڑھوں گا۔ لایئے!“

سلیم نے اپنے کمرے میں سے ایک کاپی لا کر اختر کے ہاتھ میں دے دی اور خط ڈالنے کے ارادے سے باہر نکل آیا۔

شام کے وقت اختر پہلی بار سلیم کے کمرے میں آیا۔ اُس کے ہاتھ میں وہ کاپی تھی جو دوپہر کے وقت سلیم نے اُسے دی تھی۔

”لیجیے سلیم صاحب!“ اس نے کہا۔ ”میں نے پڑھ لیا آپ کا مضمون!“

"تشریف رکھیے!" سلیم نے کہا۔ اختر کرسی پر بیٹھ گیا اور سلیم اپنے دل میں مسرّت اور اضطراب کی ملی جُلی دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ اختر کے چہرے پر ایک دلفریب مُسکراہٹ پھیلتی گئی اور سلیم کے خدشات دور ہوتے گئے۔

وہ بولا۔ "سلیم صاحب! آپ کا مضمون بے حد دلچسپ تھا۔ میں تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں گاؤں میں گھوم رہا ہوں اور وہ رمضان اگر آپ کے گاؤں کا کوئی جیتا جاگتا آدمی ہے تو میں اسے کبھی نہ کبھی ضرور دیکھوں گا۔ آپ اس مضمون کو اشاعت کے لیے ضرور بھیجئے!"

یہ ایک خوش گوار ابتدا تھی، اس کے بعد سلیم اور اختر ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ سلیم کو اختر کی شخصیت میں ایک دوست، ایک نگران اور ایک رہنما مل چکا تھا۔ وہ اس کے لیے کالج کی لائبریری سے کتابیں مُنتخب کرتا۔ اس کے ادبی کارناموں کے عیوب و محاسن کے متعلّق بے لاگ رائے دیتا۔ علی الصبح اُسے اپنے ساتھ پڑوس کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے اور قرآن کا درس سُننے کے لیے لے جاتا۔ شام کو وہ کبھی کبھی سیر کو

نکل جاتے۔

اختر ماضی اور حال کا موازنہ کرنے کے بعد قوم کے مستقبل کے متعلق بے چین رہا کرتا تھا۔ اس کے خدشات کبھی کبھی سلیم کو بھی پریشان کر دیتے لیکن وہ احساس کی اس شدّت سے آشنا نہ تھا جو اختر کو مُضطرب رکھا کرتی تھی۔ سلیم نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس میں نکھری ہوئی بہاریں تھیں، اس میں قوس کے رنگ تھے، اس میں دھوپ اور چھاؤں کا امتزاج تھا۔ وہ اگر ایک لمحہ کے لیے سنجیدہ ہوتا تو فوراً ہی قہقہہ لگانے کے لیے بے قرار ہو جاتا۔ وہ ابھی تک ان دھڑکنوں سے نا آشنا تھا جو دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہیں۔

انتہائی اُنس اور محبّت کے باوجود سلیم کے لیے کبھی کبھی اختر کی صحبت بوجھل سی ہو جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب قوم کے سیاستدانوں اور لیڈروں پر نکتہ چینی کرنے کے بعد آنے والے دور کی بھیانک تصویریں پیش کرتا۔ سلیم محسوس کرتا کہ اختر خفا ہے۔ ساری دنیا سے خفا ہے اور پھر اپنے گاؤں کا کوئی واقعہ یا کوئی لطیفہ سُنا کر گفتگو کا موضوع بدلنے کی

کوشش کرتا۔ لیکن اختر کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا کہ آج اس کے کان ایسی باتوں کے لیے بند ہیں۔ اس کی خشمگیں نگاہیں سلیم کو خاموش کر دیتیں۔ وہ کہتا ”سلیم! ہم ایک آتش فشاں پہاڑ کے دھانے پر کھڑے ہیں۔ ہم پر ایک بہت ہی نازک وقت نے والا ہے۔ اجتماعی آلام و مصائب کا سامنا کرنے کے لیے جس اجتماعی شعور اور کردار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہم میں مفقود ہے۔ اگر ہم نے آنکھیں نہ کھولیں تو مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان میں ہمارا وہی حشر نہ ہو جو اسپین میں ہو چکا ہے۔“

اس قسم کی تقریریں سلیم کو پریشان کر دیتیں اور رات کے وقت جب وہ اپنے بستر پر لیٹتا تو اُس کے کانوں میں اختر کے الفاظ گونجتے۔ کچھ دیر وہ بے چینی میں کروٹیں لیتا، پھر اُس کے منتشر خیالات اپنے کانوں پر مرکوز ہو جاتے اور محسوس کرتا کہ وہ کسی بھیانک صحرا سے نکل کر نخلستان میں پہنچ گیا ہے۔ وہ نخلستان جہاں زندگی کی دائمی مُسکرائیں اور قہقہے ماضی، حال اور مستقبل کی قیود سے آزاد ہیں۔ وہ سو جاتا، اسے چڑیوں کے چہچہے سنائی دیتے، پچھلے پہر کھیت میں ہل چلانے والے کسان کے الغوزے کی آواز

سُنتا۔ جھیل کے شفاف پانی سے کنول کے پھول توڑتا۔ آم کے درخت کے ساتھ جھولا جھولتا اور گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر گھوڑا دوڑاتا۔ کبھی کبھی وہ سپنوں کی وادی کے اُن لوگوں تک پہنچ جاتا جہاں زندگی کے ابتدائی نقوش وقت کی ریت میں دب چکے تھے اور جب وہ میٹھے اور سہانے سپنوں کے بعد بیدار ہوتا تو اختر کی باتیں اسے وہم معلوم ہوتیں۔

☆☆☆☆☆

لیکن حال کے آئینے پر مستقبل کے چہرے کے جو خدوخال ظاہر ہو رہے تھے وہ تدریجاً بھیانک ہوتے گئے۔ زندگی کے اُفق پر گرد و غبار جسے سلیم محض وہم سمجھتا تھا نمایاں ہوتا گیا۔ اس نے بچپن میں اس قسم کی کہانیاں سُنی تھیں کہ ایک مسافر کسی شہر میں داخل ہوا۔ بازاروں اور گلیوں میں خوب چہل پہل تھی۔ کہیں برات کی دھوم دھام تھی اور کہیں مداریوں اور بازی گروں کے تماشے تھے، وہ ان دلچسپیوں میں کھو گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے لیکن اچانک اُفق پر گرد و

غبار کے بادل اُٹھے اور آن کی آن میں ایک تاریک آندھی چاروں طرف چھا گئی۔۔۔۔لوگ سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مسافر بدحواس ہو کر اُن سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم کیوں بھاگ رہے۔۔۔۔؟“ لیکن کسی نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ لوگ اس قدر خوفزدہ تھے کہ کسی میں بولنے کی ہمّت نہ تھی۔ بچّے، عورتیں، جوان اور بوڑھے سب چیختے چِلاّتے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اس سراسیمگی کی حالت میں کئی بچّے، بوڑھے اور اپاہج دوسروں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔

مسافر خوفزدہ ہو کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اچانک آندھی رُک گئی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں لیکن مسافر حیران تھا کہ طوفان گُزر جانے کے باوجود لوگوں کی سراسیمگی میں کمی نہیں ہوئی۔ وہ پہلے سے زیادہ بدحواس ہو کر ایک دوسرے کے اوپر ِگر رہے تھے۔ اچانک ایک مہیب دیو نمودار ہوا۔ اس کا رنگ سیاہ اور آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں۔ اس کے بڑے بڑے دانتوں سے رال ٹپک رہی تھی اور سر پر بالوں کی جگہ ہزاروں سانپ لہرارہے تھے اور زمین اس کے پاؤں تلے لرز رہی تھی۔

اس کے قہقہے بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہولناک تھے۔ وہ بچّوں، عورتوں اور آدمیوں کو پکڑ پکڑ ہوا میں اُچھالتا اور جب وہ گرتے تو انہیں اپنے پاؤں سے مسل دیتا۔ نوجوان لڑکیاں چیخیں مار مار کر کنویں، نہروں اور تالابوں میں کُود رہی تھیں۔ بعض لوگوں نے اپنے مکانوں کے دروازے بند کر رکھے تھے لیکن اس کے مضبوط ہاتھوں کے سامنے یہ دروازے کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ وہ انہیں ہاتھ پاؤں کی ایک ہی ضرب سے توڑ ڈالتا اور پھر قہقہہ لگا کر کہتا۔ ”اب تم کہاں جاسکتے ہو، آج میں آزاد ہوا ہوں۔ سالہا سال قید میں رہنے کے بعد آج پہلی مرتبہ مجھے آزادی ملی ہے۔ قید میں میرے ہاتھ پاؤں مضبوط زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور میں بے بسی کی حالت میں دانت پیستا رہا۔ میرے کان خوبصورت لڑکیوں کی چیخیں سُننے کے لیے بے قرار تھے۔ میرے ہاتھ تمہیں ہوا میں اُچھالنے اور میرے پاؤں میں مسلنے کے لیے بے چین تھے۔۔۔ تم چیخ رہے ہو۔۔۔۔۔ لیکن قید خانے کی تنہائیوں میں میری چیخوں کا تصوّر کرو۔ میں تمہاری ہڈّیوں کے تصوّر میں قید خانے کی آہنی سلاخوں کو مروڑا کرتا تھا اور میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ جایا کرتے

تھے۔ اس وقت میں یہ عہد کیا کرتا تھا کہ آزادی ملتے ہی جی بھر کر اپنے ارمان نکالوں گا۔ میں آج آزادی کا ناچ ناچوں گا۔ میرے لیے اپنی لاشوں کی سیج بچھا دو!"

بھارت ماتا ہندو سامراج کے اس عفریت کو جنم دے چکی تھی جس کے ذہن میں آزادی کا مفہوم دس کروڑ مسلمانوں کو حقوق آزادی سے محروم کرنا تھا۔ وہ سانپ اپنے بل سے سر نکالنے کے لیے بے تاب تھا جس کے زہر نے صدیوں پیشتر اچھوت کی رگوں سے زندگی کی حرارت چھین لی تھی۔ صدیوں پیشتر ہندو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اچھوتوں کا بلیدان دیا کرتا تھا اور دیوتاؤں نے اسے اچھوتوں کی بستیاں جلانے اور اُن کی جھونپڑیوں کی راکھ پر اپنے عشرت کدے تعمیر کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ صدیوں تک بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کے مظالم برداشت کرنے کے بعد اچھوت کی قوّتِ مدافعت ختم ہو چکی تھی۔ وہ پُر امن اور اُونچی ذات کے ہندوؤں کی تقدیس کے احترام میں اپنے تمام انسانی حقوق سے دست بردار ہو چکا تھا۔

لیکن اب ہندو کے سامنے دس کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ تھا اور یہ وہ قوم تھی جس نے اس ملک پر صدیوں تک حکومت کی تھی۔ ہندو نے اچھوت کو ورن آشرم کی آخری کڑی بنانے سے پہلے اپنی تلوار سے مغلوب کیا تھا لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں محمد بن قاسم کے زمانے سے لے کر احمد شاہ ابدالی کے زمانے تک کی تلوار بے اثر ثابت ہوئی۔ پانی پت کی رزم گاہیں ہندو کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھیں کہ تلوار کی جنگ میں وہ اس قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ پرانے دیوتاؤں سے مایوس ہو کر ایک نئے دیوتا کی اعانت کا طلب گار ہوا۔ یہ نیا دیوتا انگریز تھا۔

انگریز نے اس وقت ہندوستان میں قدم رکھے جب مسلمانوں کی سطوت کے ستون کھوکھلے ہو چکے تھے۔ تاہم ان کی آخری قوّتِ مدافعت جو بنگال میں سراج الدّولہ اور جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو کی شخصیتوں میں ظاہر ہوئی، انگریز کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھی کہ اس قوم کی خاکستر میں ابھی تک چنگاریاں موجود ہیں۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو کُچلنے کے لیے ہندو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد

مسلمان انگریز کی نظر میں اور زیادہ معتوب ہو گیا اور وہ چکّی کے دو پاٹوں، انگریز اور ہندو کے درمیان پسنے لگا۔

انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے اندر مغربی طرز کی جمہوریت کے تصوّر سے ہندو کی وہ پرانی جبلّت زندہ ہو رہی تھی جس نے برہمن کی تقدیس کا چولا پہن کر ذات کو ہمیشہ کے لیے حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا تھا۔ ہندو جانتا تھا کہ ایک مرکز کے تحت جمہوری نظامِ حکومت میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو بھی سیاسی اور اقتصادی اچھوت کا درجہ قبول کرنے پر مجبور کر سکے گا۔ چنانچہ ہندو ورن آشرم کی جگہ ہندی نیشنل ازم نے لے لی۔

☆☆☆☆☆

ہندی نیشنل ازم آل انڈیا کانگریس کا لبادہ پہن کر میدان میں آیا۔ اس نئی تحریک کے اغراض و مقاصد منو جی کے ورن آشرم سے مختلف نہ تھے۔ صرف اتنا فرق تھا کہ منو جی کی تحریک نے برہمن کی تذلیل کا سہارا لیا تھا اور کانگریس کی تحریک ہندو اکثریت کے بل بوتے پر رام راج قائم کرنا

چاہتی تھی۔ منو جی کے ہاتھ میں تیز چھری تھی اور اس نے بلا تامّل، اچھوتوں کو ذبح کر کے برہمن کے قدموں میں ڈال دیا۔ لیکن گاندھی کی آستین میں ایک زہر آلو نشتر تھا جسے استعمال کرنے سے پہلے وہ مسلمانوں کو رسیوں میں جکڑ لیا ضروری سمجھتا تھا۔ منو جی نے اچھوت کو دھتکارا تھا لیکن گاندھی کو خطرہ تھا کہ قوم جسے نابود کرنے کا کام سماج کے مقدس دیوتاؤں نے اسے سونپا ہے، سو رہی ہے، مردہ نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ اپنا زہر آلود نشتر آزمانے سے پہلے انہیں بے ہوشی کے ٹیکے لگانا ضروری سمجھتا تھا۔ گاندھی کا طریقہ کار وہی ہوتا جو منو جی کا تھا تو مؤرّخ شاید پانی پت کی ایک اور جنگ دیکھتے اور دہلی کے لال قلعے پر جو جھنڈا انگریز کے جانے کے بعد لہرایا جاتا اس پر اشوکا کے چکر کی بجائے محمد بن قاسم کی تلوار کا نشان ہوتا۔ گاندھی نے ہندو اکثریت کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے اچھوتوں کے لیے بھارت ماتا کی گود کشادہ کر دی۔ ان کے لیے چند مندروں کے دروازے کھل گئے۔ انہیں سماج کے مقدس بیٹوں کے چند کنویں بھرشٹ کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور وہ صدیوں کے بعد ایک کروٹ لے کر پھر

بھارت ماتا کے قدموں میں سو گئے۔۔۔۔۔ مسلمانوں کا مدافعانہ احساس کُچلنے کے لیے گاندھی نے انہیں آزادی کا سراب دکھایا۔ تحفظات کا مطالبہ کرنے والوں کو تنگ نظر، فرقہ پرست، انگریز کے ایجنٹ اور وطن کی آزادی کے دشمن کہا گیا۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ اس وقت بھی موجود تھے جو اس سراب کی حقیقت سے واقف تھے۔ جو گاندھی کی آستین میں چھپے ہوئے خنجر کو اپنی شاہ رگ کے قریب آتا دیکھ رہے تھے، جو ہندو مقاصد کی چٹان کو بتدریج پانی سے اُبھرتا ہوا دیکھ کر قوم سے کہہ رہے تھے کہ وہ تمہاری ناؤ رام راج کی اس خطرناک چٹان کی طرف دھکیل رہا ہے جس کے ساتھ ٹکرا کہ یہ پاش پاش ہو جائے گی اور اچھوتوں کی طرح موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

لیکن ایسی آوازیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں، گول میز کانفرنس نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ کانگریں جس انقلاب کا نعرہ لگا رہی ہے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انگریز کی حکومت کے بعد مسلمان اپنا سیاسی مستقبل ہندو اکثریت کو سونپ دیں۔

کانگرس نے کئی بار حکومت کے ساتھ سودا کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کی پہلی شرط تھی کہ اگر اقلیتوں کو نظر انداز کر کے اس کی واحد نمائندگی کو تسلیم کر لے لیکن انگریز دس کروڑ مسلمانوں کے وجود سے بھی انکار نہ کر سکا۔ بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کی تسکین کے لیے دس کروڑ مسلمانوں پر اپنی سنگینوں کا پہرا بٹھانے میں اُسے کوئی مصلحت نظر نہ آئی۔ انگریز سے متعلّق کانگریس کی پالیسی میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ گاندھی جی کی آتما نے کئی چولے بدلے۔ لیکن مسلمانوں کے متعلق ان کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ تاہم آزادی کے نعروں میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ مسلم عوام کا جوش و خروش ابھی تک کانگریس کے ساتھ تھا۔

☆☆☆☆☆

مسلمانوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگرس جسے آزادی کہتی تھی، وہ ہندو اکثریت کی حکومت کا دوسرا نام تھا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات نے پہلی بار کانگریس کی حکومت ہندوستان کے

سات صوبوں پر مسلط کر دی۔ ہندو سیاستدانوں نے مسلمانوں کو نرغے میں لینے کے لیے جس قدر اطمینان اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسی قدر وہ نرغے میں پھنسے ہوئے شکار کو مغلوب کرنے کے لیے جلد بازی پر اُتر آئے۔۔۔۔واردھائی مہاتما کا زہر میں بجھا ہوا نشتر اب آستین سے باہر آچکا تھا۔۔۔۔۔رام راج کی برکات واردھا و دیا مندر جیسی ناپاک اسکیموں کی صورت میں نازل ہونے لگیں۔ ربِّ کعبہ کے سامنے سر بسجود ہونے والی قوم کے بچّوں کو مدارس میں گاندھی کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھنے کا سبق دیا جاتا۔ محمدؐ عربی کی نعت پر چلنے والوں کو بندے ماترم کا ترانہ سکھایا جارہا تھا۔ دخترانِ توحید کے نصابِ تعلیم میں دیو داسیوں کے رقص شامل کئے جا رہے تھے۔۔۔۔ مسلمانوں کے حلق میں یہ زہر انڈیلنے کے لیے ان تجاویز کے بانیوں نے وہ ہاتھ منتخب کیے جن کی اُنگلیوں پر ابھی تک قرآن حکیم کی تفسیریں لکھنے والے قلم کی سیاہی کے نشان موجود تھے۔ رام راج کی بقا کے لیے مسلمانوں کے تمدّن کے علاوہ ان کی زبان بدلنے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ چنانچہ اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی جدوجہد زیادہ شد و مد کے ساتھ شروع ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے مکمل استیصال کے لیے گاندھی جس موقع کا منتظر تھا، وہ ابھی تک نہیں آیا تھا لیکن ہندو عوام جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف محاذ بنانے کے لیے یہاں تک گوارا کر لیا تھا کہ اچھوت ان کے چند مندروں کو بھرشٹ کر ڈالیں، کینہ اور نفرت کے ان جذبات کو دیر تک چھپا کر نہ رکھ سکے، جن کی اساس پر ہندو نیشنل ازم کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ چنانچہ وسط ہند کے صوبوں میں لوٹ مار اور قتل کی وارداتیں شروع ہوئیں۔ جس شہر یا گاؤں میں ہندو مسلمانوں پر حملہ کرتے، وہاں کانگریس حکومت کی پولیس ثالث بن کی پہنچتی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیے ذلیل ترین شرائط ماننے پر مجبور کیا جاتا۔

مسلم لیگ کی طرف سے مصالحت اور تعاون کی پیش کش ٹھکرائی جا چکی تھی۔ جوہر لال نہرو کے یہ الفاظ فضا میں گونج رہے تھے ”ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں، ایک انگریز، دوسری کانگریس۔“

رام راج کا یہ دور اگرچہ مختصر تھا تاہم سنجیدہ مسلمانوں کو یہ احساس دلانے

کے لیے کافی تھا کہ اگر انہوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو اندلس کی تاریخ ہندوستان میں بھی دُہرائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلمانوں کے مدافعانہ شعور کی عملی صورت پاکستان کی قرارداد کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ پاکستان کا مطالبہ سراسر مدافعانہ تھا۔ مسلمان ہندو فسطائیت کے اُٹھتے ہوئے سیلاب کے سامنے ایک دفاعی خط کھینچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے صوبوں میں آزادی اور خود مختاری کا حق دے کر اپنی اکثریت کے صوبوں میں آزادی اور خود مختاری کا حق مانگا تھا۔ انہوں نے ہندوستان کے تین چوتھائی حصّے پر ہندو اکثریت کا حق تسلیم کر لیا اور اپنے لیے جو علاقہ مانگا تھا وہ ان کی مجموعی آبادی کے تناسب سے بھی کم تھا لیکن ہندو ایک مرکز کے ماتحت درّۂ خیبر سے لے کر خلیج بنگال تک اپنی اکثریت کے دائمی تسلّط کے خواب دیکھ چکا تھا۔ واردھا کے صنم خانوں میں وہ اسکیمیں تیّار ہو چکی تھیں جن کی بدولت چند سال میں مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی اور روحانی اعتبار سے یتیم بنایا جاتا تھا۔

مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان پر متحد ہوتا دیکھ کر بھارت کے بیٹوں نے

محسوس کیا کہ شکار ہاتھ سے جا رہا ہے۔ مرغ حرم نے مستند قومیت کے اس دامِ فریب کو پہچان لیا ہے، جسے بظاہر بے ضرر بنانے کے لیے عدم تشدّد کی بھٹی سے رنگ دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ تلملا کر رہ گئے۔ جال بچھانے والے شکاری جو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ منتشر پرندے بے تحاشا ان کی شکار گاہ کا رُخ کر رہے ہیں۔ انہیں کسی اور طرف مائلِ پرواز دیکھ کر اپنی اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئے۔ اضطراری حالت میں انہوں نے اپنے چہروں سے وہ نقاب اُتار کر پھینک دیے جو مسلمانوں کو دھوکا دے رہے تھے۔ مسلمان یہ دیکھ رہا تھا کہ آزاد خیال ہندو، تنگ نظر ہندو، دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے ہندو، دیوتاؤں سے بیزاری ظاہر کرنے والے ہندو، اچھوت کو گلے لگانے والے ہندو اور اچھوت کو سب سے زیادہ قابلِ نفرت مخلوق سمجھنے والے ہندو، انگریز کی خوشامد اور چاپلوسی سے اقتصادی مراعات حاصل کرنے والے ہندو اور فقط بکری کے دودھ اور پھلوں کے رس پر قناعت کر کے انگریز کو مرن برت کی دھمکیاں دینے والے ہندو سب ایک تھے۔ کفر اپنے ترکش کے ہر تیر کو جمع کر چکا تھا لیکن مسلمان ابھی تک بکھرے ہوئے تیروں اور ٹوٹی ہوئی کمانوں کو گِن رہے

تھے۔

اگر مسلمان پاکستان کا مطالبہ دس سال [2] پہلے کرتے تو عدم تشدد کے دیوتا اور اس پجاری اس وقت بھی اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو جاتے اور مسلمانوں کو اپنی مدافعانہ تیّاریوں کا موقع مل جاتا۔ لیکن انہیں اس وقت اپنے ٹوٹے ہوئے مکان کی چھت اور دیواروں کی مرمّت کی فکر ہوئی جب اُفق پر چاروں طرف تاریک گھٹائیں اُٹھ رہی تھیں۔ ہندو جس یقینِ محکم کے ساتھ اپنے جارحانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ رہا تھا، وہ مسلمانوں میں مفقود تھا۔ نیم خوابی کی حالت میں وار دھائی مکر و فریب کے پھندے دیکھنے کے بعد مسلمان اونگھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے پاکستان کی منزلِ مقصود کا رُخ کر رہے تھے۔

ہندو نے جہاں گزشتہ پندرہ بیس برس میں اپنی قوم کو متحد اور منظّم کر لیا

[2] ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ دس سال قبل پاکستان کو مسلمانوں کی منزلِ مقصود قرار دے چکے تھے لیکن اس وقت اسے شاعر کا ایک خواب سمجھا گیا تھا۔ چودھری رحمت علی غالباً تحریکِ پاکستان کے اوّلین محرکوں میں سے ایک ہیں جو پاکستان کو اپنا مقصدِ حیات بنا چکے تھے لیکن وہ ایک محدود طبقے کو متاثر کر سکے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور سیاسی شعور کے فقدان کے علاوہ یہ بھی تھی کہ ہندو فسطائیت ابھی تک مکر و فریب کے کئی چولوں میں چھپی ہوئی تھی۔

تھا، وہاں مسلمانوں کے اندر انتشار کے کئی بیج بو دیے تھے۔ وہ اس بات کے لیے تیّار تھا کہ اگر متحد قومیّت، عدم تشدد اور وطنیت کی لوریاں مسلمانوں کو موت کی نیند نہ سلا سکیں اور وہ اپنی شاہ رگ کے قریب اس کا زہر آلود خنجر دیکھ کر چونک پڑیں تو اُن کے حلق میں زہر خواب آور گولیاں ٹھونسنے کے لیے ان بزرگانِ دین کے ہاتھ استعمال کیے جائیں جن کا جُبّہ اور دستار یہ ظاہر کرتا ہو کہ جنّت کی راہ دکھانے والے یہیں ہیں۔ چنانچہ کانگریس ان ملّت فروشوں کی ایک جماعت تیّار کر چکی تھی جو ایک ہاتھ سے مسلمانوں کو قرآن دکھاتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اُن کے گلے میں ہندو کی غلامی کا طوق پہنانا چاہتے تھے۔

☆☆☆☆☆

تجربہ کار شکاری جب یہ دیکھتے ہیں کہ پرندے ان کے جال کو پہچاننے لگے ہیں تو وہ سدھائے ہوئے ہم جنس پرندوں کو پنجروں میں بند کر کے جال کے آس پاس جھاڑیوں میں چھپا دیتے ہیں۔ ان سدھائے ہوئے پرندوں کی بولی سے آس پاس بھٹکنے والے پرندے دھوکا کھا کر جال میں پھنستے

ہیں۔ اس طریقہ سے عام طور پر تیتر اور بٹیر کا شکار کیا جاتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں کو بلا خطر جال کی طرف آنے کی ترغیب دینے والے تیتروں یا بٹیروں کو شکاریوں کی اصطلاح میں بلاوے[3] کے تیتر یا بٹیر کہا جاتا ہے۔

تلیروں کے شکار میں یہ طریقہ کار بدلنا پڑتا ہے۔ سیر تلیر شکاریوں کی ہزار ناز برادری کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو جال کی طرف رُخ کرنے کا بلاوا نہیں دیتا۔ اس لیے اسے دھوکا دینے کے لیے ممولے کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ممولا گھریلو چڑیا سے قدرے بڑا ہوتا ہے اور تلیر اسے اپنا پیدائشی دُشمن خیال کرتا ہے۔ شکاری ممولے کو پکڑ کر پھندے کے قریب باندھ دیتے ہیں اور تلیروں کا غول اُسے دیکھتے ہی پھندے یا جال سے بے پرواہ ہو کر اس پر حملہ کر دیتا ہے۔

واردھا کے کہنہ مشق شکاری نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان ہندو سامراج کے دامِ فریب سے خطرہ محسوس کر کے پاکستان کی منزل کا رُخ کر رہے ہیں تو اس نے نام نہاد علمائے دین کے اس گمراہ ٹولے کو آگے کیا جو خدا

[3] پنجابی میں "بلارا بھی کہتے ہیں"

پرستی سے توبہ کرکے اُن کا پجاری بن چکا تھا۔ جو محمدؐ عربی کے دامن کا سہارا چھوڑ کر لنگوٹی والے مہاتما سے رشتہ جوڑ چکا تھا۔ ان لوگوں کو وہی کام سونپا گیا جو شکاری بلاوے کے تیروں اور بٹیروں سے لیتے ہیں۔ یہ علما ہندو سامراج کا جال بچھانے والے شکاریوں کی سکھائی ہوئی بولیاں بول رہے تھے۔ ”مسلمانو! آؤ یہ تمہاری آزادی کی منزل ہے۔ دیکھو ہم آزاد ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ تمہیں یہاں پھنسانے کے لیے کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، یہاں اناج بھی ہے اور پانی بھی۔ پاکستان بھوکا ہے۔ تمہیں وہاں یہ نعمتیں نہیں ملیں گی۔ ہمیں دیکھو! ہمیں پہچانو! ہم تمہارے لیڈر رہیں! ارے! تم یہ سمجھتے ہو کہ ہندو تمہیں کھا جائے گا؟ یہ ہندو جس پر تم نے برسوں حکومت کی ہے! کیا یہ بزدلی نہیں کہ تم ہندو سے تحفظات مانگتے ہو؟ خدا کی قسم جب ہندو سے اپنے حقوق لینے کا وقت آئے گا تو ہم اس کے کان پکڑ کر اپنے مطالبات منوائیں گے۔ اگر ہندو کی نیّت خراب ہوتی تو ہم اس کے ساتھ کیوں ہوتے؟ وہ لوگ تمہارے خیر خواہ نہیں جنھوں نے تمہیں مہاتما گاندھی جیسے بے ضرر انسان سے بدظن کیا ہے۔ مہاتما جی نے تمہارے لیے قیدیں کاٹیں، بکری کا دودھ پیا،

چرخہ چلایا اور مرن برت رکھے۔ تمہارے یہ لیڈر جو ہمیں مہاتما گاندھی سے بد ظن کرتے ہیں، وطن کی آزادی کے دشمن ہیں۔ اسلام کے دشمن ہیں۔ خدا کے دشمن ہیں۔ ان کا ساتھ چھوڑ دو۔ پاکستان کا خیال ترک کر دو۔ آؤ! یہاں آؤ! یہاں دانے اور پانی کی فراوانی ہے۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں آئے گا۔ آؤ! ہمارے ساتھ مل کر نعرہ لگاؤ۔ انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!!"

ایک طرف یہ "بلاوے" کے پرندے ہندو سامراج کی حمایت کے لیے نیشلسٹ مسلمانوں کی جماعت تیّار کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندو پریس مَمولے کی مدد سے تیروں کے پھانسنے کے طریقِ کار پر عمل کر رہا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان سے قبل جب بھی محسوس کرتے تھے کہ مسلمان تحفظات کے لیے مصر ہو رہے ہیں، تو انگریز کے خلاف چند نعرے لگا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرح تلیر مَمولے کو دیکھ کر شکاری اور اس کے پھندے سے بے پرواہو جاتے ہیں، اسی طرح ہندو کے متعلق مسلمان کے شکوک اور شبہات انگریز دشمنی کے جذبات میں دب

کر رہ جاتے۔ حریّت پسند مسلمان ہندوؤں کا ساتھ دے کر جیلوں میں چلے جاتے، پھر گاندھی جی مرن برت رکھ کر یا کسی اور بہانے سے جیل سے باہر آ جاتے اور حکومت کے ساتھ مصالحانہ باتوں کا دور شروع ہوتا۔ ہندو کچھ مراعات حاصل کر لیتے یا مراعات حاصل کرنے میں ناکام رہتے۔ بہرحال مسلمانوں کی مدافعانہ تحریک قصّۂ ماضی بن کر رہ جاتی۔

مسلمانوں کو پاکستان کے محاذ سے بہکانے کے لیے کانگریس نے اُن کے سامنے آخری بار انگریز کا ممولا رکھا۔ چنانچہ ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے یہ نعرے بلند ہونے لگے ”مسلم لیگ انگریز کی آلۂ کار ہے۔ قائدِ اعظم اگر پاکستان کے مطالبہ پر بضد رہا تو انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر جنگ کے بعد بھی اس ملک میں اپنے پاؤں جمائے رکھے گا۔ پاکستان مسلمانوں کا مطالبہ نہیں بلکہ انگریز کی شرارت ہے، لہٰذا یہ وطن سے غدّاری کے مترادف ہے اور اسلام کی تعلیمات کے صریحاً خلاف۔ اس ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ انگریز نے پیدا کیا ہے۔ انگریز ہمارا اصلی دشمن ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی کانگرس مختلف طریقوں سے حکومت پر زور دے رہی تھی کہ وہ پاکستان کے خلاف فوراً کوئی اعلان کرے ورنہ کانگریس اس کی جنگی سرگرمیوں میں رخنہ انداز ہونے سے دریغ نہیں کرے گی۔ انگریز ہر قیمت پر ہندو کی ناز برداری کے لیے تیّار تھا لیکن وہ مجبور تھا۔

اٹلی، جرمنی اور جاپان کے خلاف لاکھوں مسلمان سپاہی انگریز کے دوش بدوش لڑ رہے تھے اور انگریز ہندو مہاشوں کے تعاون کی اُمّید پر پاکستان کی مخالفت سے ان لوگوں کے احساسات مجروح کرنے کے لیے تیّار نہ ہوا۔

کانگریس کبھی چاپلوسی اور کبھی دھمکیوں سے کام لے رہی تھی۔ اسے اس بات پر اصرار نہ تھا کہ انگریز اس ملک کو فوراً خالی کر دیں، وہ صرف یہ وعدہ لینا چاہتی تھی کہ وہ اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت اقلیتوں کو نظر انداز کریں گے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں یورپ میں ہٹلر کا طوطی بول رہا تھا۔ یورپ کی سلطنتوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد جرمن افواج روس پر یورش کر رہی تھیں

اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سیل ہمہ گیر کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ جرمنی کی آبدوزیں امریکہ کے ساحلوں کا طواف کر رہی تھیں، لندن پر بمباری ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی گاندھی جی کی آتما کو ان باتوں سے دکھ پہنچتا اور وہ فریقین کو عدم تشدد کا سبق دیتے لیکن جب جاپان میدانِ جنگ میں کود پڑا تو عدم تشدد کے دیوتا نے انگریز کی شکست کے متعلق پُر امید ہو کر ہندو سامراج کے احیا کی تمام توقعات جاپانیوں کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ چنانچہ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع ہوئی۔ کانگریس کے مہاتما نے کسی زمانے میں کہا تھا کہ کامل آزادی سے میرا مطلب یہ ہے کہ بیرونی حکومت انگریز کی ہو اور اندرونی تسلّط ہمارا ہو۔۔۔ اب کامل آزادی کے لیے انگریز کی بجائے جاپان کے بیرونی تسلّط کے لیے راہ صاف کی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ ہندو کو یقین تھا کہ وہ اس نازک موقع پر اپنے آپ کو انگریز کا دُشمن ظاہر کر کے اس ملک کے نئے فاتحین یعنی جاپانیوں کی نگاہ میں انعامات کا مستحق سمجھا جائے گا۔ کم از کم جاپانی مسلم اقلیت کے حقوق کے متعلّق اس کے نقطۂ نظر کی حمایت ضرور کریں گے۔ لیکن یہ شاید مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ جاپانیوں کا سیلاب برما سے آگے نہ

بڑھ سکا اور عدم تشدّد کے دیوتا کے پجاری چند پل توڑنے، ٹیلی فونوں کے تار کاٹنے، پوسٹ آفس جلانے، چند بابوؤں کو دھول دھپا کرنے، چند چپراسیوں کی وردیاں پھاڑنے اور بعض سرکاری عمارتوں سے انگریز کا جھنڈا اُتار کر اس کی جگہ کانگریس کا جھنڈا لہرانے کے بعد خاموش ہو گئے۔ مشرق کا وہ نیا دیوتا جو کانگرسی دیش بھگتوں کے خیال کے مطابق بھارت ماتا کی عظمتِ رفتہ کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لے آ رہا تھا منی پور سے آگے نہ بڑھ سکا۔

☆☆☆☆☆

سلیم ایک ادیب کی حیثیت میں اپنے ہوسٹل کے لڑکوں کا ہیرو بن چکا تھا۔ اس کی شاعری میں برسات کی ندیوں کی روانی، پرندوں کی موسیقی اور بہار کے پھولوں کی رعنائی تھی۔ اس کے افسانے اور مضامین دیہاتی زندگی کی مُسکراہٹوں اور قہقہوں کے آئینہ دار تھے۔ لیکن اختر جس نے شروع شروع میں اس کی حوصلہ افزائی کی تھی، اب اس کے ادبی رجحانات بدلنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ ”سلیم!“ وہ کہتا۔ ”تم بہت اچھا کہتے ہو۔ تم

خوب لکھتے ہو۔ لیکن یہ بے مقصد ادب اس قوم کے لیے مفید نہیں جس کے گرد چاروں طرف سے آلام و مصائب کی آندھیاں گھیر اڈال رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تمہارے گاؤں کی قُمریوں کے ترانے دل کش ہیں، تمہارے باغ کے پھولوں کی مہک خوشگوار ہے اور تمہارے افسانوں کے دیہاتی کردار بے حد دلچسپ ہیں لیکن تم اس طوفان کو نظر انداز کر رہے ہو جو کسی دِن ان دلفریب مُسکراہٹوں کو آنسوؤں میں تبدیل کر دے گا۔ اس آگ سے آنکھیں بند کر رہے ہو جو تمہارے خرمن کو راکھ کا انبار بنانے والی ہے۔ بے شک تمہارے گاؤں کی محفلیں دلچسپ ہیں لیکن اس قوم کے متعلّق سوچو جو ہزاروں برس پہلے اس ملک میں آزادی اور بے فکری کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس قوم کے شاعر تمہاری طرح برسات کی ندیوں کے نغمے سُنتے ہوں گے۔ موسمِ بہار کے پھولوں سے باتیں کرتے ہوں گے، اور پھر تمہارے گاؤں کے لوگوں کی طرح وہ اپنی اپنی بستیوں میں محفلیں منعقد کرتے ہوں گے۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر وہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوں گے، جو تمہارے گاؤں میں ہوتی ہیں لیکن بھیڑیا خصلت انسانوں کا ایک گروہ آیا۔ اس نے یہ بستیاں اُن سے چھین لیں اور

یہ محفلیں درہم برہم کرڈالیں۔ جانتے ہو وہ لوگ کون ہیں؟“

اور پھر وہ خود ہی جواب دیتا۔ ”یہ ہندوستان کے سات کروڑ اچھوت ہیں جو آرین حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکے اور مغلوب ہونے کے بعد اس ملک کے سیاسی، روحانی اور اقتصادی یتیم بن کر رہ گئے۔۔۔۔ سلیم! تم کہو گے کہ وہ احمق تھے جو دُشمن کے مقابلے میں سر دھڑ کی بازی نہ لگا سکے لیکن ان کے شاعروں اور مفکّروں کو کیا کہو گے جو انہیں بر وقت جگا نہ سکے، جو اس وقت بھی جب دشمن سر پر کھڑا تھا، الاؤ کے گرد یا درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر انہیں میٹھے راگ اور دلچسپ کہانیاں سناتے رہے؟ میرے دوست! نفرت اور حقارت کا وہ طوفان جس نے برہمن کی تقدیس کا لبادہ اُوڑھ کر اچھوتوں کو تباہ و برباد کیا تھا، آج صدیوں کے بعد پھر اُٹھ رہا ہے اور اس مرتبہ اس کا رُخ ہماری طرف ہے۔ ہندو سماج کا احیا شدہ نیشنل ازم کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اگر ہم اس طوفان کا مُقابلہ نہ کر سکے تو ہمارا حال اچھوتوں سے بھی بُرا ہو گا۔ اچھوتوں کو ہندو سوسائٹی کا قابلِ نفرت حصّہ بن کر زندہ رہنے کی اجازت مل گئی لیکن ہمارے لیے دو ہی راستے

ہوں گے، موت یا ترکِ وطن۔"

"سلیم!" اختر کے لہجے میں سختی آ جاتی۔ "اگر تم اجتماعی زندگی کا شعور نہیں رکھتے تو کم از کم اس گاؤں کے لیے جس کی حسین فضاؤں میں تم نے نغمے اور قہقہے دیکھے ہیں، آنے والے خطرات کا احساس کرو۔ جب طوفان دوسری ہزاروں بستیوں کو تباہ و ویران کر دے گا تو تمہارا گاؤں اس لیے نہیں بچ رہے گا کہ وہاں تم جیسے شاعر نے پرورش پائی ہے۔ بربریت کے ہاتھ جب ہزاروں محفلیں ویران کریں گے تو تم انہیں یہ کہہ نہیں روک سکو گے کہ اس محفل کی طرف مت بڑھو۔ یہاں میں نے مُسکرانا اور ہنسنا سیکھا ہے۔ اس وقت تمہیں یہ سمجھ آئے گی کہ اجتماعی آلام و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت تم کہو گے کہ کاش میں قوم کو، میٹھے اور سہانے نغمے سُنانے کی بجائے جھنجھوڑ کر جگاتا۔"

پھر سلیم کا چہرہ دیکھ کر اختر کے لہجے میں ملائمت آ جاتی۔ "سلیم! میری باتیں ذرا تلخ ہیں لیکن میں حقیقت کے چہرے پر حسین پردے نہیں ڈال

سکتا۔ قدرت نے جو صلاحیتیں تمہیں دی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اُن کا استعمال غَلَط نہ ہو۔ تمہاری تحریر میں جادو ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جادو قوم کو سُلانے کی بجائے جگانے کے کام آئے۔ موجودہ حالت میں صرف پاکستان ہی ہماری بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہی وہ چٹان ہے جس پر کھڑے ہو کر ہم ہندو فاشزم کے سیلاب کا مُنہ پھیر سکیں گے۔ شاعروں اور ادیبوں نے کئی اقوام کو موت کی نیند سُلانے کے لیے لوریاں دی ہیں۔ لیکن ایسے شاعر بھی تھے، جن کے الفاظ نے شکست کھا کر پیچھے ہٹنے والی فوج میں نئی روح پھونک دی۔ قرونِ اولیٰ میں ہمیں ایسے شعراء کی کئی مثالیں ملتی ہیں جو روم و ایران میں اسلام کی عظمت کے پرچم لہرانے والے مجاہدین کے دوش بدوش جہاد کیا کرتے تھے۔۔۔۔ آج کا شاعر اگر پاکستان کی اہمیّت محسوس نہیں کرتا تو میں کہوں گا کہ وہ اپنے ماحول سے بیگانہ ہے۔"

اختر کے ساتھ ایسی ملاقاتوں کے بعد سلیم اپنے دل میں نئے ارادے اور نئے ولولے لے کر اُٹھتا۔ اسے اپنے گاؤں کی محفلیں عزیز تھیں اپنے

کھیتوں اور باغوں کے پھول پیارے تھے۔ اسے ان سیدھے سادے لوگوں کے قہقہوں اور مسکراہٹوں سے اُنس تھا جو وقت کو منٹوں اور سیکنڈوں کے پیمانے کی بجائے دِنوں، مہینوں اور برسوں کے پیمانے سے ناپا کرتے تھے، پھر اُسے جگر دوز چیخیں سنائی دیتیں، اپنے گاؤں کی عورتوں اور بچّوں کی چیخیں۔ وہ کپکپا اُٹھتا۔۔۔۔ وہ اس دیو کو روکنے کے لیے پاکستان کی چار دیواری کی ضرورت محسوس کرتا۔ وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتا اور پاکستان کے متعلّق کوئی مضمون شروع کر دیتا۔ وہ ظالم ہیں، وہ سامراجی ہیں، وہ فسطائی ہیں، وہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو آریا فاتحین نے ہندوستان کی مفتوح اقوام کے ساتھ کیا تھا۔۔۔ لیکن کیوں؟ وہ سوچتا۔ ”کیا وہ انسان نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا سلوک کیونکر کرسکتا ہے۔۔۔۔؟“

پھر وہ خود ہی جواب دیتا۔ ”کیا ہندوستان کے قدیم باشندے انسان نہ تھے اور برہمن نے انسان ہوتے ہوئے۔۔۔؟ لیکن وہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اب دنیا میں علم کی روشنی پھیل چکی ہے۔ سلیم اپنے دل کو تسلّی دیتا۔

حقیقت کا بھیانک چہرہ تھوڑی دیر کے لیے تصوّرات کے خوشگوار دُھندلکے میں چھُپ جاتا اور اس دُھندلکے میں اُڑتا ہو وہ اپنے گاؤں میں پہنچ جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچّے اسے دیکھتے ہی شور مچاتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے۔ مسلمانوں کے بچّے، سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچّے، وہ سب سے پیار کرتا تھا۔۔۔۔ وہ اس سے لپٹ جاتے۔۔۔۔ کوئی اس کے کندھے پر سوار ہونے کی کوشش کرتا۔ کوئی اس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ٹھونس دیتا۔ مٹّی سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کی شلوار یا پتلون کا ستیاناس کر دیتے۔ وہ انہیں کھانڈ کی ٹکیاں یا کوئی اور کھانے کی چیز تقسیم کرتا۔ بچّے ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر اپنا ہاتھ آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ''بھائی جان مجھے دو، مجھے دو!'' سلیم کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ یہ روشنی کا زمانہ ہے۔ وہ مطمئن سا ہو کر قلم رکھ دیتا لیکن اچانک وہ دل کی ایک اور آواز سُنتا۔ ''کیا اس روشنی کے زمانے میں ان دیوتاؤں کی پوجا نہیں ہوتی جن کے سامنے کبھی اچھوتوں کا بلیدان دیا جاتا تھا۔۔۔۔؟''

☆☆☆☆☆

کالج کی علمی اور ادبی مجالس کی طرح ہوسٹل کی بزمِ ادب بھی کبھی کبھی جلسے کیا کرتی تھی۔ اِن جلسوں میں عام طور پر ٹھوس علمی و ادبی مباحثوں کی نسبت ہنسنے اور ہنسانے کی باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ مشاعرہ ہوتا تو سُن کر داد دینے والوں کی نسبت سُنے اور سمجھے بغیر شور مچانے والوں کی تعداد عام طور پر زیادہ ہوتی اور گھبرائے ہوئے اور سہمے ہوئے نوجوان شعراء کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ انہیں داد مل رہی ہے یا گالیاں!

کسی موضوع پر مباحثہ ہوتا تو ہوسٹل کے زندہ دِلوں کا ایک گروہ پہلے ہی فیصلہ کر کے آتا کہ آج کِس کے لیے تالیاں بجانی ہیں اور کِس کی بات پر قہقہے لگانے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکے اختر کو بھی اِن جلسوں میں کھینچ لاتے۔ اختر اب پاکستان کا مبلّغ ہو چکا تھا لیکن اُس کے ایک اور ہم جماعت الطاف کو پاکستان کے نام سے چِڑ تھی۔ وہ گاندھی کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان اور اُس کے ان مسلمان چیلوں کو اپنی روحانی اور سیاسی پیشوا سمجھتا تھا جو رام راج کی ضروریات کے مطابق آیاتِ ربّانی کی تفسیریں کیا کرتے

تھے۔ کالج میں بھی وہ طالبِ علموں کے اُس گروہ کا لیڈر تھا جو نیشنلسٹ کہلانے کے لیے کبھی کھدّر پہن لیا کرتے تھے۔۔۔ اختر تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو الطاف اُٹھ کر احتجاج کرتا۔ ”صاحبِ صدر! پاکستان ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اختر کی تقریروں سے وطن پرست مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، اس لیے اِس موضوع پر بولنے کی اجازت نہ دی جائے۔“

الطاف کے ساتھی یکّے بعد دیگرے اس کی تائید میں کھڑے ہو جاتے۔ اس کے جواب میں اختر کے حامی اُٹھتے۔ ”ہم اختر کی تقریر ضُرور سُنیں گے۔“ جب دونوں طرف کا جوش و خروش اِنتہا کو پہنچ جاتا تو آفتاب، چھ فِٹ کا ایک قوّی ہیکل پٹھّان اُٹھ کر صاحبِ صدر کی میز کے قریب آ جاتا اور ایک فیصلہ کُن انداز میں کہتا۔ ”الطاف! اگر تم اختر کی تقریر نہیں سُن سکتے تو باہر نکل جاؤ۔ ورنہ ہم خود نکال دے گا۔ تُم خوامخواہ ہر جلسے کو خراب کرتے ہو۔“

سلیم اپنے دونوں ہاتھ الطاف کے کندھوں پر رکھ دیتا۔ ”الطاف صاحب!

تشریف رکھیے نا!!"

یہ الفاظ جس قدر نرم ہوتے اُسی قدر الطاف کے کندھوں پر اُن کا دباؤ ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا۔ "الطاف صاحب!" سلیم کے ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ سخت ہو جاتی۔ کالج کا ایک اور طالبِ علم منصور بھی کبڈی کا مشہور کھلاڑی تھا۔ اُس کی کلائیاں الطاف کی پنڈلیوں کے برابر تھیں۔ وہ سلیم کا اشارہ پا کر آگے بڑھتا اور مُسکراتا ہوا اپنا ایک ہاتھ الطاف کے کندھے پر رکھ دیتا اور اپنے مخصوص انداز میں کہتا۔ "ارے یار! کیوں سر کھپا رہے ہو۔ بیٹھ بھی جاؤ!"

الطاف بیٹھ جاتا۔ شور اور ہنگامے میں بہت کم لڑکوں کو اِس بات کا احساس ہوتا کہ وہ بیٹھا نہیں، بِٹھایا گیا ہے۔

سلیم اب دوسرے لڑکوں سے مخاطب ہو کر بُلند آواز میں کہتا۔ "بھئی بیٹھ جاؤ۔ الطاف صاحب نے اپنا اعتراض واپس لے لیا ہے۔"

الطاف اچانک اُٹھنے کی کوشش کرتا لیکن منصور اور سلیم کے ہاتھوں کے

شکنجے میں بے بس ہو کر رہ جاتا۔

مجلس میں سکون کے آثار دیکھ کر آفتاب کہتا۔ ”دیکھو الطاف! خدا کی قسم اگر اب تم نے تقریر ختم ہونے سے پہلے کوئی شرارت کی تو ہم بہت بُرا سلوک کرے گا۔ اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو اختر کی تقریر کے بعد اسٹیج پر آ جاؤ!“

صدر عام طور پر ہوسٹل ہی کی کوئی مرنجاں مرنج شخصیت ہوتی۔ وہ اکثریت کے فیصلے کا احترام کرتا اور اکثریت کا فیصلہ عام طور پر یہی ہوتا کہ اختر کی تقریر سُنی جائے۔

☆☆☆☆☆

بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سلیم نے اختر کی تقلید کی اور ایم اے میں داخل ہو گیا۔ کالج اور ہوسٹل میں اختر پاکستان کا ایک اَن تھک مبلّغ تھا۔ اور اب تک کئی نوجوان اُس کے ہم خیال ہو چکے تھے۔ پاکستان کے متعلّق ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے جو معاندانہ پروپیگنڈہ ہو رہا تھا،

اُس نے مسلم عوام کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔

ہوسٹل کی بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام ایک مباحثہ ہو رہا تھا جس میں بحث کا موضوع یہ تھا کہ کیا پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات کا صحیح حل پیش کرتا ہے؟ اس جلسے میں ہوسٹل کے طلباء کے علاوہ کالج کے دوسرے طلبا کو بھی حصّہ لینے کی دعوت دی گئی۔

مباحثے کی تاریخ سے دو دِن پہلے اختر کو کھانسی اور زکام کے ساتھ بخار کی شکایت ہو گئی۔ پہلے دِن اُس نے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ دوسرے دِن بخار زیادہ شدید ہو گیا اور سلیم ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اِسے نمونیا ہے۔

سلیم اُسے ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق دوائی پلاتا رہا۔ رات کے وقت سلیم کے ساتھ آفتاب اور منصور بھی اُس کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ دو بجے کے قریب اختر کی آنکھ لگ گئی۔ آفتاب اور منصور اپنے کمروں میں چلے گئے لیکن سلیم وہیں بیٹھا رہا۔

تنہائی سے اُکتا کر اُس نے اختر کی میز سے ایک کتاب اُٹھائی لیکن چند سطریں پڑھنے کے بعد اُس نے کتاب میز پر رکھ دی اور دوسری کتاب اُٹھائی۔ اس میں بھی وہ دلچسپی نہ لے سکا۔ اس کے بعد ان کاغذوں کی باری آئی جو اختر کی میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کاغذ کے پرزے پر چند فقرے لکھے ہوئے تھے۔ سلیم نے کاغذ کا یہ پرزہ اُٹھالیا اور بے توجہی سے ایک نظر دیکھنے کے بعد وہیں رکھ دیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُسے کوئی خیال آیا اور اُس نے پھر یہ کاغذ کا پرزہ اُٹھالیا۔ وہ فقرے جو اُسے پہلی نظر میں بے ربط سے نظر آئے، اب بہت اہم محسوس ہوتے تھے۔۔۔ یہ اختر کی تقریر کے نقاط تھے۔

سلیم نے چند بار سرخیاں پڑھیں اور پھر کاغذ کا پرزہ میز پر رکھ کر اختر کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اختر کل بحث میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ الطاف اور اُس کے ساتھی سخت تیّاری کے بعد مباحثے میں حصّہ لینے کے لیے آرہے ہیں۔ اختر کی غیر حاضری میں شاید پاکستان کے حق میں بولنے والوں میں سے کوئی ان کے دانت کھٹّے نہ کر

سکے۔ اگر انہوں نے میدان مار لیا تو اختر کو یقیناً اس بات کا صدمہ ہو گا۔ پاکستان اختر کے لیے محض ایک نظریاتی مسئلہ نہ تھا، بلکہ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ یہ وہ مرکز تھا جس کے گرد اُس کے خیالات پرواز کیا کرتے تھے۔ وہ ساحل تھا جہاں پہنچنے کے لیے وہ بڑے سے بڑے طوفان کا مُقابلہ کرنے کے لیے تیّار تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں اُس کی زندگی کے تمام نغمے گُم ہو چکے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کے لیے میں اپنے دل میں دس کروڑ مسلمانوں کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہوں۔ ایک دِن میری آواز دس کروڑ مسلمانوں کی آواز ہو گی۔ اگرچہ ہماری راہ میں کانٹوں کی باڑیں کھڑی کی جائیں گی لیکن ہم انہیں روندتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ایک دِن اُس نے کہا تھا۔ ”سلیم! تم میں ابھی تک اجتماعی زندگی کا شعور پیدا نہیں ہوا۔ ابھی تک تم یہ سمجھتے ہو کہ وقت کا بہترین مصرف اس قسم کے افسانے لکھنا اور شعر کہنا ہے۔ لیکن وہ دِن دور نہیں جب تم محسوس کرو گے کہ اِن چند لمحات کے سوا جن میں تم نے پاکستان کے لیے کوئی عملی کام کیا ہے تمہاری باقی زندگی بے حقیقت تھی۔ آج تم کسی فرضی محبوب کے کوچے کی خاک کو سرمایۂ

حیات سمجھتے ہو لیکن وہ دِن دور نہیں جب تمہیں پاکستان کی ایک ایک اِنچ زمین کو دُشمن سے بچانے کے لیے زندگی کی عزیز ترین خواہشات کو قربان کرنا پڑے گا۔۔۔ سلیم! میں تمہیں افق پر اُٹھنے والی آندھی کے آثار دکھا رہا ہوں اور تم اسے میرا وہم سمجھتے ہو۔ لیکن جب یہ آندھی آئے گی تو تم محسوس کرو گے کہ پاکستان کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہیں۔ میں بارش سے پہلے مکان پر چھت ڈالنا چاہتا ہوں اور تم بارش میں کھڑے ہو کر چھت ڈالنے کی فکر کرو گے۔ میرے دوست! پاکستان کی جنگ ایک اجتماعی فریضہ ہے اور اگر تم اپنی موت و حیات دس کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات سے وابستہ کر چکے ہو تو اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ سلیم! آؤ میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلو تاکہ اگر کہیں میرے پاؤں لڑکھڑا جائیں تو میں تمہارے مضبوط بازوؤں کا سہارا لے سکوں۔ کم از کم مجھے تسلّی ضرور ہو گی کہ میں تنہا نہیں لیکن کل تمہیں زخمیوں اور اپاہجوں کو اُٹھا کر پاکستان کی منزل کا رُخ کرنا پڑے گا۔"

"اختر تم تنہا نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں!" سلیم اپنے دل میں نئے

ولولے اور نئی امنگیں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے میز سے قلم اُٹھایا اور کورے کاغذ پر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔۔۔ اُس نے رُک رُک کر چند ابتدائی سطور لکھیں لیکن اُس کے بعد وہ اپنی قلم میں بلا کی روانی محسوس کر رہا تھا۔

جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو صبح کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ نماز کے بعد وہ اپنے مضمون پر نظر ثانی کرنے کے لیے کُرسی پر آ بیٹھا۔ رات کی بے آرامی کے باعث اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر سستانے کی نیّت سے اُس نے میز پر اپنی کہنیاں ٹیک دیں اور کلائیوں پر رکھ دیا۔ چند منٹ بعد اُسے نیند آ گئی۔

آفتاب کمرے میں داخل ہوا تو اختر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بستر پر بیٹھا سلیم کا مضمون پڑھ رہا تھا۔ ’’بھئی اختر! اپنی جان پر اِتنا ظُلم نہ کرو۔‘‘ یہ کہتے ہوئے آفتاب نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیے اور پھر اُس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ’’ابھی تمہارا بخار ابھی اُترا نہیں، ذرا کم ہوا ہے۔ خدا کے لیے آج مباحثے میں حصّہ لینے کا خیال چھوڑ دو۔ ہم تمہاری جگہ کسی اور

کو بھرتی کر لیں گے۔"

اختر نے اطمینان سے کہا۔ "آفتاب! یہ پڑھو تو سہی!"

"بھئی میں پڑھے بغیر بھی تمہیں داد دینے کے لیے تیّار ہوں لیکن ایسی کیا مُصیبت تھی کہ تُم رات کے وقت اُٹھ کر لکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔۔۔ اگر مُجھے معلوم ہوتا تو میں ساری رات تمہاری رکھوالی کرتا۔"

"بھئی آہستہ بات کرو، سلیم سو رہا ہے۔"

"سلیم بھی کیسا نالائق ہے جس نے تمہیں منع نہیں کیا۔"

"میں ابھی اُٹھا ہوں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر کی دوا کیا تھی۔ میں نے تو کروٹ بھی نہیں بدلی۔ یہ سلیم کا کارنامہ ہے۔"

"لیکن یہ ہے کیا؟"

"بھئی یہ پڑھنے سے تعلّق رکھتا ہے۔"

آفتاب اختر کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ چند سطور بے توجہی سے دیکھنے کے

بعد اُس نے مضمون کو دوبارہ شروع سے پڑھنے کی ضرورت محسوس کی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خاموشی سے پڑھنے کی بجائے اختر کو سُنا رہا تھا۔ الفاظ اور فقروں کی ترتیب اُس کی آواز میں زیر و بم پیدا کر رہی تھی۔

اس تحریر میں اُس پہاڑی ندی کی روانی اور موسیقی تھی جو کبھی سنگریزوں اور چٹّانوں سے ٹکرا کر شور مچاتی ہے اور کبھی ہموار زمین میں پہنچ کر اچانک اپنی بلند تانیں گہرے اور میٹھے سُروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر ایک اور ڈھلوان آ جاتی ہے اور یہ سر آہستہ آہستہ اُبھرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ایک گہرے کھڈ کے سِرے پر پہنچ کر یہ اُبھرتی ہوئی تانیں ایک آبشار کے ہنگاموں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سلیم کبھی پاکستان کے باغ کے متعلّق ایک شاعر کا تصوّر پیش کر کے فرزندانِ قوم کو اُن طوفانوں سے خبر دار کر رہا تھا، اُن کی آغوش میں ہزاروں تخریبی عناصر چھُپے ہوئے تھے۔۔۔۔ اور کبھی دلائل کے پہاڑ پر کھڑا ہو کر پاکستان کے مخالفین پر مہیب چٹانوں کی بارش کر رہا تھا۔ آخری چند فقرے آفتاب نے کچھ ایسے جوش و خروش سے ادا کیے کہ سلیم گہری نیند سے جاگ اُٹھا۔

آفتاب اور اُس سے زیادہ اختر کے چہرے پر اپنی تحریر کے اثرات دیکھ کر اُس نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔ مضمون ختم ہوا اور وہ دونوں سلیم کی طرف دیکھنے لگے۔

آفتاب نے کہا۔ ”بھئی سلیم! میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ تم نے پہلی بار اپنے قلم کا صحیح استعمال کیا ہے۔ اب وقت بہت تھوڑا ہے لیکن اگر تم یہ تقریر یاد کر لو تو بہت اچھا ہو گا۔ الطاف اختر کی بیماری پر بہت خوش ہے۔“

سلیم نے کہا۔ ”بھئی میں نے یہ تقریر مباحثے میں حصّہ لینے کی نیّت سے نہیں لکھی تھی۔ میں نے ایک کاغذ کے پُرزے پر اختر کی تقریر کی سُرخیاں دیکھیں اور لکھنے بیٹھ گیا اور اب معلوم نہیں میں کیا لکھ چکا ہوں۔“

اختر نے کہا۔ ”سلیم! بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہر وقت اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ان کا مشن کیا ہے۔ بعض آدمیوں میں قوم کے سپاہی بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ قدرت انہیں قوم کی عزّت اور آزادی کا محافظ بنا کر بھیجتی ہیں لیکن وہ شاعر نقال اور گویّے بن

جاتے ہیں۔ بعض محض شاعر ہوتے ہیں اور وہ قوم کی بد قسمتی سے لیڈر بن جاتے ہیں۔ جو قدرت کی طرف سے بلند پایہ موجد کا دماغ لے کر آتے ہیں لیکن اپنی تن آسانی کے باعث داستان گو بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے دل و دماغ میں غایت درجہ کی انفرادیت لے کر آتا ہے لیکن قوم کی اجتماعی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے وہ اپنی انفرادیت قربان کر دیتا ہے۔ وہ ایک شاعر ہے، ایک ادیب ہے۔ اس کا دل ایک رباب ہے جس کے نازک تاروں کے لیے کلیوں کی مُسکراہٹ مضراب کا کام دیتی ہے۔ وہ ایک تصوّر ہے جس کے دل میں قدرت نے قوسِ قزح کے رنگ بھر دیے ہیں۔ وہ ایک مغنّی ہے جس نے آبشاروں اور پرندوں کے نغمے چُرائے ہیں لیکن قوم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ قوم کے بیٹے خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں، قوم کی بیٹیوں کی عصمت خطرے میں ہے۔ ایسے دور میں یہ لوگ اپنی انفرادی خواہشات کو قوم کی اجتماعی ضروریات پر قربان کرنے کے لیے تیّار ہو جاتے ہیں۔ شاعر پھولوں کی مُسکراہٹ کی بجائے قوم کے معصوم بچّوں کی جگر دوز چیخوں سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ قوم کو لوریاں نہیں دیتا بلکہ

جھنجھوڑتا ہے۔ مصوّر قلم پھینک کر تلوار اُٹھا لیتا ہے اور مغنّی کے نغموں میں پرندوں کے چہچہوں کی بجائے تیغوں کی جھنکار اور توپوں کی دھنا دھن سُنائی دیتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ابھی تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے موجودہ حالات کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ قوم کے افراد میں اجتماعی شعور اور اجتماعی سیرت بیدار کرنے کی بجائے ایک ایسا ذہنی انتشار پیدا کر رہے ہیں، جو موجودہ حالات میں ہمارے لیے بے حد خطرناک ہے۔ دشمن کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں کھڑا ہمیں للکار رہا ہے اور ہمارا شاعر قوم کے نوجوانوں سے کہہ رہا ہے۔ ٹھہرو! میں تمہیں ایک نیا گیت سُناتا ہوں۔ میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ یہ ادب برائے ادب ہے۔ یہ نئے دور کی ابتدا ہے۔ ہم ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی پر سوار پاکستان کی منزل کا رُخ کر رہے ہیں۔ ہمیں ہر قدم پر ایک نیا بھنور دکھائی دے رہا ہے اور کشتی کے ایک کونے میں ہمارا آرٹسٹ اپنے رُباب کے تار درست کر رہا ہے۔ سلیم! مجھے تمہاری تحریر نے اس لیے متاثر نہیں کیا کہ اس میں ایک شاعر اور ادیب کے دل کی دھڑکنیں ہیں بلکہ میں اس لیے متاثر ہوا ہوں کہ تُم نے پہلی بار سنجیدگی

کے ساتھ اِس مسئلے کی طرف توجّہ دی ہے، جس کے ساتھ دس کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات وابستہ ہے۔ خدا کرے کہ یہ تمہارے شعر و ادب کے نئے دور کی ابتدا ہو۔ میں اس مباحثے میں حصّہ نہیں لوں گا۔ اب ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی لیکن تمہاری تقریر ضرور سُنوں گا۔“

آفتاب نے کہا۔ ”بھئی آج سلیم کی جگہ تم شاعر بن گئے ہو۔ اب خدا کے لیے لیٹ جاؤ اور سلیم! تم اپنے کمرے میں جا کر تقریر کی تیّاری کرو۔“

☆☆☆☆

شام کے آٹھ بجے ہوسٹل کے کامن روم میں مباحثہ ہو رہا تھا۔ صدارت کے فرائض کالج کے ایک نوجوان پروفیسر سر انجام دے رہے تھا۔ اختر اپنے کمرے کی بجائے کامن روم کے قریب ایک اور کمرے میں لیٹا مباحثے میں حصّہ لینے والوں کی تقریریں سُن رہا تھا۔ منصور اُس کی تیمارداری سے زیادہ آزادی کے ساتھ حقّہ پینے کی نیّت سے اُس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ چارپائی کے پاس باہر کی طرف کھُلنے والے دریچے سے

مقرّرین کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔

الطاف اور اس کے ساتھیوں کی تقریروں میں پاکستان کے خلاف وہی دلائل تھے جو بار بار ہندو اخبارات میں دہرائے جا چکے تھے۔ اختر کے ہونٹوں پر بھی حقارت آمیز مُسکراہٹ کھیلنے لگی اور کبھی غصّے کی حالت میں وہ اپنے ہونٹ چبانے لگتا اور منصور تقریر کے الفاظ سے زیادہ اُس کے چہرے سے متاثر ہو کر بار بار کہتا۔ ’’بکواس کر رہا ہے گدھا کہیں کا۔ آفتاب اُس کی خبر لے گا۔‘‘

الطاف اپنے گاندھی بھگت ساتھیوں کا ایک منظّم گروہ لے کر آیا تھا اور وہ اُس کی تقریر کے دوران میں بار بار تالیاں بجا رہے تھے۔ جب آفتاب کی باری آئی تو اُس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت زیادہ خفا ہو چکا ہے۔ اُس کی تقریر پاکستان کے مخالفین کے خلاف ایک اعلانِ جنگ تھی اور سُننے والے محسوس کر رہے تھے کہ اگر صدر کا احترام ملحوظِ خاطر نہ ہوتا تو وہ شاید اپنے جذبات کا عملی مظاہرہ کرنے پر اُتر آتا۔

پاکستان کی حمایت میں ایک ایم اے کے طالبِ علم کی تقریر نہایت عالمانہ

تھی لیکن اپنی باریک آواز کے باعث وہ سُننے والوں کو زیادہ متاثر نہ کر سکا۔

بالآخر صاحبِ صدر نے کہا۔ ”اب مسٹر سلیم موضوع کے حق میں تقریر کریں گے۔“ سلیم کُرسی پر بیٹھا ان کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جن پر اُس نے رات کے وقت تقریر لکھی تھی۔ تقریر اُسے حفظ ہو چکی تھی لیکن الطاف کی تقریر ناخوشگوار ہوا کا ایک جھونکا تھی جس نے اُس کے خیالات کا شیرازہ مُنتشر کر دیا۔ سلیم اس کی تقریر کے دوران میں محسوس کر رہا تھا کہ خیالات کے وہ حسین پھول جو اُس نے جمع کئے ہیں اپنی رنگینی اور رعنائی کے باوجود الطاف کا مُنہ بند کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس نے گالیوں کے جواب میں شعر لکھے ہیں۔ الطاف کے بعد اُس کے ساتھیوں کی تقریروں کے دوران میں بھی وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور اُس کے ذہن میں نئے نئے دلائل اور نئے نئے الفاظ آرہے تھے، یہاں تک کہ جب اُسے تقریر کے لیے بُلایا گیا تو اُسے یقین نہ تھا کہ وہ کیا کہے گا۔ وہ جھجکتا ہوا کرسئ صدارت کے قریب پہنچا تو اپنی لکھی ہوئی تقریر سے زیادہ مخالفین کی تقریروں کے الفاظ اُس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

الطاف نے اچانک کہہ دیا۔ ”سلیم صاحب! پاکستان کے متعلّق تقریر کریں گے یا کوئی قصیدہ سنائیں گے؟“

آفتاب نے فوراً جواب دیا۔ ”سلیم صاحب ملّت فروشوں کا مرثیہ پڑھیں گے۔“

حاضرین تھوڑی دیر شور مچاتے رہے۔ بالآخر صدر نے اُٹھ کر اُنہیں خاموشی کی تلقین کی۔ سلیم نے متذبذب سی آواز میں تقریر شروع کی۔ چند فقرے کہنے کے بعد سلیم نے لکھے ہوئے کاغذات ایک نظر دیکھنے کے بعد میز پر رکھ دیے اور قدرے توقّف کے بعد دوبارہ تقریر کرنے لگا۔ الفاظ رُک رُک کر اُس کی زبان پر آ رہے تھے۔ حاضرین میں کانا پھوسی شروع ہو چکی تھی لیکن اچانک وہ سنبھل گیا۔ اُس کی آواز صاف اور بُلند ہوتی گئی۔ وہ خیالات کی ایک نئی رو میں بہہ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

”حضرات! اگر الطاف صاحب اور اُن کے ساتھی متحدہ ہندوستان کی حمایت میں تقریریں کرنے سے نہیں شرماتے تو مجھے پاکستان کے متعلّق قصائد لکھنے میں عار نہیں۔ متحدہ ہندوستان الطاف صاحب کو ہندو اکثریت

کی غلامی کا طوق پہناتا ہے اور پاکستان مجھے ایک آزاد قوم کے فرد کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ اگر انہیں ہندو کی دائمی غلامی اور ذلّت کا شوق ہے تو مجھے عزّت اور آزادی سے محبّت ہے۔ لیکن کاش! یہ مسئلہ میری اور الطف صاحب کی ذات یا اُن لوگوں تک محدود ہوتا جنہوں نے اِس بحث میں حصّہ لیا ہے۔ اس صورت میں ہماری بحث اپنے اپنے ذاتی خیالات کی ترجمانی تک محدود رہتی لیکن یہ دو قوموں کا مسئلہ ہے۔ یہ دو نظریوں اور دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ یہ ہندو اور مسلمان کے مفادات کی ٹکّر ہے۔ ہندو متحدّہ ہندوستان چاہتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں پر دائمی تسلّط رکھ سکے۔ درّۂ خیبر سے لے کر آسام کی پہاڑیوں تک رام راج کے جھنڈے لہرا سکے اور حکومت کے اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد وہ کسی دقّت کے بغیر مسلمانوں کو برہمو سماج کا قابلِ نفرت حصّہ بنا سکے۔

مسلمان پاکستان چاہتے ہیں، اس لیے کہ وہ ایک قوم ہیں اور ایک قوم کو بڑھنے، پھُولنے اور پنپنے کے لیے آزاد وطن کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

اس لیے کہ وہ انسان ہیں اور ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی کا بوجھ اُٹھانے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ جب مسلمان پاکستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اُس کے ذہن میں وہ دفاعی مورچہ ہوتا ہے جہاں اسے ہندو اکثریت کے جارحانہ مقاصد سے نجات مل سکتی ہے اور جب ہندو متحدہ ہندوستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اُس کے ذہن میں ایک ایسی وسیع شکار گاہ ہوتی ہے جہاں اکثریت کے بھیڑیے کسی روک ٹوک کے بغیر اقلیت کی بھیڑوں کا شکار کھیل سکتے ہیں۔

ہندو پاکستان کے خلاف متّحد اور منظّم ہو چکا ہے۔ مہاسبھائی ہندو، کانگرسی ہندو، سناتن دھرمی ہندو، آریا سماجی ہندو، تشدّد پر ایمان رکھنے والا ہندو اور عدم تشدّد کی تبلیغ کرنے والا ہندو اور بظاہر مسلمانوں کو امن اور شانتی کا پیغام دینے والا ہندو، اور درپردہ مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دَل کی فوجیں تیّار کرنے والا ہندو سب ایک ہو چکے ہیں اور اگر ہم نے اپنے مُستقبل سے آنکھیں بند نہیں کر لیں تو ہمیں بھی ایک ہونا پڑے گا۔ یاد رکھیے! اگر ہم اجتماعی نجات کے لیے ایک دوسرے

کا ساتھ نہ دے سکے تو مشترکہ تباہی میں ایک دوسرے کے ساتھی ضرور ہوں گے۔

ہندو سارے ہندوستان میں اپنے دیوتاؤں کے مندر تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے اس ماضی کی طرف لوٹنے کے لیے بے قرار ہے جب وہ اپنے گناہوں کے بدلے اچھوت کا بلیدان دیا کرتا تھا۔ اور مسلمان ہندوستان کے ایک گوشے میں اپنی اُن مساجد کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں جہاں توحید کے چراغ روشن ہیں۔ جہاں ذات پات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو عدل اور مساوات کا پیغام ملتا ہے۔ ہندو اکھنڈ ہندوستان میں برہمن کا اقتدار چاہتا ہے۔ مسلمان پاکستان میں خدا کی بادشاہت چاہتا ہے۔ لیکن آج تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ نیشنلسٹ یا گاندھی بھگت مسلمان کیا چاہتے ہیں؟"

آفتاب نے دبی زبان سے کہہ دیا۔ "دال روٹی۔" اور کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

سلیم نے قدرے توقّف کے بعد اپنی تقریر پھر شروع کی۔

”یہ لوگ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کے علیحدہ وجود سے منکر ہیں۔ اُن کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ فرقہ پرستی، تنگ نظری اور رجعت پسندی ہے اور ان طرح کے الزامات سے بچنے کی ہی ایک صورت ہے کہ دس کروڑ مسلمانوں کو متحدّہ قومیت کی رسی سے جکڑ کر اُس تاریک گڑھے میں پھینک دیا جائے، جہاں سے ابھی تک اچھوت کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ یہ وطن پرست ہیں اور وطن کا دیوتا دس کروڑ مسلمانوں کا بلیدان لیے بغیر خوش نہیں ہو سکتا۔ یہ اقتصادیات کے ماہر ہیں اور انہیں اس بات کا دُکھ ہے کہ پاکستان بھُوکا اور ننگا ہو گا لیکن کاش! یہ درد مند اِن قوم ذرا جرأت سے کام لیں اور یہ کہہ دیں کہ انہیں اپنی دال روٹی کی فکر ہے۔ اگر پاکستان بن گیا تو یہ اس من و سلویٰ سے محروم ہو جائیں جو اُن کے لیے واردھا کے آسمانوں سے نازل ہوتا ہے۔

میں آزادی کی نعمت کو روٹیوں کے ساتھ تولنے کا قائل نہیں، تاہم وہ ہندو جو پاکستان کی بھُوک کے تصوّر سے گھلے جا رہے ہیں، اگر حق گوئی سے کام لیں تو اُنہیں یہ کہنا پڑے گا کہ اگر پاکستان کے زرعی صوبے اُن کے ہاتھ

سے نکل گئے تو انہیں گندم کی بجائے کوئی اور غذا تلاش کرنی پڑے گی۔ اگر پاکستانیوں کو کپڑے کی ضرورت ہے تو دنیا بھر کے کارخانہ دار پاکستان کی روٹی کے محتاج ہیں۔

یہ لوگ فنونِ حرب کے بھی ماہر ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ پاکستان دفاعی لحاظ سے بھی کمزور ہو گا۔ لہٰذا اُن کی قیمتی رائے کا احترام کرتے ہوئے ہمیں پاکستان کے قیام کا خیال ترک کر دینا چاہیے اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر ہندو کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لینا چاہیے۔۔۔ پاکستان کی فتح یا شکست کا فیصلہ تو کسی پانی پت کے میدان میں ہو گا لیکن یہ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ موت سے پہلے ہی اپنی قبریں کھود چُکے ہیں۔ پاکستان کے دفاع کو اگر کوئی خطرہ ہو گا تو وہ اُن شکست خوردہ لوگوں کی طرف سے ہو گا۔ میں انہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ ان کی پیشانیوں پر ملّت فروشی کا جو داغ آج ہم دیکھ رہے ہیں، اسے کل تک وہ شخص پہچان سکے گا۔ یہ لوگ زیادہ عرصہ قوم کو اپنے نیک مشوروں سے مُستفید نہیں کر سکیں گے۔ یہ لوگ امن پسند ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان کے

نعرے سے ہندو مہاشے خفا ہو جاتے ہیں اور اس سے آپس کا فساد بڑھتا ہے اور فساد بڑھنے سے گاندھی کی آتما کو دُکھ ہوتا ہے لہٰذا اگر مسلمان پاکستان کا خیال ترک کر کے ہندو اکثریت کی دائمی غلامی قبول کر لیں تو نہ ہندو مہاشہ خفا ہو گا نہ فساد بڑھے گا اور نہ گاندھی جی کی آتما کو دُکھ ہو گا اور سب سے زیادہ یہ کہ دنیا ہمیں تنگ نظر اور فسادی کے نام سے یاد نہیں کرے گی۔ لیکن اگر ہم اپنی خوشی سے اکھنڈ ہندوستان کے سیاسی قبرستان میں دفن ہونے کے لیے تیّار ہو جائیں تو آثارِ قدیمہ کے ماہرین ہمارا مزار دیکھ کر یہ کہا کریں گے کہ یہ ہے وہ قوم جس نے ہندو کو اپنی شرافت، من پسندی، نیک نیّتی اور وسیع النظری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ یہاں دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کے معماروں کے وہ جانشین دفن ہیں جنہوں نے بیسویں صدی میں ہندو اقتدار کا محل کھڑا کرنے کے لیے اپنے جھونپڑوں کو آگ لگا دی تھی۔ یہ ان امن پسند بھیڑوں کی ہڈّیوں کا انبار ہے جنہوں نے بھیڑیوں کو اپنا نگہبان بنا لیا تھا۔

پاکستان کو اس ملک میں ہم اپنا آخری دفاعی مورچہ سمجھتے ہیں، یہ ہندو فسطائیت کو روکنے کے لیے ہماری آخری دیوار ہے۔ ہم ہندو کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں۔ ہم اُس کی آبادی کی نسبت سے ہندوستان کے تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ حصّے پر اُس کی حکومت کا حق تسلیم کرتے ہیں لیکن ہندو کو اپنی آزادی سے زیادہ ہمیں غلام بنانے کی فکر ہے۔ جب ہندو مسلمانوں کی ہمدردی کا لبادہ اُوڑھ کر پاکستان کی مخالفت کرتا ہے تو اُس کی مثال اُس ڈاکو سے مختلف نہیں ہوتی جو اپنے ہمسائے سے یہ کہہ رہا ہو۔ بھائی دیکھو! تم اپنے گھر کے گرد چار دیواری کیوں بنا رہے ہو؟ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ڈاکو سمجھتے ہو۔ ایک غلط فہمیوں سے بھائی چارے میں فرق آتا ہے اس لیے میں تمہیں یہ دیوار تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہوشیار ڈاکو عام طور پر گھر کے کسی بھیدی کو ساتھ ملا لیتے ہیں۔ گھر کا بھیدی آ کر مالک سے کہتا ہے ارے یار! یہ کیا مُصیبت ہے کہ تم ساری رات لٹھ اُٹھائے دروازے پر پہرا دیتے ہو، جاؤ اطمینان سے سو جاؤ ورنہ پڑوسی یہ خیال کریں گے تم انہیں چور سمجھے ہو۔ حضرات! یہ کانگرسی مسلمان ہمارے گھر کے بھیدی ہیں۔"

الطاف اور اُس کے چند ساتھی یکّے بعد دیگرے احتجاج کے لیے اُٹھے لیکن ان کی آواز مخالفین کے نعروں اور قہقہوں میں دب کر رہ گئی۔

"بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ! پاکستان زندہ باد! گھر کے بھیدی مُردہ باد۔"

الطاف چلّایا۔ "صاحبِ صدر! سلیم کی تقریر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔"

آفتاب نے اُٹھ کر کہا۔ "نہیں، ہم سُنیں گے!"

اکثریت نے آفتاب کی تائید کی اور صدر نے کہا۔ "میرے خیال میں دونوں فریق یہاں سمجھے اور سمجھانے کی نیّت سے آئے ہیں۔ اس لیے میں مسٹر سلیم کو تقریر جاری رکھنے کی اجازت دیتا ہوں۔ اس کے بعد حزبِ مخالف کا لیڈر کچھ کہنا چاہے تو میں اُسے موقع دینے کے لیے تیّار ہوں۔"

حاضرین کی اکثریت نے تالیوں کے ساتھ صدر کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور سلیم نے دوبارہ اپنی تقریر شروع کی۔

"حضرات! اگر میں پاکستان کو ایک علمی اور نظریاتی مسئلہ سمجھتا، تو شاید اس بحث میں حصّہ نہ لیتا۔ مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔ پاکستان کا مسئلہ

ہماری موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ طوفان بڑی تیزی سے آرہا ہے اور جو لوگ آج پاکستان کا تمسخر اڑا رہے ہیں، کل اس کی چار دیواری کو اپنی آخری جائے پناہ خیال کریں گے۔ جب دوپہر کی جھُلستی ہوئی ہوا چلتی ہے تو منتشر قافلے خود بخود درختوں کی چھاؤں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ میں ہندو کے قہر و غضب سے پریشان نہیں بلکہ اُسے قیامِ پاکستان کے لیے ایک نیک فال سمجھتا ہوں پاکستان کی مخالفت میں اس کا متّحد محاذ ہمیں پاکستان کی حمایت میں متحدہ محاذ بنانے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن میں آپ کو ان نام نہاد مسلمانوں سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو پاکستان کی مخالفت اور 'رام راج' کے جواز میں قرآن پاک کی آیات پیش کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔۔۔ جب بغداد پر تاتاریوں کا حملہ ہونے والا تھا، اس قسم کے لوگوں نے مسلمانوں کو مناظروں میں اُلجھائے رکھا۔ آج جب ہندو ہم پر یلغار کرنے کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دَل کی فوجیں تیّار کر رہا ہے تو ان لوگوں نے پاکستان کو موضوعِ بحث بنا رکھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جس وقت تک ہندو کی تیّاری مکمّل نہیں ہو جاتی، جب تک ان کے مندر اور سکھوں کے گوردوارے بم

سازی کی فیکٹریوں میں تبدیل نہیں ہو جاتے، یہ لوگ ہمیں ذہنی انتشار میں مبتلا رکھیں گے۔ ان لوگوں کی معاندانہ سرگرمیوں کے باعث شاید پاکستان سے متعلّق مسلمانوں کی جدوجہد چند برس اور تقریروں، قراردادوں اور نعروں تک محدود رہے اور ہمیں مورچہ بنانے کی اس وقت فکر ہو جب دُشمن چاروں طرف سے گولہ باری کر رہا ہو۔

ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ قیامِ پاکستان عملی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری آزادی اور بقا کے دُشمن کیل کانٹے سے لیس ہو رہے ہیں اور ہم اگر مکمّل تباہی نہیں چاہتے تو ہمیں پاکستان یا موت کا نعرہ لگا کر میدان میں آنا پڑے گا۔

ہم ان لوگوں کی چیخ و پکار سے پریشان کیوں ہوں، جو ہمارا ساتھ چھوڑ کر غیروں کی کشتی میں سوار ہو چکے ہیں۔ جو ربِّ کعبہ سے مُنہ پھیر کر بھارت کے دیوتاؤں پر ایمان لا چکے ہیں، ہمیں اپنی ساری توجّہ اُن لوگوں کی طرف مبذول کر دینی چاہیے جو اسلام کے لیے زندہ رہنا اور اسلام کے لیے مرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو عملی جدوجہد کے لیے تیّار کرنا

ہے۔ ہمیں ملک کے ہر گوشے میں یہ پیغام پہنچانا ہے کہ اب اپنی عزّت، آزادی اور بقا کے لیے آگ اور خون میں کھیلنے کا وقت گیا ہے۔

میرے دوستو! اب تقریروں، قراردادوں اور بیان نازی کا وقت نہیں، عمل اور حرکت کا وقت ہے۔"

سلیم کی تقریر کے بعد الطاف اور اُس کے ساتھیوں کا جوش و خروش بہت حد تک ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ صدر نے الطاف کو دوبارہ اسٹیج پر آنے کی دعوت دی تو وُہ قدرے تذبذب کے بعد اُٹھا لیکن کسی نے بُلند آواز میں نعرہ لگا دیا "گھر کا بھیدی" اور آفتاب نے "لنکا ڈھائے" کہہ کر فقرہ پورا کر دیا۔ کمرہ قہقہوں سے گُونج اُٹھا اور الطاف نے اسٹیج تک پہنچنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

☆☆☆☆☆

جب مجلس برخاست ہوئی تو سلیم کے چند دوست اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ دیر اُن کی داد و تحسین سُننے کے بعد سلیم کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ

کسی نے پیچھے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”سلیم صاحب السلام علیکم۔“

یہ دلکش آواز سلیم کے کانوں سے ہوتی ہوئی دِل تک اُتر گئی۔ سلیم نے وعلیکم السلام کہہ کر پیچھے دیکھا۔۔ ایک خوش طبع نوجوان مُسکرا رہا تھا۔ سلیم پہلی نگاہ میں اُسے پہچان نہ سکا لیکن اُس کے دِل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ تُم نے اسے دیکھا ہے، تم اِسے جانتے ہو، تم اس آواز سے آشنا ہو۔ دوسری نگاہ میں ماضی کے حسین اور دِلفریب نقوش دماغ کی گہرائیوں سے نکل کر شعور کی سطح پر آ گئے۔ سلیم کی آنکھوں کے سامنے سادہ اور معصوم مُسکراہٹیں رقص کرنے لگیں۔ اس کے کانوں میں دلکش قہقہے گونجنے لگے۔ وہ بے اختیار ”ارشد ارشد!“ کہتا ہوا نووارد سے لپٹ گیا۔ ”تم کب آئے؟ تم کہاں تھے؟ اتنی دیر تم کہاں غائب رہے؟ تم نے مجھے خط تک نہیں لکھا۔۔“ سلیم جواب کا انتظار کے بغیر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔

اچانک اسے اپنے ارد گرد دوسرے لڑکوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اور

اس نے کہا۔ ”چلو کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“

ارشد اُس کے ساتھ چل دیا۔ سلیم نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا، بجلی کا بٹن دبایا اور ارشد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ قدرے اطمینان سے اپنے سوالات دُہرا رہا تھا۔

ارشد نے اُن سوالات کے جواب میں مختصر اپنی سرگزشت بیان کر دی۔ ”میں امرتسر کے میڈیکل اسکول سے فارغ التحصیل ہو چکا ہوں۔ اب تُم مجھے چھوٹا سا ڈاکٹر کہہ سکتے ہو۔ فوج کو اپنی خدمات پیش کر چُکا ہوں۔ خیال ہے کہ جلد ہی بلا لیا جاؤں گا۔ لاہور میں میرے خالُو بیمار تھے۔ میں ابّا جان کے ساتھ اُن کی تیمارداری کے لیے آیا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مُجھے اُن کی مزاج پرسی سے زیادہ تمہیں دیکھنے کی خواہش تھی۔ شام کو یہاں پہنچا تو مباحثہ ہو رہا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ تمہاری تقریر بھی سُن لی۔ اگر پاکستان کے لیے کوئی فوج بھرتی کر رہے ہو تو میرا نام بھی لکھ لو۔“

سلیم نے پوچھا۔ ”لاہور کب آئے؟“

"بس ہم کوئی چار بجے یہاں پہنچے تھے۔"

"لیکن تمہیں میرے متعلّق کیسے معلوم ہوا؟"

"بھئی میں تمہارے گاؤں سے بھی ہو آیا ہوں۔"

"کب؟"

"پچھلے مہینے آخری ہفتے کے روز میں، ابّا جان اور امّی وہاں گئے تھے۔ رات ہم وہاں رہے اور اتوار کی شام واپس چلے گئے۔"

"اور اس کے بعد بھی تم نے مجھے خط نہ لکھا!"

"بھئی میں نے خط کی بجائے خود لاہور آنے کا ارادہ کیا تھا۔"

"تو پھر مجھے تمہارے خالو جان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے بیمار ہو کر تمہیں اِس نیک ارادے کی تکمیل کا موقع دیا۔۔۔۔ اچھا میں تمہارے لیے کھانا منگواتا ہوں۔ ابھی تک میں نے خود بھی نہیں کھایا۔"

ارشد نے جواب دیا۔ "بھئی تکلّف کی ضرورت نہیں، اب بہت دیر ہو گئی

ہے اور مجھے ماڈل ٹاؤن پہنچنا ہے، وہاں میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔“

”نہیں تم ماڈل ٹاؤن نہیں جاؤ گے۔ میں تمہارے لیے چارپائی اور بستر کا انتظام کرتا ہوں۔ تم رات یہیں رہو!“

”لیکن ابّا جان پریشان ہوں گے۔ ہمیں کل دوپہر کو واپس جانا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ علی الصبح تمہارے پاس آجاؤں گا۔“

”بھئی نہیں، اگر تمہارے ابّا جان کو معلوم ہے کہ تم میرے پاس آئے ہو تو وہ یہ سمجھ جائیں گے کہ میں نے تمہیں روک لیا ہے۔ صبح میں تمہارے ساتھ جا کر معذرت کرلوں گا۔“

”بھئی یہ تو ابّا جان بھی کہتے تھے کہ میں نہیں آسکوں گا۔“

ہوسٹل کے نوکر نے کمرے کے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ”سلیم صاحب! کھانا لے آؤں؟“

”ہاں بھئی، دو آدمیوں کا کھانا لے آؤ۔“

نوکر چلا گیا اور سلیم نے ارشد کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”ارشد! میں ایک دوست کی مزاج پُرسی کر آؤں۔ پانچ منٹ میں آتا ہوں، اس کے بعد اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

☆☆☆☆☆

کھانا کھانے کے بعد سلیم اور ارشد بستروں پر لیٹے ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشت سنا رہے تھے۔ ارشد سے اچانک ملاقات پر سلیم کے ذہن میں جو سب سے اہم سوال تھا، وہ ابھی تک اس کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے دل کی وہ مقدس دھڑکنیں تھیں جنہیں اُس کے ہونٹوں تک آنا گوارا نہ تھا۔

اچانک ارشد نے کہا۔ ”سلیم! بڑے دونوں کی چھٹیوں میں تم امرتسر ضرور آؤ۔ اگر میں اپنے گاؤں گیا تو تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ امّی نے بھی تاکید کی ہے کہ تم ضرور آؤ۔“

سلیم نے کہا۔ ”بھئی! یہ آج پتہ چلا کہ تم گاؤں کے رہنے والے ہو۔ تم تو کہا

کرتے تھے کہ مجھے گاؤں کی زندگی دیکھنے کا بہت کم اتّفاق ہوا ہے۔"

ارشد نے جواب دیا۔ "ہاں بھئی ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے پہلی بار اس وقت اپنا گاؤں دیکھا تھا جب میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہاں ہماری تھوڑی سی زمین تھی جس کا بیشتر حصّہ دادا مرحوم نے اپنی زندگی میں گروی رکھ دیا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد ابّا جان نے اپنی تعلیم کے اخراجات پورا کرنے کے لیے باقی کھیت بھی گروی رکھ دیے۔ ملازم ہونے کے بعد مکان انہوں نے اپنے چچا زاد بھائیوں کے حوالے کر دیا۔ اور وہاں سے یہ عہد کر کے نکلے تھے کہ وہ گاؤں میں اس وقت تک آباد نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنی زمین نہیں چھڑا لیتے۔ اب ابّا جان نے نہ صرف وہ زمین چھُڑا لی ہے بلکہ کچھ اور خرید لی ہے۔ گاؤں سے باہر ہم نے ایک چھوٹی سی کوٹھی بھی بنوا لی ہے۔ سلیم تم ضرور آؤ۔ عصمت اور راحت بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ عصمت ابھی تک اپنی سہیلیوں کو تمہاری کہانیاں سنایا کرتی ہے۔"

"وہ کون سی جماعت میں پڑھتی ہیں؟" سلیم نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"عصمت دسویں میں ہے اور راحت ساتویں میں۔"

سلیم دو ننھے اور معصوم چہروں پر زمانے کی تبدیلیوں کا تصوّر کرنے لگا اور ماضی کے دِلفریب نقوش اسے موہوم تصویریں نظر آنے لگے۔ وہ بچپن کے بے اختیار قہقہوں کو جوانی کی سنجیدہ مُسکراہٹوں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا وہ عصمت اب بڑی ہو گئی ہے۔ رواج کے ہاتھ اُس کے چہرے پر نقاب ڈال چکے ہوں گے۔ اب وہ اُس کے لیے پھولوں کے گلدستے نہیں بنا سکے گا۔ اب وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نہیں کہہ سکے گا "دیکھو! اِسے گرا نہ دینا۔" وہ ان دِنوں، مہینوں اور برسوں سے خفا تھا جو اس کی شاہراہِ حیات کے ہر رنگین اور دلکش نقش کو اپنی آغوش میں چھپا رہے تھے۔

ارشد سو گیا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد سلیم کو بھی نیند آ گئی۔ خواب میں وہ ماضی کی دیواریں پھاندتا ہوا اُس رنگین وادی میں جا پہنچا جہاں بچپن اچھلتا کودتا اور قہقہے لگاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بڑے دِنوں کی چھٹیوں میں سلیم کو سیدھا اپنے گاؤں جانے کی بجائے امرتسر اُترنا پڑا۔ ارشد گزشتہ ملاقات میں اسے بتا چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے نوکری سے مستعفی ہو کر اپنی دکان کھول لی ہے۔ وہ امرتسر میں اپنے مکان کا پتہ بھی اُس کے پاس چھوڑ آیا تھا۔

دوپہر کے وقت دکان بند تھی، اس لیے سلیم نے تانگے والے کو مکان کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ تانگے والے کو ڈاکٹر شوکت کا مکان تلاش کرنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے محلّے میں داخل ہو کر جس دُکاندار سے مکان کا پتہ پوچھا وہ خود ہی ساتھ آ کر سے مکان کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ سلیم نے تانگے سے اپنا سوٹ کیس اُتار کر دروازے کے سامنے رکھ دیا۔ اور تانگے والے کو کرایا ادا کرنے کے بعد دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکے نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب گھر نہیں ہیں“ اور پیشتر اِس کے کہ سلیم کچھ کہتا، اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

سلیم نے قدرے تذبذب کے بعد پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُسی لڑکے نے پھر ایک بار کواڑ کھول کر اپنا سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک بار کہہ

دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔" وہ دوبارہ دروازہ بند کرنے کو تھا کہ سلیم نے جلدی سے کہا۔ "ارے امجد! تم مہمانوں کے ساتھ اِسی طرح پیش آیا کرتے ہو؟ ارشد کہاں ہے؟"

"بھائی جان باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

کسی نے امجد کا کان پکڑ کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا اور کہا۔ "آپ لاہور سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں!" سلیم نے راحت کو پہچانتے ہوئے جواب دیا۔

راحت کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا اور وہ "امّی جان! آپا جان!" کہتی ہوئی واپس بھاگ گئی۔

ماں کی آواز آئی۔ "اری کیا ہے؟"

"امّی جان وہ آ گئے ہیں؟"

"کون سلیم؟"

"ہاں وہ آ گئے ہیں۔"

عصمت کتاب پھینک کر اپنے کمرے سے نکلی اور دروازے کے ساتھ لگ کر باہر جھانکنے لگی۔ اچانک سلیم نے اُس کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ عصمت جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

ماں نے کہا۔ "راحت تم بیٹھک کا دروازہ کھول کر بھائی کو اندر بٹھاؤ، آج خدا جانے نوکر کہاں غارت ہو گیا ہے۔"

راحت نے امجد سے کہا۔ "امجد تم جاؤ انہیں بیٹھک میں لے آؤ میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

امجد نے جواب دیا۔ "بس میں نہیں مانتا تمہارا کہنا۔ تم نے میرا کان کیوں کھینچا تھا۔"

"تھپڑ لگاؤ اس کے منہ پر۔" ماں نے بگڑ کر کہا۔

"بڑا کمینہ ہے یہ۔" عصمت نے آگے بڑھ کر کہا۔ امجد ایسے مہمان کی آمد پر قطعاً خوش نہ تھا جس نے آن کی آن میں گھر کی فضا بدل دی تھی تاہم اُسے مجبوری سمجھتے ہوئے وہ مکان سے باہر نکل آیا اور سلیم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آؤ جی بیٹھک میں!"

اتنی دیر میں راحت بیٹھک کا دروازہ کھول چکی تھی۔ سلیم اپنا سوٹ کیس اُٹھا کر اندر داخل ہوا۔۔۔ راحت تذبذب کی حالت میں کھڑی تھی کہ اُس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ سلیم نے سلام کیا۔

وہ بولی۔ "بیٹا جیتے رہو، ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم تمہارے متعلّق ہی باتیں کر رہے تھے۔ ارشد ابھی باہر گیا ہے۔۔۔۔ بیٹھ جاؤ بیٹا! راحت تم نے بھائی کو سلام نہیں کیا!" اور وہ ایک شرارت آمیز تبسّم کے ساتھ "بھائی جان السّلام علیکم" کہہ کر ساتھ والے کمرے میں غائب ہو گئی۔ عصمت دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ راحت نے اس کی طرف دیکھے کر دبی زبان میں کہا۔ "آپا جان! اب تو وہ بہت بڑے ہو گئے ہیں۔"

"چُڑیل چُپ رہو!" عصمت اسے بازو سے پکڑ کر دروازے سے دُور لے

گئی۔

بیٹھک میں اُن کی ماں سلیم سے کہہ رہی تھی۔ ”بیٹا تم آرام سے بیٹھو، ارشد ابھی آ جائے گا۔ میں تمہارے لیے چائے تیّار کرتی ہوں۔ امجد! تم اپنے بھائی کے پاس بیٹھو!“

وہ چلی گئی تو سلیم امجد کی طرف متوجّہ ہوا۔ ”امجد ادھر آؤ!“ امجد جھجکتا ہوا آگے بڑھا۔ سلیم نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا۔ امجد پڑوس میں اپنے ایک ہم جماعت کے گھر جا کر پتنگ اُڑانا چاہتا تھا اور وہ اس خیال سے پریشان تھا کہ جب تک ارشد نہیں آئے گا، اسے چھٹی نہیں ملے گی لیکن سلیم بچّوں کو بہلانا جانتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلّفی سے باتیں کر رہے تھے۔

سلیم نے پوچھا۔ ”امجد! تم اپنے گاؤں کب جا رہے ہو؟“

”ہم کل جائیں گے۔ آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں؟“

”ہاں! تم میرا گاؤں دیکھ چکے ہو لیکن تم اس وقت بہت چھوٹے تھے۔“

”بھلا گاؤں میں سانپ ہوتے ہیں؟“

”ہوتے ہیں۔“

”بہت بڑے بڑے سانپ جو آدمی کو سالم نِگل جاتے ہیں؟“

”نہیں ایسے سانپ نہیں ہوتے، یہ تمہیں کس نے بتایا؟“

”راحت نے۔ وہ کہتی تھی کہ سانپ جب پھنکارتے ہیں تو آگ نکلتی ہے اور اگر انہیں ڈنڈا مارا جائے تو ڈنڈے کو آگ لگ جاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ گاؤں میں ریچھ، شیر اور چیتے ہیں۔“

”وہ تم سے مذاق کرتی ہو گی۔“

”مجھے معلوم ہے، وہ مذاق کرتی ہے۔ یہ جانور جنگلوں میں ہوتے ہیں لیکن بھُوت اور جِن گاؤں میں ضرور ہوتے ہوں گے اور رات کے وقت وہ لوگوں کو ڈراتے بھی ہوں گے؟“

”نہیں، اگر انسان خود ڈرپوک نہ ہو تو اُسے کوئی نہیں ڈراتا۔“

"آپ کو بھی نہیں ڈرایا کسی نے؟"

"نہیں۔"

"راحت کہتی ہے کہ بھُوت بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ وہ بچّوں کو چمٹ جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک کہ اُسے ٹھنڈے پانی میں غوطے نہ دیے جائیں۔ بعض بھُوت بہت ضدّی ہوتے ہیں اور اُن سے جان چھُڑانے کے لیے منہ کو سیاہی لگا کر گدھے پر سواری کرنی پڑتی ہے۔ بھلا یہ سچ ہے؟"

سلیم بڑی مُشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا اور راحت دوسرے کمرے میں دروازے کے ساتھ کھڑی اپنے دانت پیس رہی تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہے نا؟"

سلیم نے کہا۔ "تمھیں یہ سب باتیں راحت نے بتائی ہیں؟"

"ہاں جی۔ وہ بہت جھوٹ بولتی ہے۔ وہ کہتی تھی گاؤں میں جب بارش ہوتی ہے تو پانی لوگوں کے گھروں تک پہنچ جاتا ہے اور جو تیرنا نہیں جانتے

وہ ڈوب جاتے ہیں۔ اس لیے مجھے گاؤں میں نہیں جانا چاہیے۔"

سلیم نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تم سے مذاق کرتی ہے۔"

امجد بولا۔ "یہ بھی کہتی ہے کہ رات کے وقت جب گاؤں کے لوگ سو جاتے ہیں تو چوہے اُن کے اوپر چڑھ کر ناچتے ہیں اور گیدڑ کھیتوں سے نِکل کر۔۔۔" راحت نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر اسے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اور وہ فقرہ پورا نہ کر سکا۔ سلیم کی توجّہ امجد کی طرف تھی، اس لیے وہ راحت کو نہ دیکھ سکا۔ امجد کے اچانک، خاموش ہو جانے پر اُس نے کہا۔ "ہاں بھی گیدڑ کیا کرتے ہیں کھیتوں سے نکل کر؟"

"بھائی جان یہ بکواس کرتا ہے۔" راحت یہ کہتے ہوئے اندر آ گئی۔

امجد بولا۔ "ہونہہ! تم نے کہی نہیں تھیں مجھ سے یہ باتیں؟"

راحت نے کہا۔ "بھائی جان، یہ کانگرسی ہے، اس کی باتوں پر یقین نہ کیجیے، یہ کٹر کانگرسی ہے۔"

راحت نے امجد کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کانگرسی کہلانا اُس کے لیے

ایک گالی کے مترادف تھا اور کٹر کانگرسی کہلانا اس کے نزدیک بدترین گالی تھی بالخصوص جب سے اس نے مہاتما گاندھی کی تصویر دیکھی تھی، کانگرسی بن جانے کا تصوّر بھی اُس کے لیے نا قابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن میں کانگریس اور مہاتما گاندھی ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ اس نے غصّے میں آکر کہا۔ ”مجھے کانگرسی کہو گی تو میں تمہاری ساری باتیں بتادوں گا۔ تم نے مجھے مینڈکوں، کچھوؤں اور نیولوں کے متعلّق بھی بتایا تھا کہ وہ سردیوں کی راتوں میں بچّوں کے ساتھ آکر سو جاتے ہے۔ اور بھینسے مکان کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں۔ بھینسے کے متعلّق تو بڑی آپا نے بھی کہا تھا۔۔۔“

عصمت نے دوسرے کمرے سے آواز دی، ”امجد!“

اور اس نے جواب دینے کی بجائے فریاد کے لہجے میں کہا۔ ”آپا جان! چھوٹی آپا مجھے کٹر کانگرسی کہتی ہیں۔“

”امجد! ادھر آؤ!“ اندر سے دوبارہ نرم آواز آئی۔ امجد اُٹھ کر جھجکتا ہوا آگے بڑھا لیکن راحت نے جلدی سے اُس کا کان پکڑ لیا اور کھینچتی ہوئی

دوسرے کمرے میں لے گئی۔

سلیم ہنس رہا تھا۔ امجد چند منٹ کے بعد دوبارہ اُس کے کمرے میں آیا تو وہ کافی سنجیدہ ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد آ گیا۔ سلیم نے اس کے ساتھ چائے پی اور شام کے وقت دونوں سیر کے لیے نکل گئے۔ رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد سلیم، ارشد، ڈاکٹر شوکت اور اُن کی بیوی کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ راحت اور امجد خاموشی سے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ سلیم عصمت کی غیر حاضری کے باعث اس محفل میں ایک خلا محسوس کر رہا تھا۔

گفتگو کا موضوع پاکستان تھا۔ سلیم کی گرمجوشی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ تم جیسے نوجوان اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہے۔ ہندو بہت زیادہ تیّار ہو چکا ہے لیکن بدقسمتی سے ہم ابھی تک اس بات پر بھی متفق نہیں ہو سکے کہ ہم ایک قوم ہیں اور ہمیں ایک وطن کی ضرورت ہے۔ تم نوجوانوں کو بہت کام کرنا ہے۔ ورنہ مجھے ڈر ہے

کہ طوفان آچکا ہو گا اور ہم ابھی تک یہ بحث کر رہے ہوں گے کہ ہمیں کسی جائے پناہ کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

ارشد کی ماں بولی۔ "بھئی سلیم! ارشد تمہاری تقریر کی بہت تعریف کرتا تھا اگر یہاں تمہارے پاس اُس کی کوئی نقل ہے تو ہمیں بھی سُنا دو۔"

"جی، جو تقریر میں نے کی تھی، وہ تو مجھے اُسی دِن بھول گئی تھی۔ میں نے فقط مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے پر اکتفا کیا تھا۔"

"اچھا جو لکھی تھی، وہ سنا دو!"

سلیم نے اپنا سوٹ کیس کھول کر چند کاغذ نکالے اور انہیں پڑھ کر سُنانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے کئی بار خوب اور بہت خوب کہہ کر داد دی اور اختتام پر کہا۔ "بھئی خدا تمہیں ہمّت دے، تم پاکستان کے لیے بہت کام کر سکو گے!"

ارشد کی ماں بولی۔ "بیٹا! جب تم عصمت اور راحت کو عجیب و غریب کہانیاں سُنایا کرتے تھے میں اسی وقت کہا کرتی تھی کہ خدا نے تمہیں بہت

اچھا ذہن دیا ہے۔"

راحت نے آہستہ سے امجد کے کان میں کچھ کہا اور وہ بلبلا اُٹھا۔ "ابّا جان راحت مجھے پھر کانگرسی کہتی ہے۔"

راحت کو ماں نے ڈانٹا اور وہ رنجیدہ ہونے کے بجائے ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

راحت اور امجد کے جھگڑے گھر کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن چُکے تھے۔ راحت اسے چھیڑتی، وہ ماں یا باپ کے پاس جا کر فریاد کرتا، کبھی کبھی راحت کو ڈانٹ پڑتی اور تھوڑی دیر کے لیے امجد کے ساتھ بول چال بند کر دیتی۔ پھر امجد کی باری آتی۔ وہ دوسروں سے نظر بچا کر اُس کا منہ چڑاتا۔ جب اُس پر بھی متوجّہ نہ ہوتی تو وہ اس کے ہاتھ سے کتاب، قلم یا سوئیٹر بُننے کی سلائیاں چھین کر ہنستا ہوا بھاگ جاتا۔ راحت اس کا پیچھا کرتی، کبھی کبھی امجد جان بوجھ کر اُس کے ہاتھ آجاتا اور راحت اُسے پیٹنا چاہتی لیکن وہ ہاتھ جو غصّے سے بُلند ہوتے، امجد کے حسین گالوں تک پہنچتے پہنچتے رُک جاتے۔ "پھر کرو گے شرارت؟" وہ اس کا کان پکڑ کر کہتی۔

"نہیں! نہیں! آپا جان معاف کر دو۔" وہ ہنستے ہوئے کہتا اور آپا جان بھی اپنا غصّہ بھول کر ہنس پڑتیں اور اگر کبھی راحت کچھ دیر کے لیے سچ مُچ خفا ہو جاتی تو امجد محسوس کرتا کہ گھر کی فضا پر اُداسی چھا رہی ہے۔

آج بھی جب راحت اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تو تھوڑی دیر کے بعد امجد کو سلیم، ارشد اور اپنے والدین کی محفل میں تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ کچھ دیر اُس نے اپنے دل پر جبر کیا۔ بالآخر وہ اُٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ راحت جو عصمت کے پاس بیٹھی اس سے کھُسر پھُسر کر رہی تھی، دبی زبان میں بولی۔ "آپا یہ کانگرسی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

☆☆☆☆☆

رات کے وقت یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ سلیم، ارشد کی والدہ اور بچّوں کے ساتھ اُن کے گاؤں جائے گا اور وہ تین دِن وہاں رہے گا۔ چنانچہ دس بجے کے قریب وہ اُن کے ساتھ امرتسر سے اجنالہ کی طرف جانے والی موٹر پر سوار ہو گیا۔ ڈاکٹر شوکت اپنی مصروفیات کے باعث اُن کا ساتھ نہ دے سکے۔

اجنالہ سے چند میں آگے ارشد نے ڈرائیور کو لاری کھڑی کرنے کے لیے کہا۔ گاؤں کے چار آدمی جنہیں ڈاکٹر شوکت کے چچازاد بھائی نے سامان اُٹھانے کے لیے بھیجا تھا، سڑک پر کھڑے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ ارشد نے سامان اُن کے حوالے کیا اور یہ اُن کے پیچھے پیچھے پیدل گاؤں کی طرف چل دیے۔

ارشد کی والدہ اور عصمت سیاہ برقعے پہنے ہوئے تھیں اور راحت نے موٹر سے اُترنے کے بعد برقعہ اُتار کر بغل میں دبالیا تھا۔

ارشد سلیم سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ راحت بڑی چڑیل ہے۔ پچھلے دِنوں اِسے خیال آیا کہ برقع پہنے سے چھوٹی لڑکیاں بھی معتبر بن جاتی ہیں چنانچہ اِس نے ہمیں برقع سِلوانے پر مجبور کرنے کے لیے بھوک ہڑتال کر دی۔ اب اِس کی جان عذاب میں ہے۔ اگر ایک دِن برقع پہن لیتی ہے تو وہ دِن دوپٹے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی۔ ابھی ہم گاؤں پہنچیں گے تو وہاں کے بچّوں پر رُعب ڈالنے کے لیے فوراً برقع پہن لے گی۔“

کوئی دو میل پگڈنڈی پر چلنے کے بعد ارشد نے سامنے کی طرف ہاتھ سے

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سلیم! وہ ہمارا گاؤں ہے اور وہ آم کے درخت کے ساتھ ہمارا نیا مکان۔ وہ درخت بہت پرانا ہے، میرے دادا نے لگایا تھا۔“

سلیم دو دِن وہاں رہا۔ اس عرصہ میں راحت اور امجد اس کے ساتھ کافی مانوس ہو چکے تھے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد سلیم کافی دیر ارشد، راحت، امجد اور اُن کی والدہ سے باتیں کرتا رہتا۔ گزشتہ چند سال کے عرصے میں اس کے گاؤں میں کئی ایسے واقعات پیش آ چکے تھے جو سُننے والوں کے لیے بے حد دلچسپ تھے۔ چچا اسماعیل گاؤں کی زندگی میں نئے قہقہوں اور نئی مُسکراہٹوں کا اضافہ کر چکا تھا۔۔۔۔ چودھری رمضان سے کئی اور بدحواسیاں سرزد ہو چکی تھیں۔ کاکو عیسائی اور ہری سنگھ لوہار کی لفظی جنگ کئی نئے مراحل طے کر چکی تھی۔ سلیم انہیں یہ واقعات سُناتا اور کبھی کبھی اُسے ان کے علاوہ ساتھ والے کمرے سے کسی کے دبے دبے میٹھے اور دلفریب قہقہوں کی آواز بھی آتی اور اُسے اس دیوار کا احساس ہونے لگتا جو وقت نے اُس کے اور عصمت کے درمیان حائل کر

دی تھی۔

دوسری رات وہ انہیں ایک ادبی رسالے سے اپنا مضمون 'میرا گاؤں' پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ اس کی کرسی کمرے کے ایک کونے میں میز کے قریب تھی جس پر لیمپ جل رہا تھا۔ ارشد اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور کمرے کے دوسرے سِرے پر ایک چارپائی پر ارشد کی والدہ، امجد اور راحت بیٹھی ہوئی تھیں۔ عصمت ساتھ والے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ ماں نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ سفید چادر میں لپٹی ہوئی دبے پاؤں آگے بڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سلیم کو اس کمرے میں اس وقت اس کی موجودگی کا احساس ہوا جب کسی واقعہ پر ہنس رہے تھے اور دبے دبے قہقہوں کی آواز ساتھ والے کمرے کی بجائے اب اُس کمرے کے کونے سے آرہی تھی۔

اچانک امجد چلّایا۔ "امی جان! اب بڑی آپا بھی مجھے کانگرسی کہتی ہیں۔" اس پر سب ہنس پڑے اور عصمت اپنا سارا وجود سمیٹ کر ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد عصمت راحت کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی اور امجد چوکنّا ہو کر سُننے کی کوشش کر رہا تھا۔ عصمت نے غصّے کی حالت میں اُسے گردن سے پکڑ کر پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”کانگرسی پیچھے ہٹو؟“

امجد اپنے مطلب کی کوئی بات تو نہ سُن سکا تاہم اُسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ کاناپھُوسی اُس کے سوا کسی اور کے متعلّق نہیں چنانچہ وہ اپنی مدافعت کے لیے تیّار ہو کر بیٹھ گیا۔

راحت نے سلیم کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”بھائی جان! اس پیر کا واقعہ سنائیں جو آپ کا گھوڑا خریدنے آیا تھا۔“

امجد گھوڑا خریدنے والے پیر کے ساتھ اپنا کوئی تعلّق قائم نہ کر سکا تاہم اس نے سلیم کو ایک بات سے باخبر کرنا ضروری سمجھا۔ وہ بولا۔ ”بھائی جان! یہ بات بڑی آپا نے چھوٹی آپا کے کان میں کہی ہے۔ میں سُن رہا تھا۔“

ماں نے ڈانٹا۔ ”تم بہت شریر ہو گئے ہو۔“

امجد اب محسوس کر رہا تھا کہ ہر معاملے میں صاف گوئی سود مند ثابت

نہیں ہوتی۔۔۔ماں اسے گھور رہی تھی۔ راحت اس کی پنڈلیوں میں اپنے ناخن چبھونے کی کوشش کر رہی تھی اور عصمت نظر بچا کر اُس کے کان مروڑ رہی تھی۔ وہ زہر کے گھونٹ پی کر اُٹھا اور کمرے کے دوسرے کونے میں سلیم کے پیچھے کرسی پر جا بیٹھا۔

سلیم نے پیر ولایت شاہ کی سرگزشت کے ساتھ رمضان کے کوٹھے پر چڑھنے والے بھینسے کا قصّہ بھی سُنا دیا۔ اختتام پر جب سب قہقہے لگا رہے تھے، امجد ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ ہو گیا اور ارشد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”بھائی جان! ہم اپنے مکان کے پچھواڑے کسی کو پیال کا ڈھیر نہیں لگانے دیں گے۔“

ارشد نے سلیم نے کہا۔ ”بھئی جب ہم تمہارے گاؤں گئے تھے تو اس گھوڑے کی تصویر تمہاری بیٹھک میں لگی ہوئی تھی، مجھے یہ سُن کر بہت افسوس ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔“

ارشد کی ماں نے پوچھا۔ ”بیٹا کیسے مرا وہ؟“

"یوسف میری غیر حاضری میں سے گھر والوں سے چوری چنے کھلا دیا کرتا تھا، اس کا خیال تھا کہ میری غیر حاضری میں اسے پوری غذا نہیں ملتی۔ ایک دِن اُس نے اس کے آگے بہت زیادہ چنے ڈال دیے۔۔۔۔ گھر والوں کو اُس کے مرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ وہ یوسف کی محبّت کا شکار ہوا ہے۔"

امجد نے برہم ہو کر کہا۔ "یوسف کون ہے؟"

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے، وہ تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ تُم اُسے بھول گئے؟"

امجد نے کہا۔ "جب آپ کو پتہ چل گیا کہ گھوڑے کے آگے اُس نے زیادہ چنے ڈال دیے تھے تو آپ نے اسے کچھ نہ کہا؟"

"بھئی اُسے کیا معلوم تھا کہ زیادہ چنے کھانے سے گھوڑا مر جائے گا۔"

امجد کو اچانک اپنی مظلومیت کا احساس ہوا اور اس نے کہا۔ "دیکھو جی! ایک دِن میں نے بھائی جان کی میز سے دوات گرا دی تو انہوں نے مجھے دو

تین تھپڑ لگا دیے۔ ایک دِن مجھ سے بڑی آپا کا قلم ٹوٹ گیا تو انہوں نے بھی مجھے پیٹا تھا۔"

ارشد نے ہنستے ہوئے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور کہا۔ "سلیم بھائی! یہ بڑا خطرناک آدمی ہے!" راحت بولی۔ "بھائی جان! سب کانگرسی خطرناک ہوتے ہیں۔" اور امجد دانت پیس کر رہ گیا۔

ماں بولی۔ "خبر دار! میرے بیٹے کو کسی نے کانگرسی کہا تو۔۔۔۔"

☆☆☆☆☆

اگلے دِن سلیم نے اپنے میزبانوں کو خدا حافظ کہا۔ ارشد سڑک تک اس کے ساتھ آیا اور اسے موٹر پر بٹھا کر واپس چلا گیا۔ شام کے پانچ بجے سلیم اپنا سوٹ کیس اُٹھائے اُس پگڈنڈی پر جا رہا تھا جس کے ہر موڑ اور ہر کھیت کی تصویر اُس کے دل پر نقش تھی لیکن اُس پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ ایک نئے راستے کے نقوش اُس کے دل میں اُبھر رہے تھے۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر اُسے بڑ کا وہ درخت نظر آنے لگا جو اس کے مکان کے سامنے تھا اور

اس کا تصوّر آم کے اُس درخت تک جا پہنچا جس کی شاخیں ارشد کے مکان پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا ”کاش! یہ درخت اس قدر قریب ہوتے کہ ان کی شاخیں ایک دوسرے سے مِل جاتیں۔ کاش وہ مکان اس قدر پاس ہوتا کہ وہ کسی کے شرمائے ہوئے دبے دبے قہقہوں کو سُن سکتا۔ سلیم کے ذہن میں ماضی کے خیالات کی منتشر کڑیاں ایک زنجیر میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے دل میں نئی اُمنگیں اور نئے ولولے محسوس کر رہا تھا۔ اس کے شعور و احساس میں ایک گہرائی آ چکی تھی۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، اُس نے گاؤں سے باہر رہٹ کے پانی سے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد جب وہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگ رہا تھا تو اس کی دعا میں چند نئے الفاظ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ دُعا ختم کر کے اُٹھنے والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اُس کی آنکھیں بند کر لیں اور وہ ہاتھوں اور کلائیوں کو ٹٹولتے ہی چلّا اُٹھا۔ ”کون مجید؟“

مجید ہنس پڑا اور وہ اُٹھ کر اس کے گلے لپٹ گیا۔ مجید کے ساتھ ایک اور قوّی ہیکل نوجوان کھڑا تھا۔ سلیم نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور جواب

طلب نگاہوں سے مجید کی طرف دیکھنے لگا۔ مجید بولا۔ ”بھلا بتاؤ تو یہ کون ہے؟“

سلیم نے غور سے اُس کی طرف دیکھا، اچانک ماضی کے چند دُھندلے نقوش اُس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ ”ارے داؤد!“ وہ چلّایا۔

مجید نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”داؤد نکالو ایک روپیہ! دیکھو سلیم! یہ مجھ سے شرط لگاتا تھا کہ تم اِسے نہیں پہچان سکو گے۔“

سلیم بولا۔ ”بھئی مجھے پہچاننے میں کچھ تکلیف ضرور ہوئی اب اس نے اُسترے سے سر منڈانے کی بجائے بال رکھ لیے ہیں۔ بھئی داؤد کب آئے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی آٹھ دِن ہو گئے ہیں۔ آج پتا چلا کہ چودھری مجید آئے ہوئے ہیں، اس لیے یہاں چلا گیا۔ اب واپس جا رہا تھا کہ آپ مل گئے۔“

”بس اب تم یہیں ٹھہرو گے!“

مجید بولا۔ "ہاں بھئی، اب تم نہیں جاسکتے۔"

رات کے وقت مجید اور داؤد اپنی فوجی زندگی کے کارنامے سُنا رہے تھے۔۔۔ مجید اب جمعدار ہو چکا تھا اور داؤد ابھی تک سپاہی تھا۔

☆☆☆☆

جنگ کے اختتام کے بعد برطانیہ کی وزارت ہندوستان کو آزادی کے اس درخت کا پھل تقسیم کرنے والی تھی جسے جرمنی اور جاپان کی گرم ہواؤں سے بچانے کے لیے تمام اقوام سے خون اور پسینے کی بھیک مانگی گئی تھی۔ انگریز بظاہر ہندوستان کی سیاسی جنگ میں ایک فریق کی بجائے ثالث کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ کانگریس جس نے ۱۹۴۲ میں جاپان کی سنگینوں کے سائے میں ہندو سامراج کے احیا کے امکانات دیکھ کر "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا تھا، اب مایوسی کی حالت میں ٹوکیو کی بجائے لندن کو اپنی توقعات کا مرکز بنا چکی تھی۔

انگریز بہر حال جا رہا تھا۔ کب جا رہا تھا؟ کن حالات میں جا رہا تھا؟ کانگریس

کو اس کے متعلّق کوئی پریشانی نہ تھی۔ اس کے سامنے فقط ایک نصب العین تھا اور وہ یہ کہ فقط گورا سامراج جن اختیارات سے دستبردار ہو، وہ کالے فاشزم کے ہاتھ آ جائیں۔ انگریزی اقتدار کے چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا اور کانگرس چاہتی تھی کہ اُس کی ٹمٹماتی لو سے ہندو اقتدار کی شمع روشن کر لی جائے۔ شیر برطانیہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے دانت جھڑ چکے تھے اور وہ ہندوستان کی وسیع شکار گاہ کو چھوڑنے والا تھا اور بھارت کے بھیڑیوں کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے ”اَن داتا! تم جا رہے ہو تو یہ شکار گاہ ہمارے سپرد کر جاؤ۔ دیکھو ہماری اکثریت ہے۔ تمہیں ان بھیڑوں کے متعلّق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جو پاکستان کی چراگاہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہ ہماری ہیں۔ ہم اُن کی رکھوالی کریں یا شکار کھیلیں، تمہیں اس سے متعلّق پریشان ہونے کا حق نہیں۔“

ہندو کے سامنے صرف ایک محاذ تھا اور اس محاذ پر فتح حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ساری قوّتیں بروئے کار لا چکا تھا، اور یہ محاذ مسلمانوں کے خلاف تھا۔ کانگرس ایک طرف ان جنونیوں کی افواج تیّار کر رہی تھی

جنہوں نے تاریخِ انسانیت میں ظلم، وحشت اور بربریت کے ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا اور دوسری طرف انگریز کے ساتھ اُس کی منطق تھی کہ مسلمان ہمارے بھائی ہیں، اس لیے آزاد ہندوستان میں جو ہمارے حصّے آتا ہے، وہ ہمیں دے دو جو مسلمان کے حصّے آتا ہے، وہ بھی ہمیں دے دو۔ اور صرف یہی نہیں تم جانے سے پہلے ہمیں اقتدار کے گھوڑے پر سوار کر دو۔ ہمارے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول دے دو اور مسلمانوں کو رسّیوں میں جکڑ کر ہمارے سامنے ڈال دو۔ پھر تم اطمینان سے چلے جاؤ۔ پھر کوئی جھگڑا نہیں ہو گا۔۔۔۔ کوئی فساد نہیں ہو گا۔ اس ملک میں شانتی ہی شانتی ہو گی۔۔۔۔۔ اگر تم نے پاکستان کے نعروں کی طرف توجّہ دی تو ہم یہ کہیں گے کہ تم فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد رکھ کر جا رہے ہو۔ ہم ہندوستان کی مقدس گائے کے دو ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔

☆☆☆☆☆

دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ مسلمان پاکستان کو اپنا آخری حصار سمجھ کر طوفان سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتا تھا اور ہندو فاشزم پاکستان کو اپنے جارحانہ مقاصد

کے سامنے سدِّ سکندری سمجھ کر اس کے گرد گھیر اڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہندو فاشزم اپنی پوری قوّت اور تنظیم کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا لیکن مسلمانوں کے راستے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ ان کے راستے میں وہ نام نہاد نیشنلسٹ مسلمان کانٹے بچھا رہے تھے جو ذلّت کے چند ٹکڑوں کے عوض ہندو کے ساتھ قوم کی عزّت اور آزادی کا سودا کر چکے تھے۔ ان کے راستے میں وہ یونینسٹ مسلمان گڑھے کھود رہے تھے جن کے اسلاف نے کبھی سِکھّوں اور کبھی انگریزوں سے اپنی قوم کے شہیدوں کے خون کی قیمت وصول کی تھی۔ یہ ابن الوقت انگریزی راج کے خاتمہ کے آثار دیکھ کر ہندو فسطائیت کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے۔ پنجاب کو یہ اپنے باپ دادا کی میراث سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا اور یہ کہ ان کے اقتدار کا طُرّہ بُلند رہے۔ خواہ یہ مقصد انگریز کے بوٹ چاٹنے سے حاصل ہو، خواہ ہندو کی قدم بوسی سے۔

کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو عملی تیّاریوں میں مصروف تھے۔ مسلمانوں

کا شیرازہ منتشر رکھنے کے لیے ملّت فروشوں کے گروہ کئی ناموں اور کئی چولوں کے ساتھ میدان میں آچکے تھے اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔

کانگریس نے ایک مسلمان کو ”راشٹر پتی“ کے لقب سے سرفراز کر دیا ہے اس لیے مسلمانوں کو پاکستان کی ضرورت نہیں۔

پنجاب میں فلاں مولوی فلاں پروفیسر نے اپنے تازہ بیان میں کہا ہے کہ مسلم عوام پاکستان نہیں چاہتے لہٰذا پاکستان محض ایک نعرہ ہے۔

سندھ میں فلاں سیّد اور فلاں حاجی پاکستان کو مسلمانوں کے لیے مضرت رساں خیال کرتا ہے لہٰذا سمجھ دار مسلمان پاکستان کے مخالف ہو گئے ہیں۔

بلوچستان میں ایک شخص نے قراقلی اُتار کر گاندھی ٹوپی پہن لی ہے، اس لیے پاکستان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوبہ سرحد کے فلاں خان صاحب نے گاندھی جی پر ارتھنا سبھا سے اُٹھنے کے بعد یہ بیان دیا کہ

گاندھی بھی بہت اچھے آدمی ہیں، بکری کا دودھ پیتے ہیں، مرن برت رکھتے ہیں اور چرخہ کاتتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کی نجات پاکستان بنانے میں نہیں چرخہ کاتنے میں ہے۔

مسلمان بدحواس تھے، پریشان تھے۔ ان کے کندھوں پر لولے لنگڑے اور سیاسی بصیرت سے کورے رہنماؤں کی لاشیں تھیں۔ ان پر منافقوں اور ملّت فروشوں کی شخصیتوں کے بھُوت سوار تھے۔ یہ رہنما مختلف راستوں سے اپنے اپنے گروہ کو اس سیاسی قبرستان کی طرف ہانک رہے تھے جہاں کانگرس ان کے کفن دفن کے انتظامات مکمّل کر چکی تھی۔

ان مایوسیوں میں ایک آواز ڈگمگاتے، اُونگھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے مسلمانوں کے لیے صورِ اسرافیل کا کام دے رہی تھی۔ ایک دُبلا پتلا اور عمر رسیدہ رہنما انہیں منزل کا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے نحیف اور لاغر ہاتھوں سے قوم کے سفینے کے پھٹے ہوئے بادبانوں کی مرمّت کرتا اور کبھی دُشمن کے چہرے سے مکر و ریا کے نقاب نوچتا۔ اس کی گرجتی ہوئی آواز سننے والوں کی رگوں میں بجلی کی لہر بن کر دوڑ جاتی۔ وہ کانوں کو روندتا ہوا

اور مخالفت کی چٹانوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ قائدِ اعظم محمد علی جناح تھا۔

☆☆☆☆☆

۱۹۴۵ء میں کانگریس کا رویہ جس قدر مسلم لیگ کے ساتھ غیر مصالحانہ تھا اسی قدر وہ انگریز کی طرف جھک رہی تھی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور اب انگریز کو شمالی ہند سے سپاہی بھرتی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اب ان جرّی نوجوانوں کی کوئی قدر نہ تھی جنھوں نے جرمنی اور جاپان کا سیلاب روکنے کے لیے اپنے فراخ سینوں پر گولیاں کھائی تھیں۔ اب برطانیہ کے تجارتی مقاصد کو بڑی بڑی توندوں والے مہاجنوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ مشرق کے ممالک میں امریکہ کے تاجروں کی اجارہ داری کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے برطانوی کارخانہ دار کانگرس کے ٹاٹاؤں، برلوں اور ڈالمیوں سے گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔ کانگرس کے سرمایہ دار سرپرستوں کے گروہ کا لیڈر سیٹھ برلا برطانیہ میں اپنی تجارتی مہم کے لیے گاندھی کی آشیر باد حاصل کر کے اس حقیقت کی طرف ایک غیر مبہم اشارہ کر چکا تھا کہ

انگریز اور کانگرس کے سیاسی سمجھوتے میں اور برطانوی تاجر اور ہندو مہاجن کی سودا بازی کو ایک لازمی شرط قرار دیا جائے گا۔ مرکز میں عبوری دُور کے لیے ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے سلسلہ میں شملہ کانفرنس کی ناکامی کی وجہ تھی کہ کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ماننے کے لیے تیّار تھی۔ وہ مرکز میں ہندو اور مسلم نمائندوں کی برابری کے اصول کی مخالف تھی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے حصّے میں سے بھی کم از کم ایک نیشلسٹ مسلمان کو نامزد کرنے کا حق تسلیم کروانا چاہتی تھی تاکہ بوقت ضرورت اسے واردھا کے سامراجی مقاصد کے رَتھ میں جوتا جاسکے۔

بظاہر یہ نیشنلسٹ یا سیاسی یتیموں کا گروہ کانگرس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے کی راہ میں رکاوٹ نظر آتا تھا لیکن درحقیقت یہ وہ بے جان پتھّر تھے جن کی آڑ لے کر کانگرس ہندو کی فرقہ وارانہ جنگ کو غیر فرقہ وارانہ رنگ دینا جانتی تھی۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے عام

انتخابات مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک اہم ترین مرحلہ تھے۔ کانگرس کو کسی دوسری ہندو جماعت سے مقابلے کا خطرہ نہ تھا۔ وہ ہندو عوام پر یہ ثابت کر چکی تھی کہ اسلام دشمنی یا پاکستان کی مخالفت میں اس کی ذہنیت ہندو مہاسبھا کی ذہنیت سے مختلف نہیں لیکن مسلم لیگ کے سامنے کئی محاذ تھے۔ ہر صوبے میں کسی نہ کسی نام سے ملّت فروشوں کی ٹولیاں موجود تھیں اور انہیں مسلم لیگ کے مقابلہ میں کامیاب کروانے کے لیے کانگرس کے مہاجن اپنی تجوریاں کھول چکے تھے۔

پنجاب میں ابن الوقت یونینسٹوں کا گروہ یہ دیکھ کر کہ اس کے سر سے انگریز کا سایہ اُٹھنے والا ہے، اپنے اقتدار کا طُرّہ بنئے کی دھوتی کے ساتھ باندھ چکا تھا۔ بیرونی حملے کی نسبت اندرونی حملہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اقوام کو دُشمن سے زیادہ اپنے غدّار تباہ کرتے ہیں اور یہاں غدّار کوئی ایک نہ تھا، دو نہ تھے، ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ مسلمانوں کی کوئی بستی، کوئی شہر اور کوئی مجلس ایسی نہ تھی جو ان کے وجود سے خالی ہو۔۔۔۔ اور آج تک کسی قوم نے ایسے غدّار پیدا نہیں کیے جنہوں نے

اسٹیج پر کھڑے ہو کر قوم کو یہ سمجھانے کی جسارت کی ہو کہ تمہیں اپنی بقا کے لیے آزاد وطن کی ضرورت نہیں۔ رائے عام کتنی کمزور کیوں نہ ہو، ملّت فروشوں کو پہلوانوں کی حیثیت سے اپنے سیاسی اکھاڑے میں کودنے کی اجازت نہیں دیتی۔۔۔۔ وہ قوم کی آنکھوں کے سامنے زہر کا پیالہ بھر کر یہ نہیں کہتے کہ میں دُشمن کی طرف سے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ موت کے بعد تمہاری لاش کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ چھپ چھپ کر اِنتشار کا بیج بوتے ہیں۔

لیکن مسلمانوں میں اجتماعی شعور کے فقدان کا یہ عالم تھا کہ وہ ملّت فروش جنہیں صُبح و شام دُشمن کے دستر خوان کی ہڈّیاں چوستے دیکھا جاتا تھا، بازاروں میں دندناتے تھے، چوراہوں پر کھڑے ہو کر تقریریں کرتے تھے۔۔۔۔۔۔ ان کی جماعتیں تھیں، انجمنیں تھیں، اور وہ علی الاعلان قوم کے سامنے یہ ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے کہ اے قوم! اگر تجھے پاکستان مل گیا تو تیرا ستیاناس ہو جائے گا۔ عزّت، آزادی اور خود مختاری تیرے لیے بھوک، افلاس اور قحط کا پیغام لائے گی۔ ہندو ناراض ہو جائے گا اور

مہاتما گاندھی کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔۔۔۔ مسلمانو! یہ کیا بزدلی ہے کہ تم ہندو اکثریت کے اقتدار سے خطرہ محسوس کرتے ہو۔ دنیا کیا کہے گی کہ تم اس قدر تنگ نظر تھے۔

مسلم اکثریت کے شمال مغربی علاقوں میں پنجاب ریڑھ کی ہڈّی کی حیثیت رکھتا تھا اور یہی وہ محاذ تھا، جہاں کامیابی حاصل کیے بغیر مسلمانوں کے لیے پاکستان کی منزلِ مقصود کی طرف ایک قدم آگے بڑھانا ناممکن تھا۔

بنگال کے حالات اُمّید افزا تھے۔ وہاں کانگرس جن مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتی تھی، وہ اپنا اثر و رسوخ کھو چکے تھے لیکن پنجاب میں ہندو فسطائیوں کو اپنی بندوقوں کے لیے یونینسٹوں کے کندھے کا سہارا مل چکا تھا۔ کانگرس یہ سمجھ چکی تھی کہ مسلم عوام اس کے پرانے نمک خواروں میں نیشنلسٹ مسلمانوں کو شک و شُبہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں اس لیے پنجاب میں مسلم لیگ کو شکست دینے کے لیے انھوں نے یونینسٹوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور اپنے تمام ذرائع اُن کی کامیابی کے لیے وقف کر دیے۔ یہ لوگ انتخاب کی جنگ لڑنے کے لیے انگریز پرست حکام کی

مدد سے لاکھوں روپیہ جمع کر چکے تھے اور اب کانگریسی مہاجنوں کی سرپرستی کے باعث ان کی پونجی بہت زیادہ ہو چکی تھی۔

ان حالات میں مسلمان نوجوان اور بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ اجتماعی خطرات کے سامنے آنکھیں بند کر کے نہ بیٹھ سکا۔ وہ اپنی درس گاہیں، اسکول اور کالج چھوڑ کر طرّے اور لنگوٹی کے اس ناپاک اتّحاد کو شکست دینے کے لیے میدان میں آ گیا۔ پاکستان کے حق میں مسلم اکثریت کے صوبوں کی نسبت اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کا جوش و خروش کہیں زیادہ تھا اور اس کی وجہ تھی کہ ہندو کی اسلام دُشمنی ان پر زیادہ واضع تھی، اس لیے ان اصولوں کے سینکڑوں طلبا جان کی بیشتر تعداد علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتی تھی، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے محاذوں پر پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

ضلع گورداسپور کے ایک چھوٹے سے شہر میں مقامی مسلم لیگ کا انتخابی جلسہ ہو رہا تھا۔ ایک ریٹائرڈ اسکول ماسٹر صدارت کی کرسی پر رونق افروز

تھا اور ایک نوجوان تقریر کر رہا تھا۔ اس جلسے کے انعقاد سے قبل شہر اور ارد گرد کے دیہات میں منادی کی گئی تھی کہ ایک پیر صاحب کے صاحبزادے اس جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لا رہے ہیں اور چند مشہور لیڈر تقریریں کریں گے۔ دیہات کے لوگ بھی بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھنے اور کچھ پیر صاحب کے صاحبزادے سے عقیدت کا ثبوت دینے کے لیے شہر میں جمع ہو چکے تھے۔ جلسے کا وقت ہو چکا تھا کہ صاحبزادے کا پیغام گیا کہ انہیں راستے میں روک لیا گیا ہے اور وہ اگلے دِن پہنچ سکیں گے۔ مقرّرین کے متعلّق کوئی اطلاع نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں۔

مقامی ذیلدار اور تھانیدار اس جلسے کے مخالف تھے۔ تحصیلدار صاحب دو دِن قبل اس شہر کے ارد گرد کے دیہات کے معتبرین کو بُلا کر خبر دار کر چکے تھے کہ حکامِ بالا کو علاقے میں بد امنی کا اندیشہ ہے، اس لیے لوگوں کو جلسے میں شریک ہونے سے روکا جائے۔ تھانیدار صاحب شہر کے دُکاندار کو دھمکی دے چکے تھے کہ اگر اس نے مسلم لیگ کے جلسے کے لیے

لاؤڈا سپیکر دیا تو اچھا نہ ہو گا۔ ذیلدار صاحب بھی نمبرداروں کی ٹولی کے ساتھ دیہات کا چکّر لگا چکے تھے۔ کرائے کے چند مولوی علاقے میں سب سے بڑے مہاجن کی موٹر کار پر بیٹھ کر سادہ دل دیہاتیوں کو یہ بتا چکے تھے کہ پاکستان کا نعرہ ان کے لیے بہت خطرناک ہے۔ لیکن اس گاؤں کے چند لڑکے امر تسر اور لاہور کے کالجوں میں پڑھتے تھے اور مقامی اسکول کے طالبِ علموں کی ایک بھاری تعداد اُن کے زیرِ اثر تھی۔ چنانچہ وہ ان کے منظّم گروہ کے ساتھ قرب وجوار کی بستیوں میں اس جلسے کی منادی کر چکے تھے۔

جلسہ شام کے چار بجے ہونا تھا اور دیہات کے طالبِ علم دوپہر سے پہلے ہی اپنے اپنے گاؤں کے لوگوں کے گروہ لے کر شہر پہنچ رہے تھے۔ طالبِ علموں کے ہاتھوں میں سبز جھنڈیاں تھیں اور ہر ٹولی کے آگے ایک شخص ڈھول بجاتا آرہا تھا۔۔۔۔یونینسٹ اُمّیدوار نے ڈسٹرکٹ کانگرس کے صدر کو یہ اِطّلاع بھیج دی تھی کہ یہاں ایک عدد ہوشیار مولوی کی اشد ضرورت ہے۔

پیر صاحب کے صاحبزادے کا پیغام ملنے کے بعد منتظمینِ جلسہ کے سامنے یہ سوال تھا کہ اب صدارت کون کرے گا؟ ایک ضعیف العمر ریٹائرڈ اسکول ماسٹر ذیلدار تھانیدار اور حکامِ بالا کے عتاب سے بے پرواہ ہو کر کرسی صدارت پر بیٹھنے کے لیے تیّار ہو گیا تو لیڈروں کا انتظار ہونے لگا۔۔۔ ساڑھے چار بج گئے۔ حاضرین میں اضطراب پیدا ہونے لگا۔ بالآخر کالج کے ایک نوجوان نے تقریر شروع کر دی۔۔۔ وہ پاکستان کے حق میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن جو لوگ دُور سے چل کر آئے تھے، بوڑھے اور نحیف و لاغر اسکول ماسٹر کو پیر جی کے صاحبزادے اور اس نو عمر لڑکے کو کسی بڑے لیڈر کا نعم البدل سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کی تقریر کا اثر اس کے ارد گرد بیٹھنے والے آدمیوں تک محدود تھا۔ اور جو ذرا دور تھے، وہ بے پروائی سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔۔۔ اچانک اس جلسے گاہ سے کوئی سو قدم دور سڑک پر دو نئی خوب صورت کاریں اور ان کے پیچھے ایک لاری آکر رُکی جس پر لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا۔۔۔۔ یونینسٹ اُمّیدوار کار سے اُترا۔ اس کے ساتھ ایک کانگرسی مولوی اور اس علاقے کے تین با اثر زمیندار

بھی کار سے اُترے۔ دوسری کار سے علاقے کا ذیلدار، سفید پوش اور تین نمبر دار نمودار ہوئے۔ نتھا سنگھ تھانیدار اور کریم بخش حوالدار نے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا۔ یونینسٹ اُمّیدوار کے اشارے سے پروپیگنڈا کی لاری کے لاؤڈ سپیکر پر گراموفون ریکارڈ لگا دیا تھا اور مسلم لیگ کی جلسہ گاہ سے پچھلی صفوں کے لوگ آہستہ آہستہ اُٹھ کر سڑک پر جمع ہونے لگے۔ کانگرسی مولوی صاحب گاڑی کی چھت پر کھڑے ہو گئے اور مائیکروفون ہاتھ میں لے کر قرآن کی تلاوت کے بعد تقریر شروع کر دی۔ تھوڑی دیر میں مسلم لیگ کے جلسہ کی رونق آدھی سے کم رہ گئی۔

مسلم لیگ کے مقابلہ میں یونینسٹ اُمّیدوار کی اس ہنگامہ آرائی کو تقویت دینے کے لیے بازار اور آس پاس کی گلیوں کے ہندو اور سکھ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ مسلم لیگ کے جلسے میں تقریر کرنے والے نوجوان نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ”مسلم لیگ زندہ باد! پاکستان زندہ باد!“ اس کے جواب میں موٹر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے والے مولوی صاحب نے بُلند آواز میں کہا ”نعرۂ تکبیر!“ اور اس کے

جواب میں بیک وقت دو مختلف آوازیں بلند ہوئیں۔ مسلمان ”اللہ اکبر“ کہہ رہے تھے لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے بدحواسی کے عالم میں ”زندہ باد“ کہہ دیا۔ مسلمان ہنس پڑے۔ وہ ایک دوسرے کو سمجھا رہے تھے۔ ”دیکھو بھئی! جب مولوی صاحب نعرہ لگائیں تو اللہ اکبر کہنا چاہیے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے بُلند آواز میں کہا ”ہندو مسلم اتحاد“ تو سکھوں اور ہندوؤں نے ”زندہ باد!“ کہہ کر پہلی غلطی کی تلافی کر دی۔

اچانک سڑک پر ایک جیپ نمودار ہوئی۔ جس پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سلیم ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور پیچھے چار اور نوجوان بھی تھے۔ سلیم کے اشارے سے ڈرائیور نے جیپ مسلم لیگ کے اسٹیج کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ گاؤں کے وہ لوگ جو ابھی تک دل پر جبر کر کے وہاں بیٹھے ہوئے تھے، اُٹھ اُٹھ کر جیپ سے اُترنے والے نوجوانوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی یہ کہہ رہا تھا ”لیڈر آ گئے۔“ کوئی کہہ رہا تھا ”نہیں یار! یہ لیڈر نہیں۔ لیڈر ان کے پیچھے آ رہے ہوں گے۔“

سلیم اور اس کے ساتھی جیپ سے اُترے۔ ان میں دو علی گڑھ یونیورسٹی کے طالبِ علم تھے اور اُن کی سیاہ اچکن اور تنگ پاجامے دیکھ کر بعض لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ یہی لیڈر ہیں۔ نوجوان مقرّر نے اسٹیج سے اُتر کر سلیم اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کیا۔ اس سے چند سوالات پوچھنے کے بعد سلیم صورتِ حالات کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس نے جلسے کے منتظمین کو تسلّی دے کر کہا۔ ''آپ فکر نہ کیجیے، ہمارے پاس لاؤڈ اسپیکر موجود ہے، آپ اسے جیپ سے نکلوا کر اسٹیج پر لگوا دیجیے۔''

پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''بھئی ناصر علی! یہ وہی مولوی ہے، جسے ہم نے پرسوں امرتسر میں بھگایا تھا۔''

''ارے یہ کینچوا یہاں بھی پہنچ گیا۔'' کالی اچکن والے ایک نوجوان نے حیران ہو کر کہا۔ ''یار بڑا ڈھیٹ ہے یہ۔''

لاؤڈ سپیکر فِٹ ہو گیا تو سلیم نے کہا۔ ''ناصر علی صاحب! ذرا نعت پڑھ دیجیے۔''

ناصر علی نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر نعت شروع کی اور سامنے تقریر کرنے والے مولوی کی آواز اس کی بُلند اور دلکش تانوں میں دب کر رہ گئی۔ وہ مسلمان جو تھوڑی دیر قبل جلسے سے اُٹھ کر سڑک پر جمع ہو گئے تھے اب واپس آرہے تھے۔

نعت ختم ہوئی تو سلیم مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ تھانے دار اور کریم بخش حوالدار وہاں آ دھمکے۔ تھانیدار نے اسٹیج کے قریب آکر کہا۔ ”ہمیں فساد کا خطرہ ہے، اس لیے آپ یہاں جلسہ نہ کریں!“

سلیم نے جواب دیا۔ ”اچھا صاحب! لیکن وہ سامنے سڑک پر کیا ہو رہا ہے؟“

تھانیدار نے جواب دیا۔ ”ادھر مولوی صاحب تقریر کر رہے ہیں۔“

”تو آپ کا خیال ہے کہ میں یہاں پٹاخے چلانے آیا ہوں؟“

لوگوں نے قہقہہ لگایا اور تھانیدار نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش

کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہو؟“

”آپ نے ان مولوی صاحب سے پوچھ لیا ہے کہ وہ کون ہیں؟“

”تمہیں اس سے کیا واسطہ؟ تم میری بات کا جواب دو!“

”سردار جی! آپ پاکستان کے متعلّق کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟“

تھانیدار نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ ”دیکھو جی! میں یہاں دو جلسوں کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تمہارے درمیان اتنا فاصلہ ضرور چاہیے کہ ایک کی آواز دوسرا نہ سن سکے۔ یہ میری ڈیوٹی ہے۔“

”ٹھیک ہے سردار صاحب! انہوں نے خوامخواہ اس جلسے میں خلل ڈالنے کے لیے لاری لا کر یہاں کھڑی کر دی ہے۔ انہوں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ آپ یہاں ڈیوٹی پر کھڑے ہیں۔ یہ یونینسٹ بہت شریر ہیں۔ یہ فساد کا بیج بوتے ہیں اور بدنام ہو جاتے ہیں آپ جیسے افسر۔ آپ انہیں کہیں کہ موٹر یہاں سے ہٹا لیں اور اگر پٹرول نہ ہونے کی وجہ سے موٹر یہاں رُک گئی ہے تو سپاہیوں کو کہیں کہ اسے دھکیل کر ذرا دور لے

جائیں۔"

"کریم بخش حوالدار نے تلخ ہو کر کہا۔" دیکھو تم نے تقریر کی تو ہم لاٹھی چارج کر دیں گے۔"

سلیم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "کیسے بد تمیز ہو تم۔ میں تمہارے افسر سے بات کر رہا ہوں اور تم خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔ تمہیں یہ بھی خبر نہیں کہ جب تھانیدار کسی کے ساتھ بات کر رہا ہو تو حوالدار کو خاموش رہنا چاہیے۔"

تھانیدار پہلے ہی اس اُلجھن سے باہر نکلنے کا موقع تلاش کر رہا تھا وہ حوالدار پر برس پڑا۔ "تم کون ہو بیچ میں بولنے والے اور لاٹھی چارج کرنے کے لیے کس اُلّو کے پٹھّے نے کہا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد سلیم تقریر کر رہا تھا۔ تھانیدار نہ اِدھر تھا نہ اُدھر، بلکہ درمیان میں کھڑا اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

گزشتہ تین ہفتوں میں امرتسر اور گورداسپور کے اضلاع کے دورہ کرنے

کے بعد سلیم یہ سمجھ چکا تھا کہ شہروں کے باشندوں کو پاکستان کا حامی بنانے کے لیے اب تقریروں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ شہروں کے تاجر، مزدور اور ملازم پیشہ مسلمان ہندو ذہنیت کو خوب سمجھتے ہیں اور کانگرس یونینسٹ مسلمان کے کندھے پر اپنی بندوق رکھ کر انہیں فریب نہیں دے سکتی۔ شہروں کے تعلیم یافتہ بچّے اور بوڑھے طرّے اور لنگوٹی کے ناپاک اتحاد کے خلاف میدان میں آچکے تھے لیکن دیہات میں تعلیم یافتہ لوگ بہت کم تھے اور ان میں سے اکثر گھروں سے باہر سرکاری دفاتر میں کام کرتے تھے اور وہ چھوٹے یا بڑے تعلیم یافتہ زمیندار جو ملازم نہیں تھے، تھانیداروں، تحصیلداروں، ذیلداروں اور پولیس کے سپاہیوں، آنریری مجسٹریٹوں اور جھوٹی گواہیاں دینے والے معتبروں سے بہت مرغوب تھے۔ تاہم سلیم یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ان میں سے بھی ستّر یا اسّی فیصدی ایسے ہیں جو بظاہر ابن الوقت یونینسٹوں کے ساتھ ہیں، لیکن وقت آنے پر پاکستان کو ووٹ دیں گے۔ اگر وقت سے پہلے انہیں یہ پتہ چل گیا کہ اس انتخاب کے بعد پانچ دریاؤں کی سرزمین سے طرّے کا اقتدار ختم ہونے والا ہے، تو وہ علی الاعلان پاکستان کا نعرہ لگاتے ہوئے

میدان میں آ جائیں گے۔ سب سے اہم مسئلہ دیہات کے اَن پڑھ عوام کا تھا جن کے ووٹوں کی قیمت چکانے کے لیے زمیندار لیگ کے چندے میں سود در سود لینے میں اور بلیک مارکیٹ کرنے والے مہاشوں کا فالتو روپیہ بھی شامل ہو چکا تھا۔ دیہات کے لوگ ان معتبروں کو جو پانچ روپے کے عوض جھوٹی گواہی دینے کے لیے دس دس میل پیدل جایا کرتے تھے، اب خوبصورت کاروں پر یونینسٹ اُمّیدواروں کے حق میں نعرے لگاتے دیکھ رہے تھے، وہ دیہاتیوں کے ساتھ اس قسم کی عام فہم باتیں کیا کرتے تھے۔

"تمہیں مٹّی کے تیل کی ضرورت ہے؟"

"جی ہاں!"

"تمہیں کھانڈ بھی نہیں ملتی؟"

"جی وہ بھی نہیں ملتی۔"

"تمہیں کپڑے کی بھی ضرورت ہے؟"

"جی ہاں! اب تو مُردوں کے لیے کفن بھی نہیں ملتے۔"

"یونینسٹ اُمّیدواروں کو ووٹ دو۔ تمہیں مٹّی کا تیل بھی ملے گا، کھانڈ بھی ملے گی اور مُردوں کے لیے کفن بھی ملیں گے۔ کفن مُفت ملیں گے۔"

"جی مُفت؟"

"ہاں! بالکل مُفت۔ یونینسٹ پارٹی زمینداروں اور کسانوں کی پارٹی ہے۔ تمہارے لیے ہر گاؤں میں اسکول اور اسپتال کھولے جائیں گے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام ہو گا۔ لگان بالکل کم کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ہاں! کفن کی اگر کسی کو ضرورت ہو تو اب بھی مُفت مل سکتا ہے۔ اُمّیدوار خود تقسیم کرتا ہے۔"

گاؤں کے بچّے خوب صورت کار کے گرد جمع ہو جاتے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ موٹر والوں کو بے تکلّفی سے باتیں کرتے دیکھ کر وہ موٹر کے ساتھ بے تکلّف ہو جاتے۔ کوئی ہارن بجاتا۔ کوئی مڈ گارڈ پر بیٹھ کر گنّا چُوستا۔ بزرگ انہیں ڈانٹتے لیکن کار والے کہتے "بھئی بچّوں کو کچھ نہ کہو، ڈرائیور!

ذرا ان کو سیر کرادو۔ ہاں بھئی نعرہ لگاؤ۔ فلاں چودھری زندہ باد! زمیندار اور کسان زندہ باد!" اور گاؤں کے بچّے اسے موڑ پر سواری کی فیس سمجھ کر نعرے لگا دیتے۔

سلیم اس اجتماع میں ان لوگوں کی بڑی تعداد دیکھ رہا تھا جو اس قسم کے پروپیگنڈے سے مرعوب کئے جا رہے تھے۔ چنانچہ اس کی تقریر ان تقریروں سے بہت مختلف تھی جو شہر کے لوگوں کے لیے کی جاتی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"بھائی! آج میں اس بات پر بہت خوش ہوں کہ میرے سامنے ایک مسلمان مولوی تقریر کر رہا ہے اور مسلمانوں سے زیادہ ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہیں۔۔۔۔ اور وہ خوشی سے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔ لیکن سچ بتاؤ کہ تم نے پہلے کبھی یہ تماشا دیکھا ہے کہ ایک مولوی وعظ کر رہا ہو اور ہندو اور سکھ بھائی اُس کے گرد جمع ہوں؟"

سامعین میں سے بعض نے جواب دیا "نہیں۔"

"اچھا بھائی! تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسا خضر صورت مولوی قرآن اور حدیث سُنا رہا ہو، اور ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال رہے ہوں؟"

"نہیں۔" لوگوں نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی! یہ بتاؤ کہ وہ دو کاریں اور موٹر جس کی چھت پر مولوی صاحب کھڑے تقریر کر رہے ہیں، کسی کی ہیں؟"

ایک نوجوان نے اُٹھ کر جواب دیا۔ "یونینسٹ اُمّیدوار کی۔"

"لیکن بھئی! میں نے تو یہ سُنا ہے کہ اس کے پاس اپنا صرف ایک ٹانگہ تھا اور وہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔ یہ نئی نئی کاریں کہاں سے آئیں؟"

ایک شخص نے جواب دیا۔ "یہ دونوں کاریں سیٹھ دھنی رام کی ہیں، اور لاری سردار گوپال سنگھ کی ہے۔"

"تو بات یوں ہے کہ سیٹھ دھنی رام نے مسلم لیگ کے مخالف اُمّیدوار کو انتخاب کی جنگ کے لیے اپنی کاریں دی ہیں۔ گوپال سنگھ نے اپنی لاری

دی ہے اور لاؤڈ سپیکر بھی شاید کسی سردار صاحب یا سیٹھ صاحب نے دیا ہو۔ ہمیں اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ انہوں نے ضرورت کے وقت ہمارے ایک غریب بھائی کی مدد کی ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ جب ہندو ساہوکار ایک غریب کسان سے قرضہ وصول کرتا ہے تو اس کے گھر سے دو آنے کا توا بھی قرق کرا لیتا ہے لیکن آج یونینسٹ اُمّیدواروں کو وہ اپنی موٹریں دے رہے ہیں، روپیہ دے رہے ہیں۔ کل تک یہ لوگ کفن کا کپڑا بھی بلیک مارکیٹ میں بیچتے تھے لیکن اب مُسلم لیگ کے مخالف اُمّیدواروں کو سینکڑوں تھان مُفت دیے جا رہے ہیں تاکہ وہ تمہیں مُفت کفن دے کر ووٹ حاصل کر سکیں۔۔۔ میں پوچھتا ہوں کہ آج ہمارا ہندو بھائی جو سود در سود لے کر ایک آنے کا ایک روپیہ بنانے کا عادی تھا، اس قدر فضول خرچ کیوں ہو گیا ہے؟

اس سوال کا جواب شاید تم نہ دے سکو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ہندو پاکستان کا مخالف ہے یا نہیں؟"

"مخالف ہے۔" سامعین نے جواب دیا۔

”اور وہ چودھری صاحب جو اس کے پیسوں سے مسلم لیگ کے خلاف انتخاب لڑ رہے ہیں؟“

”وہ بھی مُخالف ہیں۔“

”اور سکھ جنھوں نے انہیں اپنی لاری دی ہے؟“

”وہ بھی مُخالف ہیں۔“

”اور یہ مولوی صاحب، جن کی تقریر سُن کر ہندو اور سکھ بھائی خوش ہو رہے ہیں؟“

”یہ بھی مُخالف ہیں۔“

”اور وہ تھانیدار صاحب جو ابھی مجھ پر ناراض ہو رہے تھے؟“

”وہ بھی مخالف ہیں۔“

”لیکن کیوں؟“

لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سلیم نے قدرے تاّمل کے بعد

کہا:

”بھئی پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ جِن علاقوں میں مسلمان زیادہ ہیں، وہاں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے۔ تمھیں اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“

”لیکن ہند کو اعتراض ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں ہندو زیادہ ہیں، وہاں بھی میری حکومت ہونی چاہیے اور جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں بھی میری حکومت ہونی چاہیے اور اگر چند دِن کے لیے پاکستان کی مخالفت کرنے والے مسلمان اُمّیدواروں کو وہ اپنی موٹریں، کھانڈ کی بوریاں اور کفن کے لیے کپڑا دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنا سکتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ سودا مہنگا نہیں۔ اس کا ساہوکارہ ہو گا، اسی کا قانون ہو گا، اسی کی عدالتیں ہوں گی۔ وہ آج اگر ایک روپیہ خرچ کر رہا ہے، تو اس اُمّید پر کہ کل وہ ایک لاکھ وصول کر سکے گا۔۔۔ اگر وہ پانچ سو یا ایک ہزار آدمیوں کو مُفت کفن دے کر دس کروڑ مسلمانوں کو ذلّت، افلاس اور غلامی کے

قبرستان کی طرف دھکیل سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔"

کانگرسی مولوی اس سے پہلے بھی اس قسم کی تقریر سُن چکا تھا۔ سلیم کے ساتھ امرتسر کے ایک قصبے میں اُس کی مُڈبھیڑ ہو چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس سیدھی سادی راگنی کی جو تان اس پر ٹوٹنے والی ہے، وہ خطرناک ہے۔ وہ تقریر کرتے کرتے رُک جاتا اور سمت مخالف سے چند الفاظ سُننے کے بعد پھر کوئی بات شروع کر دیتا لیکن اس کے خیالات کا تسلسل ٹُوٹ چکا تھا۔

سلیم کہہ رہا تھا۔۔۔ "کانگرسی ہندو یا سکھ پاکستان کے اس لیے مخالف نہیں ہیں کہ وہ سارے ہندوستان پر ہندو کا راج چاہتے ہیں۔ یہ یونینسٹ مسلمانوں کا گروہ اس لیے پاکستان کے مخالف ہے کہ انہوں نے انگریز کے بعد ہندو کو اپنا مائی باپ بنا لیا ہے۔ لیکن تم حیران ہو گے کہ وہ خضر صورت مولوی صاحب جن کے سر پر ہندو کی سی چوٹی ہے، نہ سکھوں کے سے بال اور نہ یونینسٹوں کا سا طُرّہ، انہیں پاکستان کی مخالفت سے کیا ملتا ہے؟"

سلیم کے ایک ساتھی نے اُٹھ کر جواب دیا۔ ”دال روٹی اور کیا!“

اب لوگ مولوی صاحب کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ سلیم نے اپنی مُسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بھئی! دال روٹی کے لیے کوئی شخص اتنا بدنام ہونا گوارا نہیں کرتا۔ یہ مرغ اور حلوے کی ڈکاریں ہیں۔۔۔ لیکن مولوی صاحب کو معلوم نہیں کہ ہمارے ہندو بھائی حلوہ اور پلاؤ کھلا کر اُن سے کیا کام لے رہے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ شکاری کانٹے کے ساتھ مچھلی کیسے پکڑتا ہے؟ وہ ڈوری کے ساتھ کانٹا باندھتا ہے؟ پھر ایک کیڑا پکڑتا ہے جسے کیچوا کہتے ہیں اور اسے کانٹے کے ساتھ لگا کر پانی میں پھینک دیتا ہے۔ مچھلی سمجھتی ہے کہ یہ اُس کی غذا ہے۔ وہ مُنہ کھول کر اس کی طرف دوڑتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کانٹا اُس کے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ بھائی! تم مچھلیاں ہو، ہندو شکاری ہے، ایسے اُمّیدوار کانٹا ہے اور یہ مولوی کیچوا ہے۔ اس کی شکل سے دھوکا نہ کھاؤ! یہ بڑا خطرناک ہے۔ ہندو شکاری یہ سمجھتا ہے کہ اس کی شکل وصورت مسلمانوں کو دھوکا دے سکتی ہے۔“

اب کانگرسی مقرّر ایک ہدف تھا اور سلیم کے ترکش کے تمام تیروں کا رُخ اُس کی طرف تھا۔ جب وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوتا تو اسکول کے لڑکے یہ کہنا شروع کر دیتے۔ ''مولوی کیچوا۔۔۔۔۔ مولوی کیچوا۔۔۔۔۔ مولوی کیچوا ہائے ہائے۔'' بعض لڑکے اب جلسے سے اُٹھ کر ایک دُکان کی چھت پر جا چڑھے اور ان کے نعرے موٹر کے گرد کھڑے ہونے والے لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔

مولوی صاحب ایک حساس طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن کانگرس کے تمام انعامات کے عوض انہیں اس نئے لقب سے سرفراز ہونا گوارا نہ تھا۔ اب بچّوں کی آوازوں کے ساتھ دیہاتیوں کے قہقہے بھی شامل ہوگئے۔ یہ نئی صورتِ حال اور بھی زیادہ المناک تھی اور پھر جب چھت پر بیٹھے ہوئے بچّوں نے ایک ساتھ ''مولوی کیچوا ہائے ہائے'' کہنا شروع کیا اور بعض ہندو سکھ بھی ہنس پڑے تو اُن کی قوّتِ برداشت ختم ہوگئی اور وہ قائدِ اعظم کو بُرا بھلا کہنے کے بعد نیچے اُتر آئے۔

جب اُن کی موٹر روانہ ہو رہی تھی تو لڑکے آگے آگے بڑھ بڑھ کر نعرے

لگا رہے تھے۔ انہوں نے ایک لڑکے کو تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن غصّے کی حالت میں موٹر کی کھڑکی کا شیشہ نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ اُن کا ہاتھ جس تیزی کے ساتھ اُٹھا تھا اُس سے زیادہ پھُرتی کے ساتھ واپس آیا۔ وہ تلملا کر ہاتھ جھٹک رہے تھے کہ ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا ذیلدار بلبلا اُٹھا۔

"ارے ظالم! مار ڈالا۔"

اگلی سیٹ سے یونینسٹ اُمّیدوار نے مُڑ کر دیکھا۔ ذیلدار صاحب کا ہاتھ اُن کی دائیں آنکھ پر تھا۔ "کیا ہوا چودھری صاحب؟" اس نے سوال کیا۔

"مولوی نے میری آنکھ میں انگوٹھا ٹھوس دیا ہے۔ توبہ میری ان کے ناخن ہیں یا نشتر؟"

مولوی صاحب کو کار سے باہر کیچوا کہا جا رہا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور اب ان کے ناخنوں کی تعریف ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگے۔ "لاحول ولا قوۃ۔ دیکھو جی! میرے ناخن بڑے ہیں یا ذیلدار کے؟"

ذیلدار نے اپنی پگڑی کا پلّو گول مول کر کے اپنی آنکھ میں ٹھونستے ہوئے

کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ آپ کے ناخن بڑے نہیں، ورنہ آپ نے میری آنکھ نکالنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ خدا کی قسم! آپ تھوڑا سا زور اور لگا دیتے تو معاملہ ختم تھا۔“

☆☆☆☆☆

رات کے وقت سلیم اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے ایک ٹھیکیدار کے ہاں قیام کیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اگلے دِن کا پروگرام تیّار کر رہے تھے کہ شہر کے چند معزّزین آ گئے۔ ان کے ساتھ وہ بوڑھا اسکول ماسٹر بھی تھا جس نے شام کے جلسے کی صدارت کی تھی۔ اس نے سلیم اور اس کے ساتھیوں سے ان لوگوں کو متعارف کرانے کے بعد کہا۔ ”بھی آج آپ لوگ آ گئے، خدا نے ہماری عزّت رکھ لی، ورنہ حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ آپ لوگ بہت کام کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ جیسے نوجوان بیدار ہو گئے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ علی گڑھ سے بھی کافی طلباء یہاں پہنچے ہیں؟“

سلیم نے کہا۔ ”جی ہاں! یہ مسٹر ناصر علی اور مسٹر ظفر علی گڑھ یونیورسٹی

کے طالب علم ہیں۔ ناصر صاحب صوبہ بہار کے رہنے والے ہیں اور ظفر صاحب کا وطن یوپی ہے اور یہ مسٹر عزیز اور جعفر لاہور سے آئے ہیں۔"

ماسٹر نے کہا۔ "خدا تمہیں ہمّت دے!"

اس کے بعد اہلِ مجلس کی توجّہ ناصر علی اور ظفر کی طرف مبذول ہو گئی۔ کسی نے سوال کیا۔ "آپ کے صوبوں میں تو مسلم لیگ کی کامیابی یقینی ہے؟"

ناصر نے جواب دیا۔ "جی ہاں! وہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہاں کے مسلمان ہندوؤں کے ستائے ہوئے ہیں۔ وہاں کانگرس کے ایجنٹ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں عوام کو اس لیے پاکستان کی ضرورت کا احساس نہیں کہ ہندو یہاں انہیں باہر نظر آتا ہے۔ اگر ایک پنجابی یا پٹھان کو یہ کہا جائے کہ ہندو بڑا وحشی اور ظالم ہے تو وہ ماننے کے لیے تیّار ہی نہیں ہو گا کیونکہ وہ یہاں اینٹ کا جواب پتھّر سے دے سکتا ہے۔ بالخصوص سرحد کے پٹھان سے اگر ہم ایسی بات کریں تو وہ ہمارا مذاق اُڑائے گا۔ اس کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ یہ لوگ

مسلمانوں کے ساتھ بد سلوکی کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ سرحد میں پاکستان کا نعرہ ابھی تک زیادہ مقبول نہیں ہوا۔۔۔۔۔ یوپی، بہار اور اقلیت کے دوسرے صوبوں میں ہمارا بچّہ بچّہ پاکستان پر قربان ہونا چاہتا ہے۔ وہاں یہ حالت ہے کہ ہندو حلوائی کی کڑاہی اگر کتّا چاٹ رہا ہو تو وہ اسے دھتکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن اگر سودا لیتے وقت مسلمان اس کے ہاتھ سے چھو جائے تو وہ مرنے مارنے کے لیے تیّار ہو جاتا ہے۔“

ایک نوجوان نے کہا۔ ”یہ تو آپ نے ٹھیک کہا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ پاکستان کے قیام سے سرحد، پنجاب، سندھ۔ اور بلوچستان اور بنگال کے صوبوں کی مسلم اکثریت کو یقینی فائدہ پہنچے گا، کیونکہ وہ آزاد ہوں گے اور ان کی اپنی حکومت ہو گی۔ ان کے لیے فلاح و ترقّی کی راہیں کھُل جائیں گی لیکن آپ لوگوں کو جو اقلیت کے صوبوں میں ہیں اس سے کیا فائدہ حاصل ہو گا؟ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ کے ایثار کی میرے دل میں کوئی قدر نہیں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کے بعد اگر ہندو نے آپ سے انتقام لیا تو آپ کی بے بسی بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اس

صورت میں آپ کیا کریں گے؟“

حاضرینِ مجلس اس سوال سے بہت برہم تھے لیکن ناصر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ پاکستان کی حمایت میں ہمارے نعرے محض سطحی جذبات کی پیداوار ہیں اور ہم نے اپنے مستقبل کے متعلّق نہیں سوچا لیکن ہم کسی اور رنگ میں سوچتے ہیں اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو کی غلامی قبول کریں۔ دوسرا یہ کہ وہ ہندوستان میں اپنی اکثریت کے علاقوں میں آزاد اور خود مختار ہو جائیں۔ پہلی صورت میں ہم سب ہندو کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ درّۂ خیبر سے لے کر خلیجِ بنگال تک رام راج کا جھنڈا لہرائے گا۔ ہم سب استبداد کی ایک ہی چکّی میں پِس رہے ہوں گے اور ہم سب کا مستقبل یکساں تاریک ہو گا۔ دوسری صورت میں کم از کم مسلم اکثریت کے صوبے ہندو کی غلامی سے بچ جائیں گے اور ہم یہ کہہ سکیں گے کہ پاکستان ہمارے آزاد بھائیوں کا وطن ہے۔ بیشک ہندوؤں کا سلوک ہمارے ساتھ سفّاکانہ ہو گا لیکن ہم

اس اُمّید پر جی سکیں گے کہ ہمارے بھائیوں کو ایک آزاد وطن مل چکا ہے اور وہ ہمارے حال سے بے پروا نہیں۔ اگر راجہ داہر کے قید خانے سے ایک مسلمان لڑکی کی فریاد نے دمشق کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا تھا تو آپ تین چار کروڑ مسلمانوں کی فریاد سُن کر اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونس لیں گے۔ اگر قوم کی مائیں بانجھ نہیں ہوئیں تو کوئی محمد بن قاسم اور کوئی محمود غزنوی ضرور پیدا ہو گا۔ پاکستان کی سرزمیں سے کوئی مردِ مجاہد ہماری فریاد سن کر ضرور تڑپ اُٹھے گا۔ بیشک ایک عبوری دور کے لیے ہمارے گرد تاریکیوں کا ہجوم ہو گا لیکن ہمارے دِلوں میں اُمّید کے چراغ جگمگاتے رہیں گے۔ ہم اپنے ظلمت کدوں میں بیٹھ کر پاکستان کی خاک سے نمودار ہونے والے سورج کا انتظار کریں گے اور فرض کیجیے پاکستان میں ہمارے آزاد بھائی ہمیں بھول بھی جائیں یا ہماری فریاد انہیں متاثر نہ کر سکے تو بھی ہم اسے خسارے کا سودا نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں مرنے کے بعد بھی تسکین ضرور حاصل ہو گی کہ جن سفاک ہاتھوں نے ہمارا گلا گھونٹا ہے وہ ہمارے بھائیوں کی شاہ رگ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم اگر عزّت اور آزادی کی زندگی میں ان کے ساتھی نہ بن سکے تو یہ ہمارے مقدر کی بات

ہے۔ لیکن ہم یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ذلّت اور غلامی کی موت میں آپ بھی ہمارے ساتھی بن جائیں۔ اگر ہم آپ کے ساتھ تیر کر ساحل تک نہیں جاسکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ ڈوب جائیں۔“

ناصر کی آواز بیٹھ چکی تھی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جھلک رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

صوبہ سرحد کے سوا مسلم لیگ ہر صوبے میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ پنجاب میں یونینسٹوں کا سفینہ انتخابات کے بھنور کی نذر ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلہ میں انہوں نے بہت بڑی شکست کھائی تھی۔ جہاں لیگ کے اسّی اُمّیدوار کامیاب ہوئے تھے، وہاں ابن الوقتوں کی تعداد فقط نو تھی۔ ہندوؤں نے یونینسٹ اقتدار کے گرتے ہوئے محل کو سہارا دیا۔ انگریز گورنر نے اُن کی سرپرستی فرمائی اور مسلم لیگ کو، جو صوبے کی سب سے بڑی پارٹی تھی، نظر انداز کر کے خضر حیات کو وزارت کی تشکیل کا موقع دیا۔ چند ملّت فروشوں کے باعث پنجاب کے مسلمان اپنی اکثریت

کے صوبہ میں اقلیتوں کے محکوم ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ ایک ہندو یا سکھ کو بھی اپنے ساتھ نہ ملا سکی، کیونکہ پنجاب میں لیگی وزارت کے قیام سے انہیں پاکستان کے محاذ کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ تھا لیکن کانگرس کو پاکستان کے خلاف سامراجی مقاصد کی توپ کھینچنے کے لیے وہ آزمودہ کار خچّر مل چکے تھے جنہیں انگریز نے اپنے سیاسی اصطبل میں بڑے شوق اور محنت سے پالا تھا۔

صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت بن چکی تھی۔ سندھ میں بھی ابن الوقت مسلمانوں کا ایک ٹولا وزارت کا توبڑا دیکھ کر کانگریس کے اقتدار کی رَتھ کھینچنے کے لیے تیّار تھا لیکن مسلم لیگ وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ بنگال میں مسلم لیگ کی اکثریت اس قدر نمایاں تھی کہ کانگرس کو جوڑ توڑ کا موقع نہ ملا۔ بہرحال کانگرس اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ ہندو اکثریت کے تمام صوبوں پر اُس کا تسلّط تھا اور وہاں ہندو عوام کو پاکستان کے خلاف فیصلہ کُن جنگ لڑنے کے منظّم کیا جا رہا تھا۔ کانگرسی وزارتوں کی سرپرستی میں ہندو مہاسبھا اور راشٹریہ سیوک

سنگھ کی افواج کیل کانٹے سے لیس ہو رہی تھیں۔ ہندو مہاجن انہیں روپے دے رہے تھے اور ہندو ریاستوں سے ان کے پاس اسلحہ اور بارود آ رہا تھا۔۔۔۔ مدافعانہ جنگ کے لیے پنجاب اور سرحد مسلمانوں کے اہم تین مورچے تھے لیکن یہاں بھی سکھوں کے گوردوارے اسلحہ سازی کی فیکٹریوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ہندوؤں کے مندروں اور اسکولوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ کی فوجیں تیّار ہو رہی تھیں لیکن شاہ پور کا وہ سیاست دان جس نے اپنی قوم کی بقا اور آزادی کے عوض وزارت کا سودا کیا تھا، خاموش تھا۔ پنجاب کا مورچہ مضبوط بنانے کے لیے ہندو اور سکھ صوبہ سرحد سے اسلحہ بھیج رہے تھے لیکن عدم تشدّد کے دیوتا کے سرحدی چیلے اس صورتِ حالات سے قطعاً پریشان نہ تھے۔

ہندوستان کے سیاسی اکھاڑے میں کانگرس کی جدوجہد بظاہر آئینی تھی لیکن درپردہ اپنے جارحانہ مقاصد کی تکمیل کے لیے تیّاریاں کر رہی تھی۔

مسلمانوں کا سنجیدہ طبقہ اس صورتِ حالات سے بے خبر نہ تھا لیکن پنجاب اور سرحد میں اُن کے دفاعی مورچوں پر چند افراد کی ملّت فروشی، یا کوتاہ

اندیشی کے باعث دُشمن کا قبضہ ہو چکا تھا۔

برطانیہ کا وزارتی مشن اپنی تجاویز لے کر آیا۔ ان تجاویز میں نہ وہ اکھنڈ ہندوستان تھا جو کانگریس چاہتی تھی اور نہ وہ پاکستان تھا جس کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا تھا۔ گروپ بندی کی صورت میں مسلمانوں کے تحفظ کے تھوڑے بہت امکانات دیکھ کر مسلم لیگ اپنے اصل مطالبہ سے دستبردار ہونے کے لیے تیّار ہو گئی۔ لیکن کانگریس کو مرکز کے اختیارات کا محدود ہو جانا گوارانہ تھا۔ اس کے فسطائی مقاصد کی تکمیل کے لیے مرکز میں ہندو اکثریت کے اختیارات کا لامحدود ہونا ضروری تھا۔ گروپ بندی میں مسلم اکثریت کے علاقوں کو جو معمولی خود مختاری ملتی تھی، اس میں کانگرس کے سیاسی مہاتما کو ایک ماہ سبھائی خورد بین کی بدولت پاکستان کے خطرناک جراثیم نظر آ گئے تھے۔ چنانچہ وہ اس تجویز کے بانیوں کو اپنی مخصوص انداز میں یہ سمجھا رہے تھے کہ تمہارا مطلب یقیناً وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ عبوری دور کی حکومت کے لیے بھی کانگرس مسلم لیگ کے مُقابلہ میں کچھ زیادہ مانگتی تھی چنانچہ مرکزی کابینہ کی تشکیل کے لیے

وائسرائے نے پانچ کانگرس، پانچ مسلم لیگ اور دو اقلیتوں کی نسبت کو چھ، پانچ اور دو کی نسبت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد کانگرس لمبے عرصہ کے لیے وزارتی مشن کی تجویز کی لنڈنی زبان کا وار دھائی ترجمہ نافذ کرنے پر مصر تھی اور جب تجاویز کے بانیوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا مطلب وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے تو گاندھی کی آتما کو دُکھ ہوا۔ تجاویز رد کر دی گئیں۔

وائسرائے لارڈ ویول یہ اعلان کر چکا تھا کہ اگر کوئی پارٹی رضامند نہ ہوئی تو بھی اس کے تعاون کے بغیر عبوری دور کے لیے مرکزی کابینہ کی تشکیل کی جائے گی۔۔۔۔۔ اعلان کے مطابق اب لیگ کو کابینہ کی تشکیل کا موقع ملنا چاہیے تھا لیکن مسلم لیگ کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس نے انگریز کے وعدوں پر اعتبار کرنے میں دھوکا کھایا ہے۔[۴]

دراصل ہندو اور انگریزی کے اس تمام ہیر پھیر کا مقصد پاکستان کی چٹان سے مسلم لیگ کے پاؤں متزلزل کرنا تھا۔ اب مسلم لیگ ہوا کا رُخ دیکھ

---

[۴] اس نئی صورتِ حالات میں سر کرپس نے یہ کہہ کر کانگرس کی مشکل حل کر دی کہ کانگرس نے لمبے عرصے کی تجاویز مان لی ہیں، اس لیے عبوری دور کی حکومت کی تشکیل کی پیشکش واپس لی جاتی ہے۔

چکی تھی اور چند قدم ڈگمگانے کے بعد اُس کا رُخ پھر اپنی اصلی منزلِ مقصود یعنی پاکستان کی طرف ہو چکا تھا۔۔۔

مسلمان کے میدان سے نکلتے ہی انگریز اور ہندو نے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور لارڈ ویول عبوری دور کے لیے کانگرس کو تشکیلِ وزارت کی دعوت دینے کا تہیّہ کر چکے تھے۔ مسلم لیگ کا آخری حربہ ڈائریکٹ ایکشن تھا جو انگریز کی ہندو نواز پالیسی کے خلاف احتجاج تھا لیکن ہندو اپنے آپ کو انگریز کا جانشین سمجھ کر میدان میں آ چکا تھا۔ بمبئی، احمد آباد، الٰہ آباد اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ہندو نے لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی۔ اس کے بعد کلکتہ کی باری آئی اور یہاں ڈائریکٹ ایکشن کے دن مسلم لیگ کے جلسوں پر اینٹوں، گولیوں اور دستی بموں کی بارش کی گئی۔ ان حالات میں وائسرائے نے آگ پر مزید تیل چھڑکنا ضروری سمجھا اور مرکز میں کانگرس کی وزارت بنا دی۔۔۔۔ وہ ہندو جس نے اقتدار حاصل ہو جانے کی اُمّید پر اتنا کچھ کیا تھا، اب طاقت کے نشے میں چور ہو چکا تھا۔ پنڈت

نہرو کے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ میری وزارت مخالفین کی سرگرمیوں کو کُچلنے کے لیے اپنی ساری قوّت صرف کر دے گی۔ پٹیل نے بمبئ میں تقریر کی اور وہاں فساد کی سلگتی ہوئی آگ کے شعلے زیادہ تیز ہو گئے۔

ابھی تک مسلم اکثریت کے کسی شہر یا علاقے میں ایسا نہیں ہوا تھا لیکن ہندو نے کلکتہ میں جو آگ لگائی تھی، اس کے چند شعلے نواکھالی جا پہنچے۔ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اور کلکتہ کے کچھ پناہ گزین ہندوؤں کے ہاتھوں اپنی لرزہ خیز داستانیں سُنانے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے، چنانچہ فساد شروع ہو گیا۔ مسلم لیگی وزارت کا عہدہ دار اور لیڈر صورتِ حالات پر قابو پانے کے لیے فوراً وہاں پہنچے۔۔۔ صلح اور امن کے لیے اپیلیں کی گئیں اور صورتِ حالات پر قابو پایا گیا۔ مسلم پریس کی اطلاعات کے مطابق قتل ہونے والے ہندوؤں کی تعداد پچاس اور سو کے درمیان تھی اور

بعض لیڈر اسے چھ[5] تک شمار کرتے تھے۔ اس کے برعکس صرف کلکتہ میں تین ہزار مسلمان قتل کیے جا چکے تھے لیکن ہندو اور مسلمان کے قتل میں بہت فرق تھا۔ مہاتما گاندھی کی وہ آتما جس نے انتہائی صبر و سکون سے بمبئی، الہ آباد، احمد آباد، کانپور اور دوسرے شہروں میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا، بے چین ہوئی۔ ہندو پریس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ مہاتما گاندھی دہلی کی بھنگی کالونی سے مسلمانوں کی سفّاکی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہوا اُٹھا اور نواکھالی پہنچ گیا اور وہاں سے یہ خبریں آتی تھیں کہ آج مہاتما گاندھی نے اتنے میل پیدل سفر کیا ہے۔ آج مہاتما جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور ہندوستان کے طول و عرض میں مہاتما جی کے چیلے اُن کے آنسو پونچھنے کی تیّاریاں کر رہے تھے۔ بالآخر وہ آتشیں مادہ پھوٹ نکلا جو بھارت ماتا کے سینے میں مدّت سے پک رہا تھا۔ عدم تشدّد کے دیوتا کے پجاری بہار کے مسلمانوں کو

---

[5] یہاں تعداد گھٹا کر دکھانا مقصود نہیں۔ مسلم اکثریت کے علاقے میں ہندوؤں کا تھوڑا یا بہت قتل بہر حال افسوس ناک بات تھی۔ اگر اس میں لیگی وزارت یا کسی اور ذمہ دار سیاسی پارٹی کا ہاتھ ہوتا تو یہ بات اور بھی شرم ناک ہوتی۔ لیکن موقع پر پہنچ جانے والے بنگالی ہندوؤں کے اپنے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں کہ نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں اور وزارت نے اس فساد کو دبانے کی کوشش کی بلکہ مسلمانوں نے اپنے گھروں میں ہندوؤں کو پناہ دی۔ ایسے حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط ہو گا، کہ یہ مقامی مسلمانوں کی سازش نہ تھی بلکہ ایسا حادثہ تھا جس کے اسباب بمبئی، کلکتہ اور دوسرے شہروں سے فراہم ہو چکے تھے۔

آگ اور خون کا پیغام دے رہے تھے۔ ہندو فسطائیت، وحشت، بربریت اور سفّاکی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی

☆☆☆☆☆

گھر میں مجید کی شادی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ لائل پور سے اُس کی بہن امینہ اپنے شوہر کے ساتھ دوپہر کی گاڑی سے آنے والی تھی۔ سلیم اور مجید انہیں لینے کے لیے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے. گاڑی آئی. امینہ کا خاوند انٹر کلاس کے ڈبّے سے اُترا، ساتھ والے زنانہ ڈبّہ کی کھڑکی سے امینہ نے اپنے برقعے کا نقاب اُٹھا کر باہر جھانکا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اُس کی گود سے آٹھ دس ماہ کا بچّہ لے لیا۔ امینہ نے ماں بننے کے بعد پہلی بار سلیم کو دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اُس کے چہرے پر حیا کی سُرخی چھا گئی۔ وہ اُتری۔ نوکر سامان اُتار چکا تھا اور مجید اپنے بہنوئی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ سلیم نے پلیٹ فارم پر شیشم کے درخت کے نیچے لکڑی کے بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”امینہ وہاں بیٹھ جاؤ! ذرا بھیڑ کم ہو جائے تو چلتے ہیں۔ امینہ کا خاوند اور مجید بھی وہاں آ گئے۔ مجید نے نوکر سے کہا” تم جا

کر ٹانگے میں سامان رکھو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" نوکر چلا گیا۔ امینہ کے خاوند نے سلیم کی طرف متوجّہ ہو کر کہا "سلیم صاحب! آپ کی بہن آپ سے بہت ناراض ہے۔"

سلیم نے امینہ کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر کہا۔ "کیوں ری چڑیل! مجھ سے خفا ہو؟"

امینہ نے برقعہ کا نقاب اُٹھا کر چہرے پر مصنوعی غصّہ لاتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! میں آپ سے بات نہیں کروں گی۔"

"ارے ارے! اتنا غصّہ ٹھیک نہیں بھئی مجید! ہماری صلح کرا دو!"

امینہ نے اپنے بھائی کی طرف متوجّہ ہو کر جھجکتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! آپ تو بھلا فوج میں تھے، اس لیے نہ آ سکے لیکن ان سے پوچھئے، یہ لاہور سے لائل پور نہیں پہنچ سکتے تھے؟ پہلے تو یہ امتحانوں کا بہانہ کرتے تھے لیکن اب کون سی مصروفیت تھی؟"

امینہ کے خاوند نے کہا۔ "ہاں جی۔ پہلے انہوں نے مجھے لکھا کہ ایم اے کا

امتحان دینے کے بعد ضرور آؤں گا۔ اس کے بعد لکھا کہ کتاب لکھ رہا ہوں اسے ختم کرنے کے بعد آؤں گا۔ کتاب چھپ کر ہمارے پاس پہنچ گئی لیکن یہ نہ آئے۔۔۔۔۔۔ امینہ کہتی تھی کہ انہیں شکار کا شوق ہے اور میں ہر روز اِن کے لیے بندوقیں صاف کیا کرتا تھا۔"

سلیم نے کہا۔ "بھئی میں ابّا جان کے پاس سیالکوٹ چلا گیا تھا۔ وہاں سے انہوں نے کشمیر جانے کی اجازت دے دی۔ اب میں بالکل فارغ ہوں۔ کسی دِن ضرور آؤں گا اور جب تک میری بہن تنگ نہیں آجائے گی، وہیں رہوں گا۔"

ریلوے پلیٹ فارم سے مسافر خانے کی طرف کھلنے والے گیٹ پر ریلوے بابو کسی مسافر سے جھگڑ رہا تھا اور چند لوگ اُس کے گرد جمع تھے۔ مجید، سلیم کو امینہ اور اس کے خاوند کے ساتھ باتیں کرتا چھوڑ کر اُس طرف چلا گیا۔ گیٹ کے قریب پہنچتے ہی اُس نے ہنستے ہوئے مُڑ کر دیکھا اور سلیم کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سلیم تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔

"کیا ہے یہاں؟" اس نے سوال کیا۔

مجید نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”ارے ادھر دیکھو! چودھری رمضان بابو کے ساتھ جھگڑ رہا ہے۔“

سلیم نے چودھری رمضان کو باپ کے ساتھ گرما گرم بحث کرتے دیکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن مجید نے اُسے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ ”ارے ٹھہرو! ذرا باتیں سُننے دو۔“

بابو کہہ رہا تھا۔ ”تم کو ساڑھے تین روپے دینے پڑیں گے۔ میرے ساتھ زیادہ باتیں مت کرو۔“

چودھری رمضان نے جواب دیا۔ ”واہ جی۔ اگر تمہیں تین روپے دینے تھے تو میں ٹکٹ کیوں لیتا؟“

”ارے میں ٹکٹ کی بات نہیں کرتا۔ تمہارے سامان کا وزن زیادہ ہے، میں اس کا کرایہ مانگتا ہوں۔“

رمضان نے جواب دیا۔ ”خدا کی قسم! یہ تمام ہانڈیاں دوسروں کی ہیں۔ میں نے اپنے گھر کے لیے صرف ایک خریدی تھی۔“

"مجھے اس سے کیا واسطہ کہ تم نے اپنے لیے ایک ہانڈی خریدی ہے، یا سب خریدی ہیں۔ یہ پوری تمہاری ہے اور اس میں جتنا سامان ہے، میں اس کا کرایہ تم سے وصول کروں گا۔"

"دیکھو بابو جی! میں نے ایک بار آپ سے کہا ہے کہ میں پسرور کے قریب اپنے رشتہ داروں کو ملنے گیا تھا۔ گاؤں کی عورتوں نے کہا کہ پسرور کی ہانڈیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے ضرور لیتے آنا۔ فجی، سنتی، ہرنام کور، بھاگو، تیلن، رحمت بی بی، ریشمے جولاہی اور پڑوس کی کئی عورتیں میرے گرد ہو گئیں۔ وہ مجھے پیسے دینا چاہتی تھیں لیکن میں نے سوچا گاؤں کی مائیں بہنیں ہیں اگر ایک دو روپے خرچ بھی ہو گئے تو کوئی بات نہیں۔ بابو جی! میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ آپ خود سوچیں، اگر آپ میرے گاؤں کے رہنے والے ہوں اور آپ کی ماں مجھے یہ کہے کہ چودھری رمضان! میرے لیے پسرور سے ایک ہانڈی لے آنا تو مجھے انکار کرتے شرم نہ آئے گی؟"

"بس چپ رہو۔" بابو نے گرج کر کہا۔ "کرایہ نکالو!"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ ہانڈیوں کا کرایہ اُن کی قیمت سے تین گنا زیادہ ہوتا ہے؟"

"بس آج تمہیں معلوم ہو گیا نا۔ آئندہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے۔"

"بابو جی! اگر تمہیں خدا نے کسی کے ساتھ نیکی کرنے کی توفیق نہیں دی تو دوسروں کو کیوں منع کرتے ہو؟"

"مذاق مت کرو۔ میں ڈیوٹی پر کھڑا ہوں۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ڈپٹی کے اوپر کھڑے ہو، ورنہ میں نہ لاتا یہ ہانڈیاں۔"

لوگ ہنس رہے تھے اور بابو کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ وہ چلّایا۔ "زبان بند کرو اور پیسے نکالو۔"

رمضان نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا۔ "بابو جی! تم خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہو۔ اگر میری بات پر یقین نہیں آتا تو ہانڈیوں کی بوری یہاں رکھ لو، گاؤں کی عورتیں خود لینے کے لیے آجائیں گی۔ ان سے دو دو آنے لے

لینا۔ تمہاری رقم پوری ہو جائے گی۔۔۔ ورنہ میرا ٹکٹ مجھے واپس دے دو۔ میں یہ ہانڈیاں پسرور چھوڑ آتا ہوں۔"

"تم کسی جنگل سے تو نہیں آئے؟"

"بابو جی! پسرور شہر ہے، جنگل نہیں۔" عمر رسیدہ اسٹیشن ماسٹر یہ تماشا دیکھ کر آگے بڑھا اور اس نے نرمی سے رمضان کو محکمہ ریلوے کے قواعد و ضوابط سمجھانے کی کوشش کی۔

چودھری رمضان نے فریاد کے لہجے میں کہا۔ "بابو خدا کی قسم! گاڑی میں اتنی بھیڑ تھی کہ میں سارا راستہ یہ بوری اپنی گود میں رکھ کر لایا ہوں۔ ہانڈیوں کی قیمت میں نے دی، ٹکٹ کے پیسے میں نے دیے۔ تکلیف میں نے اُٹھائی، اب آپ ہی بتایئے اگر ساڑھے تین روپے اس بابو کو دے دوں تو مجھے کیا فائدہ ہو گا؟"

"فائدہ یہ ہو گا کہ تم جیل نہیں جاؤ گے اور تمہاری عزّت بچ جائے گی۔"

چودھری رمضان کچھ سوچ کر بولا۔ "بابو جی میں نے کوئی چوری کی ہے جو

جیل جائیں گے؟ یہ لو ساڑھے تین روپے اور ایسی تیسی ان ہانڈیوں کی۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساڑھے تین روپے گن کر بابو کو دے دیا پھر جھک کر بوری کھولی اور ایک ہانڈی نکال کر فرش پر مارتے ہوئے بولا۔
"یہ مائی فجی کی۔"

پھر اس نے دوسری اُٹھا کر پھینکی اور کہا۔ "یہ سنتی کی۔" اسی طرح اُس نے یکے بعد دیگرے باقی ہانڈیاں توڑتے ہوئے کہا۔ "یہ ہرنام کور کی، یہ بھاگو تیلن کی، یہ رحمت بی بی کی، یہ ریشمے جولاہی کی، یہ جلال کی ماں کی!"

جوں جوں ہانڈیاں کم ہو رہی تھیں اس کا جوش اور غصّہ زیادہ ہو رہا تھا۔ سلیم، مجید اور دوسرے لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ چودھری رمضان نے آخری ہانڈی اُٹھائی تو اسے بر وقت کسی کا نام یاد نہ آیا۔ اُس نے بابو کی طرف غضب ناک ہو کر کہا۔ "اور یہ بابو کی ماں کی۔" کہتے ہوئے زمیں پر دے ماری۔ بابو نے اُسے مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا لیکن سلیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

بابو سلیم کو جانتا تھا۔ وہ بولا۔ ”دیکھو جی! یہ گالیاں دیتا ہے۔ ہم اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔“

رمضان بولا۔ ”بابو جی! میں نے تم کو کوئی گالی دی ہے۔ گالیاں تو اُن کی سُننے والی ہوں گی جن کی یہ ہانڈیاں تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آج شام بھاگو تیلن کی آواز تمہارے کانوں میں نہیں پہنچے گی اور تم میری باتوں کو گالیاں نہ کہتے۔“

سلیم نے اسٹیشن ماسٹر کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”وہ غریب آدمی ہے لیکن اگر میں اُسے پیسے دوں تو وہ نہیں لے گا۔ وہ میرے گاؤں کا ہے۔ آپ اپنی طرف سے اسے یہ پیسے دے دیں۔“ سلیم نے پانچ روپے کا نوٹ اسٹیشن ماسٹر کو دے دیا۔

چودھری رمضان اب از سرِ نو لوگوں کو اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے اُس کے قریب آکر کہا۔ ”بھئی چودھری! ناراض ہو کر نہ جاؤ۔ یہ لو پانچ روپے میں دیتا ہوں لیکن اب دوبارہ پسرور سے ہانڈیوں کی بوری لاؤ تو بُک کروالینا۔“

"نہیں جی اپنے پیسے پاس رکھو، میں باز آیا ایسی نیکی سے۔"

"نہیں بھائی لے لو! ہم تمہیں جرمانہ اور ہانڈیوں کی قیمت واپس کرتے ہیں۔"

چودھری رمضان نے مجید اور سلیم کی طرف دیکھا اور اُن کے اشارے سے نوٹ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ اس کے بعد خالی بوری اپنے کاندھے پر رکھ لی۔

مجید نے کہا۔ "چودھری! چلو ہمارے ساتھ تانگے پر چلو۔" جب وہ تانگے پر سوار ہوئے تو رمضان کہہ رہا تھا۔ "بھئی! دنیا میں شرافت کی کوئی قدر نہیں۔ وہ بابو جس کا نیولے کی طرح منہ ہے مجھے کہہ رہا تھا کہ میں یہاں ڈپٹی کے اوپر کھڑا ہوں۔ جب تمہیں اور صوبے دار کو دیکھا تو بڑے بابو نے چپکے سے پانچ روپے نکال کر دے دیے۔"

☆☆☆☆☆

مجید کی برات واپس آچکی تھی۔ گھر میں عورتیں دلہن کے گرد جمع تھیں۔

مجید کی ماں، دادی اور چچیوں کو مبارک باد دی جا رہی تھی۔ ایک معمّر عورت نے مجید کی دادی سے پوچھا۔ ”تحصیلدار کی ماں! سلیم کی شادی کب کرو گی؟“

”بہن! اگر میرے بس میں ہو تو آج ہی کر دوں لیکن علی اکبر کہتا ہے کہ اگر اسے کوئی ملازمت ملی تو وکالت کے لیے تین سال اور پڑھنا پڑے گا اس لیے شادی ایک بوجھ ہو گا۔“

”ہے ہے! ساری عمر پڑھتا ہی رہے گا۔ اس کے ساتھی تین تین بچّوں کے باپ ہو گئے۔۔۔۔۔ اور وہ تین سال اور پڑھے گا۔ کہیں رشتہ تلاش کیا ہے؟“

”بہن! بہت رشتے آتے ہیں لیکن سلیم کی ماں کو ایک لڑکی پسند آ گئی ہے اور وہ کسی اور کا نام نہیں لینے دیتی۔ دو سال ہوئے، اس کی ماں بھی آ کر کہہ گئی تھی کہ لڑکے کی منگنی کہیں نہ کرنا۔ کل علی اکبر کو ان کی طرف سے خط آیا تھا شاید اگلے مہینے وہ خود آئیں۔“

باہر کی حویلی میں سائبان کے نیچے آدمیوں کا ہجوم تھا اور قریباً اسی قسم کے سوالات سلیم کے باپ اور دادا سے پوچھے جا رہے تھے۔ سلیم گھر سے کوئی چیز لینے آیا تو اُس کی بہن زبیدہ نے اُسے دیکھتے ہی دوسری لڑکیوں کو آواز دی۔ ”امینہ، صغریٰ، حلیمہ، عائشہ۔ بھائی جان آ گئے۔“ اور آن کی آن میں سلیم کی چچا زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد اور ماموں زاد بہنوں نے اُسے گھیر لیا۔ امینہ نے ابتدا کی۔ ”بھائی جان! بھابی کب لاؤ گے؟“

”کون کی بھابی؟ چُڑیل چُپ رہو نہیں تو مار کھاؤ گی۔“

امینہ نے ہنس کر کہا۔ ”دیکھو بھائی جان! مجھے مار لو لیکن بھابی ضرور لاؤ۔“

لڑکیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ سلیم انہیں اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا باہر نکالا۔ صحن میں اُس کی ماں نے کہا۔ ”سلیم مجھے یاد نہیں رہا، تمہارے دو خط آئے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہاری میز کی دراز میں رکھ دیے تھے۔“

سلیم نے جلدی سے اندر جا کر میز کی دراز سے نکالے۔ ایک مختصر سا خط اختر کی طرف سے تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں رضا کاروں کی

جماعت کے ساتھ بہار جا رہا ہوں۔ اگر تم جانا چاہو تو دو چار دِن میں لاہور پہنچ جاؤ۔

دوسرا خط ناصر کی طرف سے تھا اور یہ کس قدر طویل تھا۔ سلیم نے جلدی سے آخری صفحہ اُلٹ کر لکھنے والے کا نام دیکھا اور اُسے اطمینان کے ساتھ پڑھنے کی نیّت سے باہر نکل آیا۔ باہر کی حویلی میں سائبان کے نیچے آدمیوں کی محفل گرم تھی، اس لیے وہ بیٹھک میں چلا گیا۔ ناصر علی کے خط کا مضمون یہ تھا:

میرے پاکستانی بھائی!

میں یہ خط کلکتہ کے ایک اسپتال سے لکھ رہا ہوں۔ بہار میں آگ اور خون کے طوفان سے گزرنے کے بعد میں یہاں پہنچا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ بیان نہیں کر سکتا۔ اگر بیان کر بھی سکوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ تمہیں یہ کیسے یقین آئے گا کہ دو ہزار انسانوں کی ایک بستی جہاں ایک صبح زندگی کی مُسکراہٹیں بیدار ہو رہی تھیں، شام تک راکھ کا ایک انبار بن چکی تھی۔ جہاں سورج کی ابتدائی کرنوں نے جیتے جاگتے،

ہنستے بولتے انسانوں کو دیکھا تھا وہاں آفتاب کی واپسیں نگاہیں بے گور و کفن لاشیں دیکھ رہی تھیں۔ سلیم! یہ میرا گاؤں تھا اور صوبہ بہار کی اُن سینکڑوں بستیوں میں سے ایک تھا جہاں بچّوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں نے اہنسا اور شانتی کے علمبرداروں کو اُن کے اصلی روپ میں دیکھا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے کان، ناک، ہاتھ اور دوسرے اعضا کاٹ کر ہماری مسجد کی سیڑھیوں پر سجائے گئے۔ بچّوں کو نیزوں پر اُچھالا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کی عصمت اور عفّت کی دھجیاں اُڑائی گئیں اور باپ اور بھائیوں کو بہ نوکِ سنگین مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی ذلّت اور رسوائی کا تماشا دیکھیں۔

تم شاید ہمیں بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دو لیکن یقین کرو کہ یہ وہ طوفان ہے جس کے لیے ہم قطعاً تیّار نہ تھے۔ کانگرسی حکومت ہم پر بھیڑیے چھوڑنے سے پہلے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ چکی تھی۔ وہ پولیس جو ہمارے گھروں کی تلاشیاں لے کر چھوٹے چاقو تک ضبط کر چکی تھی، ہندوؤں کو بندوقوں اور پستولوں سے مسلح کر چکی تھی۔ حکومت اُن کی تھی۔ قانون

اُن کا تھا۔ پولیس اُن کی تھی۔ اسلحہ اور بارود ان کا تھا۔ ہم کب تک لڑتے اور کہاں تک مقابلہ کرتے؟ وہ خالی ہاتھ جو مدافعت کے لیے اُٹھے، کٹ کر رہ گئے، وہ سینے جن میں غیرت اور ایمان تھا گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔ میرے گاؤں کے پانچ سو نوجوانوں نے لاٹھیوں کے ساتھ چار گھنٹے ان بلوائیوں کا مقابلہ کیا جو تعداد میں اُن سے آٹھ دس گنا زیادہ تھے۔ ان میں سے بعض بندوقوں اور پستولوں اور باقی تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھے۔ اور ہم نے انہیں بھگا دیا۔۔۔ وہ چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ آئے تو اُن کی تعداد دس ہزار تھی اور پولیس کی سنگینیں اُن کی رہنمائی کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ انہیں فتح ہوئی لیکن کیا ہماری شکست تھی۔۔۔؟ اگر گولیوں کی بارش میں پانچ سو نوجوان دس ہزار حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے ختم ہو جائیں اور اُن کے بعد بچّوں اور بوڑھوں کو تہ و تیغ کر دیا جائے اور بستی کو آگ لگا دی جائے تو کیا اسے مدافعت کرنے والوں کی شکست کہا جائے گا؟ اور پھر اگر کسی بوڑھے باپ کو درخت کے ساتھ باندھ دیا جائے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وحشت اور بربریت کے ہاتھوں میں اس کی نوجوان بیٹیاں تڑپنے، چیخنے اور چلّانے کے بعد ختم ہو جائیں اور پھر ان

کی لاشوں کے ساتھ بھی۔۔۔۔ سلیم! میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ میں اب تک زندہ کیوں ہوں اور سورج اب تک کیوں طلوع ہوتا ہے۔ ستارے اب تک کیوں چمکتے ہیں؟

یہ خط میں نے تمہیں اس لیے نہیں لکھا کہ تم میرے خاندان اور میرے گاؤں کی تباہی پر اظہارِ افسوس کرو۔ بہار میں ایک خاندان یا ایک بستی تباہ نہیں ہوئی، اب تک تقریباً ساٹھ ہزار انسان مارے جا چکے ہیں اور چار لاکھ بے خانماں ہو چکے ہیں لیکن اس قدر تباہی اور بربادی کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ابھی ہندو فاشزم اپنی تمام تخریبی قوّتوں کے ساتھ میدان میں نہیں آیا۔ بہار میں ابھی چھوٹے پیمانے پر ایک تجربہ کیا گیا ہے، ابھی تک وہ خنجر جو عدم تشدّد کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں، پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے۔ ہندو آتشیں پہاڑ سے صرف چند چنگاریاں نکلی ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ مسلمان ہوشیار ہو جائیں، بالخصوص اکثریت کے صوبوں کے مسلمان۔

ان کی قوّتِ مدافعت کے ساتھ اقلیت کے صوبوں کے مسلمان اپنی زندگی اور بقا کی اُمّیدیں وابستہ کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے لیے نہیں تو کم از کم اپنی بقا کی جنگ کے لیے ہی پنجاب کے مسلمانوں کو تیّار کرو۔۔۔۔ اگر بہار کے واقعات کے بعد بھی آپ لوگوں کی آنکھ کھلی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم زندہ رہنے کے مستحق نہیں۔

ہمارے لیڈروں کی یہ حالت ہے کہ وہ ابھی تک قوم کے ہر درد کے علاج کے لیے اپنا تازہ بیان کافی سمجھتے ہیں وہ دنیا کو یہ بتا دینا ہی کافی سمجھتے ہیں کہ دیکھو ہندو کیا کر رہا ہے۔ اس نے اتنے گھر جلا ڈالے، اتنے آدمیوں کو مار ڈالا۔۔۔۔۔ دفاعی کمیٹی بنی۔ اس کے بعد مجلسِ عمل بنی، لیکن ان کی تمام سرگرمیاں بیان بازی تک محدود ہیں۔ خدا کے لیے قوم کے نوجوانوں کو بیدار کرو۔ پانی اب سر کے برابر آ چکا ہے۔

میرے زخم ٹھیک ہو چکے ہیں اور پانچ چھ روز تک میں رضاکاروں کے ایک وفد کے ساتھ بہار جا رہا ہوں۔

تمہارا مخلص

ناصر علی

خط پڑھنے کے بعد سلیم بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھا رہا۔ بیٹھک سے باہر اسے مردوں اور عورتوں کے قہقہے ناخوش گوار محسوس ہو رہے تھے۔ یوسف ہانپتا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا۔ ”بھائی جان! میں آپ کو اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں، آپ کے دوست آئے ہیں۔“

”کون؟“ سلیم نے سوال کیا۔ ”مہندر سنگھ۔“

”اچھا! انہیں یہاں لے آؤ!“

یوسف بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر میں مہندر سنگھ بیٹھک میں داخل ہوا۔ سلیم نے اُٹھ کر اُس سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے قریب کرسی پر بٹھایا۔ مہندر سنگھ نے کہا۔ ”میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ کل بلونت سنگھ کو آنا تھا اس لیے میں مجید کی برات میں شریک نہ ہو سکا۔“

”آ گیا وہ؟“

”جی ہاں!“

"اسے یہاں کیوں نہیں لائے۔ اس سے ملے بہت عرصہ ہو گیا ہے!"

"وہ آج صبح اپنی سسرال چلا گیا تھا۔ کل یا پرسوں وہ آپ کے پاس آئے گا۔"

"ابھی تک وہ کشمیر کی فوج میں ہے نا؟"

"جی ہاں! اب تو وہ کہتا ہے کہ میں بہت جلد کیپٹن بننے والا ہوں۔"

سلیم نے سوچ کر کہا۔ "مہندر چائے پیو گے؟"

"نہیں چائے تو میں پی کر آیا ہوں۔ میں آپ کو یہ کہنے آیا تھا کہ پرسوں اگر آپ کو فرصت ہو تو شکار کو چلیں۔" "پرسوں تک شاید میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"میں بہت دور جا رہا ہوں۔"

"آپ کچھ پریشان ہیں؟"

سلیم نے کچھ دیر پریشان رہنے کے بعد کہا۔ ”مہندر! الیکشن کے دِنوں میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک طالب علم یہاں آیا ہوا تھا میں نے اس کے ساتھ تمہاری ملاقات بھی کرائی تھی۔“

”ہاں! مجھے ابھی تک وہ غزل یاد ہے جو اس نے یہاں سنائی تھی۔ بہت اچھی آواز تھی اس کی۔“

”وہ بہار کا رہنے والا تھا۔“

مہندر نے قدرے مُضطرب ہو کر کہا۔ ”اس سے متعلّق کوئی بری خبر آئی ہے؟“

”اس کا خط آیا ہے۔“

”بہار کے متعلّق بڑی افسوسناک خبریں آ رہی ہیں۔ کیا لکھتا ہے وہ؟“

”یہ اس کا خط ہے۔۔۔“ سلیم نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”تم اسے پڑھ سکتے ہو۔“

خط پڑھنے کے بعد مہندر کچھ دیر سلیم کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اس نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "تو آپ بہار جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کاش میں آپ کے ساتھ جا سکتا۔۔۔۔ کاش مجھ جیسے ایک آدمی کی قربانی تباہی و ہلاکت کے اس طوفان کو روک سکتی۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ طوفان کسی دِن یہاں بھی آئے گا۔۔۔ ہندو فاشزم انسانیت کو ختم کرنے کے لیے جو چِتا تیّار کر رہا ہے، پنجاب میں میری قوم اس کا ایندھن بنے گی۔۔۔۔ بھائی سلیم! اس آگ کو یہاں آنے سے روکیے۔ ورنہ پانچ دریا کسی دِن سرخ ہو جائیں گے۔۔۔۔ لیکن نہیں آپ اسے نہیں روک سکتے۔۔۔۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ میری قوم ان فاشسٹوں کو اپنے گوردوارے استعمال کرنے کی اجازت دے چکی ہے۔ سکھ مسلمانوں کا گھر جلانے کے شوق میں اپنے گھر بھی جلا ڈالیں گے اور ہندو آگ اور تیل مہیّا کرنے کے بعد مزے سے تماشا دیکھے گا۔۔۔۔"

سلیم نے کہا۔ "مہندر! جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں، میں پنجاب کا

مستقبل اس قدر ہولناک نہیں سمجھتا۔"

"اس وقت مجھ جیسے لوگوں کی آواز کوئی نہیں سُنے گا۔ اس وقت ایسی آواز نکالنے والے آدمی کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔۔۔۔۔"

☆☆☆☆☆

آگ پھیلی گئی۔ بمبئ اور بہار میں انسانیت کا دامن نوچنے والے ہاتھ یو پی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں غنڈوں اور بلوائیوں کی جو فوج منظّم ہو رہی تھیں، انہیں کانگرسی وزارتوں کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی لیکن پنجاب اور سرحد کی وزارتوں نے مسلمان کے بازوئے شمشیر زن کو اپنی مصلحتوں کی بیڑیاں پہنا رکھی تھیں۔

پنجاب کے ملّت فروش نے اپنے ہندو سرپرستوں کو اور زیادہ مطمئن کرنے کے لیے مسلم لیگ کے رضاکاروں کی جماعت کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ بظاہر یہ حکم پنجاب کو پُرامن رکھنے کے لیے دیا گیا تھا لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی رہی سہی قوّت مدافعت کچل کر بھارت کے

بھیڑیوں کے لیے میدان صاف کیا جائے۔ اس اقدام کو غیر جانبدارانہ رنگ دینے کے لیے مہاسبھا کے سوادَل وغیرہ پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں لیکن کانگرس کے رضاکاروں کو پوری آزادی تھی۔ دوسرے الفاظ میں مہاسبھائی رضاکاروں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے فقط اپنے سائن بورڈ بدل دینے کی ضرورت تھی۔ اس حکم کا عملی نفاذ فقط مسلمانوں تک محدود تھا۔ پنجاب کے مسلمان اس وزارت کا تختہ اُلٹنے پر مجبور ہو گئے جس نے اُن کی اکثریت کے صوبہ میں بھی ان پر اقلیّت کو مسلط کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کے دفاتر کی تلاشیاں شروع ہوئیں۔ چند لیڈر گرفتار ہوئے۔ دوسروں نے نیک نامی میں حصّہ دار بننے کے لیے ان کی تقلید کی۔ چنانچہ چند دِن میں ملّت کے وہ اکابر جو معمولی غصّے کی حالت میں قدرے نرم اور زیادہ نشے کی حالت میں قدرے گرم بیان دے کر ملّت کے تمام دکھوں کا علاج کر دیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سرپٹ دوڑتے ہوئے جیلوں میں جا پہنچے۔ ان میں سے کئی بزرگ ایسے تھے جنہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر وہ ایک دِن لیٹ جیل پہنچے تو شاید لیڈروں کی پچھلی صف میں دھکیل دیے جائیں گے۔

بظاہر یہ تحریک عمر رسیدہ لیڈروں کی رہنمائی سے محروم ہو چکی تھی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ قیادت متوسط درجہ کے باعمل نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئی اور یہ تحریک عوامی بن گئی۔ قوم خضر حیات خاں اور ان کے سرپرستوں کا چیلنج قبول کر چکی تھی۔ قوم کے فرزند، قوم کی بیٹیاں اور قوم کی مائیں میدان میں آ چکی تھیں۔ باہمّت مسلم نوجوان ملّت فروشوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اُبلند کر چکے تھے۔ جیلیں بھر چکی تھیں، پولیس کی لاٹھیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ اشک آور گیس کے بم ناکارہ ہو چکے تھے۔ مسلم اخبارات بند تھے لیکن پنجاب میں کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا جہاں پولیس کی تمام کوششوں کے باوجود خفیہ تحریک کی طرف سے ہدایات نہیں پہنچتے تھیں۔ خضر اور سچر کے قانون کے مطابق ایک جگہ چار مسلمانوں کا جمع ہونا جرم تھا لیکن کوئی قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں ہزاروں انسانوں کا جلوس نہیں جاتا تھا۔ پنجاب کا ملّت فروش محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنی قوم کو مردہ سمجھ کہ ہندو کے ساتھ اس کی عزّت اور آزادی کا سودا کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔

یہی حال صوبہ سرحد کا تھا۔۔۔۔۔۔ کانگریس نے درّہ خیبر پر رام راج کا جھنڈا گاڑنے کی نیّت سے جس شترِ بے مہار پر سواری کی تھی، وہ دلدل میں پھنس چکا تھا۔۔۔۔ پٹھان کی نگاہوں میں چرخے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔

گورداسپور کی طرف سے آنے والی ایک لاری امرتسر کے اڈّے پر آکر رُکی۔ سلیم اور اس کے ساتھ ایک اور نوجوان جلدی سے اُتر کر پاس ہی ایک دکان سے لسّی پی رہے تھے کہ کسی نے سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”چودھری جی! السّلام علیکم۔“

سلیم نے مُڑ کر اُس کے سلام کا جواب دیا لیکن وہ اُسے پہچان نہ سکا۔ ”آج کدھر چڑھائی کی ہے؟“

سلیم اب محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس شخص کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ”لاہور جا رہا ہوں۔“

”اور میاں محمد صدیق بھی لاہور جا رہے ہیں؟“ اس نے سلیم کے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں جی! میں سیالکوٹ جا رہا ہوں۔" سلیم کے ساتھی نے جواب دیا۔

"بتایئے! میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

سلیم کے ساتھی نے جواب دیا۔ "نہیں آپ کی بڑی مہربانی۔"

پاس ہی سڑک کے دوسرے کنارے امرتسر سے لاہور جانے والی بس کا کلینر پُکار رہا تھا۔ "چلو بھئی لاہور۔۔۔۔۔ موٹر تیّار ہے۔" اور سلیم اور صدیق اس آدمی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد موٹر پر سوار ہو گئے۔

جب موٹر چل پڑی تو سلیم نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "صدیق! یہ کون تھا؟" "یہ کریم بخش حوالدار ہے۔ آپ بھول گئے الیکشن کے دِنوں میں اس نے آپ سے تھوڑا سا جھگڑا کیا تھا۔"

"ارے یار! میں پہچان نہیں سکا۔ اصل میں یہ وردی کے بغیر تھا۔"

صدیق نے کہا۔ "یہ تبدیل ہو کر امرتسر آ گیا ہے۔ میرے خیال میں اب یہ سی آئی ڈی میں ہے۔"

"بھئی! یوں بھی تو خضر کی پولیس آج کل سفید کپڑوں میں ڈیوٹی دینا زیادہ آسان سمجھتی ہے۔ وہ ہمیں بڑی مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔"

لاہور پہنچ کر سلیم نے صدیق سے کہا۔ "تم یہیں اڈّے پر رہو۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد سلیم شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا ایک مسجد کے ساتھ پان فروش کی دکان پر رُکا۔ اس نے دُکاندار کو غور سے دیکھنے کے بعد سوال کیا۔ "کیوں جی نرگس کے پھول کہاں ملیں گے؟"

دُکاندار نے سر سے لے کر پاؤں تک چند بار اُس کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر بولا۔ "میرے ساتھ آیئے؟"

سلیم اس کے پیچھے چل دیا۔ دُکاندار گلی کے موڑ پر ایک مکان کے بند دروازے کی طرف اشارہ کر کے واپس چلا گیا۔ سلیم نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پانچ مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی نے اندر سے آواز دی۔ "کون ہے؟"

سلیم نے کہا۔ ”مکان نمبر اکیس یہی ہے؟“ ایک نوجوان نے دروازہ کھولتے ہوئے باہر جھانکا اور سلیم سے پھر سوال کیا۔ ”آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”اختر صاحب یہاں ہیں؟“

”نہیں! وہ کہیں جا چکے ہیں۔ آپ کا نام سلیم ہے؟“

”جی ہاں! مجھے دس بجے سے پہلے یہاں پہنچنا تھا لیکن موٹر نہ مل سکی۔“

”آپ اندر آ جائیے!“

سلیم اندر داخل ہوا تو نوجوان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی چیز ہمارے پاس موجود ہے۔ آئیے!“

سلیم اس کے پیچھے ڈیوڑھی سے گُزرنے کے بعد ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے ایک کونے میں پانچ لڑکے ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ سلیم نے اپنی جیب سے چند کاغذات میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں پمفلٹ کے لیے مضمون لکھ کر لایا ہوں۔ اختر صاحب کب واپس آئیں

گے؟"

ایک نوجوان نے جو بظاہر اس گروہ کا لیڈر معلوم ہوتا تھا، جواب دیا۔ "ان کے متعلّق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کے پمفلٹ کے متعلّق ہمیں ہدایت دے گئے ہیں اور یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ آپ کو ایک سائیکلو اسٹائل مشین دے دی جائے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کی مقامی لیگ کے پاس ایک سائیکلو اسٹائل مشین بھی نہیں ہے؟"

"بھئی! ہماری لیگ کے دفتر میں ایک ٹوٹا ہوا حقّہ تھا، اب وہ بھی شاید پولیس اُٹھا کر لی گئی ہے۔"

"اچھا سلیم صاحب! آپ ہمارے ساتھ کچھ کام کرائیں گے یا جانا چاہتے ہیں؟"

"مجھے آپ حکم دے سکتے ہیں لیکن بہتر یہی ہو گا کہ میں آج رات واپس پہنچ جاؤں۔ ہمارے علاقے میں پروپیگنڈے کا کوئی انتظام نہیں۔"

دس گیارہ سال کی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔ "ہم

نے بیس ہزار اشتہار چھاپ دیے ہیں۔ بڑی آپا کہتی ہیں بلیٹن کا مضمون دیجئے اور کاغذ کا انتظام بھی کیجیے۔"

لڑکی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور نوجوان نے سلیم کو اپنی طرف متوجّہ کر کے کہا:

"بھئی! ہماری بہنوں نے بہت کام کیا ہے۔ یہ ہمیں ایک لمحہ بیکار نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اچھا ہوا آپ کا پمفلٹ آ گیا۔ ہم انہیں چند گھنٹے اور مصروف رکھ سکیں گئے۔۔۔۔ اچھا آپ جائیں۔ اصغر وہ سوٹ کیس سلیم صاحب کو دے دو لیکن بھائی ذرا احتیاط کرنا۔ آج کل پولیس اِن چیزوں کو بم سے زیادہ خطرناک سمجھتی ہے۔ اگر پکڑے جاؤ تو پولیس والوں کو اس جگہ کا پتہ نہ دینا۔ اگر کہو تو تمہارے ساتھ امرتسر تک کسی کو بھیج دیں۔"

سلیم نے کہا۔ "میرے ساتھ ایک آدمی ہے، میں اُسے اڈّے پر چھوڑ آیا ہوں۔"

شام کے پانچ بجے سلیم اور اس کا ساتھی موٹر پر دوبارہ امرتسر پہنچے تو کریم

بخش حلوائی کی دُکان کے سامنے کرسی پر بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ موٹر سے اُترتے وقت صدیق کی نگاہ اچانک اس پر جا پڑی اور اُس نے سلیم سے کہا۔ ”ارے یار وہ بد معاش ابھی تک یہاں ہے۔“

”کون؟“

”کریم بخش اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔“

سلیم نے کہا۔ ”دیکھو صدیق، اگر معاملہ خراب ہو گیا تو میں اُس کے ساتھ نپٹنے کی کوشش کروں گا۔ تمہیں اگر سوٹ کیس لے کر بھاگنے کا موقع مل جائے تو میری پروانہ کرتا۔ امرتسر میں کسی کو جانتے ہو؟“

”میرے یہاں کئی رشتہ دار ہیں۔“

اتنی دیر میں کریم بخش دُکان سے اُٹھ کر اُن کے قریب آ چکا تھا۔ ”چودھری جی! بہت جلد آ گئے آپ لاہور سے؟“ اس نے آتے ہی کہا۔

”جی ہاں! مجھے یہاں کوئی زیادہ کام نہیں تھا۔“

”آج رات میرے پاس ٹھہریں۔“

”مہربانی! لیکن مجھے گھر میں بہت ضروری کام ہے۔“

”کوئی جلسہ ولسہ ہو گا؟“

”ہاں! جلسے بھی تو ہوتے رہتے ہیں۔ اچھا خُدا حافظ ! اب دیر ہو رہی ہے۔ کہیں گورداسپور کی موٹر نہ نکل جائے۔“

”موٹریں بہت۔ آپ فکر نہ کریں۔ میاں محمد صدیق، آپ کو تو شاید سیالکوٹ جانا تھا؟“

صدیق کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ایک غلطی کر چکا ہے۔ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”بس جی میں بھی اِن کے ساتھ ہی واپس آ گیا۔“

کریم بخش نے سلیم سے کہا۔ ”صبح شاید آپ کے پاس یہ سوٹ کیس نہیں تھا؟“

سلیم نے جواب دیا۔ ”نہیں، میرا سامان لاہور میں پڑا ہوا تھا۔ صدیق چلو!

دیر ہو رہی ہے۔ اچھا حوالدار صاحب! السلام علیکم!"

حوالدار نے کہا۔ "اس اڈّے پر تو کوئی لاری نہیں ہے۔ دوسرے اڈّے پر آپ کو لاری مل جائے گی۔ چلیے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔۔۔۔۔ لایئے میں اٹھالیتا ہوں آپ کا سوٹ کیس۔"

"نہیں! مہربانی، یہ بھاری نہیں ہے۔"

صدیق نے کہا۔ "لایئے میں اٹھالیتا ہوں۔"

سلیم نے سوٹ کیس صدیق کے ہاتھ میں دے دیا۔ پولیس کا ایک سپاہی سڑک پر لاٹھی لیے کھڑا تھا۔ کریم بخش نے چلتے چلتے مُڑ کر اُسے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ اُن کے پیچھے چل پڑا۔ سلیم اس کی یہ حرکت دیکھ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے سامنے سڑک پر جانے والے کسی آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ارے صدیق وہ منوّر جارہا ہے، بلاؤ اس گدھے کو" اور صدیق "منوّر! منوّر! ارے منوّر کے بچے!!" کہتا ہوا تیزی سے آگے چل دیا۔ آن کی آن میں صدیق کوئی تیس قدم آگے جاچکا تھا۔

حوالدار اور کانسٹیبل پریشانی کی حالت میں سلیم کے قریب کھڑے تھے۔ اچانک کریم بخش سلیم کا بازو پکڑ کر چلّایا۔ ”گنڈا سنگھ، بھاگو۔ اس سوٹ کیس والے کا پیچھا کرو۔ دیکھو وہ بھاگ رہا ہے۔ سیٹی بجاؤ!“

گنڈا سنگھ سیٹی بجاتا ہوا بھاگا لیکن صدیق کی رفتار اس سے بہت تیز تھی۔ رائے عامہ پولیس کے متعلّق پیدا ہو چکی تھی۔ ایک ہٹّے کٹّے نوجوان نے اچانک اپنی ٹانگ آگے کر دی اور گنڈا سنگھ ”تیری ماں۔۔۔۔۔“ کہ کر مُنہ کے بل گِر پڑا۔۔۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو کر قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ غضب ناک ہو کر اُٹھا۔ سوٹ کیس والے مجرم سے زیادہ اسے ٹانگ پھنسانے والے کی تلاش تھی۔

”کیا ہوا سنتری جی؟“ ایک عمر رسیدہ بنئے نے آگے بڑھ کر سوال کیا اور گنڈا سنگھ نے آگے بڑھ کر انتہائی بے تکلّفی کے ساتھ اُس کے مُنہ پر ایک تھپّڑ رسید کر دیا۔

اتنی دیر میں کریم بخش بھی سلیم کا بازو پکڑے ہوئے اُس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ چلّایا۔ ”گنڈا سنگھ بھاگو اُس کا پیچھا کرو۔“

گنڈا سنگھ دوبارہ بھاگا لیکن اب اسے معلوم نہ تھا کہ اُس کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ صدیق سامنے مظاہرین کے ایک جلوس میں غائب ہو چکا تھا۔

دو اور کانسٹیبل کریم بخش کے پاس پہنچ چکے تھے، اور وہ انتہائی غضبناک لہجے میں سلیم سے کہہ رہا تھا "بابو جی! بتاؤ اس سوٹ کیس میں کیا تھا اور اسے کہیں بھیجا ہے تم نے؟"

سلیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم ہو کون؟"

ایک سپاہی نے کہا۔ "حوالدار صاحب کے ساتھ ہوش سے بات کرو۔"

"اچھا یہ حوالدار صاحب ہیں؟"

کریم بخش چلّایا۔ "لے چلو اسے تھانے میں۔ اس کے پاس بم تھے۔"

☆☆☆☆☆

پولیس کی مار پیٹ کے بعد سلیم حوالات میں منہ کے بل پڑا درد سے کراہ

رہا تھا۔ تھانیدار اپنے علاقے میں گشت کرنے کے بعد رات کے آٹھ بجے واپس آیا اور دو سپاہی سلیم کو حوالات سے نکال کر اُس کے سامنے لے گئے۔

سلیم کو تھانیدار کی میز کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ سلیم کے دانتوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور اُس کی گردنِ جھُکی ہوئی تھی۔ تھانیدار نے تھوڑی دیر میز پر پڑے ہوئے کاغذات اُلٹ پٹ کرنے کے بعد سلیم کی طرف دیکھا۔ دونوں پہلی نگاہ میں ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ سب انسپکٹر منصور علی کالج میں اُس کا ہم جماعت تھا۔ وہ ندامت، پریشانی اور اضطراب کی حالت میں سلیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلیم کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ چند سیکنڈ قریب پڑی ہوئی کرسی کا سہارا لینے کے بعد فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ تھانیدار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ مکر کرتا ہے جی!" ایک سپاہی نے اُسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ تھانیدار نے آگے بڑھ کر اسے ایک ہاتھ سے دھکّا دیا اور سپاہی دہلیز کے

پاس جا گرا اور پھر اُس نے سپاہیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”گنڈا سنگھ! اس کی پیٹی اُتار لو۔ میراں بخش! اس کے لیے پانی لاؤ!“

تھوڑی دیر بعد سلیم کو ہوش آ چکا تھا۔ تھانیدار کے حکم سے سپاہیوں نے اسے برآمدے میں چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ سپاہی جس نے ٹھوکر ماری تھی، پریشانی اور گنڈا سنگھ جسے اُس کی پیٹی اُتارنے کا حکم ملا تھا تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔

تھانیدار نے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس کس نے مارا ہے؟“

سپاہی گنڈا سنگھ اور میراں بخش کی طرف دیکھنے لگے۔

گنڈا سنگھ بولا۔ ”جی اس کے پاس بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تھا۔ ہم نے حوالدار صاحب کے حکم سے اسے مارا ہے۔“

”اچھا۔ وہ بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس کہاں ہے؟“

”جی اسے ایک اور آدمی لے کر بھاگ گیا ہے۔“

"سوٹ کیس والا بھاگ گیا اور جو خالی ہاتھ تھا تم اُسے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ یہی بات ہے نا؟"

"جی ہاں!"

"شاباش! تم بہت سمجھدار آدمی ہو، لیکن اُسے پکڑ کر کیوں نا لائے جس کے پاس بم تھے، وہ کہاں ہے؟"

"جی اُسی کے متعلّق تو ہم پوچھ رہے تھے اس سے۔ یہ تین دفعہ بے ہوش ہوا ہے لیکن نہیں بتاتا کہ وہ سوٹ کیس والا کہاں گیا ہے؟"

تھانیدار چلّایا۔ "لیکن تم نے اسے کیوں نہیں پکڑا، اپنے اس باپ کو کیوں پکڑ کر لائے؟"

"جی میں گر پڑا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔"

"تم نے اس کا سوٹ کیس دیکھا تھا؟"

"جی دیکھا تو تھا۔"

”کیا رنگ تھا اُس کا؟“

”شاید سبز تھا۔“

”تم نے بم دیکھے تھے؟“

”جی نہیں، حوالدار صاحب نے دیکھے ہوں گے۔“

تھانیدار نے گرج کر کہا۔ ”حوالدار کہاں ہے؟“

”جی وہ بھی تھک کر گئے ہیں۔“

”کیسے تھک گیا وہ؟“

”جی ملزم کو پیٹ کر۔ وہ کہتے تھے میں تھک گیا ہوں، ابھی کھانا کھا کر آتا ہوں۔“

حوالدار داخل ہوا۔ اور اس نے آتے ہی کہا۔ ”جی مجھے بلایا ہے؟“

”ہاں تم نے کوتوالی میں مجھے ٹیلی فون کیا تھا کہ تُم نے کہیں بم دیکھے ہیں، کہاں ہیں وہ؟“

"جی وہ سوٹ کیس لے کر بھاگ گیا ہے، یہ اُس کا ساتھی ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔"

"اور تم نے سوٹ کیس میں بم دیکھے تھے۔"

"نہیں! مجھے شک ہے بلکہ یقین ہے یہ صبح لاہور گئے تھے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے۔"

تھانیدار نے بات کاٹ کر کہا۔ "کیوں گنڈا سنگھ امرتسر اور لاہور کے درمیان صُبح سے شام تک کتنے آدمی سفر کرتے ہیں؟"

"جی ہزاروں!"

"اچھا یہ بتاؤ، وہ سب بموں کا کاروبار کرتے ہے؟"

"جی نہیں۔"

حوالدار نے کہا۔ "جی ان کے پاس سوٹ کیس تھا صُبح جب وہ گئے تھے۔۔۔۔"

"تو۔۔۔"

تھانیدار نے پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ "اچھا یہ بات ہے۔ کیوں گنڈا سنگھ؟ اگر امرتسر اور لاہور کے درمیان سفر کرنے والے کسی آدمی کے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھو تو تم اُسے گولی مار دو گے؟"

گنڈا سنگھ نے گھبرا کر کہا۔ "جی وہ کیوں؟"

"کیونکہ ہمارے حوالدار کا خیال ہے کہ سوٹ کیس میں بموں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

"جی اگر حوالدار صاحب حکم دیں تو پھر مجھے گولی چلانی پڑے گی، ورنہ ہر سوٹ کیس میں بم تو نہیں ہوتے۔"

کریم بخش نے کہا۔ "جی! میں آپ کو سارا واقعہ سناتا ہوں۔"

تھانیدار نے گرج کر کہا۔ "میں کچھ نہیں سُنتا۔ تم نے ایک شخص کو بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اُٹھا کر بھاگنے کا موقع دیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو تم پرلے درجے کے بے وقوف ہو کہ اُسے چھوڑ کر دوسرا آدمی پکڑ

لائے۔ اگر یہ غلط ہے اور اس شخص کو تم نے بلا وجہ مارا ہے تو بھی میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔ ایس پی شاید یہ بات برداشت نہ کرے کہ امرتسر میں کوئی شخص بموں کا ایک سوٹ کیس بھر کر لایا ہے اور دو آدمی اسے پکڑ نہیں سکے۔ تم گنڈا سنگھ کو لے جاؤ اور اُسے پکڑ کر لاؤ اور میں ایس پی کو ٹیلی فون کرتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے انعام تیّار رکھے۔"

کریم بخش ملتجی ہو کر بولا۔ "خان صاحب! ہوتا ہے کہ میں نے غلطی کی ہو لیکن میں انہیں جانتا ہوں، اور اس کا ساتھ دونوں سخت لیگی ہیں۔۔۔ الیکشن کے دنوں میں۔۔۔"

تھانیدار نے کہا۔ "کیوں گنڈا سنگھ، آج شہر میں کتنے مسلم لیگیوں کا جلسوں نکلا ہے؟"

"وہ پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھے۔"

"اپنے حوالدار سے کہو اُن سب پر بم رکھنے کے جرم میں مقدمہ چلائے۔"

”ہاں کریم بخش! اس سوٹ کیس کا رنگ کیا تھا؟“

”جی سیاہ تھا۔“

”کیوں گنڈا سنگھ کیا رنگ تھا اُس کا؟“

گنڈا سنگھ تھانیدار کے تیور دیکھ چکا تھا۔ وہ بولا۔ ”جی میں نے جو سوٹ کیس دیکھا تھا، وہ تو شاید سبز تھا۔“

کریم بخش نے بدحواس ہو کر کہا۔ ”خُدا کی قسم! سیاہ تھا۔“

تھانیدار نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ ”کریم بخش! صاف کیوں نہیں کہتے کہ تُم اس سے ذاتی عداوت کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ تم نے بہت زیادتی کی ہے۔ میں سول سرجن کو فون کرتا ہوں۔“

کریم بخش نے کہا۔ ”خان صاحب آدمی سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔“

”لیکن آئندہ میں ایسی غلطی برداشت نہیں کروں گا۔ وہ کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔ اب مجھے تمہاری طرف سے معافی مانگنی پڑے

گی۔"

گنڈا سنگھ نے کہا۔ "جی یہ بات آپ نے بالکل ٹھیک کہیں ہے۔ حوالدار صاحب نے اس کی پیٹھ پر تیس بید مارے ہیں لیکن گالی دینا تو درکنار اس نے اُف تک نہیں کی۔"

تھانیدار نے کہا۔ "میراں بخش اسے ویگن میں لٹادو۔"

☆☆☆☆☆

رات کے دس بجے پولیس کی ویگن شہر کی ایک گلی میں آکر رُکی۔ سب انسپکٹر منصور علی نے نیچے اُتر کر ٹارچ کی روشنی میں ایک مکان کا سائن بورڈ دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی یہی مکان ہے۔"

پھر اُس نے سلیم کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر موٹر سے اُتارا اور کہا۔ "چلو تمہیں پہنچا آؤں۔"

"نہیں، آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں۔"

منصور علی نے انگریزی میں کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے پرسوں اس تھانے کا چارج لیا ہے اگر تم یہاں ہوئے تو کل یا پرسوں کسی وقت تم سے ملوں گا۔“

جب سلیم اس کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا تو اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ منصور نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”ہمّت کرو۔ غدّاروں کا اقتدار دم توڑ رہا ہے۔۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔ ڈرائیور چلو۔“

موٹر چلی گئی اور سلیم تذبذب کی حالت میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد ڈگمگاتا ہوا مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!!“ اس نے آوازیں دیں لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی نحیف و لاغر آواز ڈیوڑھی اور صحن سے گزر کر سونے کے کمروں تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اچانک اسے خیال آیا کہ شاید گھر پر کوئی نہ ہو۔ شاید وہ گاؤں چلے گئے ہوں۔ اس کی ہمّت جواب دے رہی تھی۔ وہ اپنے سر کو جو درد سے پھٹ رہا تھا، دونوں ہاتھوں میں دبا کر دہلیز کی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر ہاتھ

سے دروازہ ٹٹولنے لگا۔ باہر کی کنڈی کھُلی تھی۔ اس نے ہمّت کر کے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

گلی کی دوسری طرف سے کسی نے اپنے مکان کی کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے کہا۔ ”کون ہے؟“

آواز بے حد ناخوشگوار محسوس ہوئی اور اس نے بُلانے والے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے آواز دی ”ڈاکٹر صاحب!“

پڑوسی نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب گرفتار ہو گئے ہیں۔“ سلیم کا دل بیٹھ گیا۔ پڑوسی نے پھر کہا۔ ”بھئی اگر گھر والوں سے کوئی کام ہے تو گھنٹی بجاؤ۔“

سلیم کو اب تک گھنٹی کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے تاریکی میں ہاتھ مارنے کے بعد گھنٹی کا بٹن دبایا اور دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ایک منٹ کے بعد اُسے مکان کے اندر چند باتوں آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے دوبارہ گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کسی نے ڈیوڑھی میں بجلی کی بتّی جلائی اور دروازے کی دراڑ اور روزن سے روشن نمودار ہونے لگی۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

سلیم نے نحیف سی آواز میں کہا۔ "میں ہوں، سلیم!"

ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور راحت نے باہر جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "بھائی جان آپ؟ اس وقت؟" سلیم جواب دیے بغیر لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے دوسرے سِرے پر راحت کی ماں اور اس کے پیچھے عصمت کھڑی تھی۔ اچانک راحت کو سلیم کی قمیص اور کوٹ پر خون کے دھبّے اور چہرے پر ضربوں کے نشان دکھائی دیے۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کرتی ہوئی چِلاّئی۔ "امّی جان! یہ زخمی ہیں!"

ماں نے آگے بڑھ کر سلیم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! کیا ہو تمہیں؟"

سلیم نے اپنی نیم وا آنکھیں اُوپر اٹھائیں اور ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں پولیس کے قابو آ گیا تھا۔"

ماں نے کہا۔ "چلو بیٹا اندر چلو!"

سلیم نے کہا۔ "چلئے میں ٹھیک ہوں۔ یوں ہی چکّر آ گیا تھا۔" معاً سلیم نے

اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ کر گردن جھکالی۔ عصمت جو ابھی تک چند قدم دور بے حس و حرکت کھڑی تھی، اچانک آگے بڑھی۔ ”امّی! یہ بے ہوش ہو رہے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سلیم کا دوسرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور سلیم جیسے خواب کی حالت میں کہہ رہا تھا۔ ”میں ٹھیک ہوں، آپ فکر نہ کریں۔ یونہی چکر آ گیا تھا۔ اس نے میرے سر پر ٹھوکریں ماری ہیں۔“

عصمت اور اس کی ماں اسے سہارا دے کر کمرے میں لے گئیں اور وہ بدستور کہہ رہا تھا۔ ”آپ چھوڑ دیں، آپ چھوڑ دیں، آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹا! لیٹ جاؤ یہاں!“ اس نے گردن اُٹھائی بستر کی طرف دیکھا اور بے اختیار منہ کے بل اس پر گر پڑا۔

عصمت نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلیم کے منہ پر دوائی لگاتے ہوئے کہا۔ ”امی! یہ پولیس والے بالکل قصاب بن گئے ہیں۔ دیکھے بیدوں کے نشان ہیں۔ راحت جلدی سے پانی گرم کرو۔ سر کے زخم پر خون جم گیا

ہے۔"

جب عصمت اس کے سر پر گرم پانی سے ٹکور کر رہی تھی۔ سلیم نے آنکھیں کھولیں۔ عصمت کی ماں نے جھک کر پوچھا۔ "کیوں بیٹا اب طبیعت کیسی ہے؟"

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

عصمت نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "امّی جان انہیں بولنے سے تکلیف ہوتی ہے۔"

ماں نے مُسکرا کر کہا۔ "بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!"

عصمت نے زخم پر پھاہا رکھ کر پٹّی باندھی اور اُس کے بعد میز سے گلاس اُٹھا کر سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ پی لیجیے!"

سلیم نے اُٹھ کر گلاس پکڑ لیا اور تذبذب سا ہو کر عصمت کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی ماں نے کہا۔ "پی لو بیٹا!"

"سارا؟" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

راحت بولی۔ "یہ دوا نہیں، پانی اور گلوکوز ہے۔"

میٹھے پانی کا گلاس پینے کے بعد سلیم نے دوبارہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کب گرفتار ہوئے تھے؟"

عصمت کی ماں نے کہا۔ "پولیس انہیں کل شام پکڑ کر لے گئی۔ وہ مظاہرہ کرنے کے لیے باہر کے دیہات سے پانچ سو آدمیوں کا جلوس لے کر شہر میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارا نوکر بھی اُن کے ساتھ گرفتار ہو گیا ہے۔"

"میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔ اب آپ آرام کریں۔"

"بیٹا! خدا کا شُکر ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے۔ میں تم سے سب باتیں صبح پوچھوں گی۔۔۔۔ اب تم آرام کرو۔ ڈاکٹر صاحبہ مجھے گھُور رہی ہیں۔"

ساتھ والے کمرے سے امجد آنکھیں ملتا ہوا آیا اور بستر پر سلیم اور اس کے گرد اپنی ماں اور بہنوں کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ "بھائی جان کو کیا ہوا؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں، چلو بیٹا سو جاؤ۔"

"نہیں امّی جان! پہلے بتایئے نا بھائی جان کو کیا ہوا ہے؟"

"آؤ! بتاتی ہوں۔" ماں اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔

راحت نے کہا۔ "بھائی جان! اب آپ کے سر میں زیادہ تکلیف تو نہیں؟"

"نہیں، آپ آرام کریں۔"

عصمت نے راحت کو اشارے کے ساتھ کچھ سمجھایا اور اس نے کہا۔ "بھائی جان! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپا جان کا خیال ہے کہ آپ کو ایک انجکشن دے دیا جائے۔"

ماں نے دوسرے کمرے سے کہا۔ "ہاں بیٹی! انجکشن ضرور دے دو۔"

سلیم نے کہا۔ "ڈاکٹر کی رائے سے اتّفاق کرنے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں۔"

عصمت نے اپنے باپ کے تھیلے سے انجکشن لگانے کا سامان نکالا۔ پانی اُبال

کا پچکاری کو صاف کیا، دوا بھری، راحت سلیم کی قمیص کی آستین اوپر چڑھا کر سپرٹ لگا رہی تھی کہ ماں نے آواز دی ”بیٹی! ذرا احتیاط کرنا۔“

عصمت ہچکچائی ہوئی آگے بڑھی، اسکول کے اُس بچّے کی طرح جو امتحان دینے کے لیے جا رہا ہو، اس کا دل دھڑک رہا تھا۔۔۔ سلیم نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عصمت نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے اچانک سوئی بازو میں اُتار دی اور راحت نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ انجکشن لگانے کے بعد عصمت نے راحت کی طرف مُڑ کر دیکھا، اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

ماں نے دروازے میں آکر کہا۔ ”کیوں بیٹی لگا دیا انجکشن؟“

اس کے منہ سے حیا میں ڈوبی ہوکی آواز نکلی۔ ”جی ہاں۔“

امجد اپنی چارپائی سے اُٹھا اور نظر بچا کر دبے پاؤں چلتا ہوا راحت کے پاس آ پہنچا۔ ”آپا ان کو کیا ہوا ہے؟“

ماں نے کہا۔ ”دیکھو بے ایمان میں سمجھتی تھی یہ سو گیا ہے۔ چلو بیٹی جب

تک تم یہاں ہو اِسے نیند نہیں آئے گی۔"

وہ دوسرے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئیں۔ سلیم دیر تک جاگتا رہا۔ قدرت اسے اس کی توقع کے خلاف یہاں تک لے آئی تھی۔ اب اسے پولیس کے ڈنڈوں کا کوئی افسوس نہ تھا۔ عصمت نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کے زخموں پر پھاہے رکھے تھے اور اس کے نزدیک اُن زخموں کی قیمت بہت بڑھ گئی۔۔۔۔ اس کے کانوں میں وہ میٹھی اور دلکش آواز گونج رہی تھی۔ وہ ان کانپتے ہوئے خوبصورت ہاتھوں کا تصوّر کر رہا تھا، وہ ان آنکھوں کا تصوّر کر رہا تھا۔ جن میں محبّت کے دریا موجزن تھے اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار وہ حسین چہرہ آ رہا تھا جس میں دودھ، شہید اور گلاب کے رنگوں کی آمیزش تھی۔

صُبح کے وقت راحت نے سلیم کے بستر کے قریب تپائی پر چائے اور ناشتہ رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! چائے پی لیجیے۔ ابھی ڈاکٹر صاحبہ تشریف لانے والی ہیں۔"

سلیم نے پوچھا۔ "راحت تمہاری آپا ڈاکٹر کب سے بن گئیں؟"

راحت نے دروازے سے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور پھر مُسکراتی ہوئی سلیم کی طرف متوجّہ ہوئی۔ ”بھائی جان! آپ کو معلوم نہیں؟ آپا جان تو اس شہر کی بہت مشہور ڈاکٹر ہیں۔ انہیں نزلے اور زکام کا علاج آتا ہے۔ کھانسی کی گولیاں مُفت تقسیم کرتی ہیں۔ گلی کے بچّوں کی آنکھوں میں دوائی بھی ڈال دیتی ہیں۔“

امجد نے اندر داخل ہو کر کہا۔ ”بھائی جان! آپا جان سے آنکھوں میں دوائی نہ ڈلوانا۔ بہت لگتی ہے۔ کان کے درد کو بھی اِن کی دوائی سے کوئی آرام نہیں آتا۔“

عصمت شرمائی اور جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، امجد اس کے تیور دیکھ کر دوسرے دروازے سے صحن کی طرف نکل گیا۔ راحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز تبسّم لاتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب مبارک ہو! آپ کا علاج کامیاب ہے۔“

عصمت کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی اور وہ ایک نظر سلیم کی طرف دیکھنے کے بعد بولی۔ ”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" سلیم نے جواب دیا۔

راحت بولی۔ "اجی اتنے مشہور ڈاکٹر کا علاج ہوا اور آپ ٹھیک نہ ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

عصمت نے گھور کر راحت کی طرف دیکھا۔ "بڑی چڑیل ہو تم۔"

"ڈاکٹر بننا بُری بات تو نہیں۔ سلیم نے کہا۔

عصمت نے کہا۔ "جی یہ مذاق کرتی ہے۔ میں نے میٹرک کے بعد فرسٹ ایڈ سیکھی تھی اور انہوں نے مجھے ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا۔"

سلیم نے کہا۔ "بہرحال مجھے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ایک اچھے ڈاکٹر سے مجھے اس سے بہتر علاج کی توقع نہ تھی۔"

"جی مجھے ابّا جان نے چند دوائیاں بتا دی ہیں۔"

عصمت کی ماں کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے سلیم کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! میں پچھلے پہر تمہیں دیکھنے کے لئے آئی تھی۔ تم

سو رہے تھے۔ اب طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

”جی ہاں! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”تم یہاں پولیس کے ہاتھ کیسے آ گئے بیٹا؟“

عصمت اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر رہی تھی لیکن ماں کا یہ سوال سُن کر وہ دروازے کے قریب رُک گئی۔۔۔۔۔ ماں نے کہا۔ ”بیٹی بیٹھ جاؤ“ اور وہ جھجکتی ہوئی کمرے کے کونے میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلیم نے مختصراً اپنی سرگزشت سُنادی۔

عصمت کی ماں نے کہا۔ ”بیٹا! یہ وزارت کب ختم ہو گی؟“

سلیم نے جواب دیا۔ ”یہ ہماری ہمّت پر مختصر ہے۔ میرے خیال میں اگر مسلمانوں کا یہی جوش و خروش رہا تو موجودہ حکومت دو ہفتے سے زیادہ نہیں چل سکتی۔“

ماں بولی۔ ”ارشد کے ابّا کا بھی یہی خیال تھا۔“

تیسرے دِن سلیم وہاں سے یہ احساس لے کر رُخصت ہو رہا تھا کہ عصمت اس کے دل و دماغ اور روح کی پرواز کا مرکز بن چکی ہے۔ اس نے اُس کے ساتھ بہت کم باتیں کی تھیں اور شائد کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو اُس کے دل کی کیفیّت کی آئینہ دار ہوتی۔ تاہم سلیم نے ہر لفظ کے ساتھ اس کے سادہ اور معصوم دِل کی دھڑکنیں سُنی تھیں۔ وہ اُن جھُکی جھُکی اور شرمائی ہوئی نگاہوں کو دیکھ چکا تھا جو کہہ رہی تھیں۔ ”میں تمہاری ہوں، میں روزِ اوّل سے تمہاری ہوں اور تم میرے ہو۔ ہمیشہ کے لیے میرے!“

عصمت کی ماں نے رخصت کے وقت سلیم کو ایک لفافہ دے کر تاکید کی تھی کہ وہ اُسے اپنی ماں کے سوا کسی کو نہ دکھانے اور سلیم کے بغیر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس خط کا اس کی زندگی کے ساتھ گہرا تعلّق ہے۔

☆☆☆☆☆

یونینسٹ وزارت کے ہندو سرپرستوں کا خیال تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کا جوش و خروش ہنگامی ہے اور اسے پولیس کی لاٹھیوں سے ٹھنڈا کرنے کے بعد شمال مغرب میں ہندو فاشزم کی یلغار کے لیے راستہ صاف ہو

جائے گا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مسلم لیگ نے کسی منظم پروگرام اور تیّاری کے بغیر تحریک چلائی ہے اور جس طرح انگریز نے کئی بار اگلی صف کے لیڈروں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر کر کے کانگرس کی بڑی سے بڑی تحریک کو ٹھنڈا کر دیا تھا، اسی طرح مسلم لیگ کے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف مسلم عوام کا مورچہ ٹوٹ جائے گا۔ لیکن حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ کسی سیاسی پارٹی یا لیڈروں کی جماعت کی تحریک نہ تھی۔ خضر نے ہندو مقاصد کی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ کر پنجاب کے مسلم جمہور کو چیلنج دیا تھا اور اس چیلنج کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ لیگ اور پنجاب کے بانوے فی صدی مسلمان ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ اجتماعی خطرہ اجتماعی قوّتِ مدافعت کو بیدار کر چکا تھا اور کرائے کے وہ ٹٹّو جنہیں ہندو نے وزارت کا توبڑا دکھا کر اقتدار کے رَتھ میں جوت لیا تھا، اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ دلدل میں پاؤں رکھ چکے ہیں۔

پاکستان کے نعرے کو جو تقویت برسوں میں حاصل نہ ہوئی تھی، وہ اس

چونتیس دِن کی عملی جدوجہد میں حاصل ہو چکی تھی۔ بالآخر خضر حیات خان کانگرس کے رَتھ سے اچانک اپنا رسّا تڑا کر بھاگا اور گورنر نے مجبوراً مسلم لیگ کے لیڈر کو تشکیلِ وزارت کی دعوت دی۔ لیکن کانگرس اس صورتِ حال کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ مکڑی جس نے برسوں کی محنت سے مکر و فریب کے سنہری تاروں کا جال تیّار کیا تھا، منہ میں آیا ہوا شکار جاتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی۔ ہندو ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں اس لیے حکمران تھا کہ وہاں ہندو کی اکثریت تھی۔ ہندو مسلم اکثریت کے صوبوں میں اس لیے برسرِ اقتدار رہنا چاہتا تھا کہ وہاں بعض ماؤں نے ملّت فروشوں کو جنم دیا تھا۔ اب ہندو اس لیے برہم تھا کہ پنجاب کی مسلم اکثریت اس کے تسلّط سے آزاد ہو رہی تھی۔ اس کے نزدیک پنجاب میں مسلم اکثریت کی نمائندہ وزارت کا قیام پانچ دریاؤں کی سرزمین کے عملی طور پر پاکستان میں شامل ہو جانے کے مترادف تھا، اس لیے پنجاب میں بھی کانگرس کو اپنا قدیم چولا تبدیل کرنا پڑا۔ مسلمان بھی عدم تشدّد کے علمبرداروں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ رہے تھے۔ کانگرس فاشزم اپنے قدیم ہتھیار بے کار دیکھ کر نئے حربوں کے ساتھ میدان میں آ چکا

تھا۔ گاندھی کی آتما تاراسنگھ کی زبان سے بول رہی تھی "ہندوؤ اور سیکھو! تمہارے امتحان کا وقت آچکا ہے۔ جاپانیوں اور نازیوں کی طرح تباہی کے لیے تیّار ہو جاؤ۔ ہماری ماتر بھی خون کے لیے پکار رہی ہے۔ ہم خون کے ساتھ اس کی پیاس بجھائیں گے۔ ہم نے مغلستان کو ختم کیا تھا اور ہم پاکستان کو پاؤں تلے روندیں گے۔ ہم زندہ رہیں یا مر جائیں لیکن پنجاب میں مسلمانوں کا اقتدار قبول نہیں کریں گے۔"

ڈاکٹر گوپی چند کہہ رہا تھا۔ "ان دنوں ایسے مظاہرے کرو کہ ہم میں سے کوئی بھگوڑا بن کر مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کر سکے۔"

ہندو اور سکھ پریس بیک زبان چلا رہا تھا۔ "ہم ایسے حالات پیدا کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں جن کے باعث پنجاب میں لیگی وزارت کا قیام ممکن ہو جائے۔"

چنانچہ ایسے حالات پیدا کر دیے گئے۔ کانگرس، سکھوں اور سنگھیوں کی قوّت کے بل بوتے پر اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ماسٹر تاراسنگھ کو پاکستان کے خلاف ہندوؤں اور سکھوں کے متّحد

محاذ کا لیڈر بنایا گیا۔ اس نے پنجاب اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنی کرپان بے نیام کی اور مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ گاندھی کے امن پسند چیلے سکھوں کی تیّاریوں کے پیشِ نظر پنجاب میں بہار کی تاریخ دہرانے کے متعلّق پُر اُمّید تھے لیکن ان کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ ماسٹر تاراسنگھ اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکا کہ اس سکھ پنجاب سے مسلمانوں کو نکال کر دم لیں گے۔ ماسٹر تاراسنگھ کے سورما اٹک تک پہنچے بغیر دم نہ لینے کا عہد کر کے میدان میں آئے تھے لیکن بھارت کے بیٹے حیران تھے کہ امرتسر اور لاہور کے بازاروں میں نہتے مسلمان ان سورماؤں کی کرپانیں چھین رہے ہیں۔۔۔۔ راولپنڈی، ملتان اور دوسرے شہروں میں بھی وہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکے۔ سکھوں کا سب سے بڑا محاذ امرتسر تھا۔۔۔۔۔۔ امرتسر کے گوردوارے اور مندر ان افواج کے بارود خانے تھے جو پنجاب کے مسلمان کے ذہن سے پاکستان کا تصوّر مٹانے کے لیے میدان میں آنے والی تھیں۔ لیکن ان فوجوں کی کامیابیاں مسلمانوں کے مکانوں اور دُکانوں کو جلانے اور عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے تک محدود رہیں۔ امرتسر

کے مسلمانوں نے اچانک حملے کے باعث شروع میں کافی نقصان اُٹھایا۔ سکھوں نے نہتے راہگیروں پر بندوقوں اور پستولوں سے نشانہ بازی کی مشق کی، بچوں اور عورتوں پر اپنی کرپانوں کی دھار کی تیزی آزمائی لیکن جب با ہمّت نوجوانوں کا ایک گروہ میدان میں آگیا تو یہاں بھی لاہور اور دوسرے شہروں کی طرح یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ سفّاکی اور بزدلی ایک ہی بُرائی کے دونام ہیں۔

پنجاب کے مسلمان زیادہ تر خاموش تماشائیوں کی حیثیت میں سکھوں اور ہندوؤں کو اپنے گھر جلانے کی اجازت نہ دے سکے۔ انہوں نے ان کرپانوں کو چھیننے کی کوشش کی جو رام راج کے قیام کے لیے بے نیام ہوئی تھیں۔ اس لیے کانگرس کی نظر میں وہ مفسد تھے۔ انہوں نے اکالی دَل، سیوا دَل اور راشٹر یہ سیوک سنگھ کے سورماؤں کو بچّوں، بوڑھوں اور عورتوں کے قتلِ عام سے روکا لہٰذا وہ تنگ نظر اور فرقہ پرست تھے۔ ان کی قوّتِ مدافعت نے کانگرس کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ وہ سکھوں کی قوّت کے بل بوتے پر پنجاب کو اکھنڈ ہندوستان میں شامل کر سکتی ہے۔ اس

لیے کانگریس جو ہندوستان کے تقسیم ہو جانے کو گائے کے دو حصّوں میں کٹ جانے کے مترادف قرار دے چکی تھی، اب پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ بنگال اور آسام کو بھی تقسیم کروانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اور تقسیم کے لیے کانگرس کے یہ دلائل تھے کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے تو مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کے علاقوں کی ہندو اکثریت کو بھی پاکستان میں مسلم شریعت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں۔ ہندو اور دوسری اقلیتوں کے جان و مال اور تہذیب و تمدّن کے تحفظ کے لیے اِن صوبوں کی تقسیم ضروری ہے۔ ہندوستان کے نئے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کو کانگرس کا یہ استدلال پسند آگیا۔ اس لیے ۳ جون کے اعلان کے مطابق ان صوبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔

آسام کے ضلع سلہٹ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے ریفرینڈم تجویز ہوا۔

☆☆☆☆☆

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم فسادات کا نتیجہ تھی۔ فسادات بہار، یو پی اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی ہوئے تھے، اور ان صوبوں میں ایسے علاقے بھی تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اگر مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے ہندو کو پاکستان کی مسلم اکثریت سے خطرہ تھا تو بہار، یو پی اور دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے کم خطرہ نہ تھا۔ اگر پنجاب اور بنگال کے دو کروڑ غیر مُسلموں کو پاکستان کے وسیع اور زرخیز علاقے کاٹ کر دیے جا سکتے تھے، تو ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی ہندوستان کے بعض حصّوں پر اپنا حق رکھتے تھے۔ اگر ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے تقسیم ہوئی تو دس کروڑ مسلمان ایک چوتھائی سے زیادہ کے حق دار تھے۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یو پی، بہار اور آسام کے کچھ حصّے پاکستان میں شامل ہوتے تھے۔ ہندوستان کے جنوب میں بھی مسلمانوں کی ایک پاکٹ بنتی تھی۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہندو اور انگریز کی سازش نے ایسا نہ ہونے دیا۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی تھی، اور وہ اس بے انصافی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیّار نہ تھے۔ قدرت انہیں یہ سبق دینا چاہتی تھی کہ وہ قوم جو بے انصافی اور بد دیانتی کے خلاف لڑنے کی ہمّت نہیں رکھتی، دیانت اور انصاف کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔۔۔۔ مسلمانوں نے آزاد وطن کی تمنّا کی تھی انہوں نے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کا اصول پیش کیا تھا۔ ان کے لیڈروں نے پاکستان کے حق میں دلائل دیے تھے، نعرے لگائے تھے، تقریریں کی تھیں، وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان، انگریز، کانگرس اور ان کے درمیان منطق کی ایک گتھّی ہے، اور جب سلجھ جائے گی، پاکستان انہیں مل جائے گا۔ لیکن بہت کم ایسے تھے جنہیں یہ احساس تھا کہ تاریخ کی بعض گتھیاں قلم اور زبان سے زیادہ نوکِ شمشیر کی محتاج ہوتی ہیں۔

مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے اس نامنصفانہ فیصلے کے خلاف جنگ کرنے کی

تیّاری نہیں کی تھی۔ مسلم لیگ کے سپاہی بد قسمتی سے ابھی تک لکڑی کے گھوڑوں پر سوار تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے ڈیڑھ سو برس قبل ہندوستان کے راجوں اور نوابوں سے سودا بازی کی بدولت انگریز کی سامراج کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اب یہ سامراج اپنا بوریا بستر باندھنے سے پہلے ہندو سرمایہ داروں سے سودا کر رہا تھا۔ فرنگی طبیب کسی راجے یا نواب کا علاج کرنے کے بعد اس کی ریاست میں اپنی قوم کے لیے تجارتی مراعات حاصل کیا کرتے تھے اور مونٹ بیٹن وہ جرّاح تھا جو انگریز تاجر اور ہندو مہاجن میں ناطہ جوڑنے کے لیے لاکھوں مسلمانوں کی شاہ رگ کاٹ چکا تھا۔ مسلم لیگ کی آنکھیں بند نہ تھیں، وہ اس نشتر کو دیکھ رہی تھیں لیکن اس کے پاس وہ ہاتھ نہ تھے جو لارڈ مونٹ بیٹن کا نشتر پکڑ لیتے۔۔۔! مسلم لیگ مجبور تھی کہ اس نشتر کا چرکا برداشت کرے لیکن مونٹ بیٹن اور ہندو کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ زخم اُن کی توقع سے کہیں زیادہ گہرا ہو گا۔۔۔۔ اور مونٹ بیٹن کی ناانصافی کے بعد ریڈ کلف کی بد دیانتی تاریخ انسانیت کے

سب سے المناک حادثے کا باعث بن جائے گی۔

☆☆☆☆☆

سُرخ لکیر

سلیم دوپہر کے وقت بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ یوسف بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور چلّایا۔ ”بھائی جان! بھائی جان! امّی آ رہی ہیں۔“

پیشتر اس کے کہ سلیم اس سے کوئی سوال پوچھتا، یوسف اُسی رفتار کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور صحن میں داخل ہو کر شور مچانے لگا ”آپا صغریٰ! آپا زبیدہ! چچی جان! امّی آ رہی ہیں۔“

سلیم اپنے دل میں لطیف اور خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ امّی کا اس سے زیادہ گھر میں کسی کو انتظار نہ تھا۔ زبیدہ اور اس کی چچازاد بہنیں شور مچاتی ہوئی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔

زبیدہ نے کہا۔ ”بھائی جان! امّی جان آرہی ہیں۔“

صغریٰ بولی۔ ”بھائی جان مبارک ہو!“

باقی لڑکیاں شور مچانے لگیں۔ ”بھائی جان مبارک، بھائی جان مبارک۔“
افضل کی بیوی نے اندر داخل ہوکر کہا۔ ”کیا شور مچار کھا ہے تم نے؟“

صغریٰ بولی۔ ”امّی جان، چچی جان آرہی ہیں!“

ایک لڑکی نے ڈیوڑھی سے حویلی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”چچی جان آ گئیں۔ چچی جان سلام!“

گھر کی عورتوں اور لڑکیوں نے ڈیوڑھی میں سلیم کی ماں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اب سلیم بظاہر انتہائی انہماک کے ساتھ کتاب دیکھ رہا تھا لیکن اس کی تمام تر توجّہ ڈیوڑھی کی طرف تھی۔ عورتیں سلیم کی ماں کو مبارک باد دے رہی تھیں۔

افضل کی بیوی کہہ رہی تھی۔ ”بہن اندر چلو! یہاں گرمی ہے۔ اری راستہ چھوڑو۔ صغریٰ اپنی چچی کے لیے شربت بناؤ۔“

ماں نے سلیم کو دیکھا اور بیٹھک میں آ گئی۔ سلیم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی مُسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کان اور گال سُرخ ہو رہے تھے۔ اب ماں اور بیٹے کو زیادہ جوش و خروش سے مبارکباد پیش کی جا رہی تھی۔ سلیم کی ماں ایک کرسی پر بیٹھ گئی لیکن سلیم تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ ماں کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ہنسنے لگی۔ سب ہنسنے لگیں اور سلیم کے کان اور گال اور زیادہ سُرخ ہو گئے۔ اچانک سلیم باہر نکلنے کے ارادے سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن ماں نے کہا۔ ”بیٹا ٹھہرو!“ اور چچی نے ہنستے ہوئے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔“

زبیدہ بولی۔ ”امی جان! باباجی اور دادی اماں نہیں آئے؟“ ماں نے جواب دیا۔ ”وہ پیچھے آ رہے ہیں۔“

یوسف بولا۔ ”دادی جان راستے میں بابا نور محمد کے گھر چلی گئی ہیں اور دادا جان مسجد میں چلے گئے ہیں۔“

افضل کی بیوی نے پوچھا۔ ”بہن یہ تو بتاؤ، سلیم کی دادی کو لڑکی پسند آئی یا

نہیں۔"

"سلیم کی دادی کا کچھ نہ پوچھو بہن۔ اس نے تو لڑکی کو دیکھتے ہی کہنا شروع کر دیا کہ میں اسے اِسی ہفتے بیاہ کر لے جاؤں گی۔ دو دن انہوں نے ایک منٹ کے لیے بھی اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ وہ جس کمرے میں جاتی ہے، یہ اس کے پیچھے ہیں۔ وہ سو رہی ہیں تو یہ پنکھا جھل رہی ہیں۔ وہ کھانا کھا رہی ہے تو اس کے پاس بیٹھی کہہ رہی ہیں بیٹی! تم نے کچھ کھایا ہی نہیں۔ کبھی اس کی ماں سے کہتیں تم اسے دودھ زیادہ پلایا کرو۔ ایک دفعہ عصمت سے کہنے لگیں۔ بیٹی! مجھے کتاب پڑھ کر سناؤ۔ تمہاری آواز بہت پیاری ہے۔ کل رات اس کی چھوٹی بہن نے شرارت کی اور اُن کے کان میں کہہ دیا کہ عصمت کے سر میں درد ہے، پھر تو سلیم کی دادی نے وہ تماشا کیا کہ خدا کی پناہ۔ لڑکی کہہ رہی تھی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میرے سر میں درد نہیں ہے۔ گھر والے بھی ہنس رہے تھے لیکن انہوں نے کسی کی نہ سُنی اور جب تک اس کے سر پر بادام روغن کی مالش نہیں کر لی چین نہیں آیا۔"

چچی نے کہا۔ ”اس کی ماں تو بہت خوش ہوئی ہو گی؟“

”وہ خوش بھی تھی اور پریشان بھی۔ یہ کہتی تھیں کہ دو ہفتے کے اندر اندر شادی کی تاریخ مقرّر کر دو اور وہ پریشان تھے کہ شادی بیاہ کے کام اتنی جلدی کیسے ہو سکتے ہیں۔“

افضل کی بیوی نے کہا۔ ”اب کیا فیصلہ ہوا ہے؟“

”وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا فیصلہ ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب سلیم کے ابّا سے مل کر کوئی تاریخ مقرّر کر دیں گے۔“

افضل کی بیوی نے مُسکرا کر سلیم کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”بہن! سلیم کہا کرتا تھا کہ لڑکیوں اور لڑکوں کی رضامندی کے بغیر ان کی شادی کر دینا ظلم ہے۔ اس سے بھی پوچھ لو نا!“

سلیم کی ماں نے کہا۔ ”میں نے راستے میں اُس کی دادی کو چھیڑا تھا، توبہ! وہ تو میرے بال نوچنے کے لیے تیّار ہو گئیں۔ میں نے کہا اماں! مجھے ڈر ہے کہ کہیں سلیم انکار نہ کر دے۔ سنا ہے لاہور میں اسے کوئی میم پسند آ گئی ہے۔

میری بات سُن کر سلیم کی وادی آگ بگولہ ہو گئیں اور کہتے لگیں میں جوتے مار مار کر اس کا سر گنجا کر دوں گی۔ میں نے کہا۔ امینہ کی بھی یہی خواہش ہے کہ سلیم کی شادی کسی میم کے ساتھ ہو۔ وہ کہنے لگیں گھر پہنچتے ہی میں امینہ کو خط لکھواؤں گی کہ وہ یہاں نہ آئے!"

غلام حیدر کی بیوی نے کہا۔ "ابھی وہ آتی ہیں تو ہم سب کہیں گی کہ سلیم نہیں مانتا، پھر تم تماشا دیکھنا لیکن تم ہنس پڑیں تو وہ سمجھ جائیں گی اور سلیم تم بھی تھوڑی دیر چپ رہنا۔ آؤ بہن! ہم دالان میں بیٹھتی ہیں۔"

جب سلیم کی دادی گھر میں داخل ہوئی تو گھر کی عورتیں اور لڑکیاں ایک دوسرے سے سر گوشیاں کر رہی تھیں۔ انہوں کے دالان میں پاؤں رکھتے ہی کہا۔ "بیٹی! نائن کو بلاؤ اور گاؤں کے ہر گھر میں گُڑ کی ایک بھیلی بھیج دو۔ سعیدہ بیٹی! تم اُٹھو، یہ تھک گئی ہے۔"

"منگنی کر آئیں ماں جی؟" سعیدہ، غلام حیدر کی بیوی، نے سوال کیا۔

دادی اس سوال پر حیران ہو کر سلیم کی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ سلیم کی

ماں نے اپنا چہرہ سنجیدہ سا بنا لیا۔ دادی نے باقی عورتوں اور لڑکیوں کی طرف دیکھا اور پریشان سی ہو کر رہ گئی۔ پھر قدرے برہم ہو کر بولی۔ ”سلیم کی ماں نے تمہیں بتایا نہیں؟“

افضل کی بیوی نے دادی کو شربت کا گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”ماں جی! بات یہ ہے کہ سلیم نہیں مانتا۔“

دادی نے شربت کا گلاس پھینک دیا اور چلّائی۔ ”ہے ہے تیری زبان میں کیڑے پڑیں۔“

صغریٰ ہنسی ضبط کرتے ہوئے آگے بڑھی۔ ”دادی جان! بھائی سلیم کہتا ہے کہ میں تو لاہور سے کوئی میم بیاہ کر لاؤں گا!“

دادی ایک لمحہ کے لیے خاموش رہی پھر اچانک اُٹھ کر بولی۔ ”کہاں ہے وہ بے ایمان؟“

افضل کی بیوی نے کہا۔ ”ماں جی! اسے اطمینان کے ساتھ سمجھانا۔ ایسے موقعوں پر غصّہ ٹھیک نہیں ہوتا!“

"ہونہہ۔ غصّہ ٹھیک نہیں۔ میں جوتوں سے اُس کا سر گنجا کر دوں گی۔ اس نے دسویں جماعت پاس کی تھی تو میں نے کہا تھا کہ اس بے ایمان کی شادی کر دو لیکن میری کون سنتا ہے۔ سب نے یہی کہا کہ اس کو ولایت تک پڑھانا ہے۔ اس کا دادا کہتا تھا کہ اگر علی اکبر بی اے کر کے نہیں بگڑا تھا تو یہ کیسے بگڑے گا۔ اسے لاہور بھیج دیا۔ کہاں ہے وہ؟"

اپنے سوال کا جواب نہ پا کر دادی سب کو بُرا بھلا کہتی ہوئی کمروں میں سلیم کو تلاش کرنے لگی۔

صغریٰ نے کہا۔ "دادی جان، بھائی جان بیٹھک میں ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد گھر کی عورتیں بیٹھک سے باہر کھڑی قہقہے لگا رہی تھیں۔ دادی کہہ رہی تھی۔ "کیا کہتے ہو بے ایمان! میم لاؤ گے میرے گھر؟ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

وہ ہنس رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ "دادی جان۔۔۔۔!"

"بس میں تمہاری دادی نہیں ہوں!"

"دادی جان آپ کون سی میم کے متعلّق باتیں کر رہی ہیں؟"

"مجھے تمہاری تمام کرتوت معلوم ہو گئی ہے۔ اسی لیے نئے نئے سوٹ سلوایا کرتے تھے؟"

افضل ڈیوڑھی کے راستے بیٹھک میں داخل ہوا۔ "کیا ہوا؟" اس نے سوال کیا۔

دادی نے جواب دیا۔ "اپنے بھتیجے سے پوچھو!"

سلیم نے کہا۔ "دادی جان آپ سے مذاق ہو رہا ہے!"

"جھوٹا کہیں کا۔ تم نے کہا نہیں کہ میں وہاں شادی نہیں کروں گا!"

"دادی جان خدا کی قسم! وہ تمہیں چڑا رہی ہیں!"

افضل عورتوں کے قہقہے سُن کر ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ "کیا بات ہے بھابی؟" اس نے سلیم کی ماں سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں، سلیم کی دادی گرمی میں تین میل پیدل چل کر آئی ہیں۔

انہیں ذرا غصّہ آ رہا ہے!"

اور سلیم کی دادی یہ سُنتے ہی گرم ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل آئی۔
"بے ایمان چڑیلیں ٹھہرو!"

صغریٰ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ دادی نے آگے بڑھ کر اس کی چوٹی پکڑ لی اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ سلیم قریب پہنچ کر کہنے لگا۔ "دادی جان! ایک اور لگاؤ اسے۔ بڑی چڑیل ہے یہ۔"

دادی کے ہاتھ تھک گئے لیکن صغریٰ کی ہنسی میں فرق نہ آیا۔

☆☆☆☆☆

مہندر سنگھ کے گاؤں میں علاقے کی امن کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ آموں کے ایک باغ میں علاقے کے سرکردہ مسلمان سکھ اور ہندو جمع ہوئے اور سیٹھ رام لال نے اپنی تقریر میں لوگوں کو پُر امن رکھنے کے لیے چند آدمیوں کی کوششوں کی بے حد تعریف کی۔ اس نے کہا۔ "بھگوان کا شکر ہے کہ گزشتہ چار پانچ ماہ میں جبکہ پنجاب میں جگہ جگہ ہندو مسلمان اور سکھ ایک

دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں، ہمارے ضلع میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ ہم آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ اس علاقے کے بزرگوں میں سے میں چودھری رحمت علی اور سردار اِندر سنگھ کو سب سے زیادہ تعریف کا حق دار سمجھتا ہوں کہ وہ بزرگ اس عمر میں بھی روزانہ دیہات میں گشت کے لیے جاتے اور شانتی کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ بھائی افضل اور بھائی شیر سنگھ نے جو کام کیا ہے وہ کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ لوگوں نے باہر سے آکر اس علاقے میں فساد کرانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کسی کو سر نہیں اٹھانے دیا۔ آج ہندو، سکھ اور مسلمان بہنیں آزادی سے پھرتی ہیں، کسی کو جرأت نہیں کہ اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ یہ سب بھائی افضل اور بھائی شیر سنگھ کی ہمّت کا نتیجہ ہے۔“

”بھائیو! بڑوں اور بوڑھوں کی نسبت نوجوانوں میں جوش زیادہ ہوتا ہے لیکن ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے علاقے میں سلیم اور مہندر سنگھ جیسے پڑھے لکھے نوجوان موجود ہیں۔ انہوں نے دِن رات ایک کر کے ہر

گاؤں میں امن کمیٹی بنائی ہے اور انھی کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج ہم آپس میں بھائیوں کی طرح بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ ہمارا ضلع پاکستان میں جا چکا ہے۔ حد بندی کے متعلّق ابھی تک آخری اعلان نہیں ہوا لیکن ہم نے یہ عہد کیا ہے کہ حد بندی کے کمیشن کا فیصلہ خواہ کچھ ہو، اس علاقے میں فساد نہیں ہو گا۔ چودھری رحمت علی اور ان کے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں نے اس علاقے کے مسلمانوں کی طرف سے سکھوں اور ہندوؤں کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور ہمیں ان پر اعتبار ہے۔ انہوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے کہ وہ ہم سے کوئی زیادتی یا نا انصافی نہیں ہونے دیں گے۔ اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا ہے کہ ہم بھی اپنے مسلمان بھائیوں کو اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم ہندوؤں کی اس علاقے میں کوئی طاقت نہیں، پھر بھی ہم گئو ماتا پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھانے کے لیے تیّار ہیں کہ ہماری طرف سے کوئی شرارت نہیں ہو گی۔"

سکھوں کی طرف سے چرن سنگھ اور اِندر سنگھ نے اعلان کیا کہ ہم گورو

گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھانے کے لیے تیّار ہیں۔

اس کے بعد سیٹھ رام لال کے گھر سے ایک خوبصورت گائے اور گیانی سورن سنگھ کے گھر سے گرنتھ مہیّا کیا گیا اور قریباً ہر گاؤں کے سرکردہ سکھوں نے گرنتھ پر اور ہندوؤں نے گائے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھائے۔

بالآخر چودھری رحمت علی جس کی بھنویں تک سفید ہو چکی تھیں، اپنی چھڑی کا سہارا کے کر اٹھا۔ "بھائیو!" اس نے نحیف آواز میں کہا۔ "جس دن وائسرائے نے اعلان کیا تھا کہ ضلع گورداسپور پاکستان میں آگیا ہے، میں نے اسی دِن اپنی برادری کے آدمیوں کو جا کر ہدایت کی تھی کہ اب ہندوؤں سکھوں اور عیسائیوں کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر آتی ہے۔ اس کے بعد میں پیر عبد الغفور اور مولوی حسن علی کے ساتھ ہر گاؤں میں گیا ہوں اور ہم نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا ہے کہ اسلام کسی کے خلاف ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔ جن جوشیلے آدمیوں سے ہمارے سکھ اور ہندو بھائیوں کو فساد کا ڈر تھا، انہوں نے مسجد میں کھڑے ہو کر حلف اُٹھایا

ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کی حفاظت کریں گے۔ یہ ہمارا فرض تھا بھائیو! پاکستان اور ہندوستان بن جانے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بھیڑیے بن گئے ہیں۔ ہم صدیوں سے ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے ہیں۔ بچپن میں ہم اِن درختوں پر اکٹھے جھولے جھولا کرتے تھے جو ہمارے بزرگوں نے لگائے ہیں اور ہمارے بچّے ان درختوں پر جھولا جھولتے ہیں جو ہم نے لگائے تھے۔ ہم آپس میں کیوں لڑیں؟ ہم ان مکانوں کو آگ کیوں لگائیں جو ہم نے ایک ایک اینٹ اکٹھی کر کے تعمیر کیے ہیں۔ جس زمین پر محنت کرنے سے آج تک ہم سب کو روٹی ملی ہے، وہ کل بھی ہمیں روٹی دے گی۔ ہمارے بزرگوں نے ان بنجر زمینوں کو ہمارے لیے سبز باغوں اور لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کیا۔ یہ زمین مقدس ہے۔ اس سے ان کے پسینے کی مہک آتی ہے، اس میں اُن کی ہڈّیاں دفن ہیں۔ اس زمین نے ہمارے لیے صدیوں تک پھل، پھُول اور اناج پیدا کیا ہے۔ ہم اس پر بے گناہوں کا خون نہیں گرائیں گے۔ بھائیو! میں تمہیں یقین دِلاتا ہوں کہ اگر میں اس علاقے سے کسی مسلمان کو کسی ہندو یا سکھ کا گھر جلانے سے نہ روک سکا

تو میں اپنے خون کے چھینٹوں سے اس آگ کو بجھانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے یہ باتیں اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں کہیں بلکہ اس لیے کہیں ہیں کہ میں مسلمان ہوں اور جب یہ ضلع پاکستان میں شامل ہو گیا ہے تو مجھ پر اپنی قوم کی طرف سے فرض عائد ہوتا ہے کہ میں پاکستان کی ہندو اور سکھ رعایا کی حفاظت کروں۔"

☆☆☆☆☆

سلیم اور مہندر اس میٹنگ میں موجود تھے۔ علاقے کے چند اور تعلیم یافتہ نوجوان بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب جلسہ برخاست ہوا تو کندن لال نے سلیم سے کہا۔ "بھئی ریڈیو کی خبروں کا وقت ہو گیا ہے۔ اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو چلیئے۔" مہندر نے کہا۔ "چلیئے سلیم صاحب! بھائی بلونت بھی آئے ہوئے ہیں۔"

"چلو!"

سلیم مہندر اور چار اور تعلیم یافتہ نوجوان کندن لال کی بیٹھک کی طرف

چل دیے۔ خبریں سُننے کے بعد سلیم بلونت سنگھ سے ملنے کے لیے مہندر کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن کندن لال نے کہا۔ ”نہیں یہیں بیٹھئے، بلونت سنگھ کو میں یہیں بُلوا لیتا ہوں۔ میں نے نوکر آم لانے کے لیے بھیجا ہے۔“

”نہیں مجھے گھر میں کچھ کام ہے۔“ سلیم یہ کہہ کر اُٹھا لیکن اپنے دوستوں کے اصرار پر بیٹھ گیا۔ کندن لال نے ایک لڑکے کو آواز دے کر کہا۔ سروپ جاؤ کپتان صاحب کو بُلا لاؤ!“

ایک نوجوان نے سلیم سے سوال کیا۔ ”باؤنڈری کمیشن کے فیصلے سے متعلّق آپ کی کیا رائے ہے؟“

سلیم نے جواب دیا۔ ”فیصلے سے متعلق میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔“

کندن لال نے کہا۔ ”آپ نے اندازہ لگایا ہو گا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کمیشن ۳جون کے اعلان میں شاید کوئی تبدیلی نہ کرے!“

سلیم نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں یہ ممکن نہیں۔ عارضی تقسیم میں مسلم اکثریت کے بہت سے علاقے ہندوستان میں شامل کر دیے گئے

ہیں۔ میرے خیال میں حد بندی کا نظم و نسق میں سہولت کے پیشِ نظر ایسا کیا گیا ہے۔ مثلاً ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ وہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی کا تناسب چودہ اور آٹھ کا ہے اور غیر مسلم آبادی میں عیسائی اور اچھوت بھی ہیں۔ اس کے بعد دسوہہ، جالندھری، ہوشیار پور، نکور، فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلوں میں بھی اکثریت ہے اور یہ تمام علاقے پاکستان سے ملحق ہیں۔"

بلونت سنگھ شراب کے نشے میں جھومتا ہوا اندر داخل ہوا اور سلیم اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کرنے کے بعد ایک خالی کرسی کھسکا کر سلیم کے قریب بیٹھ گیا۔ مہندر محسوس کر رہا تھا کہ اس کے منہ سے شراب کی بو سلیم کو پریشان کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے لیے لیے گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ بلونت سنگھ بتا رہا تھا کہ مہاراجہ کشمیر نے اسے پولو کھیلنے کے لیے اپنے اصطبل سے ایک گھوڑا انعام دیا ہے۔ وہ اس بات سے ناراض تھا کہ سلیم پچھلے سال سری نگر آیا لیکن اس سے نہیں ملا۔

سلیم نے معذرت کی۔ ”بھئی! میں تین دن سری نگر رہ کر گلمرگ اور اس کے بعد پہل گام چلا گیا تھا۔ ہاں بھئی! میں تمہیں کیپٹن بننے پر مبارکباد دیتا ہوں!“

”چھوڑ یار یہ کون سی کامیابی ہے میری۔ میرے جو ساتھی انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے وہ میجر اور کرنل بن گئے۔ کشمیر آرمی میں بھی جن افسروں کو جنگ میں بلا لیا گیا تھا وہ سب ترقّی کر گئے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ کشمیر میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم بھی کچھ بن جائیں گے لیکن وہاں کسی نے سر نہ اُٹھایا اور ہمیں بہادری دکھانے کا موقع نہ ملا۔ البتّہ اب وہاں چیونٹیوں کے پیچھے کچھ پَر نکلنے لگے ہیں۔ اُمّید ہے کشمیر میں کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ ہمیں خطرہ تھا کہ ہماری رجمنٹ ٹوٹ جائے گی لیکن اب یہ خطرہ نہیں رہا۔ مہاراجہ نے فوج کم کرنے کی بجائے اور سکھ مانگے ہیں۔“ کندن لال نے سوال کیا۔ ”آپ کے خیال میں کشمیر میں بغاوت کا خطرہ ہے؟“

”بغاوت وہاں کیا ہو گی، البتّہ پاکستان کا نام سُن کر کچھ لوگ بے چین ہو رہے ہیں۔ ان کا جوش ہم دو گھنٹوں میں ٹھنڈا کر دیں گے۔ بہر حال اب

پاکستان کی وجہ سے مہاراجہ فوج کی اہمیّت محسوس کرنے لگا ہے۔“

مہندر سنگھ نے سلیم کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ کر موضوع بدلنے کی نیّت سے کہا۔ ”بھائی جان! ہم باؤنڈری کمیشن کے فیصلے سے متعلّق بحث کر رہے تھے۔“

بلونت سنگھ نے اپنے چہرے پر ایک معنی خیز مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ ہمیں معلوم ہے۔“

کندن لال نے کہا۔ ”ہاں بھئی سلیم! آپ یہ کہہ رہے تھے کہ اجنالہ، ہوشیار پور، ڈسوہہ، جلندھر، نکودر، زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں مسلم آبادی کی اکثریت کے باعث پاکستان کو ملیں گی۔ لیکن اس صورت میں ہمارے ضلع کی تحصیل پٹھان کوٹ میں ہندو آبادی زیادہ ہے، پھر یہ بھی ہندوستان میں شامل ہو گی۔“

سلیم نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں لدھیانہ میں مسلم اکثریت کا علاقہ جو پاکستان کے ساتھ ملحق نہیں، پٹھان کوٹ کے ساتھ تبدیل کیا جا

سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو بھی پاکستان کو آٹھ دس زرخیز ترین تحصیلوں کے بدلے ایک بنجر تحصیل چھوڑ دینے میں کوئی خسارہ نہیں ہو گا۔"

بلونت سنگھ نے کہا۔ "بھئی! اگر نقشہ ہو تو میں بھی کچھ بتاؤں گا!"

کندن لال نے کہا۔ "نقشہ آپ کے پیچھے دیوار پر لٹک رہا ہے۔" بلونت سنگھ نے اُٹھ کر کہا۔ "بھئی سلیم! تم پنسل ہاتھ میں لو اور نشان لگا کر بتاؤ، پھر میں بھی تمہیں بتاؤں گا!"

کندن لال نے میز کی دراز سے سرخ پنسل نکال کر سلیم کے ہاتھ میں دے دی اور اس نے ان کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔ "میرے خیال میں پاکستان اور ہندوستان کی قدرتی سرحد ستلج ہے۔ اس صورت میں ہوشیار پور سے غیر مسلم اکثریت کی تحصیلیں پاکستان میں آ جائیں گی لیکن ان کے تبادلے میں ستلج پار مسلم اکثریت کے علاقے ہندوستان میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اب ضلع امرتسر کا سوال آتا ہے۔ اس کی تحصیل اجنالہ کے متعلّق میں یہ بتا چکا ہوں کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، باقی ضلع میں

سکھوں کی اکثریت ہے اور دربار صاحب کی وجہ سے وہ اسے بہت زیادہ اہمیّت دیتے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ اجنالہ کے سوا باقی امرتسر کو فیروز پور کے ساتھ ملا دیا جائے۔ اس صورت میں باؤنڈری لائن یہ ہو گی۔"

سلیم نے پنسل کے ساتھ نقشے پر ایک ہلکی سی لکیر کھینچ دی۔

بلونت سنگھ نے کہا۔ "بس تم یہی سمجھتے ہو؟"

سلیم نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں اگر انگریز ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے خلاف زیادتی کر کے فسادات کی نئی آگ نہیں بھڑکانا چاہتا تو سرحد یہی ہو گی۔"

بلونت سنگھ نے سلیم کے ہاتھ سے پنسل لیتے ہوئے کہا۔ "ریڈ کلف کا فیصلہ سُننے کے بعد یہ نقشہ ضرور دیکھنا۔۔۔ یہ بلونت سنگھ کا نہیں، اسے ریڈ کلف اور مونٹ بیٹن کا ہاتھ سمجھو۔ سلیم بھئی تم تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لو، میں وہ لکیر کھینچنے والا ہوں جو ریڈ کلف اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کھینچ چکے ہیں۔"

سلیم نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”بھئی مجھے غش نہیں آئے گا۔ تم اطمینان رکھو!“

بلونت سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ ”غش! میرے دوست جس دِن ریڈ کلف اپنی پٹاری کھولے گا، اس دِن بڑوں بڑوں کو غش آجائے گا۔ دیکھو!“

بلونت سنگھ نے نقشے پر دوسری لکیر کھینچ دی۔ سرخ رنگ کی یہ لکیر سلیم کی لکیر کے مقابلہ میں بہت نمایاں تھی اور سلیم حیرانی اور اضطراب کی حالت میں نقشے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بلونت سنگھ نے نہ صرف ستلج اور بیاس کے درمیان مسلم اکثریت کے تمام علاقے ہندوستان میں شامل کر چکا تھا بلکہ اُس کی لکیر شکر گڑھ کے سوا گورداسپور کا باقی ضلع امرتسر کا تمام رقبہ اور لاہور کا کچھ علاقہ بھی ہندوستان کی طرف دکھا رہی تھی۔ نقشے نظر ہٹا کر سلیم نے بلونت سنگھ کی طرف دیکھا، اور اچانک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”یار! آج تم زیادہ پی آئے ہو۔ میں اکثریت کے گیارہ لاکھ مسلمانوں کو بچانے کی فکر میں تھا اور تم نے پندرہ لاکھ اور ہندوستان کی طرف دھکیل دیے ہیں۔“

"تم ہنس رہے ہو۔ ابھی میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔" بلونت سنگھ نے اوپر کی طرف ایک اور لکیر کھینچ کر پہلی لکیر کے ساتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "پندرہ لاکھ نہیں، میں نے تیس پینتیس لاکھ اور مسلمان ہندوستان کی طرف دھکیل دیے ہیں۔ کشمیر ہندوستان میں شامل ہو گا، وہ لکیر دیکھو۔" سلیم نے کہا۔ "اچھا تو تم نے کشمیر کے ضلع گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کر دیا ہے لیکن بھئی وائسرائے تو گورداسپور کو پاکستان میں شامل کر چکا ہے۔ اب تم فیصلہ بدل دو تو اور بات ہے۔"

بلونت سنگھ نے قدرے جوش میں آکر کہا۔ "گورداسپور کشمیر کی طرف ہندوستان کا راستہ ہے، اِسے ہندوستان میں شامل ہونا پڑے گا۔ مونٹ بیٹن کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ جب پینتیس لاکھ مسلمانوں کی آبادی رکھنے والی ریاست کا راجہ ہندوستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے تو ضلع گورداسپور کے پانچ چھ لاکھ مسلمانوں کی مخالفت کی پروا نہیں کی جائے گی۔"

سلیم نے کہا۔ "بھئی اگر یہ صورت ہوتی تو ہمیں بھی دکن، بھوپال اور جونا

گڑھ کا راستہ مل جائے گا۔"

بلونت سنگھ نے کہا۔ "دکن، بھوپال اور جونا گڑھ ہماری جیب میں ہیں۔ ہم صرف کشمیر کے متعلق سوچ رہے ہیں۔"

کندن لال کے نوکر نے ایک گول طشت میں آم لا کر میز پر رکھ دیے۔ سلیم نے مہندر اور کندن لال کے اسرار پر ایک آم اُٹھا لیا لیکن کھاتے وقت وہ محسوس کر رہا تھا کہ آج آموں کا ذائقہ بدل چکا ہے۔

کندن لال نے بلونت سنگھ سے کہا۔ "بھی تم نہیں کھاؤ گے؟"

"نہیں بھئی۔ آموں کے لیے آج میرے پیٹ میں جگہ نہیں!"

سلیم نے کہا۔ "سچ بتانا بلونت سنگھ، آج تم نے کتنی بوتلیں چڑھائی ہیں؟" بلونت سنگھ نے جواب دیا۔ "یار دیکھو۔ تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے دِل لگی کر رہا ہوں۔ لیکن یہ نقشہ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ پھر کسی دِن کہو گے کہ تم نے کسی اُلّو کے پٹھے سے نہیں، آدمی سے بات کی تھی!"

مہندر اپنے بھائی کی باتوں سے سخت پریشان تھا۔ اس نے گفتگو کا رُخ

بدلنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان! سلیم صاحب کی منگنی ہوئی ہے۔ آپ نے انہیں مبارک باد نہیں دی؟“

”بھائی مبارک ہو، کب ہوئی منگنی؟“

سلیم کی بجائے مہندر نے جواب دیا۔ ”کوئی دو ہفتے ہوئے ہیں!“

”اچھا بھئی مٹھائی کب کھلاؤ گے؟“

سلیم نے جواب دیا۔ ”پندرہ اگست کے بعد تم سب کو دعوت دوں گا!“

بلونت سنگھ نے کہا۔ ”پندرہ اگست تک تو میں یہیں ہوں۔“

جب مجلس برخاست ہوئی تو مہندر نے کچھ دور تک سلیم کا ساتھ دیا۔ گاؤں سے باہر نکل کر اس نے مغموم لہجے میں کہا۔ ”بلونت کی باتوں سے آپ کو تکلیف ہوئی ہو گی، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اس وقت بھی شراب سے بدمست ہو گا!“

سلیم نے مہندر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مہندر! تمہیں میرے متعلّق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے دیکھتے ہی یہ اندازہ لگایا تھا کہ آج معاملہ خراب ہے۔“ سلیم نے بظاہر مہندر کو مطمئن کر دیا کہ بلونت سنگھ کی باتوں کو اُس نے شرابی کی بکواس سے زیادہ اہمیت نہ دی لیکن جب وہ تنہا اپنے گاؤں کا رُخ کر رہا تھا تو اُس کے کانوں میں بلونت سنگھ کے الفاظ گونجنے لگے۔ وہ تصوّر میں بار بار اُس سرخ لکیر کو دیکھ رہا تھا جو بلونت سنگھ نے نقشے پر کھینچی تھی۔ اچانک اُس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ ”اگر یہ درست ہوا تو؟“ اور تھوڑی دیر کے لئے اس کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ یہ لکیر بڑھتی اور پھیلتی گئی یہاں تک کہ پانچ دریاؤں کی سر زمین میں اسے ایک نیا دریا نظر آنے لگا۔۔۔ آگ اور خون کا دریا۔ اس دریا کا سیلاب بستیوں اور شہروں کو نیست و نابود کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ لکیر اسے ایک مہیب اژدہا نظر آ رہی تھی اور ہندو فاشزم کی عفریت اس پر سوار ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”اب میں آزاد ہو گیا ہوں۔۔۔۔ اب مجھے آگ اور خون سے کھیلنے کی پوری آزادی مل گئی ہے۔“ ریڈ کلف کے قلم کی ایک جنبش نے اُسے ستلج کے کنارے سے اُٹھا کر راوی کے کنارے تک پہنچا دیا تھا اور اُسے کشمیر کی

سیر کرانے کے لیے گورداس پور کی گزر گاہ پر مسلمانوں کی لاشیں بچھا دی گئی تھیں اور کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمان۔۔۔۔؟

سلیم کے دل میں اچانک نئی دھڑکنیں بیدار ہوئیں۔ وہ چلّایا۔ ”نہیں نہیں، یہ غلط ہے۔۔۔۔ یہ ناممکن ہے، یہ ایک شرابی کی بکواس ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انگریز کبھی ایسی ناانصافی نہیں کر سکتا۔ کوئی مہذّب انسان ایسا نہیں کر سکتا۔“ لیکر سمٹتے سمٹتے اس کی آنکھوں سے ناپید ہو گئی اور وہ دوسری سامنے آگئی جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کھینچی تھی۔

☆☆☆☆☆

پرانے وقتوں میں بھارت ماتا کے بیٹے قتل و غارت اور لوٹ مار کے لیے نکلا کرتے تو کالی دیوی کی پوجا کر کے منتیں مانا کرتے تھے۔ یہ موری اپنے پجاریوں کو ہر اس مکروہ فعل کی اجازت دیتی تھی جو انسانی ضمیر کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا تھا۔ بیسویں صدی کی تہذیب کے گہوارے میں آنکھیں کھولنے والا ہندو بھی اپنی فطرت کے لحاظ سے تاریک زمانے کے ہندو سے مختلف نہ تھا۔ قدیم ہندو سماج کی بنیاد نفرت اور حقارت کے اس

جذبے پر رکھی گئی تھی جسے ہندو پنچ ذات کے لیے اپنے دل میں جگہ دے چکا تھا۔ پرانے ہندوؤں کی برتری کا راز شودر کی تذلیل میں تھا۔

نئی ہندو سماج کی بنیاد مسلم دشمنی کے جذبے پر استوار ہوئی تھی اور وہ اپنے تفوق کے لیے مسلمانوں کو مغلوب کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ صدیوں کے ظلم اور استبداد نے اچھوت کی رگوں سے زندگی کا خون نچوڑ لیا تھا اور ہندو کے اقتدار کی لاٹھی کے سامنے وہ بھیڑوں کا ایک گلہ بن چکے تھے۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ اُن سے مختلف تھا۔ انہوں نے صدیوں اس ملک پر حکومت کی تھی، انہوں نے برہمن کے سومنات کی ہیبت کے سامنے سر جھکانے کی بجائے اُس کے ٹکڑے اُڑائے تھے اور دورِ زوال میں بھی اُن کی رہی سہی قوّتِ مدافعت اتنی ضرور تھی کہ ہندو اپنے ان حربوں کو بیکار سمجھتا تھا جو اُس نے اچھوت پر آزمائے تھے۔ ہندو اپنے قدیم دیوتاؤں کی کرامات سے مایوس ہو کر کسی نئے دیوتا کی تلاش میں تھا۔ اپنی سفّاکی اور بربریت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کے لیے اُسے کسی کالی دیوی کے سہارے سے زیادہ کسی ایسے دیوتا کی عملی مدد کی ضرورت

تھی، جو مسلمانوں کو باندھ کر اُس کے آگے ڈال دینے کی قدرت رکھتا ہو۔

قدیم وقتوں میں جب اُنہیں شودروں کی سرکوبی کی ضرورت محسوس ہوتی تو دھرتی ماتا کے سینے سے کئی ہاتھوں اور کئی سروں والے کالے اور مہیب دیوتا خود بخود نکل آیا کرتے تھے۔ کسی کی ناک ہاتھی کی سونڈ سے بڑی ہوتی، کسی کے سر پر بالوں کی بجائے سانپ لہرا رہے ہوتے اور کسی کی دم ہی اتنی لمبی ہوتی کہ برہمنوں اور اُونچی ذات کے لوگوں کے خلاف بغاوت کرنے والے راکشش یا شودر سہم کر بھاگ نکلے۔ لیکن جب سے مسلمانوں نے اس ملک میں قدم جمائے تھے، دھرتی ماتا نے ایسے دیوتاؤں کو جنم دینا بند کر دیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں ایک دِن ایک بدیشی دیوتا لندن سے ہوائی جہاز پر سوار ہو کر دہلی پہنچا۔ اس دیوتا کا رنگ سفید تھا۔ شکل و صورت بھی ہندوستان کے خوفناک دیوتاؤں سے مختلف تھی تاہم مرن برت اور مون برت رکھنے والے مہاتما اور اُن کے چیلے دیکھتے ہی پہچان گئے کہ یہ وہی دیوتا ہے جس کی بھارت ماتا کو مدّت سے تلاش تھی۔ یہ باہر سے سفید ہے لیکن اس کا دل

کالی دیوی کے چہرے سے کہیں زیادہ سیاہ ہے۔ کالے پجاریوں کا یہ سفید دیوتا لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھا۔

☆☆☆☆☆

اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ماؤنٹ بیٹن کی کارگزاریوں اور دوسرے پلڑے میں برطانوی سامراج کے تمام گزشتہ جرائم کو رکھ دیا جائے تو ماؤنٹ بیٹن کا پلڑا بھاری رہے گا۔ اگر انسانیت کے قاتلوں کی فہرست تیّار کی جائے تو ماؤنٹ بیٹن کا نام سب سے اُوپر لکھا جائے گا۔ چنگیز اور ہلاکو جہاں جاتے آگ اور خون کا پیغام لے کر جاتے تھے لیکن ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے برصغیر کو آزادی اور جمہوریت کی نعمتوں سے مالا مال کرنے کے لیے آیا تھا۔ چنگیز اور ہلاکو اس قوم کے رہنما تھے جو خنجر کو آستین میں چھپانے کے فن سے نا آشنا تھی، وہ ہاتھوں پر ربڑ کے دستانے چڑھا کر انسانوں کا گلا نہیں گھونٹتے تھے۔ وہ قتل کرتے تھے اور مقتولوں کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتے تھے تاکہ مؤرخوں کو ان کے متعلّق غلط فہمی نہ ہو۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن بیسویں صدی کا ایک مہذّب قاتل تھا اور

اُسے قاتلوں کے ایک ایسے گروہ کی سرپرستی نصیب ہوئی جو برسوں سے اپنے بدترین اعمال کو بہترین الفاظ میں چھپانے کی مشق کر رہا تھا۔ ہندو جاتی کا روشن خیال سپاہی مقتول کی لاش پر کھڑے ہو کر بھی یہ کہنا سیکھ چکا تھا کہ میں تمہارے لیے امن و دوستی کا پیغام لایا ہوں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن بظاہر ہندوستان کی تقسیم اور انتقالِ اختیارات کے لیے آیا تھا لیکن در حقیقت اس کا مشن مسلمانوں کے قتلِ عام کے لئے ہندوؤں کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ آبادی کو ہندوستان اور ہندوؤں کی کم سے کم آبادی کو پاکستان میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر میں مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے صوبوں کو تقسیم کے اصول کو صرف مسلم اکثریت کے صوبوں یعنی پنجاب اور بنگال کی تقسیم میں تبدیل کر دیا۔ اس نامنصفانہ تقسیم نے نہ صرف پاکستان کو اس کے بہترین علاقوں سے محروم کر دیا بلکہ ہندوستان کی مسلم اور پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کا وہ توازن بھی ختم کر دیا جس کی بدولت دونوں مملکتوں میں امن کی اُمّید تھی۔ پاکستانی

علاقے سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ مسلم آبادی اور کوئی دو کروڑ ہندو اور سکھ آبادی ہندوستان میں شامل کر دی گئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس ناانصافی سے مسلمانوں کو صرف ساڑھے چھ کروڑ کی آبادی کے حصّے کا رقبہ ملا۔

مسلمان یہ تلخ گھونٹ اپنے حلق سے اتارنے پر مجبور کر دیے گئے لیکن یہ صرف ابتدا تھی۔ اس کے بعد انتقالِ اختیارات کی باری آئی۔ مسلمانوں کو وہ سلطنت دے دی گئی جس کی حدود بھی متعین نہیں ہوئی تھیں۔ انہیں وہ حکومت مل گئی جس کے حصّے کی افواج ایک سوچی بھی اسکیم کے مطابق ابھی تک ہندوستان سے باہر رکھی گئی تھیں۔ پاکستان کے دستے کا تمام اسلحہ اور بارود ہندوستان میں پڑا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندو فاشزم کے سیلاب کے دروازے کھولنے سے پہلے پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ انتقالِ اختیارات میں اس کی جلد بازی اس اسکیم کا اہم ترین حصّہ تھی جس کے مطابق بنگال اور پنجاب کی تقسیم ہوئی تھی۔

۱۵ اگست سے قبل دہلی کے نواح سے لے کر امرتسر تک آگ اور خون

کے طوفان کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ ۱۵ اگست سے قبل پٹیالہ، نابھہ، کپور تھلہ، بھرت پور اور الور کی افواج مشرقی پنجاب میں پہنچ چکی تھیں۔ راشٹر یہ سیوک سنگھ کے گروہ ہندو ریاستوں سے اسلحہ اور بارود حاصل کر کے پنجاب کا رُخ کر رہے تھے اور حکومت مشرقی پنجاب کی مسلمان پولیس کو غیر مسلح کر رہی تھی۔ امر تسر میں مسلمان کانسٹیبلوں کو غیر مسلح کر کے اُن پر گولیوں کی باڑ مارنے کے بعد مشرقی پنجاب کے حکام یہ واضح کر چکے تھے کہ وہ کس قسم کا امن قائم کریں گے۔

پندرہ اگست سے بہت پہلے سکھوں، مہاسبھائیوں اور کانگرسیوں کا اتحاد پنجاب کے خرمن میں آگ لگا چکا تھا اور ماؤنٹ بیٹن کو معلوم تھا کہ اگر مسلمانوں کو بے دست و پا بنا کر اس فسطائی لشکر کے سامنے ڈال دیا گیا تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ پندرہ اگست سے پہلے اگر پاکستان کو اس کے حصّے کی افواج اور اسلحہ کے ذخائر مل جاتے تو ممکن نہ تھا کہ پنجاب میں سکھ ڈوگرہ اور گورکھا افواج کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتلِ عام کو روکنے کے لیے پاکستان کی آواز اس قدر بے اثر ثابت ہوتی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ راشٹر یہ

سیوک سنگھ کے بھیڑیے اور ہندو اور سکھ ریاستوں کے سپاہی پنجاب میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے اور پاکستان کے مسلمان صرف بے چارگی کے آنسو بہا کر خاموش ہو جاتے۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان میں وحشت اور بربریت کے جس سیلاب کے دروازے کھولنا چاہتا تھا اس کے راستے کی تمام قوّتیں اور رُکاوٹیں بھی دُور کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ اگر ماؤنٹ بیٹن اس حد تک مسلمانوں کا دُشمن تھا تو اُسے مسلمانوں کو لولا لنگڑا پاکستان دینے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اس سوال کا صحیح جواب ہمیں لیبر وزارت کے طرزِ عمل سے ملتا ہے۔ لیبر وزارت ہندوستان کی سیاسی جنگل میں ایک فریق کی بجائے ایک ثالث کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور ثالث کی حیثیت میں وہ ہندو کو زیادہ سے زیادہ دے کر خوش کرنا چاہتی تھی۔ ہندو سارا ہندوستان مانگتا تھا لیکن انگریز اپنی سنگین سے دس کروڑ مسلمانوں کو مغلوب کر کے ہندو کے آگے ڈالنے کے لیے تیّار نہ تھا۔ اس صورت میں ثالث کی بجائے ہندو کے ساتھ شامل ہو کر ایک فریق کی حیثیت اختیار کرنا پڑتی تھی۔۔۔۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسلمانوں کے سامنے پاکستان کی وہ صورت پیش کر دی جو ان

کے وہم و گمان میں نہ تھی اور اس کے ساتھ ہی ہندو کو خوش کرنے کے لیے اُسے تمام ان لوازمات سے مسلح کر دیا جنہیں وہ پاکستان کو نیست و نابود کرنے کے لیے کافی سمجھتا تھا۔[٦]

پندرہ اگست کو دہلی میں ہندوستان کی آزادی کا آفتاب طلوع ہوا نہیں بلکہ پندرہ اگست کو دہلی میں آزادی کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا اور اس کے آتشیں مواد کا رُخ اس نشیب کی طرف پھیر دیا گیا جہاں مسلمانوں کو پاکستان کے دفاعی حصار کی بنیادیں رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ پندرہ اگست کو انگریز نے پتھّر کے زمانے کی وحشت اور بربریت کو بیسویں صدی کی جنگی مشینوں پر سوار کر دیا۔

اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی، وہ ریڈ کلف کی بد دیانتی اور بے ایمانی نے پوری کر دی۔ یہاں بھی مسلمانوں کو ایک انگریز کی دیانتداری اور نیک نیّتی پر بھروسا کرنے کی سزا ملی۔ ریڈ کلف کا قلم ستلج یا بیاس کے

[٦] قائدِ اعظم اسلحہ اور افواج کی تقسیم سے پہلے انتقالِ اختیارات کے مخالف تھے۔ وہ ماؤنٹ بیٹن کو اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کر چکے تھے لیکن اُن کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

کنارے رُکنے کی بجائے راوی کے کنارے جا پہنچا۔ اس کی منطق سو فیصدی مہا سبھائی تھی۔ ستلج، بیاس اور راوی کے درمیان مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کے ساتھ شامل کر دینے سے نہروں اور ریلوں کے انتظام میں خلل اور انتشار کا اندیشہ تھا۔ چونکہ امر تسر کی دو تحصیلوں میں سکھوں اور ہندوؤں کی اکثریت تھی، اس لیے امر تسر کے سارے ضلع کو ہندوستان میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔ بیاس کے پار مسلم اکثریت کی تمام تحصیلیں ہندوستان میں شامل کر دی گئیں۔ مسلم اکثریت کا ضلع گورداسپور جو تین جون کے اعلان کے مطابق پاکستان کا حصّہ بن چکا تھا تحصیل شکر گڑھ کے سوا اس لیے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا کہ مادھو پور سے نکلنے والی ان نہروں پر بھی بھارت کا کنٹرول ضروری سمجھا گیا تھا جو امر تسر کی دو تحصیلوں کے مقابلہ میں اکثریت کے اڑھائی اضلاع کو سیراب کرتی تھیں۔ تحصیل اجنالہ کی مسلم آبادی ہندو اور سکھوں سے قریباً دوگنا تھی لیکن چونکہ یہ ہندو اور سکھ اکثریت کے ضلع امر تسر کا ایک حصّہ تھی، اس لیے اسے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ ضلع لاہور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور اس کی تحصیل قصور میں بھی مسلم

آبادی زیادہ تھی۔ تاہم ریڈ کلف نے یہ مناسب سمجھا کہ قصور کا کچھ حصّہ ہندوستان کو دے دیا جائے اور ستلج کے پار ضلع فیروز پور میں مسلم اکثریت کے علاقے اس لیے ہندوستان میں شامل کر دیے گئے کہ سر ریڈ کلف یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ پاکستان کو ان سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

یہ ریڈ کلف نے خود ہی آنکھیں بند کر کے پنجاب کے نقشے پر ایک لکیر کھینچ دی تھی یا ماؤنٹ بیٹن نے یہ لکیر کھینچتے وقت اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا؟ ریڈ کلف نے یہ فیصلہ خود ہی لکھا تھا یا ماؤنٹ بیٹن نے یہ فیصلہ حسبِ ضرورت تبدیل کر دیا تھا؟ ہمارے لیے اس بحث میں اُلجھنے کی بجائے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ بد دیانتی اور ناانصافی ایک اہم ضرورت کے ماتحت کی گئی تھی۔ مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنے ہندوستانی پجاریوں کو ایک اور تحفہ دینا چاہتا تھا اور یہ نیا تحفہ کشمیر تھا۔ اگر دریائے ستلج سرحد بنتا تو ہندوستان کے راستے میں ستلج اور بیاس کے درمیان ایک وسیع علاقہ اور اس کے بعد ضلع گورداسپور حائل ہوتا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن تین جون کے اعلان میں ستلج اور بیاس کے درمیان مسلم

اکثریت کے تمام علاقے ہندوستان کو دے چکا تھا۔ اب ہندوستان کے راہ میں آخری پتھّر صرف ضلع گورداسپور تھا جسے وہ شاید انتہائی مجبوری کی حالت میں پاکستان کا حصّہ قرار دے چکا تھا۔ اس پتھّر کو ہندوستان کی راہ سے ہٹانے کا کام ریڈ کلف سے لیا گیا۔[۷]

اگر ضلع گورداسپور تحصیل اجنالہ اور بیاس کے پاس ضلع فیروز پور میں مسلم اکثریت کی تمام تحصیلیں ہندوستان کے حوالے نہ کی جاتیں تو اس کے چار نتائج ہوتے۔ ایک یہ کہ سکھوں کی ایک بہت بڑی تعداد پاکستان میں چلی جاتی اور انہیں جارحانہ اقدام کی جرأت نہ ہوتی۔ اگر فساد ہوتا بھی تو ستلج اور بیاس کے درمیان اقلیت کے علاقوں کے مسلمانوں کو فوراً اپنی اکثریت کی تحصیلوں میں پناہ مل جاتی اور اگر امرتسر کی دو تحصیلوں

[۷] گورداسپور سے متعلّق ماؤنٹ بیٹن کی نیّت کا اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ سہ جون کے بعد اس نے پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ کوئی ایسا علاقہ جس میں ایک فرقے کی معمولی سی اکثریت ہو، تمام کا تمام ہندوستان یا پاکستان میں شامل کر دیا جائے۔ تشریح کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ضلع گورداسپور کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت بہت معمولی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کی نگاہ صرف ضلع گورداسپور پر کیوں پڑی۔ امرتسر، فیروز پور، جلندھر اور ہوشیار پور پر کیوں نہ پڑی؟ ماؤنٹ بیٹن کے پیش کردہ اصول کے مطابق بھی صرف پٹھان کوٹ کی تحصیل ہندوستان میں جاتی تھی لیکن اس کے بدلے پاکستان کو دس تحصیلیں اور ملتی تھیں۔ لیکن یہاں کسی اصول کا سوال نہیں تھا، یہاں صرف یہ مسئلہ تھا کہ ہندوستان کا ایک کونہ ہر قیمت پر کشمیر سے ملا دیا جائے۔

میں سکھ کوئی زیادتی کرنے کا ارادہ کرتے تو انہیں یہ سوچنا پڑتا کہ تحصیل اجنالہ اور ضلع گورداسپور کے سکھوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

ایسی تقسیم کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندو فاشزم مشرقی پنجاب کو آگ اور خون کا پیغام دینے کے بعد کشمیر کی وادیوں کا رُخ نہ کرتا۔

تیسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ پاکستان اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے زیادہ مضبوط ہوتا اور چوتھا یہ کہ مشرقی پنجاب کی سرزمین لاکھوں مسلمانوں کے خون سے لالہ زار نہ ہوتی اور پاکستان کی بنیادیں ہلانے کے لیے ہندوستان زخمی، ننگے اور بھوکے مہاجرین کے قافلے بھیجنے کا حربہ آزمانے میں اپنا فائدہ نہ دیکھتا۔ لیکن یہ سب باتیں ہندو پجاری اور اس کے انگریز دیوتا کی خواہشات کے خلاف ہوتیں۔

☆☆☆☆☆

چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی رات کو مسلمانوں کے گھروں میں آزادی کے نعرے اور مسرّت کے قہقہے گونج رہے تھے۔ بارہ بج کر ایک منٹ پر

پاکستان اور ہندوستان کی آزاد مملکتیں وجود میں آچکی تھیں۔

گاؤں کے مسلمانوں کے گھروں میں چراغاں کیا جا رہا تھا۔ کمسن لڑکے پٹاخے اور پھلجھڑیاں چلا رہے تھے اور بڑے مسجد میں جمع ہو کر شکرانے کے نفل پڑھ رہے تھے۔

سلیم نے ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر اپنے بالا خانے کی چھت پر پاکستان کا جھنڈا نصب کیا۔ مجید اس کے قریب گیس بتّی لیے کھڑا تھا۔ نیچے باہر کی حویلی اور مسجد کے ساتھ کھلی جگہ میں جمع ہونے والے لوگ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

چودھری رحمت علی باقی آدمیوں کے ساتھ مسجد سے باہر نکلا تو اِندر سنگھ دروازے پر کھڑا تھا۔ ”بھائی مبارک ہو!“ اس نے کہا۔

چودھری رحمت علی نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور کہا۔ ”بھائی! تم کو بھی مبارک ہو۔۔۔۔ پاکستان ہم سب کا وطن ہے۔“

گاؤں کے دوسرے سکھوں نے بھی چودھری رحمت علی اور باقی

مسلمانوں کو مبارکباد دی۔ چودھری رحمت علی نے کہا۔ ”آؤ بھئی! بیٹھے ہیں!“

لوگ چودھری رحمت علی کے ساتھ باہر کی حویلی میں داخل ہوئے۔ جنہیں چارپائیوں پر بیٹھنے کے لیے جگہ نہ ملی، ان کے لیے چٹائیاں بچھادی گئیں۔ بعض سکھ قدرے بُجھے بُجھے نظر آتے تھے لیکن اسماعیل کے قہقہوں نے انہیں جلدی ہی یہ احساس دلا دیا کہ یہ گاؤں وہی ہے اور اس گاؤں کی محفلیں اسی طرح رہیں گی۔

کسی نے کہا۔ ”ارے چودھری رمضان کہاں ہے؟“

اِندر سنگھ نے کہا۔ ”لچھمن سنگھ اسے لے کر آؤ مزا نہیں آتا اس کے بغیر!“

لچھمن سنگھ نے جواب دیا۔ ”بھئی آج وہ نہیں آئے گا۔ میں نے اسے بہت کہا تھا۔“

اسماعیل نے پوچھا۔ ”کیا کر رہا ہے وہ؟“

لچھمن سنگھ نے جواب دیا۔ ”بھئی وہ میرے گھر کے دروازے پر پہرہ دے رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر آج کسی نے تمہارے گھر میں کنکر بھی پھینک دیا تو میری ناک کٹ جائے گی۔“

غلام حیدر بولا۔ ”آج تو کچھ بانٹنا چاہیے۔ رمضان کے اپنے گھر میں چور گھُس جائے تو وہ آواز نکالنے والا نہیں!“

لچھمن سنگھ نے کہا۔ ”لیکن بھئی! مجھے یقین ہے کہ وہ میری خاطر ضرور لڑے گا!“

پیراں دتہ نے کہا۔ ”میں اسے لاتا ہوں۔“

کاکو عیسائی بولا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں!“

لچھمن سنگھ نے جواب دیا۔ ”بھائی ہری سنگھ کو بھی لے آنا!“ کاکو نے جواب دیا۔ ”ہری سنگھ گھر نہیں ہے۔ خبر نہیں کہاں گیا ہے!“

گاؤں کے لڑکوں کو رمضان سے کم دلچسپی نہیں تھی چنانچہ پیراں دتہ اور کاکو کے ساتھ چند لڑکے بھی چل پڑے۔

ایک لڑکے نے حویلی کے پھاٹک کے پاس پٹاخا چلایا تو اسماعیل نے کہا۔ "بھئی! دیکھو پٹاخے مت چلاؤ۔ چودھری رمضان پریشان ہو رہا ہو گا!"

اِندر سنگھ نے کہا۔ "بھگوان کا شکر ہے کہ ہمارے ضلع میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ سنا ہے کہ چند دِن سے امرتسر کی حالت بہت بُری ہے۔ چودھری رحمت علی! آپ نے سلیم کی منگنی وہاں کی ہے، آپ کو چاہیے تھا کہ جب تک وہاں فساد ہے، انہیں یہاں لے آتے!"

چودھری رحمت علی نے کہا۔ "سلیم کے خُسر نے بچوں کو گاؤں میں بھیج دیا ہے۔ تحصیل اجنالہ میں فساد کا کوئی خطرہ نہیں پھر بھی اگر کوئی خطرہ ہو تو ہم انہیں لے آئیں گے!"

سائیں اللہ رکھا نے کہا۔ "چودھری جی بھگت رام کا لڑکا رام لال لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ ہمارا ضلع پاکستان سے نکل کر ہندوستان چلا جائے گا!"

بھگت رام بولا۔ "بھئی کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ سلیم بھی کہا کرتا تھا کہ سارا پنجاب پاکستان کو ملے گا لیکن انگریز نے کئی ضلعے ہندوستان کو دے دیے

لیکن اب تو یہ جھگڑا ہی ختم ہو چکا ہے۔ اب وائسرائے اپنا فیصلہ کیسے بدلتا سکتا ہے۔"

بیلا سنگھ نے کہا۔ "چودھری جی ہمیں تو یہ خوشی ہے، پاکستان کی سرکار سلیم کو کوئی بڑا عہدہ دے گی۔ سلیم کہا کرتا ہے کہ میں سب سے پہلے اس گاؤں میں اسکول اور ہسپتال کھلوادوں گا اور پکی گلیاں بنواؤں گا!"

لچھمن سنگھ نے کہا۔ "اسکول بنے نہ بنے، پکّی گلیاں ضرور بننی چاہئیں، برسات میں میرے تو پاؤں گل جاتے ہیں۔"

رحمت علی نے کہا۔ "بھائی! اب اپنی حکومت ہو گی، ان شاء اللہ بہت کچھ بنے گا۔"

تھوڑی دیر میں کاکو اور پیراں دتہ چودھری رمضان کو لے آئے اور اسماعیل نے پرانے وقتوں کی باتیں شروع کر دیں۔ رمضان کہہ رہا تھا۔ "یار! اسماعیل دنیا بدل گئی لیکن تم نہ بدلے۔ اچھا بھئی ہنس لو کبھی رمضان کو یاد کیا کرو گے۔"

افضل بولا۔ ”کہاں جانے کا ارادہ ہے چودھری؟“

”یار! بڑھاپے میں زندگی کا کیا اعتبار ہوتا ہے۔“

اسماعیل نے کہا۔ ”فکر نہ کرو چودھری، ہماری قبریں ایک دوسرے سے دور نہیں ہوں گی!“

شیر سنگھ نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے سلیم سے کہا۔ ”سلیم بھئی! میں یہ مانتا ہوں کہ اس ضلع کے مسلمانوں نے اب تک بہت حوصلے سے کام لیا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے گاؤں میں بھی ایسے آدمی ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ مسلمان صرف پندرہ تاریخ کا انتظار کر رہے ہیں اور پاکستان بنتے ہی وہ سِکھّوں پر حملہ کر دیں گے۔“

سلیم نے جواب دیا۔ ”چچا! آج رات کے بارہ بجے تک اُن کی ذمّہ داری انگریز پر تھی، لیکن اب اس ضلع کے سِکھّوں کی حفاظت کی ذمّہ دار پاکستان کی حکومت پر ہے اور مسلمان یہ جانتے ہیں کہ اگر فساد ہوا تو

پاکستان بدنام ہو گا۔ پھر اب تو آپ کو یہ خیال بھی نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمان فساد کریں گے۔ اگر اس ضلع کے مسلمانوں کی نیّت خراب ہوتی تو اب تک سکھوں کے دروازوں پر پہرے کیوں دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے بعد اگر ہندوستان کی حکومت نے خود شرارت نہ کی تو ضلع امرتسر میں بھی امن ہو جائے گا۔"

شیر سنگھ نے کہا۔ "بھئی! مجھے کیا تسلّی دیتے ہو، میں تو جانتا ہوں۔ میں تو ان بھائیوں کو تسلّی دلانا چاہتا ہوں جو اب تک پریشان ہیں۔ میرا واسطہ تو افضل کے ساتھ ہے۔ اگر افضل پاکستان بننے پر خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔ آج تم نے اپنے گھر میں چراغ جلائے ہیں، جاؤ جا کر ہمارے گھر دیکھو۔ میں نے دو روپے کی موم بتّیاں جلا دی ہیں!"

سلیم نے کہا۔ "چچا! آپ فکر نہ کریں۔ دو چار دن میں سب کو اطمینان ہو جائے گا۔"

☆☆☆☆☆

۱۶ اگست کے دن سلیم اور مجید شہر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی غیر حاضری میں تھانیدار چار سپاہیوں کے ساتھ گاؤں میں آیا اور اس نے سلیم کے دادا سے کہا ''آپ کے خلاف شکایت موصول ہوئی ہے کہ آپ علاقے میں فساد کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بات غلط ہے تاہم افسروں نے حکم دیا ہے کہ جب تک حالات بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے، آپ اپنی بندوقیں ہمارے پاس جمع کرا دیں۔''

سلیم کا دادا اس بات کے لیے تیّار نہ تھا لیکن تھانے دار نے کہا۔ ''اگر آپ خوشی سے بندوقیں جمع کرا دیں تو سکھوں اور ہندوؤں کو آپ کی نیک نیّتی پر اور زیادہ یقین ہو جائے گا ورنہ پولیس آپ کو مجبور کرے گی اور ہندو اور سکھ بھی آپ کی نیّت پر شُبہ کریں گے۔''

چودھری رحمت علی نے قدرے پس و پیش کے بعد افضل اور غلام حیدر کو مشورہ دیا کہ وہ وہ اپنی بندوقیں تھانیدار کے حوالے کر دیں۔ چودھری رحمت علی کے بھائی نور محمد کے گھر میں بھی ایک بندوق تھی اور وہ بھی تھانیدار نے چھین لی۔

جب پولیس واپس شہر کا رُخ کر رہی تھی تو راستے میں انہیں سلیم اور مجید مل گئے۔ سب انسپکٹر کے اشارے پر انہوں نے اپنے گھوڑے روک لیے۔ وہ ایک ہی نگاہ میں اپنی بندوقیں پہچان چکے تھے۔

مجید کی کمر میں پستول دیکھ کر تھانیدار نے کہا۔ ''صوبے دار صاحب! میں آپ کے گاؤں سے بندوقیں لے آیا ہوں۔ آپ کے لیے یہ بہتر ہو گا، کہ جب تک آپ چھٹی پر ہیں اپنا پستول ہمارے پاس جمع کرا دیں!''

مجید نے ترش روئی سے جواب دیا۔ ''میں اپنے پستوں کی حفاظت کر سکتا ہوں!''

تھانیدار نے کہا۔ ''لیکن ہمیں حکم ملا ہے کہ جو لوگ کسی سرکاری ڈیوٹی پر نہ ہوں، اُن کے ہتھیار جمع کر لیے جائیں!'' مجید نے جواب دیا۔ ''لیکن ابھی تک فوج شاید پولیس کے حکم سے آزاد ہے۔''

''لیکن آپ چھٹّی پر ہیں؟''

''میں پاکستانی فوج میں ہوں اور یہ ضلع بھی شاید پاکستان میں ہے۔ تھانیدار

صاحب! آپ کے راستے میں ایک اور گاؤں بھی تھا۔ آپ ہماری بندوقیں تو لے آئے لیکن وہاں کیوں نہیں گئے؟ اگر آپ کو معلوم نہیں تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ سیٹھ رام چند کے گھر میں دو بندوقیں ہیں اور کیپٹن بلونت سنگھ بھی میری طرح چھٹّی پر آیا ہوا ہے۔ اس کے پاس ایک رائفل، ایک شارٹ گن اور ایک ریوالور ہے۔ اگر تلاشی لینے کی ہمّت کرو تو شاید ان کے گھروں سے اور بھی بہت کچھ نکل آئے۔"

تھانے دار نے کہا۔ "آپ کو ہمارے متعلّق غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر افسروں کا حکم ہوتا تو ہم اُن کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہ کرتے لیکن افسروں کی پالیسی یہ ہے کہ مسلمانوں کو رضا کارانہ طور پر اپنا اسلحہ جمع کرانے کے لیے کہا جائے لیکن ہندوؤں اور سکھوں کو پریشان نہ کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو وہ محسوس کریں گے کہ پاکستان گورنمنٹ کی نیّت ان کے متعلّق اچھی نہیں۔ آپ فوج ہیں، آپ اپنا پستول لے جائیں لیکن اگر آپ جمع کرا دیتے تو اچھا ہوتا۔"

"اگر مجھے جمع کرانے کی ضرورت پیش آئی تو بھی میں اپنی رجمنٹ کو

پولیس پر ترجیح دوں گا!"

"اچھا آپ کی مرضی!"

مجید نے سوال کیا۔ "یہ بندوقیں ہمیں کب واپس ملیں گی؟" تھانیدار نے جواب دیا۔ "جب افسروں کا حکم ہو گا۔"

راستے میں سلیم مجید سے کہہ رہا تھا۔ "مجید میں بہت پریشان ہوں۔ کل مسلمان تھانیدار ہمارے علاقے سے تبدیل کر دیا گیا ہے اور سکھ حوالدار نے اس سے چارج لیا ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ تھانے دار اس علاقے میں اکالی دل کا جتھہ دار بھی ہے۔ کل یا پرسوں باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کا اعلان ہونے والا ہے۔ انہوں نے اپنی بندوقیں پولیس کے حوالے کرنے میں بڑی غلطی ہے۔"

دو دِن کے بعد ضلع گورداسپور کے وہ مسلمان جنہوں نے پندرہ اگست کے دِن اپنے مکانوں پر پاکستان کے جھنڈے لہرائے تھے، انتہائی بے بسی، پریشانی اور اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔

"اب کیا ہو گا؟"

ریڈیو پر باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ سنایا جا چکا تھا۔ ضلع گورداس پور پاکستان سے چھین کر ہندوستان کو دیا جا چکا تھا اور اس فیصلہ کے بعد چند گھنٹوں کے اندر اندر پولیس کے تمام مسلمان ملازم غیر مسلح کیے جا چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

باؤنڈری کمیشن کا اعلان مسلمانوں کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گِرا۔ بالخصوص ضلع گورداسپور کے مسلمان جنہوں نے ریڈیو پر یہ اعلان سُنا، اپنے کانوں پر اعتبار کرنے کے لیے تیّار نہ تھے۔ دور افتادہ دیہات کے لوگ اسے ایک دلچسپ افواہ سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔" وہ اپنے سکھ پڑوسیوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ "بھائیو! یہ بات غلط ہے۔ ریڈیو نے جھوٹ کہا ہو گا۔"

اعلان سے اگلے دِن سلیم اپنے مکان کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

رات بھر کی بے چینی اور بیداری سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی ماں کمرے میں آئی اور مغموم لہجے میں بولی "بیٹا! کچھ کھالو۔ تم نے شام کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔"

"امّی! مجھے بھوک نہیں۔"

ماں نے اپنے چہرے پر ایک مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تم کہتے تھے کہ اجنالہ کی تحصیل اور ہمارا ضلع دونوں پاکستان میں آئیں گے۔ تمہارے ابّا بھی یہی کہتے تھے، ڈاکٹر شوکت کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ کہتے تھے کہ حد بندی کے بعد امن ہو جائے گا اور اگلے مہینے کے پہلے ہفتے وہ خود آ کر تمہاری شادی کی تاریخ مقرّر کریں گے لیکن اب مجید کہتا ہے کہ سکھ فساد سے باز نہیں آئیں گے۔ بیٹا اب کیا ہو گا؟ وہ ہماری بندوقیں بھی لے گئے ہیں۔ کل تمہارے ابّا جان آنے والے تھے، وہ بھی نہیں آئے۔ شاید آج آ جائیں۔ گاڑی تو آ گئی ہو گی؟"

سلیم نے جواب دیا۔ "امّی گاڑیاں بند ہو گئی ہیں!"

”بیٹاوہ نہ آسکتے تو تار ضرور دیتے۔“

”امّی! ابّا ابھی نہیں آسکتے!“

مجید بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ”سلیم آؤ!“ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ سلیم اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلیم کی ماں نے بدحواس ہو کر پوچھا۔ ”بیٹا! کیا خبر ہے؟“

”کچھ نہیں چچی جی! سلیم کو ایک آدمی بُلاتا ہے!“

سلیم مجید کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ماں نے پھر کہا۔ ”ٹھہرو بیٹا! مجھے بتا کر جاؤ۔“

سلیم رُکا لیکن مجید اُس کا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

باہر کی حویلی میں افضل گھوڑوں پر زینیں ڈال رہا تھا۔ سلیم کو اُس کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا۔ ”مجید خدا کے لیے بتاؤ کیا بات ہے؟“

مجید نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جواب دیا۔ ”سلیم بہت بُری خبر ہے۔ تایا جان فوجی ٹرک سے اُتر کر گاؤں کی طرف آ رہے تھے کہ اسٹیشن کے قریب سکھوں کے جتھے نے ان پر حملہ کر دیا۔ اُن کی جان بچ گئی ہے لیکن وہ بہت بُری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”فجّو پہلوان خبر لایا ہے۔“

افضل دو گھوڑوں پر زین ڈال چکا تھا اور تیسرے کو لگام دے رہا تھا۔ سلیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ مجید نے دوسرے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”چچا! خدا کے لیے تم یہیں ٹھہرو! میں اور سلیم فجّو کو ساتھ لے کر جاتے ہیں اور اس کے ہاتھ اطلاع بھی دیں گے۔ ہمارے گاؤں پر کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ آپ کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ یہ ہے میرا پستول، میری الماری، میں پچاس اور گولیاں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ ضرورت پڑی تو امّی آپ کو گولیاں نکال دیں گی۔ آپ گاؤں کے تمام لوگوں کو اکٹھا کریں!“

افضل نے معمول کے لہجے میں کہا۔ ”اچھا بھئی میں نہیں جاتا۔ لیکن فجّو کو جلد واپس بھیج دینا۔“

مسجد کے قریب جامن کے درخت کے نیچے رحمت علی اور اسماعیل فجّو کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ افضل نے کہا۔ ”فجّو بھئی! تم ان کے ساتھ جاؤ اور واپس آ کر ہمیں اطلاع دو!“

رحمت علی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ”مجھے ضرور جانے دو!“

افضل نے جواب دیا۔ ”نہیں، آپ گھر چلیں۔ ہمیں اب صرف آپ کی دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ سیٹھ رام چند کے گاؤں میں سکھ جمع ہو رہے ہیں۔ ہمارے گاؤں سے بھی چند سکھ وہاں چلے گئے ہیں۔ شیر سنگھ میرے ساتھ وعدہ کرے کے گیا تھا کہ اگر انہوں نے کسی شرارت کا ارادہ کیا تو وہ میں فوراً اطلاع دے گا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔

☆☆☆☆☆

مہندر سنگھ کے گاؤں کے اسی باغ میں جہاں چند ہفتے قبل علاقے کے

سر کردہ لوگوں نے تقریریں کی تھیں، پھر ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ کرپانوں اور برچھیوں سے مسلح ایک ہزار کے قریب سکھ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے سیٹھ رام چندر کی تقریر سن رہے تھے۔ آٹھ دس آدمیوں کے ہاتھ میں بندوقیں اور رائفلیں بھی تھیں۔ مہندر سنگھ آم کے درخت کے ساتھ ٹیک لگائے ایک طرف کھڑا تھا۔ سیٹھ رام چندر تقریر کر رہا تھا:

”میرے سکھ بھائیو! تم پنجاب کے شیر ہو۔ گرو گوبند سنگھ کے نام کو دھبّہ نہ لگانا۔ تمھیں اس بات پر خوش نہیں ہونا چاہیے کہ پنجاب کے چند ضلع تم کو مل گئے ہیں۔ میرے بھائیو! مسلمانوں کا پاکستان بن گیا ہے۔ لیکن تمہارا خالصتان ابھی تک نہیں بنا۔ کانگریس نے اس صوبے کے چند ضلعے تم کو لے دیے ہیں۔ اب اس علاقے کو خالصتان بنانا تمہارا کام ہے اور اسے تمہاری کرپانیں ہی خالصتان بنا سکتی ہیں۔ تم جس وقت کا انتظار کر رہے تھے، وہ آ گیا ہے۔ تمھیں اٹک تک پہنچنا ہے اور اٹک تک پہنچنے سے پہلے تمھیں مشرقی پنجاب کو ان لوگوں سے صاف کرنا ہے جو خطرے کے وقت تمہاری پیٹھ میں چھُرا گھونپیں گے۔ اورنگ زیب سے لے کر اب تک

مسلمان تمہارا دُشمن چلا آتا ہے، اگر مسلمان مشرقی پنجاب میں ٹک گیا تو یاد رکھو سارا پنجاب تو کیا تم اس حصے کو بھی خالصتان نہیں بنا سکو گے جو ہمیں مل گیا ہے۔ تمہارے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے کہا ہے کہ سکھ خیبر پر اپنا جھنڈا گاڑ کر دم لیں گے۔ جس قوم کا لیڈر بہادر ہو وہ قوم بُزدل نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں نے پاکستان مانگا تھا، ان کا پاکستان بن گیا ہے اس لیے انہیں وہاں بھیج دو۔ جب مشرقی پنجاب سے ساٹھ ستّر لاکھ مسلمان وہاں پہنچیں گئے تو پاکستان کو ہوش آ جائے گا۔ بہادرو ہمّت کرو۔ اب پولیس تمہاری ہے، فوج تمہاری ہے، حکومت تمہاری ہے۔ لیکن جو کام تمہارے ذمّے ہے، وہ تم ہی کو کرنا ہو گا۔ اگر تم نے حملہ نہ کیا تو کوئی اور جتھا رحمت علی کے گھر سے ڈولیاں لے جائے گا اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے!"

اس کے بعد چرن سنگھ نے تقریر کی:

"گرو کے سِکھّو! جتھے دار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دس بجے سے پہلے یہاں پہنچ جائے گا اور اب گیارہ ہونے والے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں پٹیالہ کے

جوانوں ضرورت پڑے گی لیکن اب یہاں اتنے آدمی جمع ہو گئے ہیں کہ رحمت علی کے گاؤں کے مسلمانوں کی ایک ایک بوٹی بھی بمشکل ہمارے حصّے آئے گی۔ ہمارے پاس بندوقیں بھی کافی ہو گئی ہیں۔ ان کی بندوقیں میں نے دو دن پہلے ضبط کرادی تھیں۔ ہمیں اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ رحمت علی اور اس کے بھائیوں اور لڑکوں کا اس علاقے کے مسلمانوں پر بہت اثر ہے۔ اگر انہیں ہمارے ارادوں کا پتہ چل گیا تو وہ چند گھنٹوں میں ہزاروں مسلمانوں کو اکٹھا کر لیں گے لیکن اگر ہم مسلمانوں کے ہوشیار ہونے سے پہلے یہ گاؤں فتح کر لیں تو اس علاقے کے مسلمانوں کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ میرے خیال میں ہمیں جتھے دار کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ وہ دوسرے گاؤں پر حملہ کر چکے ہوں۔"

ایک سکھ نے کہا۔ "اس گاؤں میں بھی مسلمانوں کے آٹھ دس گھر ہیں، پہلے انہیں صاف کیوں نہ کر لیا جائے۔"

رام چندر نے اُٹھ کر جواب دیا۔ "سردار جی! یہ تو ہمارے گھڑے کی مچھلیاں ہیں۔۔۔ یہ کہاں جائیں گے؟ لیکن پہلے آپ کو رحمت علی کے

گاؤں پر حملہ کرنا چاہیے ورنہ وہ خبر ہو جائیں گے۔"

ایک اور سکھ نے کہا۔ "دیکھو بھئی! ہم مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لیے تیّار ہیں لیکن اپنے سکھ بھائیوں کے ساتھ نہیں لڑیں گے۔ رحمت علی کے گاؤں کے کئی سکھ مسلمانوں کے طرف دار ہیں۔ ہمیں حملہ کرنے سے پہلے ان کا ارادہ معلوم کر لیا چاہیے۔"

ہری سنگھ لوہار نے اُٹھ کر کہا۔ "ہمارے گاؤں کے بیس سکھ یہاں موجود ہیں اور جب آپ حملہ کریں گے تو ہمارے گاؤں کے باقی سکھ بھی آپ کا ساتھ دیں گے۔ ہمیں صرف اِندر سنگھ اور اس کے گھر کے دوسرے آدمیوں سے خطرہ تھا سو اس کا علاج بھی ہم نے کر لیا ہے۔ اِندر سنگھ کے دو لڑکے ہمارے ساتھ ہیں۔ شیر سنگھ کو ہم نے شراب کی دو بوتلیں پلا دی ہیں اور وہ اس وقت رام چندر کی بیٹھک کے پاس درخت کے نیچے بے سُدھ پڑا ہوا ہے۔ اِندر سنگھ اب لاٹھی کے سہارے کے بغیر چل بھی نہیں سکتا۔ اب رہ گیا شیر سنگھ کا لڑکا۔ اوّل تو وہ اپنے بچّوں کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے گا اور اگر وہ باز نہ آیا تو ہم یہ سمجھیں گے کہ مسلمانوں

کی طرح وہ بھی پنتھ کا دُشمن ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ وقت پر ہمارا ساتھ دے گا۔ ہمارے گاؤں کے مسلمانوں پر دھاوا بولنے کے لیے آپ کو اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ وہ کل سے خبر سُن کر رو رہے ہیں کہ گورداسپور ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ آج انہیں اپنا ہوش نہیں لیکن کل تک شاید دوسرے گاؤں کے مسلمان وہاں آجائیں۔ تم نے یہ تو سن لیا کہ علی اکبر بُری طرح زخمی ہوا ہے!"

رام چندر نے اُٹھ کر کہا۔ "سردارو! میں یہ جانتا ہوں کہ جو کچھ وہاں سے ملے وہ سب آپ کے حصّے میں آئے۔ اب جلدی کرو ورنہ کل تک دوسرے جتھے پہنچ گئے تو وہ آپ سے حصّہ مانگیں گے۔ رحمت علی کے گھر میں صرف دولت ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ ہمارے علاقے کی چیزیں ہمارے علاقے میں ہی رہنی چاہئیں!"

مہندر سنگھ اچانک آگے بڑھا اور لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر چلّایا۔

"میرے بزرگو اور بھائیو! آج تم بہت بڑا فیصلہ کر رہے ہو۔ میں تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ اگر تم حملہ کا ارادہ کر چکے ہو تو میں

تمہارا راستہ نہیں روکوں گا لیکن میری بات ضرور سنو!"

رام چندر نے چرن سنگھ کو آنکھ کا اشارہ کیا اور بولا۔ "نہیں، اب باتوں کا وقت نہیں۔ ہمیں بہت دیر ہوئی ہے۔ ہم واپس آکر تمہاری باتیں سُن لیں گے۔ بولو ست سری اکال۔"

فضا تھوڑی دیر کے لیے "ست سری اکال" کے نعروں سے گونج اُٹھی۔

مہندر سنگھ نے ہاتھ بُلند کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو! تمہیں گورو گرنتھ کی قسم میری بات سُن کر جاؤ۔ اگر میں کوئی غلط بات کہوں تو جو جی چاہے مجھے سزا دینا۔ میں نے تین مہینے تمہارے گھروں پر مسلمانوں سے پہرہ دلوایا ہے، میں تمہارا دُشمن نہیں اور اگر میں تمہارا دُشمن ہوں تو سیٹھ رام چندر تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔ بھائیو! میری بات سُن لو۔ اس کے بعد اگر تمہارا یہی فیصلہ ہوا تو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے میں سب سے آگے جاؤں گا!" جو لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے، وہ بیٹھ گئے اور جو شور مچا رہے تھے، وہ آہستہ، آہستہ خاموش ہو گئے اور مہندر سنگھ اطمینان سے تقریر کرنے لگا:

"گرو کے سِکھّو! آج تک تم نے یہ نہیں سوچا کہ مسلمانوں کو پاکستان مل گیا ہے اور ہندوؤں کو ہندوستان مل گیا ہے لیکن تمہیں کیا ملا ہے؟ تم نے میری بات کبھی نہیں سُنی لیکن وہ دِن دور نہیں جب تم سب میری طرح سوچو گے۔ ہندوؤں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو تقسیم نہیں ہونے دیں گے لیکن انہوں نے تقسیم منظور کرلی۔ نہ صرف ہندوستان کی تقسیم بلکہ انہوں نے پنجاب کو دو حصّوں میں تقسیم کروایا۔ ایک حصّہ مسلمان کے پاس چلا گیا ہے اور دوسرا حصّہ ہندو کا۔ اس میں ہندو ہی کا فائدہ تھا۔ اس صورت میں سکھ اور مسلمان دونوں ہندو کے غلام ہو جاتے۔ مسلمان ہوشیار تھے، انہوں نے اپنا حصّہ لے لیا۔

واہگورو کے لیے سوچو! پنجاب میں جو مسلمانوں کا حصّہ تھا، وہ مسلمان لے گئے ہیں لیکن جو تمہارا حصّہ تھا، وہ کہاں گیا؟ مجھے جواب دو! خاموش کیوں ہو گئے۔ تمہارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ سیٹھ رام چند کو اس سوال کو جواب معلوم ہے لیکن وہ نہیں بتائے گا نہیں۔ کوئی ہندو تمہیں اس بات کا جواب نہیں دے گا۔ کیونکہ پنجاب میں جو تمہارا حصّہ تھا، وہ

ہندوستان کا ہندو وصول کر چکا ہے۔ اب وہ نہیں چاہتا کہ تم اس سے اپنا حصّہ مانگو، اس لیے سیٹھ رام چند چاہتا ہے کہ تمہیں اس طرف توجّہ ہی نہ کرنے دی جائے۔ وہ تمہیں مشورہ دیتا ہے کہ تم پہلے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو قتل کرو۔ پھر پاکستان پر حملہ کر کے اٹک کا رخ کرو، پھر تمہیں اپنا خالصتان مل جائے گا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ پنجاب کی تقسیم کے بعد جو ضلعے پاکستان سے علیحدہ ہوئے ہیں وہ ہمارے ہیں یا ہندوؤں کے؟"

"ہمارے ہیں!" چند سکھوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔

"بھائیو! تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ہمارے ضلعے ہیں، یہ ہمارا خالصتان ہے، اس میں جو لوگ بستے ہیں، وہ ہماری رعایا ہے۔ ہم اپنی رعایا کے ساتھ جو سلوک مناسب سمجھیں گے کریں گے لیکن ہندو ہمیں یہ مشورہ کیوں دیتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو قتل کریں۔ یہ اس لیے کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ لڑائی شروع کر دیں تو ہندو آرام سے مشرقی پنجاب ہضم کر جائے گا۔ بھائیو! اگر تم مسلمانوں کے ساتھ لڑنا چاہتے ہو تو میں تمہیں نہیں روکتا لیکن پہلے ہندو سے یہ تسلیم کروالو کہ پنجاب کا یہ حصّہ تمہارا خالصتان ہے

اور ہندو کو اس پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کانگریس کے لیڈروں سے کہو کہ پہلے وہ خالصتان کا اعلان کر دیں، پھر ہم مسلمانوں سے نپٹ لیں گے۔ اگر مسلمان سکھوں کو پاکستان سے مار کر نکالے گا تو ہم انہیں خالصتان سے مار کر نکال دیں گے۔ اگر وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تو ہم بھی خالصتان میں مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے!"

چرن سنگھ نے کہا۔ "بھائیو! یہ مسلمانوں کا طرف دار ہے۔ اس کی باتیں مت سنو۔"

مہندر سنگھ نے کہا۔ "سردار جی! میں مسلمانوں کا طرف دار نہیں لیکن میں ہندوؤں کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہتا۔ ہندو کو شروع سے خیال تھا کہ کہیں ہم پاکستان کی طرح خالصتان نہ بنا لیں۔ اس لیے اس نے بڑی ہوشیاری سے ہمیں مسلمانوں کے ساتھ لڑا دیا اور ہماری توجّہ خالصتان سے ہٹا دی۔ ہمارے لیڈروں نے خالصتان کا نعرہ لگایا لیکن جب وقت آیا تو ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ مل گئے اور خالصتان

کے لیے کوشش کرنے کی بجائے ہم نے ان لوگوں کا ساتھ دیا جو سارے ہندوستان کو اپنی جاگیر سمجھتے تھے۔

بھائیو! آج ہندو ہمیں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں سے لڑائے گا، کل تمہاری پیٹ ٹھونک کر کہے گا کہ آگے بڑھو اور پاکستان پر ہلّہ بول دو۔ اگر ہم پاکستان سے کچھ علاقہ لے بھی لیں تو بھی مشرقی پنجاب کی طرح اسے ہندوستان میں شامل کرلے گا اور اگر ہم مارے جائیں تو بھی وہ خوش ہو گا کہ خالصتان سے جان چھوٹی۔

وہ چاہتا ہے کہ پاکستان پھر ہندوستان میں شامل ہو جائے لیکن وہ خود لڑنے کی بجائے تمہیں قربانی کے بکرے بنانا چاہتا ہے۔ آج بھی یہ حال ہے کہ مہاتما گاندھی اور کانگرس کے دوسرے لیڈر پاکستان اور باقی دنیا کے سامنے سچّا ہونے کے لیے مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے ہیں اور سکھوں کو درپردہ مسلمانوں کے ساتھ لڑایا جارہا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ تم مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو نکال دوگے۔ تم اپنے ان پڑوسیوں کے گھر جلادوگے جن کو تم نے گرنتھ اور گائے پر ہاتھ رکھ

کر دوستی کا یقین دلایا تھا۔ جو بندوق ہندو خود نہیں چلا سکتا وہ اس نے تمہارے کندھے پر رکھ دی ہے لیکن تم نے ان سکھوں کے متعلّق بھی سوچا ہے جو پاکستان میں آباد ہیں؟ کیا یہ مسلمان جن کو تم یہاں سے نکالو گے، پاکستان پہنچ کر سکھوں کو نہ نکالیں گے؟"

ایک سکھ نے اُٹھ کر کہا۔ "ہم کسی مسلمان کو بچ کر نہیں جانے دیں گے اور اس کے بعد پاکستان کے سکھوں کی حفاظت کے لیے ہم وہاں پہنچیں گے!"

چکھ شور مچانے لگے۔ "ہم وہاں پہنچیں گے۔۔۔ ہم وہاں پہنچیں گے۔۔۔ ست سری اکال، واہگوروجی کا خالصہ واہگوروجی کی فتح۔"

مہندر چلّایا۔ "بھائیو! میں تمہارا راستہ نہیں روکتا۔ لیکن میری بات تو سن لو۔ ہم آپس میں بیٹھے ہیں۔ یہاں کوئی مسلمان نہیں۔ سنو! جب ماسٹر تارا سنگھ نے امرتسر میں فساد کروایا تھا تو ہم نے پوری تیاری کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کیا تھا۔ امرتسر میں ہم خوب تیّار تھے، ماسٹر تارا سنگھ کا خیال تھا کہ وہ اسے ایک دِن میں فتح کر کے لاہور پہنچ جائیں لیکن اس کا

نتیجہ کیا نکلا؟ پنجاب میں جو ہمارا دبدبہ تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اب ہندو ہمیں یہ تسلّی دے رہے ہیں کہ پولیس، فوج اور ریاستوں کے سپاہی مدد کریں گے لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر ہم مشرقی پنجاب میں بھی فوج اور پولیس کی مدد کے بغیر نہتے مسلمانوں کو قتل نہیں کر سکتے تو ہم پاکستان پر کیسے حملہ کر سکیں گے؟ اور اگر پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے ہندوستان کی فوج ہمارا ساتھ دے گی تو یہ ایک باقاعدہ جنگ ہو گی۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ۔ ہندو اگر کامیاب ہو گا تو وہ اپنا اکھنڈ ہندوستان بنالے گا لیکن اس جنگ میں سکھوں کی ساری طاقت صرف ہو جائے گی اور تم میں ہندو سے خالصتان کا مطالبہ کرنے کی ہمّت نہ ہو گی۔ وہ خالصتان کو اکھنڈ بھارت کے راستے میں آخری کانٹا سمجھ کر مسل ڈالے گا اور ہندو نے یہ دیکھا کہ اس نے پاکستان کے ساتھ جنگ کرنے میں غلطی کی ہے تو وہ فوراً صلح کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے گا اور جنگ کی تمام ذمہ داری سکھوں پر تھوپ دے گا۔

بھائیو! کبھی تم میری بات یاد کرو گے۔ اگر مسلمان کی فتح ہوئی تو بھی ہم

مارے جائیں گے۔ وہ ہم سے مشرقی پنجاب کے ایک ایک بچے کا انتقام لے گا اور اگر ہندو کی فتح ہوئی تو بھی وہ تمہارا خالصتان بھی نہیں بننے دے گا۔ آج اس کی فوج اور پولیس مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے ہمیں اپنی رائفلیں دے رہی ہے۔ کل جب تم خالصتان کا نام لو گے تو یہی فوج اور پولیس تمہارے لیے ہتھکڑیاں لے کر آئے گی۔ آج ہندو اپنے مطلب کے لیے ماسٹر تارا سنگھ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال رہا ہے۔ کل تم دیکھو گے کہ یہی ہندو اسے جیل کی کوٹھری میں ٹھونس دے گا۔ اس وقت تم میں بغاوت کی ہمّت نہ ہو گی۔ تم صرف مسلمانوں کے ساتھ مل کر خالصتان بنا سکتے تھے لیکن یہ ہندو کی کامیابی ہے کہ اس نے ایک طرف تمہارے خالصتان پر قبضہ کر لیا ہے اور دوسری طرف تمہیں مسلمانوں کے ساتھ لڑا بھی دیا ہے۔

بھائیو! بہادر کسی کے احسان کا بدلہ اس طرح نہیں دیا کرتے۔ آج تم جن لوگوں پر حملہ کرنا چاہتے ہو، انہوں نے دِن رات ہمارے گھروں پر پہرہ دیا ہے۔ انہوں نے ہماری ماؤں اور بہنوں کو اپنی مائیں اور بہنیں سمجھا

ہے۔ چوہدری رحمت علی کے خاندان نے کسی مسلمان کو اس علاقے میں شرارت نہیں کرنے دی۔ جس دِن یہ اعلان ہوا تھا کہ گورداسپور پاکستان کو دے دیا گیا ہے، ہمیں ڈر تھا کہ مسلمان اپنے وعدوں سے پھر جائیں گے لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم رہے۔ اب یہ ضلع ہمیں مل گیا ہے، آج ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ سکھ نیکی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔ اگر تم یہ نہیں چاہتے کہ وہ یہاں رہیں تو انہیں یہاں سے نکل جانے کا واقع دو۔ یہ وہی باغ ہے جہاں امن کمیٹی کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ جہاں سردار چرن سنگھ نے گرنتھ اور سیٹھ رام چند نے گائے پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھائے تھے۔ اپنے وعدوں کو یاد کرو اور ان پر حملہ کرنا چاہتے ہو تو چند دن ٹھہر جاؤ اور یہ معلوم کر لو کہ پاکستان کے مسلمان مغربی، پنجاب میں ہمارے سکھ بھائیوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔“

چرن سنگھ نے کہا۔ ”ہم ایک آدمی کی وجہ سے پنتھ کا فیصلہ رد نہیں کر سکتے۔ آج سارے پنجاب میں لڑائی شروع ہو چکی ہے۔ اگر ہم بیٹھے رہے تو پنتھ کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے۔ اگر ہم نے دُشمنوں کو موقع دیا تو

وہ اپنا روپیہ پیسہ اور سب کچھ نکال کر لے جائیں گے۔ آج تک رحمت علی کے خاندان کے کسی شرابی کو اپنے گاؤں کی زمین سے گزرنے نہیں دیا لیکن آج ہم اس کی بہو بیٹیوں کے ہاتھ سے شراب پئیں گے!"

مہندر چلّایا۔ "اس کی بہو بیٹیوں کا نام نہ لو۔ انھوں نے ہماری ماؤں اور بہنوں کو ہمیشہ اپنی مائیں اور بہنیں سمجھا ہے۔ جو آگ ایک گھر کو جلاتی ہے وہ دوسروں کو جلائے گی۔ کسی کی بہو بیٹی کی طرف وہی دیکھتا ہے، جس کو اپنی بہو بیٹی کی عزّت کا خیال نہیں!" چرن سنگھ نے غصّے سے کانپتے ہوئے اپنا پستول نکال کر مہندر کی طرف سیدھا کر دیا۔ "ہم اس گاؤں میں اپنی بے عزّتی کروانے نہیں آئے۔ اگر اس گاؤں کے سکھ مسلمان ہو چکے ہیں تو ہمیں اس کی مدد کی ضرورت نہیں، ہم جاتے ہیں۔ جس میں ہمّت ہے، وہ ہمارا راستہ روک کر دکھائے۔ سِکھّو! بتاؤ تم پنتھ کے ساتھ ہو یا مسلمانوں کے ساتھ؟"

مہندر کے گاؤں کے ایک سکھ نے اُٹھ کر بلند آواز میں کہا۔ "سردار چرن سنگھ کیا دیکھ رہے ہو، مارو گولی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اس گاؤں کا

کوئی سکھ پنتھ سے باہر نہیں!"

"ہاں! مجھے گولی مارو۔ میں تمہاری تباہی نہیں دیکھ سکتا۔" مہندر سنگھ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ "تم جو گڑھا دوسروں کے لیے کھود رہے ہو، اس میں کسی دِن خود گرو گے۔ میں اس دِن کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہتا۔"

چرن سنگھ کا پستول مہندر کے سینے کو چھُو رہا تھا اور تماشائی چلّا رہے تھے۔ "گولی چلاؤ سردار جی! یہ بزدل ہے، یہ غدّار ہے، یہ پنتھ کا دُشمن ہے۔"

مہندر نے کہا۔ "ہاں جلدی کرو! تمہارا ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے!"

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُنائی دی اور لوگ اُٹھ اُٹھ کر شہر سے آنے والی پارٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ بندوقوں، رائفلوں اور پستولوں سے مسلح آٹھ سوار باغ کے قریب پہنچ کر رکے۔ چرن سنگھ نے بلونت سنگھ اور تھانیدار کو دیکھ کر مہندر کے سینے سے اپنا پستول ہٹا لیا۔ تھانیدار اس علاقے میں سکھوں کا جتھے دار تھا۔ اس نے گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم ابھی تک یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہم دو گاؤں صاف کر آئے ہیں اور تم آرام سے

بیٹھے ہوئے ہو؟"

چرن سنگھ نے کہا۔ "سردار جی! کیپٹن بلونت سنگھ کا بھائی ہم پھوٹ ڈال رہا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اگر ہم نے رحمت علی کے گاؤں پر حملہ کیا تو یہ مسلمانوں کی طرف سے ہمارا مقابلہ کرے گا!"

تھانیدار نے بلونت سنگھ کی طرف دیکھا اور بلونت سنگھ نے گھوڑے سے کود کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "اس کی رگوں میں میرے باپ کا خون نہیں۔ ایسا بے غیرت میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔ یہ شروع سے مسلمانوں کے ساتھ تھا۔"

مہندر نے جواب دیا۔ "میں اس لیے مسلمانوں کے ساتھ تھا کہ مجھے تمہارا گھر بچانے کی فکر تھی!"

"بدمعاش! مجھ سے بحث نہ کرو۔ تم باپو کے نام کو رسوا کر رہے ہو۔ تم پنتھ کے خلاف بغاوت کر رہے ہو۔"

"اگر پنتھ بے گناہوں کے قتل کی اجازت دیتا ہے تو میں اس کا باغی ہوں!"

”خاموش!“ بلونت سنگھ نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر پوری طاقت سے مکّا رسید کرتے ہوئے کہا۔ مہندر ِگرتے ِگرتے سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

چرن سنگھ کے لڑکے موہن سنگھ نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”اس نے ماسٹر تارا سنگھ کی بے عزّتی کی ہے۔ اگر یہ میرا بھائی ہوتا تو میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔“

مہندر نے آگے بڑھ کر اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور سراپا التجا بن کر کہا۔ ”بھائی! مجھے مار ڈالو لیکن اس پاپ میں حصّہ نہ لو۔“

تھانیدار نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ ”اگر مسلمان کو مارنا پاپ ہے تو ہمارے گرو بھی پاپی تھے۔ سِکّھو! تم کیا سن رہے ہو؟ بلونت سنگھ تم کہتے تھے کہ اس علاقے کے سکھ بالکل تیّار ہیں لیکن تمہارے اپنے گھر میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے؟“

”میں اس پھوٹ کو ابھی ختم کیے دیتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے بلونت نے مہندر کو پے در پے کئی مکّے رسید کیے۔ مہندر ِگر پڑا تو اس نے اسے تین

چار ٹھڈّے مارے۔ اچانک ایک نوجوان لڑکی آگے بڑھی اور چیختی چلّاتی بلونت سے لپٹ گئی۔ یہ اس کی بہن بسنت تھی۔ ”بھائی تمہیں کیا ہو گیا۔ مہندر نے کیا قصور کیا ہے؟ اسے کیوں مارتے ہو؟“ وہ چلّا رہی تھی۔

”حرام زادی تو یہاں کیوں آئی؟ چلی جا یہاں سے!“ یہ کہتے ہوئے بلونت نے اسے گردن سے پکڑ کر دھکا دیا اور وہ چند قدم دور جا گری۔ مہندر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، بلونت نے اُس کی کمر میں ٹھنڈا مارا اور وہ پھر منہ کے بل لیٹ گیا۔ بسنت اُٹھ کر پھر بلونت سے لپٹ گئی اور چلّانے لگی۔ ”لوگو مہندر کو بچاؤ۔ میرے بھائی نے آج بہت پی لی ہے۔ اسے ہوش نہیں۔ اسے ہوش نہیں۔ اسے معلوم نہیں یہ کیا کر رہا ہے۔ یہ شراب سے اندھا ہو چکا ہے۔“

بلونت سنگھ اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”حرام زادی! مجھے معلوم ہے وہ ٹامی گن تم نے چھپائی ہے۔ میں تمہاری کھال اُدھیڑ دوں گا۔ بتاؤ میری ٹامی گن کہاں ہے؟ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔“ گھر کے سامنے پہنچ کر بلونت اُسے بُری

طرح پیٹ رہا تھا۔ اس کی ماں چیختی چلّاتی باہر نکلی۔ اس نے بلونت کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے زور سے دھکّا دیا اور وہ چند قدم دور پیٹھ کے بل جا گری۔ بلونت دوبارہ اپنی بہن کو بالوں سے پکڑ کر کہہ رہا تھا۔

”بتاؤ! بتاؤ! میری ٹامی گن کہاں ہے؟“

☆☆☆☆☆

شہر کے چند آدمی علی اکبر کے زخمی ہونے کی خبر سُن کر ہسپتال میں جمع ہو چکے تھے۔ فجّو ایک درخت کے نیچے سلیم اور مجید کے گھوڑوں کے پاس کھڑا تھا۔ مجید ہسپتال کے ایک کمرے سے باہر نکلا، لوگ اس کے گرد جمع ہو کر علی اکبر سے متعلّق پوچھنے لگے۔ مجید جواب دینے سے زیادہ انہیں ٹالنے کی کوشش کرتا ہوا آگے بڑھا اور فجّو کے پاس جا کر بولا۔ ”فجّو! تم جاؤ۔ ان سے کہو کوئی نہ آئے، ہم انہیں لے آئیں گے۔ چچا افضل کو الگ کر کے سمجھا دینا کہ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے، وہ چند گھڑیوں کے مہمان ہیں۔ چچا افضل کو یہ بھی بتا دینا کہ وہ ہوشیار رہیں۔ راستے میں رام چند کے گاؤں کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم نے سکھوں کے نعروں

سُنے ہیں۔ صبح سے اب تک اس علاقے میں کئی جگہوں پر سکھوں کے حملے ہو چکے ہیں۔ گھر کے کسی آدمی کو یہاں نہ آنے دینا۔ یہاں اگر کسی کے ٹھہرنے کی ضرورت ہوئی تو میں سلیم کو چھوڑ کر تھوڑی دیر میں گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ تم جاؤ!"

کمرے میں سلیم اپنے باپ کے بستر کے قریب کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے دوسرا انجکشن دینے کے بعد کہا۔ "مسٹر سلیم! شاید انہیں تھوڑی دیر کے لیے پھر ہوش آ جائے۔ ممکن ہے کہ آپ کوئی بات کر سکیں۔ میں دوسرے زخمیوں کو دیکھ آؤں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "میں یہ نہیں کہوں گا کہ کوئی اُمّید نہیں۔ کبھی کبھی قدرت معجزے بھی کر دیتی ہے۔ آپ دعا کریں۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر چکا ہوں۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجید کمرے میں داخل ہوا اور چپ چاپ سلیم کے قریب کھڑا ہو گیا۔

کوئی دس منٹ کے بعد علی اکبر نے ہوش میں آکر آنکھیں کھول دیں اور سلیم اور مجید کو دیکھنے کے بعد اس کے ہونٹوں سے نحیف آواز نکلی۔ ”بیٹا! گھر جاؤ۔ وہ حملہ کریں گے۔۔۔۔ وہ ضرور حملہ کریں گے۔ سلیم بیٹا! تمہاری ماں نے مجھے تمہاری شادی کے لیے ایک انگوٹھی لانے کو کہا تھا۔ وہ میرے بٹوے میں ہے۔ ڈاکٹر شوکت کا گھر بھی ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اب وہ تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے لیکن سکھوں کو جاتے جاتے ضرور بتا جانا کہ تم مسلمانوں کی اولاد ہو۔ مجید خاندان کی عزّت بچانا۔ اب تم جاؤ، خدا کے لیے جاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ آندھی آنے سے پہلے گھر پہنچ جاؤ۔ سکھوں اور ہندوؤں کی دوستی پر بھروسہ نہ کرنا۔ وہ اس وقت تک تمہارے دوست تھے، جب تک انہیں تمہارا ڈر تھا۔ اب پاکستان کے سوا مسلمانوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ جانتے ہو سب سے پہلے میرے سینے پر گولی کس نے ماری تھی؟ وہ میرا ہم جماعت تھا۔۔۔ لیکن وہ ایک سکھ تھا۔ سکھ اسی طرح دوستی کا حق ادا کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں پاکستان مل گیا ہے۔۔۔۔ اب ہمیں کوئی نہیں مٹا سکتا۔۔۔“

علی اکبر کوئی پندرہ منٹ سلیم اور مجید سے باتیں کرتا رہا۔ سلیم محسوس کر رہا تھا کہ قدرت کوئی معجزہ کر چکی ہے۔ اس نے نرس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”نرس! ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اب طبیعت ٹھیک معلوم ہوتی ہے، شاید وہ آپریشن کر کے گولی نکال سکیں!“

نرس کو زخمی سے متعلّق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ اس کے خیال میں یہ بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لَو تھی۔ تاہم سلیم کے اصرار پر وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے چلی گئی۔

ڈاکٹر آیا تو سلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! ابّا جان ابھی ہم سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی لیکن یہ اچانک خاموش ہو گئے ہیں۔“

ڈاکٹر نے دل کی حرکت کا معائنہ کرنے کے بعد علی اکبر کی ایک آنکھ کھول کر دیکھی اور مغموم لہجے میں کہا۔ ”ان کا باتیں کرنا ایک معجزہ تھا۔ انجکشن دینے کے بعد مجھے تسلّی نہ تھی کہ یہ ہوش میں آکر آپ سے باتیں کر سکیں گے۔ مجھے افسوس ہے۔“

سلیم پتھّر کی مورتی کی طرح بے حس و حرکت کھڑا اپنے باپ کی لاش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش ہو جائیں گے اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔ مجید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سلیم نے اُس کی طرف دیکھے اور کچھ کہنے کی بجائے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ مجید کی آنکھوں سے آنسو اُبل رہے تھے لیکن سلیم کی آنکھیں خشک تھیں۔

شہر کے چند آدمی لاش کو چارپائی پر ڈال کر سلیم کے گاؤں پہنچانے کے لیے تیّار ہو گئے۔ وہ ابھی ہسپتال کے احاطے سے باہر نکلے تھے کہ فجّو سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اُس نے چند قدم دور گھوڑا روکتے ہوئے بُلند آواز میں کہا۔ ”سکھوں نے گاؤں پر دھاوا بول دیا ہے۔“

مجید نے چارپائی ایک درخت کے نیچے رکھوا کر ایک نوجوان کے ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ ”سلیم! تم یہیں رہو۔ میں جانتا ہوں۔“

سلیم نے دوسرے آدمی کے ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی باگ چھینتے ہوئے

کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا!“

”لیکن تم نہتے ہو!“

”ہم دونوں نہتے ہیں۔“ سلیم نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

مجید نے ایک عمر رسیدہ آدمی کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”حاجی صاحب! یہ لاش آپ کے پاس امانت ہے۔ اگر شام تک ہماری طرف سے کوئی اِطّلاع نہ آئے تو اسے دفن کرادیں۔“

بوڑھے حاجی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ”بہت اچھا بیٹا! تم جاؤ!“

مجید گھوڑے پر سوار ہو گیا تو ایک نوجوان نے بھاگ کر اُس کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے پاس کچھ نہیں، یہ لیجیے!“

مجید نے اُس کے ہاتھ سے ایک چھوٹا سا خنجر لے لیا۔ ایک اور نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میاں سلیم ٹھہریے! ایک چیز میرے پاس بھی ہے!“

نوجوان نے آگے بڑھ کر اپنی شلوار کا پائنچہ اُوپر اٹھایا اور اُن کے ساتھ رومال سے بندھا ہوا ایک چھوٹا سا ریوالور نکال کر سلیم کو پیش کیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو چند دِن قبل سلیم کے ساتھ لاہور سے سائیکلو اسٹائل مشین لینے کے لیے گیا تھا۔ ”یہ بھرا ہوا ہے، میں آپ کو اور گولیاں بھی دیتا ہوں۔“ نوجوان نے اپنی شلوار کے نیفے کے نیچے ہاتھ ڈال کر کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر سلیم کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اس میں چالیس گولیاں ہیں۔ آپ میرا خیال نہ کریں۔ میرے پاس ایک ریوالور فالتو تھا۔“

سلیم نے احسان مندانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ تھوڑی دور جاکر اس نے کہا۔ ”مجید ریوالور تم لے لو۔ مجھے وہ چھرا دے دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

”ابھی چلو! آگے چل کر دیکھا جائے گا۔“

مجید، سلیم اور فجّو نے گھوڑے سرپٹ چھوڑ دیے۔

☆☆☆☆☆

گاؤں کے ان چند مسلمانوں کے سوا جنہوں نے اپنے سکھ پڑوسیوں پر اعتماد کرنے کی غلطی کی تھی، باقی تمام اپنے بچّوں سمیت رحمت علی کی حویلی میں جمع ہو چکے تھے۔ حملہ آور ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہوئے رہائشی مکانات کے پچھواڑے سے کوئی سو گز کے فاصلے پر رُک گئے۔

جتھے دار نے بلونت سنگھ سے کہا۔ ”اب اس فوج کے سردار آپ ہیں۔ مجھے آج شام تک تمام علاقے کا چکر لگانا ہے۔ زیادہ بارود ضائع نہ کریں۔ شام تک مجھے آپ کی رپورٹ پہنچ جانی چاہیے!“

بلونت سنگھ نے کہا۔ ”شام تک آپ کو بہت اچھی رپورٹ ملے گی!“

”ہاں بھئی! اس گھر کے مال میں ہمارا بھی حصّہ ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں، ہم سب کچھ آپ کے پاس لے آئیں گے۔ آپ جس طرح چاہیں تقسیم کریں!“

"میرا مطلب خوبصورت مال سے ہے!"

"سردار جی! مجھے صرف ایک چاہیے! باقی سب آپ کی ہیں!"

جتھے دار نے اپنے مسلح ساتھیوں میں سے چار کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دے کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

بلونت سنگھ نے جتھے کو مختلف ٹولیوں میں تقسیم کرنے کے بعد ہدایات دیں۔ رہائشی مکانات کی بُلند دیواروں کے باعث اس طرف سے حملہ کرنا مشکل تھا۔ بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ رہائشی مکان کے دو وسیع دالان اور اس کے بعد باہر کی حویلی کے گودام اور مویشی خانے تھے۔ اس دیوار کے ساتھ ساتھ ایک تنگ گلی مویشیوں کی حویلی کے پھاٹک تک پہنچتی تھی۔ بلونت سنگھ نے ایک ٹولی کو گلی کے راستے اور دوسری ٹولی کو جوہڑ کے اوپر سے چکّر لگا کر سکھوں کے محلّے سے پھاٹک کی طرف سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔

پہلی ٹولی ابھی بالا خانے والے کونے سے چند قدم دور تھی کہ گلاب سنگھ

برچھی لیے گلی سے نمودار ہوا اور اُن کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہیں آگ نہیں لگانے دوں گا۔“ اُس نے بُلند آواز میں کہا۔ ”ہٹ جاؤ!“ ایک سکھ نے یہ کہہ کر اُس کی طرف اپنی رائفل سیدھی کر دی۔

”تمہیں آگے بڑھنے کے لیے میری لاش کے اوپر سے گزرنا پڑے گا!“

”یہ کون ہے؟“ بلونت سنگھ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اوہو گلاب سنگھ! آخر اپنے باپ کے بیٹے نکلے؟“

گلاب سنگھ نے اسے جواب دینے کی بجائے اپنی برچھی اُس کی طرف سیدھی کر دی۔ بلونت نے دو تین قدم پیچھے ہٹ کر اپنی رائفل سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری یہ جرأت!“

موہن سنگھ بھی اپنا پستول اس کی طرف سیدھا کر چکا تھا لیکن گاؤں کے چند سکھ بیچ میں آپڑے اور انہوں نے بلونت سنگھ کو سمجھایا کہ اگر اس نے اِندر سنگھ کے پوتے پر ہاتھ اٹھایا تو گاؤں کے بہت سے سکھ بگڑ جائیں گے۔ ابھی تکرار ہو رہی تھی کہ اِندر سنگھ لاٹھی ٹیکتا ہو گلی سے نمودار ہوا۔ اس

کے پیچھے گلاب سنگھ کے چچا اور گاؤں کے چند سکھ تھے۔ یہ سب برچھیوں اور کرپانوں سے مسلح تھے۔ اِندر سنگھ نے قریب پہنچ کر کہا۔ ”گلاب، سنگھ ہٹ جاؤ، ان کا راستہ مت روکو۔“

گلاب سنگھ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ اس کے گاؤں کے بعض سکھ بھی جو جتھے کے ساتھ آئے تھے، حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

گلاب سنگھ نے اپنے دادا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بابا جی! یہ ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے آئے ہیں۔“

اِندر سنگھ نے کہا۔ ”یہ سکھوں اور مسلمانوں کی لڑائی ہے۔ آج تک مجھے یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ میں رحمت علی سے ڈرتا ہوں لیکن آج کے بعد مجھے یہ طعنہ کوئی نہ دے سکے گا!“

”بابا ہم نے گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے اور آپ نے بابا رحمت علی کو اپنا بھائی بنایا تھا۔“

"آج وہ بھائی چارا ٹوٹ چکا ہے۔ آج میں ایک سکھ ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مکان کی چھت کی طرف دیکھا اور بُلند آواز میں پکارا۔ "رحمت علی! تمہارے گھر میں بارات آئی ہے، چھُپ کیوں گئے، باہر آؤ!"

چوہدری رحمت علی چند آدمیوں کے ساتھ چھت کی منڈیر کی آڑ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اِندر سنگھ کی آواز سُن کر فوراً اُٹھا اور منڈیر کے پاس جا کھڑا ہوا۔۔۔۔۔۔ بالاخانے کی چھت سے افضل نے آواز دی۔ "ابّا جان بیٹھ جاؤ! پیچھے ہٹ جاؤ، ان کے پاس بندوقیں ہیں؟"

اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ میں نے کسی سے بُرائی نہیں کی۔ مجھے بات کرنے دو!"

منڈیر چھت سے ایک گز اُونچی تھی۔ رحمت علی کا چھوٹا بھائی سر جھکا کر چلتا ہوا آگے بڑھا اور منڈیر کے قریب گھٹنوں کے بل ہو کر رحمت علی کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ بھائی جان!"

رحمت علی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور نیچے جمع ہونے والے سکھوں کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ ہم نے تمہارے گھروں پر پہرہ دیا ہے۔ تم نے گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے۔۔۔ ہم نے تمہارے ساتھ کبھی دھوکا نہیں کیا۔ ہم نے تمہاری بہو بیٹیوں کو۔۔۔۔“

وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ ایک سکھ نے نیچے سے بندوق چلا دی۔ گولی رحمت علی کے سر میں لگی اور وہ منڈیر پر ِگر پڑا۔ اس کا سینہ منڈیر پر اور بازو باہر کی طرف لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے بھائی نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ بلونت سنگھ نے رائفل کے ساتھ یکے بعد دیگرے دو فائر کئے اور وہ زخمی ہو کر پیچھے ِگر پڑا۔ نیچے گلاب سنگھ نے برچھی کے ساتھ بلونت سنگھ پر حملہ کیا لیکن موہن سنگھ نے اچانک پستول چلا دیا اور وہ سینے پر گولی کھا کر ِگر پڑا۔ اِندر سنگھ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی اور وہ ایک چیخ مار کر پوتے کی لاش پر ِگر پڑا۔ بالا خانے سے افضل نے یکے بعد دیگر کئی فائر کئے اور تین سکھ زخمی ہو کر ِگر پڑے۔ سکھ بد حواس ہو کر پیچھے ہٹنے لگے اور افضل نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ نیچے حویلی کی دوسری طرف جمع ہونے والے

مسلمانوں نے بُلند آواز میں اللہ اکبر کہا۔

سکھ پستول کی گولیوں کی زد سے دور ہٹ کر اندھا دھند بالا خانے اور چھت پر گولیاں برسا رہے تھے۔ رحمت علی کا آدھا دھڑ جو منڈیر سے باہر لٹک رہا تھا، گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی نے سیڑھیوں پر چڑھ کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بے اختیار دوڑتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور منڈی کے قریب پہنچ کر ایک گولی اس کے سینے اور دوسری سر میں لگی اور وہ گرتے گرتے اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ آدمی جو مکان کے اس حصّے کی حفاظت پر متعیّن تھے، اس کی آمد سے اس وقت باخبر ہوئے جب وہ اپنے شوہر کے قریب پہنچ کر گولیوں سے زخمی ہو چکی تھی۔

سلیم کی بہن زبیدہ چھت پر چڑھی لیکن اچانک بالا خانے سے افضل نے اُسے دیکھ لیا اور وہ پوری طاقت سے چلّایا۔ ”زبیدہ آگے مت جاؤ، ہٹ جاؤ۔۔۔“

زبیدہ تذبذب کی حالت میں کھڑی تھی کہ اُس کی ماں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ افضل نے پھر کہا ”بھابی کسی کو اوپر مت آنے دو۔

عورتوں اور بچّوں کو دالان میں بٹھا کر دروازہ بند کر لو۔"

ایک نوجوان نے گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر رحمت علی اور اس کی بیوی کی لاشیں منڈیر سے اُتار کر نیچے لٹا دیں۔

بلونت سنگھ کی تجویز کے مطابق سکھ دو حصّوں میں تقسیم ہو کر آگے بڑھے۔ وہ گروہ جو گنّوں کے کھیتوں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھا تھا، کی دقّت کا سامنا کیے بغیر حویلی کے پھاٹک کی طرف جا نکلا لیکن دوسری ٹولی گلی میں داخل ہوئی تو چھت سے اینٹوں کی بارش ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی افضل نے بالا خانے سے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ چار آدمی پستولوں کی گولیوں اور پندرہ بیس اینٹوں سے زخمی ہو کر گِر پڑے۔ اور باقی اُلٹے پاؤں بھاگ نکلے۔

بلونت سنگھ نے انہیں بھی گنّوں کے کھیت سے گزر کر جوہڑ کے کنارے کنارے دوسری طرف پہنچنے کا حکم دیا۔

☆☆☆☆☆

گاؤں کے جنوب میں گنّوں کے آٹھ دس کھیت ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ مجید نے سیدھا گاؤں کا رُخ کرنے کی بجائے ان کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی کھائی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔

ایک کھیت کے کونے میں پہنچ کر مجید گھوڑے سے اُتر پڑا اور باگ پکڑ کر بھاگتا ہوا کھیت کے اندر داخل ہو گیا۔ سلیم اور فجّو نے اس کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر میں وہ کھیت کے درمیان بیری کے ایک درخت کے نیچے پہنچ چکے۔ گھوڑوں کو درخت کے ساتھ باندھ کر انہوں نے گاؤں کا رُخ کیا۔ گاؤں سے بندوقوں اور رائفلوں کی آوازوں کے ساتھ اللہ اکبر اور ست سری اکال کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ کھیت کے دوسرے کنارے پہنچ کر وہ ایک تنگ پگڈنڈی پر بھاگنے لگے۔ گاؤں کے قریب انہوں نے پگڈنڈی چھوڑ دی اور گنّوں کے دو کھیتوں کے درمیان منڈیر پر ہو لیے۔ کوئی چالیس قدم چلنے کے بعد مجید نے مُڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ دس پندرہ قدم اور چلنے کے بعد رُک گیا اور اس کے ساتھی بھی اس کے قریب کھڑے ہو گئے۔ یہاں سے گیت

کے سِرے پر شیشم اور کیکر کے درختوں کی قطار دکھائی دے رہی تھی۔ مجید نے آہستہ سے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو!“

مجید نے ابھی پانچ چھ قدم ہی اٹھائے تھے کہ کسی کی آواز سنائی دی۔ ”سیٹھ رام چند! میرا بارود بلونت سنگھ نے لے لیا ہے۔“

”بلونت سنگھ کا اپنا تھیلا بھرا ہوا تھا، وہ ختم ہو گیا؟“ وہ چند آدمیوں کو لے کر مسجد کے اوپر چڑھا ہے، وہاں سے خوب نشانے لگیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں فیصلہ ہو جائے گا۔ ارے کندن لال! تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔ جاؤ۔ اس طرف کون آئے گا؟“

”خطرے تو ہے نا سردار جی!“

”یہاں کون آئے گا؟ چلو اُس طرف تماشا دیکھو۔“

سیٹھ رام چند نے کہا۔ ”نہیں سردار جی، ادھر آ جانا آپ جیسے سورماؤں کا کام ہے۔ ہم پکڑیاں کھانے والے ہیں۔ ہم اِدھر سے کبھی کبھی فائر کر دیتے ہیں۔ نشانہ لگے یا نہ لگے، کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ ان کے کچھ

آدمی اِدھر بٹے ہوئے ہیں۔ بلونت سنگھ نے بھی ہمیں کہا تھا تم یہیں رہو۔ آپ بھی بیٹھ جائیں سردار جی! یہ مُٹھّی بھر مسلمان کب تک لڑیں گے۔ بھگوان کی کرپا سے بیس پچیس مسلوں کے لیے تو آپ کا لڑکا ہی کافی ہے!"

مجید نے مُڑ کر اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پھر زمین پر لیٹ کر گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ کھیت کی منڈیر پر درختوں کے درمیان جنگلی بوٹیاں اور بیلیں اُگی ہوئی تھیں اور منڈیر سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر شیشم کے درخت کے سائے میں سیٹھ رام چند، کندن لال اور چرن سنگھ کھڑے تھے۔ تینوں کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ رام چند اپنے تھیلے سے کارتوس نکال کر چرن سنگھ کو دے رہا تھا۔ مسجد کی طرف سے یکے بعد دیگرے آٹھ دس فائر ہوئے اور چرن سنگھ نے کہا۔ "دیکھا بلونت سنگھ نے فائرنگ شروع کر دی۔" رام چندر نے کہا۔ "یار! اس کا بھائی بڑا بودا نکلا۔"

"یار! بہادر تو یہ بھی نہیں۔ نرا دِکھاوا ہی ہے۔ اصل میں اس کی آنکھ رحمت علی کی پوتی پر ہے؟"

رام چند نے چونک کر کہا۔ ”کس پر، سلیم کی بہن پر؟ ارے یار وہ تو تمہارے موہن کو ملنی چاہیے۔ میری کوشلیا اس کی بڑی تعریف کیا کرتی ہے۔“

چرن سنگھ نے کہا۔ ”اچھا دیکھا جائے گا۔ میں جاتا ہوں لیکن بھائی تمہارے پاس دو رائفلیں اور ایک پستول بے کار پڑا ہے، ایک رائفل مجھے دے دو۔ میں کسی اور کو دے دوں گا۔“

”دیکھو سردار جی! میں نے آپ کو تین رائفلیں لا کر دی ہیں۔ مجھ سے یہ نہ لو۔ شاید مجھے بھی کوئی نشانہ لگانے کا موقع مل جائے!“

مجید نے پستول نکال کر منڈیر پر سے کودتے ہوئے کہا۔ ”ہتھیار پھینک دو! ہاتھ اٹھالو، ہلو مت!“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے چرن سنگھ پر پستول کا فائر کر دیا۔ چرن سنگھ کے سر میں گولی لگی اور گرتے وقت اس کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی۔ رام چند اور کندن لال کے ہاتھوں سے رائفلیں گِر پڑیں۔ سلیم اور فجّو پہلوان نے دوڑ کر تینوں رائفلیں اُٹھا لیں۔ مجید نے اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں اِدھر آؤ، جلدی کرو!“

رام چند اور اس کا بیٹا مجید کے پستول کے اشارے پر منڈیر عبور کر کے گنّوں کے کھیت میں پہنچ گئے۔ سلیم نے رام چند کا پستول اور بارود کا تھیلا اُتار لیا اور فجّو نے کندن لال کے گلے سے تھیلا اُتار لیا۔

رام چند نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”صوبیدار جی! بھگوان کی قسم ہم نے انہیں منع کیا تھا لیکن ہماری کون سنتا ہے۔“

مجید نے کہا۔ ”ذرا آگے چلو اور بکواس مت کرو!“

”ہم پر دِیا کرو، مہاراج! ہم نے کچھ نہیں کیا۔“

مجید نے کہا۔ ”ہم تمہیں ایک شرط پر چھوڑنے کے لیے تیّار ہیں!“

رام چند نے گھگھیا کر کہا۔ ”مہاراج! مجھے جو کہیں میں کرنے کے لیے تیّار ہوں۔“

مجید نے کہا۔ ”ہمیں آدھ گھنٹے کے اندر تین اور رائفلوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں ہر رائفل کے ساتھ پانچ سو گولیاں بھی جائیں۔ تمہارا لڑکا ہمارے پاس رہے گا۔ اگر یہ سامان ہمیں آدھ گھنٹے تک نہ پہنچا تو کندن لال کو گولی

مار دی جائے گی!"

مہاراج! میرے پاس دو رائفلیں اور ہیں لیکن وہ گھر میں ہیں۔ کارتوس میں آپ کو زیادہ بھی دے سکتا ہوں لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ آپ میرے بیٹے کو گولی نہیں ماریں گے؟"

"تمہاری مرضی ہے تو ہم پر یقین کرو ورنہ ہم تمہارے سامنے اِسے گولی مارتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے مجید نے کندن لال کی طرف پستول سیدھا کر دیا۔ رام چند نے کہا۔ "مہاراج! مجھے تم پر یقین ہے۔ چودھری رحمت علی کا پوتا جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا لیکن میں آدھ گھنٹے میں اتنا سامان لے کر کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ مجھے زیادہ وقت دیجئے۔ میں گھوڑے پر واپس آجاؤں گا لیکن آدھ گھنٹہ صرف مجھے وہاں پہنچنے کے لیے چاہیے!"

مجید نے کہا۔ "بہت اچھا! میں تمہیں پینتالیس منٹ دیتا ہوں۔ تم گھوڑے پر سامان لاد کر لاؤ اور اس کھیت کی دوسری طرف شیشم کے درخت کے

نیچے پہنچ کر گھوڑا ہمارے آدمی کے حوالے کر دو۔ اگر تم نے کوئی شرارت کی تو یقین رکھو کہ تمہارا بیٹا تمہیں نہیں ملے گا!"

"مہاراج! جب سامان سے لدا ہوا گھوڑا آپ کو مل جائے گا تو آپ کندن لال کو چھوڑ دیں گے؟"

مجید نے چلّا کر کہا۔ "بدمعاش میرا وقت ضائع نہ کرو۔ کندن لال کو ہم اس وقت چھوڑیں گے جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تم نے کوئی شرارت نہیں کی، ابھی بھاگو، اگر کوئی اور بات کی تو تم دونوں کو گولی مار دوں گا!"

رام چند ماہ سے نکل کر بھاگا لیکن منڈیر عبور کر کے اس نے پھر ایک بار مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! اپنی گھڑی پر وقت دیکھ لیں!"

"بے ایمان جلدی کرو!"

سیٹھ رام چند زندگی میں پہلی بار اپنی پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا اور ہر قدم پر اس کے منہ سے یہ آوازیں نکل رہی تھیں "ہائے بھگوان! یہ کیا ہوا۔ مجھے اکھنڈ ہندوستان کی ضرورت نہیں۔۔۔ مجھے رام راج نہیں

چاہیے۔۔۔ مجھے صرف اپنا بیٹا چاہیے۔۔۔ دو ہزار پینتالیس سو سیکنڈ۔۔۔ ایک، دو، تین، چار۔۔۔ وہ گنتا جا رہا تھا۔

سلیم، فجّو پہلوان کی پگڑی کے ساتھ کندن لال کے ہاتھ باندھ چکا تھا۔ مجید نے فجّو کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”چچا فجّو! تم اسے بیری کے نیچے لے جاؤ۔ اگر یہ ہلے یا بولے تو تم بڑی آسانی کے ساتھ اِس کی گردن مروڑ سکو گے۔ وہاں جا کر اِسے درخت کے ساتھ اچھی طرح باندھ دینا۔ اس کی قمیص کا ٹکڑا اپھاڑ کر اِس کے منہ میں ٹھونس کر اوپر سے باندھ دینا تاکہ یہ شور نہ مچا سکے۔

”آپ فکر نہ کریں، میں اسے اس طرح باندھوں گا کہ نانی یاد آ جائے گی؟“

”شاباش! پھر کوئی اپنے گھنٹے کے بعد تم اس شیشم کے درخت کے پاس چھُپ کر اس کے باپ کا انتظار کرو۔ اس بات کی تسلّی کر لینا کہ اس کے ساتھ کوئی نہ ہو۔ پھر گھوڑے سامان اُتار کر شیشم کے درخت کے دائیں طرف پانچ قدم دور۔۔۔ اس کے بعد رام چند کو اس کے بیٹے کے پاس لے

جانا۔ ہاں اُس کی تلاشی ضرور لے لینا۔ پھر اسے بھی باندھ کر تم وہیں بیٹھے رہو۔ بس اب تم اسے لے جاؤ۔ سلیم سے خنجر لے لو، شاید تمہیں ضرورت پڑے اور گھوڑوں کی زینیں اور لگامیں اُتار کر انہیں کھلا چھوڑ دو!"

سلیم نے کہا۔ "مجید وقت جا رہا ہے!"

مجید بولا۔ "لڑائی نہیں، ایک طویل جنگ ہے سلیم، خدا معلوم فیصلہ کب ہو اور کہاں ہو؟ ابھی ابتدا ہوئی ہے۔ ہمیں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔"

سلیم نے کہا۔ "ہمارا رائفلیں لے کر اندر پہنچنا ضروری ہے!"

"میں دیکھتا ہوں، اگر اس طرف چھت پر کوئی نظر آ گیا تو کم از کم رائفلیں تو پہنچا سکیں گے۔" مجید یہ کہہ کر کماد کے کھیت کی منڈیر کے پاس جامن کے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اچانک وہ یہ کہتا ہوا تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگا۔ "سلیم! وہ باہر کی حویلی میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس طرف ہمارا

کوئی آدمی نہیں!"

بندوقوں اور رائفلوں کی تڑ تڑ اور سکھوں اور مسلمانوں کے ساتھ کے عورتوں اور بچّوں کی چیخیں بھی سُنائی دے رہی تھیں۔

سلیم ایک رائفل اور کارتوسوں کا تھیلا اُٹھا کر بھاگنے کو تھا کہ مجید نے "ٹھہرو! ٹھہرو!!" کہتے ہوئے اوپر سے چھلانگ لگا دی اور اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ "اگر تم سمجھتے ہو کہ تم ایک ہزار آدمیوں میں گھُس کر انہیں ہانک دو گے تو تم پاگل ہو۔ ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہے میرے ساتھ آؤ!"

مجید اور سلیم رائفلیں اور تھیلے اُٹھا کر کھیت کے کنارے اور درختوں کی آڑ میں بھاگتے ہوئے دوسرے کونے میں آم کے درخت کے قریب پہنچے۔ مجید نے دو رائفلیں ایک گھنی جھاڑی کے نیچے چھپاتے ہوئے کہا۔ "سلیم! تم آپ پر چڑھ جاؤ، میں مسجد کی چھت پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مسجد کی پچھلی طرف سیڑھی لگی ہوئی ہے، اگر کوئی مجھے دیکھ کر سیڑھی کی طرف بڑھا تو فائر کر دینا، ورنہ اس وقت تک فائر نہ کرو جب تک کہ میں ہاتھ سے اشارہ نہ کروں۔"

☆☆☆☆☆

جب تک مسجد کی چھت سے فائر شروع نہیں ہوئے تھے، حویلی میں پناہ لینے والے مُٹھّی بھر مسلمانوں کی لاٹھیاں اور برچھیاں کئی بار بیرونی دیوار پھاندنے اور پھاٹک توڑنے والے حملہ آوروں کے دانت کھٹّے کر چکی تھیں۔ ایک ٹولی نے گلی کی طرف سیڑھی لگا کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن افضل نے بالا خانے سے فائر کر کے انہیں بھگا دیا۔ سکھوں نے پہلی بار پھاٹک توڑنے کی کوشش کی تو اندر سے اینٹوں کی بارش میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بعد دیوار پھاندنے کی کوشش کرنے والوں کو لاٹھیوں اور برچھیوں سے روکا گیا تو حملہ آوروں نے پیچھے ہٹ کر رائفلوں کے ساتھ پھاٹک پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ کئی آدمی جو اندر سے پھاٹک کو بند رکھنے کے لیے زور لگا رہے تھے، زخمی ہو کر ایک طرف ہٹ گئے۔ حملہ آوروں کی ایک ٹولی نے آگے بڑھ کر دروازے کو دھکا دیا اور لوہے کی مضبوط کنڈی ٹوٹ جانے سے پھاٹک کھل گیا۔ اب دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔

افضل اپنے پستول کی آخری گولی چلانے کے بعد تلوار اُٹھا کر باہر کی حویلی میں پہنچ چکا تھا۔ آس پاس کی چھتوں پر پہرہ دینے والے باقی نوجوانوں نے بھی نیچے کود کر حملہ کر دیا۔ چھروں، چاقوؤں، برچھیوں اور لاٹھیوں کی لڑائی میں سکھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور کوئی دس منٹ کی لڑائی میں تیس لاشیں چھوڑ کر الٹے پاؤں باہر نکل گئے۔ اس نقصان کے بعد کسی کو پھاٹک یا دیوار کے قریب جانا پسند نہ تھا۔ مسلمانوں نے پھاٹک دوبارہ بند کر لیا اور ایک چھکڑا دھکیل کر ساتھ کھڑا کر دیا۔ افضل نے سکھوں کی دو لاشیں گھسیٹ کر پہیّوں کے آگے رکھ دیں اور اس کے اشارے پر دوسروں نے باقی زخمی اور مردہ سکھوں کو اُٹھا کر چھکڑے کے نیچے اور اُوپر ڈال دیا۔ مسلمان اب دیوار کے ساتھ کھڑے دوسرے حملے کا انتظار کر رہے تھے لیکن سکھ اب پیچھے ہٹ کر صرف نشانہ بازی کر رہے تھے۔

چند نوجوانوں نے زخمیوں کو اُٹھا کر گھر کے دالان میں عورتوں اور بچّوں کے پاس پہنچا دیا۔

بندوقوں اور رائفلوں کی ٹھکا ٹھک اچانک بند ہو گئی اور سکھوں کی آوازیں

سنائی دینے لگیں۔ افضل نے کہا۔ ”اسماعیل تم بالا خانے پر جاؤ۔ اگر ادھر سے کوئی حملہ ہوا تو اطلاع دو!“

اسماعیل بھاگا۔ گھر کے مکان کا صحن عبور کرنے کے بعد وہ مکان کی نچلی چھت سے ہوتا ہوا بالا خانے کی سیڑھی پر چڑھا۔ ابھی وہ سیڑھی کے درمیان میں تھا کہ بیک وقت رائفلوں اور بندوقوں کے تین چار فائر ہوئے، ایک گولی اس کی کمر، دوسری بازو اور تیسری ٹانگ میں لگی۔ لیکن وہ گرتا، سنبھلتا اور لڑھکتا ہوا اوپر چڑھ گیا اور بالا خانے کی آخری سیڑھی پر منہ کے بل گِر پڑا۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔ چھت کے ایک کونے میں پاکستان کا جھنڈا ابھی تک لہرا رہا تھا جو ۱۴ اگست کو نصب کیا گیا تھا۔

بالا خانے کی منڈیر پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ چند گولیاں جھنڈے کے بانس میں لگیں اور وہ درمیان سے ٹوٹ کر اسماعیل کے اوپر گِر پڑا۔ اسماعیل ٹوٹا ہوا جھنڈا پکڑ کر پیٹ کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ منڈی کے قریب پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل اُٹھا اور پھر ایک ہاتھ سے منڈیر کا سہارا

لے کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے ہاتھ سے جھنڈے کو اپنے سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے پکارا۔ "پاکستان زندہ باد! پاکستان زندہ باد! پاکستان۔۔۔" ایک گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ جھنڈے سمیت منہ کے بل گر پڑا۔ سبز جھنڈے پر سفید چاند اور ستارے کا نشان اس کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

رائفلوں اور بندوقوں سے مسلح ٹولی کے مسجد کی چھت پر پہنچ جانے سے مویشیوں کی حویلی کا صحن اور گھر کے مکانات کی چھتیں گولیوں کی زد میں آ چکی تھیں۔ اسماعیل کے گرتے ہی بلونت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے حویلی کے صحن میں جمع ہونے والوں پر گولیاں برسائی شروع کر دیں۔ دو منٹ کے اندر اندر پندرہ آدمی زخمی ہو کر گر پڑے۔ چند آدمی بدحواس ہو کر مویشیوں کے کمرے میں گھُس گئے اور باقی افضل کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ بلونت سنگھ نے نیچے جمع ہونے والوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور انہوں نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ یہ حملہ

دوسرے حملوں کی نسبت کہیں زیادہ منظّم اور شدید تھا۔ بیس پچیس آدمیوں نے ایک دم ساتھ آگے بڑھ کر پھاٹک کو دھکا دیا۔ پیشتر اس کے کہ لوگ مزاحمت کے لیے آگے بڑھتے چھکڑا لاشوں کے ڈھیر سمیت اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ کواڑ کھل گئے اور حملہ آوروں کا ایک گروہ نعرے لگاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ دوسرا گروہ جسے گاؤں کے سکھوں نے سیڑھیاں مہیّا کی تھیں گلی کی طرف سے مکانوں کی چھتّوں پر چڑھ گیا۔ اس گروہ کے ساتھ تین آدمی بارہ بور کی بندوقیں لیے ہوئے تھے۔

مسلمان اب زندگی کی نسبت موت کو زیادہ قریب سمجھ کر لڑ رہے تھے۔ ایک طرف صحن میں کرپانوں اور برچھیوں کے ساتھ حملہ کرنے والوں سے اُن کی دست بدست لڑائی تھی اور دوسری طرف مسجد اور مکانوں کی چھتّوں سے بندوقوں والے ان پر تاک کر نشانے لگا رہے تھے۔ بارہ بور کے چھروں سے مسلمانوں کے ساتھ چند سکھ بھی زخمی ہو گئے۔ اس لیے انہوں نے فائر بند کر دیا لیکن مسجد سے رائفلوں کے فائر بدستور ہوتے رہے۔

بلونت سنگھ مسجد کی چھت پر کھڑا نعرے لگا رہا تھا۔ ”شاباش بہادرو! اب قلعہ فتح ہو چکا ہے۔ کسی کو مت چھوڑو! عورتوں کو نکالو اور مکانوں کو آگ لگا دو۔ شاباش!“

اچانک اس کی پیٹھ پر گولی لگی اور وہ ایک چیخ مار کر سر کے بل چھت سے پندرہ فٹ نیچے آ گرا۔ اس کے ساتھ جو بیٹھ کر فائر کر رہے تھے۔ اچانک کھڑے ہو گئے اور جھک کر نیچے دیکھنے لگے۔ وہ ایک دوسرے سے اپنے لیڈر کے گرنے کی وجہ پوچھ رہے تھے کہ پیچھے سے رائفل چلنے کی آواز آئی اور یکے بعد دیگرے دو اور آدمی زخمی ہو کر گر پڑے۔ باقی تین اچانک منہ کے بل لیٹ گئے۔

موہن سنگھ اپنے ساتھیوں سے پوچھ رہا تھا۔ ”یہ گولیاں کہاں سے آئیں؟“

مجید منڈیر کے قریب سے سر نکال کر جھانکنے کے بعد اچانک چھت پر چڑھ گیا۔ اس پر کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ اس نے کسی توقّف کے بغیر دس گولیاں چلا دیں اور چھت پر لیٹنے والوں میں سے کسی کو اُٹھنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے بعد اُس نے ایک رائفل اُٹھالی اور حویلی کی طرف

حملہ کرنے والوں پر فائر شروع کر دیے۔ اس کی پہلی گولیاں ان دو سکھوں کے سینوں پر لگیں جو مویشیوں کے کمرے کی چھت پر بندوقیں لیے کھڑے تھے۔ ایک رائفل کا میگزین خالی ہوا تو اس نے دوسری اُٹھا لی۔ اتنی دیر میں زخمیوں میں سے ایک سکھ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجید نے اچانک اس پر فائر کر دیا۔ ایک اور سکھ ہل رہا تھا مجید نے اُس کے سر میں بندوق کا کندھا مارا اور وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

اس کے بعد وہ ایک مشین کی سی پھرتی کے ساتھ حملہ آوروں پر فائز کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں سلیم درخت سے اُتر کر اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے چھت پر چڑھتے ہی بانس کی سیڑھی اوپر کھینچ لی اور مجید کے قریب بیٹھ کر فائر شروع کر دیے۔ بارود کی کمی نہ تھی۔ دو تھیلیوں کے علاوہ جو انہوں نے کندن لال اور رام چند سے چھینے تھے، چھ سکھوں کے بھرے ہوئے تھیلے بھی اُن کے قبضے میں آ چکے تھے۔ سکھوں میں افراتفری مچ گئی۔

مجید نے سلیم سے کہا۔ ”سلیم! تم صرف دروازے سے باہر نکلنے والوں پر فائر کرو۔ حویلی میں تمہاری گولی کسی اپنے آدمی کو لگ جائے۔“ کوئی پندرہ

منٹ میں حویلی کے پھاٹک سے اندر اور باہر ڈیڑھ سو سکھ ڈھیر ہو چکے تھے اور باقی بے تحاشا اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

سکھوں کی ایک ٹولی جو گلی سے سیڑھیاں لگا کر رہائشی مکانوں کی چھتّوں پر پہنچ چکی تھی، اب صحن میں داخل ہو کر دالان کے دروازے توڑنے کی کوشش کر رہی تھی، جہاں عورتوں اور بچّوں کے علاوہ زخمی پڑے ہوئے تھے۔

مویشیوں کی حویلی سے بھی بعض سکھوں نے گولیوں کی بوچھاڑ میں پھاٹک کے راستے باہر آنے کی بجائے اندر کا رُخ کیا اور رہائشی حویلی کے صحن میں پہنچ گئے۔ وہ دو حویلیوں کے درمیان ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنا چاہتے تھے لیکن افضل کو بروقت اس نئے خطرے کا احساس ہوا اور اس نے بھاگ کر پوری قوّت کے ساتھ ایک کواڑ اندر کی طرف دھکیل دیا۔ ایک سکھ جو اندر سے کنڈی لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند قدم دور پیٹھ کے بل جا گرا۔ افضل ڈیوڑھی میں داخل ہو کر سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ سکھ اس پر ٹوٹ پڑے۔ ایک برچھی اس کی ران اور دوسری اس کے پیٹ میں لگی۔

دوسری برچھی کی نوک ریڑھ کی ہڈی کے قریب باہر نکل آئی۔ افضل نے بائیں ہاتھ سے برچھی کا دستہ پکڑتے ہوئے دائیں ہاتھ سے حملہ آور کے سینے میں اپنی برچھی مار دی۔ وہ پیٹھ کے بل گر پڑا اور فضل لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔

سکھ "گھیر لو، پکڑ لو، مار ڈالو۔" کہتے ہوئے اس کے گرد جمع ہو گئے اور وہ انہیں ایک ہاتھ سے دور رکھنے اور دوسرے ہاتھ سے پیٹ میں پھنسی ہوئی برچھی کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں باقی مسلمان وہاں پہنچ گئے۔ غلام حیدر نے یکّے بعد اپنی تلوار سے دو سکھوں کو مار گرایا۔ بشیر نے ایک کو اپنی کلہاڑی سے چت کر دیا۔ باقی سکھ ڈیوڑھی سے بھاگ کر صحن میں جمع ہونے والے جتھّے سے جا ملے۔ سکھوں کی تعداد یہاں بھی بچے کھُچے مسلمانوں سے تین گُنا زیادہ تھی۔ یہ صحن سلیم اور مجید کی گولیوں کی زد سے محفوظ تھا۔ لڑنے والے مسلمانوں میں سے اب بہت کم ایسے تھے جو زخمی نہ تھے۔ تاہم عورتوں اور بچّوں کی حفاظت کے لیے وہ جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔ افضل نے آخری بار ہمّت کی اور ایک گرے ہوئے

سکھ کی تلوار اُٹھا کر ڈیوڑھی سے نکلا اور صحن میں ایک دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دو سکھ پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے قریب آ گئے اور اس نے یکّے بعد دیگرے دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد اس کی ہمّت جواب دے گئی اور وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ شیر سنگھ کے بھائی نے آگے بڑھ کر اس کے سر میں کرپان مار دی اور چلّایا۔ ”میں نے افضل کو ختم کر دیا ہے۔ میں نے افضل کو۔۔۔۔“ بشیر نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر کلہاڑی ماری اور وہ افضل کے پاس گر کر تڑپنے لگا۔

افضل سے گرنے سے سکھوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ جم کر لڑنے لگے۔ اچانک مجید دونوں ہاتھوں میں پستول لیے ڈیوڑھی کے راستے بھاگتا ہو صحن میں داخل ہوا۔ اس نے یکّے بعد دیگرے دونوں پستولوں سے چند فائر کیے۔ ہری سنگھ دالان کے دروازے پر پٹرول چھڑک رہا تھا، ایک گولی اس کی پیٹھ ہر لگی اور وہ گر پڑا۔ باقی سکھ صوبیدار آ گیا کہتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مجید صحن سے گزر کر سیڑھی کے درمیان کھڑا ہو گیا اور سکھوں پر تاک تاک کر نشانے لگانے لگا۔ سکھ انتہائی بدحواسی کی

حالت میں ایک دوسرے کو دھکیلتے، گراتے اور پاؤں تلے روندتے ہوئے ڈیوڑھی کے راستے مویشیوں کی حویلی میں آ گئے۔ یہاں سے باہر کا پھاٹک عبور کرتے وقت ان میں سے جو سلیم کی گولیوں کا نشانہ بن گئے اور باقی سکھوں کے محلے کی طرف بھاگ گئے۔ چار سو کے قریب سکھ جنہوں نے مسجد کی چھت پر مجید اور سلیم کا قبضہ ہوتے ہی میدان چھوڑ دیا تھا، سکھوں کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر اپنے باقی ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ گاؤں کی سکھ عورتیں بھی اپنے اپنے کوٹھوں پر کھڑی سینوں پر دوہتڑ مار مار کر مسلمانوں کو گالیاں دے رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

اس عرصہ میں گاؤں کے دوسرے حصّوں میں بھی چند المناک واقعات پیش آ چکے تھے۔ بعض مسلمانوں نے حملے کے وقت اپنے سکھ پڑوسیوں کے ہاں پناہ لی تھی۔ حملہ آور پسپا ہو کر سکھیوں کے محلے میں جمع ہوئے تو گاؤں کے بعض سکھ انہیں یہ کہہ کر اپنے گھروں میں لے گئے کہ انہوں نے شکار گھیر رکھا ہے۔ گھرے ہوئے شکار پر طاقت آزمائی ان کے لیے

کوئی مشکل کام نہ تھا۔ پیراں دِتّہ چوکیدار نے اپنے پڑوس عطر سنگھ کے ہاں پناہ لی تھی۔ پیراں دِتّہ کے تین لڑکوں کو قتل کر دیا گیا اور اسے جب تک زندہ رکھا گیا جب تک اس کی لڑکی کی چیخیں اور سسکیاں اُکھڑی اُکھڑی سانسوں میں تبدیل نہ ہوئیں۔ وہ بیری کے درخت کے ساتھ بندھا ہوا چلّا رہا تھا۔ ”مجھے مار ڈالو، خدا کے لیے مجھے مار ڈالو، میں یہ نہیں سیکھ سکتا۔ میری آنکھیں نکال دو، اسے چھوڑ دو، دیکھو! اب وہ مر چکی ہے۔“

مہر دین جولاہا شہر کے کارخانے میں ایک مزدور تھا۔ حملے سے ایک دِن قبل اسے اپنے ماموں کے فوت ہو جانے کی اِطّلاع ملی تھی اور وہ اس کی فاتحہ خوانی کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بیلا سنگھ کی بیوی اس کے بال بچّوں کو اپنے گھر لے گئی تھی۔ سہ پہر کے وقت شکست خوردہ سکھ گاؤں سے مشرق کی طرف آموں کے باغوں میں جمع ہو رہے تھے۔ مہر دین واپس آ گیا۔ اپنے گھر پہنچنے کے لیے اسے باغ میں سے گزرنا تھا لیکن سکھوں کا ہجوم دیکھ کر وہ سائیں اللہ رکھے کے تکیے کی طرف ہو لیا۔ اللہ رکھا کی لاش آم کے اس درخت کے ساتھ لٹک رہی تھی جس کی گٹھلی

اس نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی۔ اس کی کوٹھری کے دروازے کے سامنے دو اجنبی آدمیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ مہر دین اپنے راستے میں مسلمانوں کے ایک گاؤں کو جلتا ہوا دیکھ آیا تھا۔ اب باغ میں سکھوں کا ہجوم اور لاشیں دیکھنے کے بعد اُس کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کے گاؤں پر بھی حملہ ہو چکا ہے۔ ''میری بیوی۔۔۔ میرے بچّے۔۔۔ میری ماں۔'' وہ چلّانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی آواز حلق سے باہر نہ آ سکی۔ وہ اپنے آپ کو تسلّی دے رہا تھا۔ ''میں غریب ہوں، میں مزدور ہوں، میرا کوئی دُشمن نہیں۔ میں نے کبھی کسی کو ناراض نہیں کیا۔ چچا بیلا سنگھ نے انہیں بتا دیا ہو گا کہ یہ مہر دین کا گھر ہے، وہ اپنے ماموں کی فاتحہ خوانی کے لیے گیا ہوا ہے۔ اس کے بچّوں کو کچھ نہ کہو۔ جگت سنگھ کو اس نے پچھلے دِنوں بیس روپے ادھار دیے تھے اور اب تک نہیں مانگے تھے۔ اس لیے اس نے بھی جتھے کو منع کیا ہو گا اور پھر چوہدری رحمت علی، اس کے بھائیوں، اس کے بیٹوں اور پوتوں کی موجودگی میں اس گاؤں پر حملہ نہیں ہو سکتا۔ وہ کن مہینوں سے علاقے کے سکھوں کی حفاظت کر رہے تھے لیکن یہ سائیں اللہ رکھا اور یہ دو مسافر؟ انہیں سکھوں نے غلطی سے مار دیا

ہو گا۔۔۔ شراب کے نشے میں سکھوں سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔"

سکھوں کے کوٹھوں پر عورتیں چلّا رہی تھیں۔ مہر دین نے سوچا۔ وہ جتھے کو بُرا بھلا کہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ سکھوں کو کہہ رہی ہیں کہ گاؤں کی مسلمان عورتیں ہماری بہنیں ہیں۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ پھر بھی اتنے بڑے جتھے کو گالیاں دینا ٹھیک نہیں۔ کبھی انسان کو غصّہ بھی آ جاتا ہے اور خاص طور پر جب سکھ شراب پی کر جمع ہوتے ہیں تو انہیں کسی نہ کسی پر غصّہ ضرور آ جاتا ہے۔ سائیں اللہ رکھا اور ان دو مسافروں نے ضرور انہیں گالیاں دی ہوں گی۔ اب یہ کم بخت عورتیں انہیں چڑا رہی ہیں۔۔۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ گاؤں کے سکھوں کو انہیں سمجھانا چاہیے کہ بہنو! تم اطمینان سے گھروں میں بیٹھ جاؤ، جتھے والے ہمارے مسلمان پڑوسیوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ پھر عقل مند آدمیوں کو ان سکھوں کے پاس آ کر یہ کہنا چاہیے کہ سردارو! عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں کی پرواہ نہ کرو۔ ہم تم سے معافی مانگتے ہیں۔ اِندر سنگھ، بیلا سنگھ، لچھمن سنگھ اور بابا رحمت علی بھی ان کے ساتھ چلا آئے تو کوئی ہرج نہیں۔

بابا رحمت علی نے کی بار سکھوں اور مسلمانوں کو جمع کر کے تقریریں کی ہیں۔ اس کی بات میں بڑا اثر ہے۔ شراب پی کر غصّہ ضرور آجاتا ہے لیکن اگر کوئی سمجھانے والا ہو تو وہ سمجھ بھی جاتے ہیں۔ جب کارخانے میں ہڑتال ہوئی تھی تو سکھ مزدوروں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ کارخانے کے مالکوں نے بہت کوشش کی تھی کہ سکھ اور مسلمان آپس میں لڑ پڑیں لیکن مزدوروں کا لیڈر جب سٹیج پر آکر یہ کہتا۔ ”مزدور بھائیو! تم آپس میں بھائی بھائی ہو۔“ معاملہ ٹھیک ہو جایا کرتا تھا۔۔ اس جتھے میں کئی مزدور ہوں گے لیکن کاش میں اس جتھے کے سامنے ایک تقریر کر سکتا۔ لیکن مجھے ضرور کچھ کرنا چاہیے۔ میں اپنی بیوی کو چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتا۔ سکھوں کو اگر خالصہ جی یا سردار جی کہہ کر سلام کیا جائے تو وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ میں انہیں سلام کروں گا۔ خاصہ جی سلام۔ سردار جی سلام۔ اب مہر دین کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ خالصہ جی کہلا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں یا سردار جی کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کے سکھ ”واہگورو جی کا خالصہ، واہگورو جی کی فتح“ اور ”ست سری اکال“ بھی کہا کرتے ہیں۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ کاش اسے کوئی بتاتا

کہ اس وقت سکھوں کو کون سا فقرہ زیادہ پسند آئے گا۔ وہ تکیے سے نکل کر باغ کا رُخ کر رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کہے گا۔ تاہم وہ بار بار یہ چاروں فقرے دہرا رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے رُک جاتا اور اس کے دل کی دھڑکنیں یہ کہنے لگتیں۔ ”مہر دین بھاگ جاؤ۔۔۔“ لیکن مہر دین ایک سلام کے عوض اپنے بیوی بچّوں اور ماں کی زندگی کا سودا کرنے جا رہا تھا۔ اس کی حالت اس شخص سے مختلف نہ تھی جو کسی اژدہے کے سامنے پھولوں کی بھینٹ لے کر جا رہا ہو۔ اس کا احساس و شعور ان مدارج تک جا چکا تھا جہاں بُزدلی اور بہادری کے درمیان باریک سی حدِّ فاضل غائب ہو جاتی ہے۔

ایک سوار کو باغ میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ سوار نے گھوڑا روکا اور بُلند آواز میں کہا۔ ”جتھے دار سورج ڈوبنے سے پہلے یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ فوج کے ڈوگرہ سپاہیوں کو جیپوں پر لے کر آئے گا۔ اس نے کہا ہے کہ سڑک سے آگے اگر کوئی کھائی ہو تو اس میں مٹّی

ڈال کر موٹروں کے لیے راستہ بنا دو!"

ایک سکھ نے سوال کیا۔ "کتنے سپاہی آئیں گے؟"

سوار نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں لیکن جتھے دار نے مجھے تسلّی دی ہے کہ وہ پانچ منٹ میں مسلمانوں کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دے گا!"

ایک سنگھ نے کہا۔ "تم نے سیٹھ رام چند کا پتہ کیا؟"

سوار نے جواب دیا۔ "میں جاتے ہوئے اس کے گھر سے ہو کر گیا تھا، وہ گھر سے دو نئی رائفلیں اور بارود کا ایک بکس لے کر اس طرف آیا ہے۔ ابھی تک یہاں نہیں پہنچا!"

سکھ حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سوار نے کہا۔ "عجیب بات ہے، وہ یہاں سے خالی ہاتھ گھر گیا ہے اور پھر بارود اور دو رائفلیں لے کر گھوڑے پر واپس آیا ہے۔"

ایک سکھ نے کہا۔ "اس کا لڑکا بھی غائب ہے۔ وہ دونوں کہیں بھاگ گئے

ہیں!"

مہر دین درخت کی آڑ میں کھڑا اپنے دل کو تسلّی دے رہا تھا۔ "ابھی لڑائی نہیں ہوئی۔ ابھی لڑائی کو روکا جا سکتا ہے۔ جب وہ آ کر گاؤں کو آگ لگا دیں گے تو اسے بجھانا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی سکھوں کو جوش نہیں آیا۔ ابھی شاید انہیں نے شراب نہیں پی۔ ابھی تک سیٹھ رام چند رائفلیں اور بارود لے کر نہیں آیا۔ ابھی منّت و سماجت سے کام لیا جا سکتا ہے۔" وہ اچانک درخت کی آڑ سے نکل کر آگے بڑھا اور سہمی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "واہگورو جی۔۔۔ سردار جی کا خالصہ۔۔۔ نہیں جی۔۔ اکال جی کی فتح۔۔۔جی نہیں، سردار جی سلام!"

اس کے جواب میں سکھ "پکڑ لو، مار ڈالو" کہتے ہوئے اُٹھے اور مہر دین کانپتا ہوا اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ چلّا رہا تھا۔ "میں بے قصور ہوں، میں نے کسی کو گالی نہیں دی۔ میں مزدور ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں تو سلام کرنے آیا تھا!"

جب اُسے سکھوں کی کرپانوں اور برچھیوں کے متعلّق کوئی غلط فہمی نہ رہی

تو اس نے بھاگ کر جوہڑ میں چھلانگ لگادی۔ سکھ کناروں پر کھڑے اُسے گالیاں دے رہے تھے۔ اور وہ کمر کے برابر پانی میں کھڑا التجائیں کر رہا تھا۔ جتھے میں اس کے مزدور ساتھی بھی تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کرتار سنگھ۔ منشا سنگھ، ہربنس سنگھ میں مہر دین ہوں۔ میں تمہاری طرح ایک مزدور ہوں۔ میں تمہاری طرح غریب ہوں۔ جب کارخانے میں ہڑتال ہوئی تھی تو ہم ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ میرا ماموں فوت ہو گیا تھا، میں سیدھا وہاں سے آرہا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر میں نے سوچا کہ سلام کرلوں۔ دیکھو یار گالیاں نہ دو۔ مائیں بہنیں سب کی ایک جیسی ہوتی ہیں!"

"ارے یہ مہر دین۔" بیلا سنگھ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

مہر دین کو تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ چلّایا۔ "ہاں سردار جی! انہیں سمجھاؤ۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں تمہارا پڑوسی ہوں!" بیلا سنگھ نے کہا۔ "باہر نکلو سوّر کے بچّے!" بیلا سنگھ نے مٹّی کا ایک ڈھیلا اُٹھا کر زور سے اُس کی طرف پھینکا۔ مہر دین چند قدم پیچھے ہٹ کر ذرا اور گہرے پانی میں چلا گیا۔ چند سکھ جوتے اُتار کر جوہڑ میں کود پڑے۔۔۔

مہر دین جوہڑ کے درمیان سینے کے برابر پانی میں کھڑے ہو کر چلّا رہا تھا۔ بیلا سنگھ، جگت سنگھ! تم میرے پڑوسی ہو۔ میں چھٹی کے دِن تمہارے ہل چلایا کرتا تھا۔ مجھے بچاؤ۔ انہیں روکو۔ میری ماں بوڑھی ہے۔ میں ساتھ بچوں کے لیے کما کر لاتا ہوں، وہ بھوکے مر جائیں گے۔ مجھے اپنی جوان لڑکیوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ ان کی ماں بیمار رہتی ہے؟"

جگت سنگھ نے جواب دیا۔ "تمہاری ماں تمہارے باپ کے پاس چلی گئی ہے۔ تمہاری بیوی کو ہم نے دوسرے جہان پہنچا دیا ہے۔ اب تمہیں کسی کے لیے کما کر نہیں لانا پڑے گا۔ ہم نے تمہاری لڑکیوں کی شادیاں بھی کر دی ہیں۔ اب سیدھی طرح باہر آجاؤ!"

بھگت رام اور اس کا لڑکا رام لال بھی کنارے پر کھڑے تھے۔ رام لال کہہ رہا تھا۔ "بدمعاش باہر نکلو! اس جوہڑ سے ہماری گائیں پانی پیتی ہیں۔ تمہاری لاش کون نکالے گا!"

مہر دین اب خاموش ہو چکا تھا۔ اس کی ذہنی کشمکش فقط ان سوالات تک محدود تھی۔ "کیا یہ ممکن ہے؟ کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میری بوڑھی

ماں کو مار دیا ہو؟ میری بیوی اور لڑکوں قتل کر دیا اور لڑکیوں کے ساتھ۔۔۔؟"

جو ہڑ میں کودنے والے پانچ سکھ اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے دو اس کے ساتھ کام کرنے والے مزدور تھے۔ ان کی کرپانیں اور ان کے چہرے اس کے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔ اسے اب کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ اسے اب کسی کا خوف نہ تھا۔ وہ آخر بار چلّایا۔ "آؤ مجھے مار ڈالو۔ میں موت سے نہیں ڈرتا!"

ایک سکھ نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر کرپان ماری اور کنارے پر کھڑے تماشائیوں نے نعرہ لگایا۔ "بولو ست سری اکال" پانی میں ڈوبتی ابھرتی اور تڑپتی ہوئی لاش پر یکے بعد دیگرے پانچ سکھ اپنی کرپانوں کی تیزی آزمارہے تھے۔

☆☆☆☆☆

چوہدری رمضان کو اپنے پڑوسی لچھمن سنگھ سے زیادہ کسی پر اعتماد تھا۔ حملہ

ہونے تھوڑی دیر پہلے اسماعیل اس کے گھر آکر کہہ گیا تھا کہ تم فوراً ہماری حویلی میں پہنچ جاؤ لیکن اس نے لچھمن سنگھ سے مشورہ کیا تو اس نے کہا۔ ”کس کی مجال ہے کہ ہمارے گاؤں کی طرف دیکھے۔ پھر بھی اگر تمہیں ڈر ہے تو بھائی، بہو اور لڑکی کو میرے گھر پہنچا دو۔ جو ان کی طرف آئے گا، اسے پہلے میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا!“

رمضان کا بیٹا جلال گاؤں سے باہر مویشی چرانے گیا ہوا تھا۔ رمضان اپنی بیوی بہو اور لڑکی کو لچھمن سنگھ کے گھر چھوڑ کر اس کی تلاش میں گاؤں سے باہر نکلا تو اسے سکھوں کا جتھا گاؤں کا رُخ کرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اُلٹے پاؤں بھاگا اور لچھمن سنگھ کی حویلی میں داخل ہو کر چلّایا۔ ”لچھمن سنگھ جتھّا آگیا۔ تمہیں معلوم ہے جلال مویشی لے کر کس طرف گیا ہے؟ تمہارا لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ بتاؤ لچھمن سنگھ تمہیں پتا ہو گا!“ لچھمن سنگھ کی خاموشی پر رمضان نے کہا۔ ”لچھمن سنگھ میں نالے کی طرف جاتا ہوں۔ تم دوسری طرف جاؤ۔ بھابی سے کہو لڑکیوں کو اندر چھپالے۔ جلدی کرو۔“

لچھمن سنگھ نے آگے بڑھ کر حویلی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جتھا

آگے جا رہا ہے۔ آؤ تم اندر بیٹھو!“

گولی چلنے کی آواز آئی اور رمضان چلّایا۔ ”دیکھو انہوں نے حملہ کر دیا۔“ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھولنے کی کوشش کی لیکن کچھمن سنگھ نے اُسے بازو سے پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ رمضان کہہ رہا تھا۔ ”بھائی مجھے چھوڑ دو۔ میرا جلال باہر ہے۔ میں اسے لے آتا ہوں۔ دیکھو، گولیاں چل رہی ہیں۔ اگر وہ مارا گیا تو میری زندگی کسی کام کی۔ بھائی اگر تمہیں میری جان کا خطرہ ہے تو خود جا کر جلال کو لے آؤ!“

کچھمن سنگھ نے اسے دالان کے دروازے کے قریب لے جا کر زور سے اندر کی طرف سے دھکا دیا۔ رمضان کے پاؤں کو دہلیز کی ٹھوکر لگی اور منہ کے بل اندر جا گرا۔ اندر کرپانوں سے مسلح پانچ سکھ شراب پی رہے تھے اور رمضان کی بیوی اور بیٹی ایک دیوار کے ساتھ کھڑی خوف سے کانپ رہی تھیں۔ رمضان کی بہو ایک سال کے بچے کو سینے سے چمٹائے رو رہی تھی۔ تاہم رمضان ابھی تک خوش فہمی میں مبتلا تھا، اس نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کچھمن سنگھ، تمہارا دل بڑا سخت ہے۔ اگر جلال کی طرح تمہارا

بیٹا باہر ہوتا اور کوئی تمہیں باہر جانے سے روکتا تو شاید تم اس سے لڑ پڑتے۔ بھائی مجھے جانے دو، خدا کے لیے!" گاؤں کے ایک سکھ نے کہا۔ "چودھری ادھر آ! تیری یہاں ضرورت ہے۔"

رمضان نے کہا۔ "تم سب یہاں کیا کر رہے ہو، گاؤں پر حملہ ہو چکا ہے۔ سنو! رحمت علی کی حویلی کی طرف گولیاں چل رہی ہیں۔ جاؤ، انہیں روکو۔ آج تک باہر کے کسی بدمعاش کو اس گاؤں میں دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آج تمہاری بہو بیٹیاں بدمعاشوں کی گالیاں سُن رہی ہیں اور تم یہاں بیٹھ کر شراب پی رہے ہو۔ ایسے موقعوں پر مرد گھروں میں نہیں بیٹھا کرتے۔ یہ گاؤں کی عزّت کا سوال ہے۔ کچھمن سنگھے انہیں نکالو!"

ایک سکھ نے آگے بڑھ کہ رمضان کی داڑھی پکڑ لی اور دوسرے قہقہے لگانے لگے۔

کچھمن سنگھ نے کہا۔ "بھئی جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو!"

ایک سنگھ نے کہا۔ "کیوں بھئی تیرا جھٹکا کریں یا تجھے ذبح کریں؟"

رمضان کی بیوی چِلاّئی۔ ”اسے چھوڑ دو، اسے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے کچھمن سنگھ۔ تم نے اسے بھائی بنایا تھا؟“

دوسرے سکھ نے کہا۔ ”مارو اس بڑھیا کو!“

رمضان نے کہا۔ ”دیکھو بھئی بوڑھے آدمی سے یہ مذاق اچھا نہیں ہوتا!“

ایک سکھ نے کرپان بُلند کرتے ہوئے کہا۔ ”تجھ سے مذاق کرنے والے کی ایسی کی تیسی!“ لیکن کچھمن سنگھ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ”بھئی یہاں نہیں۔ اسے باہر لے جاؤ۔“ رمضان کی بیوی چیختی چلاّتی آگے بڑھی لیکن کچھمن سنگھ نے اُسے زور سے دھکا دیا اور وہ چند قدم دور جا گری۔ تین سکھ رمضان کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے حویلی کے صحن میں لے گئے اور دو وہیں رہے۔ رمضان کی بیٹی نے آگے بڑھ کر کچھمن سنگھ کی بیوی کا بازو پکڑ لیا۔ ”چچی! تم نے مجھے بیٹی بنایا تھا۔ میرے ابّا کو بچاؤ۔“ رمضان کی بہو نے کہا۔ ”ماسی ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو معاف کر دو۔ تم کہا کرتی تھیں کہ علم دین تمہارا پوتا ہے۔ جب یہ پیدا ہوا تھا تو تم نے گُڑ بانٹا تھا۔ ہمیں بچاؤ ماسی!“

لچھمن سنگھ کی بیوی پھر بھی ایک عورت تھی، اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ”میری کون سُنتا ہے۔ اب تم دونوں امرت چکھ لو۔ بھابی تم بھی امرت چکھ لو!“

لڑکیاں سہم کر پھر دیوار سے لگ گئیں۔

ایک سکھ نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو، ہم انہیں امرت چکھا لیں گے۔“ باہر حویلی کے صحن میں رمضان فریاد کر رہا تھا۔ ”لچھمن سنگھ میں نے کیا کِیا ہے۔ تمہاری آنکھیں کیوں بدل گئیں۔ میں وہی رمضان ہوں۔ تم میری ہر بات پر ہنسا کرتے تھے۔ لچھمن سنگھے یاد ہے، جب میں بیمار ہو گیا تھا تو تم کہتے تھے اگر رمضان مر گیا تو گاؤں سونا ہو جائے گا۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ تم سچ مچ مار ڈالو گے۔ خدا کے لیے بتاؤ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ اگر تمہیں اب میرا گاؤں میں رہنا پسند نہیں تو میں کہیں چلا جاتا ہوں۔ میرے بیل لے لو، میری بھینسیں لے لو۔ ساون! صوبہ سنگھ! میں نے تمہارا بھی کچھ نہیں بگاڑا۔۔۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ تمہیں میری ہر بات پر ہنسی آیا کرتی تھی۔ آج کیوں نہیں ہنستے تم، آج تمہیں کیا ہو گیا؟

میرے بچّوں کو چھوڑ دو، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ لچھمن سنگھ! بھائی لچھمن سنگھ! نہیں! نہیں! خدا کے لیے۔۔۔“

ایک سکھ نے کرپان ماری اور رمضان کا سر دھڑ سے علیحدہ ہو گیا۔ رمضان کی لڑکی چیخیں مارتی ہوئی باہر نکلی۔ ایک سکھ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کی بیوی اور بہو بھی باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں لیکن سکھوں نے اُن کا راستہ روک رکھا تھا۔ کسی نے باہر سے حویلی کے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے آواز دی۔ ”باپو دروازہ کھولو!“

لچھمن سنگھ آگے بڑھ کر کنڈی کھولی اور اس کا لڑکا ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ ”باپو جلال مجھ سے بچ کر بھاگ آیا ہے۔ اس نے میری کرپان چھین لی ہے!“

سکھوں نے اس پر قہقہہ لگایا۔ لچھمن سنگھ نے برہم ہو کر کہا۔ ”جلال نے تمہاری کرپان چھین لی ہے۔ بے حیا کہیں ڈوب مرو!“

لڑکے نے کہا۔ ”بابو میں نے وار کیا تو اس نے نالے میں چھلانگ لگا دی۔

میں نے اس کا پیچھا کیا تو میرے کیس کھل گئے اور وہ کرپان چھین کر بھاگ گیا!'

ایک سکھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب تک وہ پاکستان پہنچ چکا ہو گا!"

"نہیں، وہ اس طرف آیا ہے۔ شاید اپنے گھر میں چھپا ہوا ہو۔ میں دیکھتا ہوں!" لچھمن سنگھ نے کہا۔ "بھگت سنگھ اس کے ساتھ جاؤ!"

"میں بھی اس کے ساتھ جاتا ہوں۔" ایک اور سکھ نے کہا۔

لچھمن سنگھ کے لڑکے کے ساتھ دو سکھ دیوار پھاند کر رمضان کے گھر میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے۔

لچھمن سنگھ نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں نہیں آئے گا۔ اب تم لوگ میرے ساتھ فیصلہ کرو۔"

ایک سکھ نے کہا۔ "ہمارا فیصلہ ہو چکا ہے۔ جلال کی بیوی کے لیے ہم تمہیں دو سو اور بہن کے لیے تین سو روپے دیتے ہیں اور اس بڑھیا کے لیے ساون سنگھ سے پندرہ بیس روپے لے لو!"

لچھمن سنگھ نے کہا۔ ”بس اب جلدی سے پیسے نکالو، ورنہ جتھے والے آ گئے تو نیلامی میں ان کی قیمت بڑھ جائے گی اور میرے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا!“

لچھمن سنگھ کے لڑکے نے کہا۔ ”باپو! جلال کی بہن کو میں اپنے پاس رکھوں گا!“

جلال اپنے مکان اور لچھمن سنگھ کی حویلی کی درمیانی دیوار کے ساتھ شیشم کے گھنے درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ کرپان تھی جو اس نے لچھمن سنگھ کے لڑکے سے چھینی تھی۔ اپنے باپ کی لاش دیکھنے اور سکھوں کی باتیں سُننے کے بعد کئی بار اس کے دل میں آئی کہ وہ درخت سے حویلی میں چھلانگ لگا کر ان پر جھپٹ پڑے لیکن ہر بار اس کی ہمّت جواب دے جاتی۔

لچھمن سنگھ کو اپنے پڑوسی کے گھر کی آبرو کی قیمت مل چکی تھی اور وہ اطمینان سے نوٹ گِن رہا تھا۔

صحن کے ایک سکھ نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ ”بھئی تم اندر کیا کر رہے ہوں۔ انہیں لے آؤ۔ جلدی کرو!“

رمضان کی بیوی باہر نکلتے ہی بھاگ کر اپنے شوہر کی لاش پر ِگر پڑی۔ ایک سکھ نے جلال کی بیوی کے ہاتھوں سے اُس کا بچّہ چھین کر ہوا میں اُچھالا اور دوسرے نے اُس کی زمین تک پہنچنے سے پہلے کرپان ماری اور اس کی ٹانگ کاٹ ڈالی۔ اس کی ماں چیختی چلّاتی آگے بڑھی تو ایک سکھ نے اس کو سر کے بالوں سے پکڑ لیا۔ لڑکے کو دوبارہ ہوا میں اچھالا گیا اور اس مرتبہ اسے کرپانوں کی نوک پر روکنے کی مشق کی گئی۔

جلال چیخیں مارتا ہوا درخت سے کودا اور ایک زخمی درندے کی طرح سکھوں پر جھپٹ پڑا۔ اس کا وار اس سکھ پر تھا جس نے اس کی بیوی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے وار میں وہ ساون کو جو اس کی ماں کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا، موت کے گھاٹ اُتار چکا تھا۔ اس کی بیوی نے ِگرے ہوئے سکھ کہ کرپان اٹھالی اور کچھمن سنگھ پر حملہ کر دیا۔ کچھمن سنگھ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ ایک کھونٹے کے ساتھ اس کا پاؤں ٹکرایا اور وہ پیٹھ کے

بل گِر پڑا۔ جلال کی بیوی کی کرپان اس کی ٹانگ پر لگی۔ وہ دوسرا وار کرنا چاہتی تھی کہ ایک سکھ نے پیچھے سے اس کی سر پر کرپان ماری اور اس کی کھوپڑی دو ٹکڑے ہو گئی۔ اتنی دیر میں جلال ایک سکھ کو گِرا چکا تھا اور باقی اس کے پے در پے حملوں سے بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ لچھمن سنگھ کا لڑکا دبے پاؤں آگے بڑھا اور اس نے جلال کے عقب میں پہنچ کر پوری قوّت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ اس کی کرپان جلال کے کندھے پر لگی اور چھ انچ نیچے اُتر گئی۔ وہ گرا اور سکھ اس پر پل پڑے۔ اس کے جسم کا ایک عضو کئی حصّوں میں کاٹا جا رہا تھا۔ اس کی بہن جو ابھی تک دیوار کے ساتھ کھڑی کانپ رہی تھی اچانک ایک گِرے ہوئے سکھ کی کرپان اُٹھا کر آگے بڑھی۔ سکھ بے خبری کی حالت میں جلال کی لاش پر اپنا غصّہ نکال رہے تھے۔ لچھمن سنگھ چلّایا۔ ”پیچھے دیکھو! بچو!“ اس کا لڑکا گھبرا کر پیچھے مڑا لیکن پیشتر اس کے کہ اس کے ہاتھ مدافعت کے لیے اُٹھتے لڑکی کی کرپان اس کا ایک بازو کاٹ چکی تھی۔ لڑکی نے دوسرا وار کرنے کی کوشش کی لیکن ایک سکھ نے اسے بازو سے پکڑ کر گِرا دیا۔ وہ اس کا لباس نوچ رہے تھے، اسے درندوں کی طرح دانتوں سے کاٹ رہے

تھے اور اس کی ماں اسے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لچھمن سنگھ اُٹھ کر لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے کرپان مار کر جلال کی ماں کی گردن کاٹ دی۔

جلال کی بہن بے ہوش ہو چکی تھی۔ ایک سکھ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

”چلو کرتار سنگھ، اب اسے لے چلیں۔ یہ ہمیں بہت مہنگی پڑی ہے۔“

☆☆☆☆☆

حملہ آوروں کے پسپا ہونے کے بعد سلیم کے گھر میں ایک عارضی سکوت طاری ہو گیا۔ جو لڑائی کے ہنگامے سے کہیں زیادہ بھیانک اور کرب انگیز تھا۔ عورتیں اور بچّے دالان سے باہر آ کر پتھرائی ہوئی نگاہوں سے شہیدوں کی لاشیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے سینوں میں محشر کے ہنگامے تھے۔ لیکن زبانیں گنگ تھیں۔ کسی کو بولنے کی جرأت نہ تھی۔ کسی میں آواز نکالنے کی ہمّت نہیں۔ ان کے چہروں پر ایک ایسی فریاد تھی جسے دیکھا جا سکتا تھا، سُنا نہیں جا سکتا تھا۔ کانپتے اور لرزتے ہوئے ہاتھ زخمیوں

کو پٹّیاں باندھ رہے تھے۔ مردوں میں کسی کو یہ سوال کرنے کا حوصلہ نہ تھا کہ اب کیا ہو گا۔ سب کے سب محسوس کرتے تھے کہ سیلاب کی دوسری لہر پہلی لہر سے کہیں زیادہ تند و تیز ہو گی۔ سب کے سامنے موت زندگی سے زیادہ قریب تھی۔

مجید نے دشمن سے چھینا ہوا اسلحہ چند آدمیوں کو دے دیا۔ سلیم بشیر کو ساتھ لے کر کھیت کی طرف بھاگا اور وہاں چھپائی ہوئی رائفلیں اور بارود اُٹھا لیا۔ فجّو پہلوان کی فرض شناسی کی بدولت اسے شیشم کے درخت کے قریب بیٹھے رام چند کی دو فالتو رائفلیں بھی مل گئیں۔

سلیم اور مجید کے علاوہ صرف تین آدمی ایسے تھے جو بندوقیں چلانا جانتے تھے اور وہ باقی آدمیوں کو آنے والی جنگ کے لیے تیّار کر رہے تھے۔

سلیم ایک نوجوان کو سمجھا رہا تھا۔ ”دیکھو بندوق کو یوں بولٹ کو اس طرح کھینچو، گولیاں اس طرح ڈالو، گھوڑے کو یوں دباؤ۔ نشانہ اس طرح باندھو۔ دیکھو تمہارا ہاتھ ہلتا ہے، بندوق کو کندھے کے ساتھ دبا کر رکھو!“

سلیم کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سلیم! یوسف کا کچھ پتہ نہیں چلتا!“

ماں کے چہرے کا حزن و ملال سلیم کی قوّتِ برداشت سے باہر تھا، وہ بولا: ”یوسف گھر میں نہیں کیا؟“

ماں بولی۔ ”یوسف حملے سے کچھ دیر پہلے باہر نکل گیا تھا لیکن واپس نہیں آیا۔“

”اچھا خدا سے دُعا کیجیے۔“ یہ کہتے ہوئے سلیم پر اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تم کیا دیکھ رہے ہو۔ مجھے میگزین میں گولیاں ڈال کر دکھاؤ!“

ماں چند منٹ کے لیے سلیم کی طرف دیکھتی رہی لیکن اس نے دوبارہ اس کی طرف توجّہ نہ کی۔ وہ اب دوسرے آدمی کو ہدایات دے رہا تھا۔ پیاس سے اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ماں چُپکے سے آنسو پونچھتی ہوئی اندر کی حویلی کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی تو

اس کے ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ ”لو بیٹا! تمھیں پیاس لگی ہوئی ہے۔“ اس نے گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ سلیم نے چپکے سے گلاس منہ سے لگایا۔ اس کے بعد سلیم کی ماں نے مجید کو پانی پلایا اور وہ دونوں پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ماں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس میں بولنے کی ہمّت نہ تھی۔ سلیم کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے بھائی کے لیے کم پریشان نہیں۔ اچانک وہ ماں کی طرف متوجّہ ہو کر بولا۔ ”امّی! آپ جایئے! اگر خدا کو اس کی زندگی منظور ہے تو کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔“

”ماں انتہائی مایوسی کی حالت میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی ڈیوڑھی کے قریب پہنچی تھی کہ مجید نے بُلند آواز میں کہا۔ ”چچی جان یوسف آ گیا!“

ماں نے مُڑ کر دیکھا۔ یوسف حویلی کے ایک کونے سے دیوار پھاند کر اندر آ چکا تھا۔ اس کے ساتھ کاکو عیسائی تھا۔ ماں رُک کر یوسف کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ اس کی طرف آنے کی بجائے بھاگتا ہو سلیم کے قریب پہنچا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کی قمیص پسینے سے تر تھی۔ ماں چند

قدم اور آگے بڑھی لیکن یوسف نے اس کی طرف متوجّہ ہونے کی بجائے زمین پر پڑی ہوئی ایک بندوق اٹھالی۔ سلیم نے سوال کیا۔ ”تم کہاں تھے؟“

یوسف نے جواب دینے کی بجائے مڑ کر کاکو کی طرف دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”جب آپ کی حویلی پر جتھے نے حملہ کیا تھا تو یوسف بابا علی محمد کے باغ میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں وہاں گھاس کاٹ رہا تھا۔ اس نے بندوقوں کی آواز سُنتے ہی گاؤں کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے روک لیا۔ ہم کھیتوں میں چھپتے ہوئے گاؤں کے قریب پہنچے تو لڑائی ہو رہی تھی اور حویلی تک پہنچنے کے تمام راستے بند تھے لیکن اس کے باوجود یوسف یہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے روکا اور کہا کہ چلو پولیس کو اطلاع دیں۔ ہم شہر کی طرف بھاگے لیکن وہاں فوج اور پولیس کے سکھ سپاہی مسلمانوں کو گولیاں مار رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم اُلٹے پاؤں واپس ہو گئے۔ راستے میں سکھوں کی ٹولیاں تھیں، اس لیے ہمیں فصلوں میں سے چکر کاٹ کر آنا پڑا۔ ہم بیلا سنگھ کے باغ کے قریب گنّوں کے

کھیت میں چھُپ کر ان کی باتیں سُن آئے تھے۔ شام تک ان کی مدد کے لیے اور جتھے پہنچ جائیں گے اور وہ دوبارہ حملہ کریں گے۔۔۔“

سلیم نے مجید کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مجید! اگر ہم انہیں بھگا دیں تو ممکن ہے کہ ہمیں کچھ وقت اور مل جائے۔“

مجید نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔ ”تم پانچ آدمیوں کے ساتھ یہاں رہو۔ میں باقی آدمیوں کو لے کر جاتا ہوں۔ پھاٹک کو بند رکھنے کے لیے چند مضبوط کھونٹے اُکھڑوا کر دروازوں کے آگے گاڑ دو۔

☆☆☆☆☆

پانچ بج چکے تھے اور گاؤں سے باہر باغ میں جمع ہونے والے سکھ بے تابی سے شہر سے آنے والی کمک کا انتظار کر رہے تھے۔ جب چھ بج گئے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ ”اب کیا کیا جائے؟“

ایک گروہ کا لیڈر کہہ رہا تھا کہ ہمیں شہر کا رُخ کرنا چاہیے۔ اگر جتھے دار راستے میں مل گیا تو ہم اس کے ساتھ واپس آ جائیں گے۔ ورنہ اسے شہر

سے ساتھ لے کر آئیں گے۔ ممکن ہے کہ باؤنڈری فورس کے مسلمان سپاہیوں کی ٹولی اس علاقے میں پہنچ گئی ہو اور جتھے دار آج رات اس گاؤں پر چڑھائی نہ کر سکے۔"

دوسرے گروہ کے لیڈر نے اُٹھ کر کہا۔ ایسی صورت میں ہمارا شہر کی طرف رُخ کرنا اور بھی خطرناک ہے۔ میرے خیال میں ہمیں گاؤں کے گرد گھیرا ڈال لینا چاہیے تاکہ رات کے وقت یہ لوگ بھاگنے کی کوشش نہ کریں اور جتھے دار کے پاس ایک اور آدمی بھیج دینا چاہیے!"

ایک اور سکھ نے اُٹھ کر کہا۔ "انہوں نے ہم سے کچھ بندوقیں چھین لی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ یہ بندوقیں لے کر باہر نکل آئے تو ہم ان کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ اس کے علاوہ اگر ہم یہیں بیٹھے رہے تو ممکن ہے اردگرد کے مسلمان جمع ہو کر ہمارے کسی گاؤں پر حملہ کر دیں۔ بھئی ہم جانتے ہیں۔ جب جتھے دار فوج لے کر آ جائے گا تو ہم بھی پہنچ جائیں گے!"

سلیم کے گاؤں کا ایک سکھ اُٹھ کر بولا۔ "سردار جی! مسلمانوں میں یہ

جرأت کہاں کہ وہ آپ کے گاؤں پر حملہ کریں۔ اب اگر آپ یہاں سے چلے گئے تو ہمارے گاؤں کے مسلمانوں کے حوصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ وہ راتوں رات اردگرد کے تمام کا مسلمانوں کو یہاں جمع کرلیں گے۔"

دوسرے گاؤں کے لیڈر نے جواب دیا۔ "بھئی تمہیں اپنا خطرہ ہے۔ تم چاہتے ہو کہ ہم یہاں بیٹھ کر تمہارے گھروں کی حفاظت کریں اور اپنے گھر دوسروں کے لیے چھوڑ دیں۔ تم نے ہمیں دھوکا دیا۔ تم کہتے تھے کہ یہ لوگ مقابلہ نہیں کریں گے۔ تم کہتے تھے کہ تمہیں صرف پچاس آدمی اور چار بندوقیں مل جائیں تو تم انہیں دس منٹ میں ختم کر دو گے۔ ہم نے تمہارے لیے سارے سکھوں کو جمع کیا لیکن جب لڑائی شروع ہوئی تو تم نے ہمیں آگے کر دیا اور خود پیچھے ہٹ گئے۔ تم نے باہر کے آدمی مروائے اور اپنے جسم پر خراش تک نہیں آنے دی۔"

اس پر سلیم کے گاؤں کے ایک نوجوان سکھ کو طیش آگیا اور اس نے اُٹھ کر کہا۔ "اچھا سردار جی! یہ بات ہے؟ اب تم میں بُزدلی کا طعنہ دیتے ہو۔ ہم نے تو پہلے ہی ہاتھ جوڑ کر تمہیں کہہ دیا تھا کہ ہمارے گاؤں کو اپنے

حال پر چھوڑ دو۔ گلاب سنگھ نے بھی تمہیں سمجھایا تھا لیکن تم نے اسے مار ڈالا، اب ہمیں بزدلی کا طعنہ دیتے ہو۔ حالانکہ تم خود بُزدل ہو اور بھاگتے وقت اپنی بندوقیں بھی وہیں چھوڑ آئے ہو!"

دوسرے دیہات کے سکھوں کو جوش آگیا اور گالی گلوچ کے بعد ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔

ایک سکھ گھوڑا بھگاتا ہوا آیا اور اسے دیکھ کر سکھوں کا جوش و خروش تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا سوار نے کہا۔ "جتھے دار صاحب کہتے ہیں کہ کل صُبح فوج کے پچاس آدمی لے کر پہنچیں گے۔ آج رات وہ دوسرے گاؤں پر حملہ کر رہے ہیں!"

ایک سکھ نے سوال کیا۔ "انہوں نے بندوقیں کیوں نہیں بھیجیں؟"

سوار نے جواب دیا۔ "میں نے رائفلیں مانگی تھیں تو مجھے گولی مارنے کے لیے تیّار ہو گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں یہ نہیں کر سکتا کہ تمہیں ہتھیار بھی دوں اور پھر اُن کی حفاظت کے لیے سپاہی بھی دوں۔ انہوں نے دستی

بم دیے ہیں اور کہا ہے کہ اگر تم بنیوں کی اولاد نہیں ہو تو یہ بم اُن کے گھروں کو مٹّی کا ڈھیر بنانے کے لیے کافی ہیں۔ رات کے وقت تمہیں یہ بم پھینکنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اگر تم میں ہمّت نہیں تو عیسائیوں کو مجبور کرو، وہ آسانی سے ان کی حویلی کے قریب جا کر یہ بم پھینک سکیں گے!"

ایک سکھ نے کہا۔ "عیسائیوں سے اس گاؤں کے آدمی کام لے سکتے ہیں!"

گاؤں کے ایک سکھ نے جواب دیا۔ "وہ مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑیں گے۔"

"انہیں مجبور کیا جا سکتا ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "لیکن وہ بم چلانا بھی تو نہیں جانتے۔"

"ہم انہیں سکھا دیں گے!" فوج کے ایک تربیت یافتہ سکھ نے کہا۔ "لاؤ جی بم مجھے دو!"

سوار اپنے گلے سے بموں سے بھرا تھیلا اتار رہا تھا کہ ساتھ والے چری کے کھیت سے بندوقوں کی گولیاں برسنے لگیں۔ سکھ سراسیمگی کی حالت

میں چیختے چِلّاتے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ پہلی گولی جتھے دار کے ایلچی کو لگی۔ اس کے گھوڑے نے بد حواس ہو کر ایک طرف چھلانگ لگائی اور وہ گر پڑا۔ آن کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔ مجید بھاگتا ہوا کھیت میں گیا اور اس نے بموں سے بھرا ہوا تھیلا اٹھایا۔ اس کے ساتھی بھی کھیت سے نکل آئے اور اِدھر اُدھر بھاگنے والوں پر گولیاں برسانے لگے۔

میدان بالکل صاف ہو گیا تو بشیر نے کہا۔ ”مجید! خدا کی قسم میرا ایک نشانہ بھی خالی نہیں گیا؟“

یوسف بولا۔ ”بھائی جان! دیکھا، آپ کہتے تھے کہ میں رائفل نہیں چلا سکوں گا۔ اس موٹے سکھ کو میں نے گرا دیا ہے۔“

مجید کے والد کا اسّی سالہ چچا علی محمد بولا۔ ”کاش یہ بندوقیں ہمیں حملہ ہونے سے پہلے ملتیں!“

مجید نے کہا۔ ”بابا! تقدیر نے ہمارے لیے یا تو فتح لکھی ہے یا عزّت کی موت۔ اب وہ ہمیں چوہوں کی طرح نہیں مار سکیں گے۔ یہ دیکھو! بموں

سے بھرا ہوا تھیلا۔ یہ قدرت کا انعام ہے!" جتھے کی یہ حالت دیکھ کر گاؤں کے سکھ اور ہندو بھی اپنے بال بچّوں کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ چند آدمیوں نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی لیکن مجید نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر روک دیا۔

☆☆☆☆☆

مجید اور اس کے ساتھی "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے حویلی کی طرف واپس جا رہے تھے اور حویلی میں جمع ہونے والے لوگ بھی ان کے جواب میں نعرے لگا رہے تھے۔ اچانک آس پاس کے کھیتوں سے بھی ان نعروں کا جواب آنے لگا۔

مجید نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم فوراً حویلی کے اندر داخل ہو جاؤ۔ ممکن ہے کہ سکھ ہمیں دھوکہ دے کر حملہ کرنا چاہتے ہوں!"

تھوڑی دیر میں حویلی کے اندر جمع ہونے والے تمام آدمی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور دم بخود ہو کر کھیتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ نعروں کی

آواز آہستہ آہستہ قریب آنے لگی اور اس کے ساتھ ہی کماد کے کھیتوں میں سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔

"کون ہے؟" مجید نے ایک آدمی کو کھیت سے نکلتے ہوئے دیکھ کر بُلند آواز میں سوال کیا۔

"مجید، میں ہوں!"

"کون؟ داؤد؟"

"ہاں!" اس نے کرب انگیز لہجے میں جواب دیا۔ داؤد کے پیچھے پندرہ بیس آدمیوں کی ٹولی نمودار ہوئی۔ مجید نے کہا۔ "اب پھاٹک کھولنا مشکل ہے۔ تم دیوار پھاند کر اندر آجاؤ۔۔ تمہارے ساتھ اور مسلمان بھی ہیں؟"

"ہاں! بہت سے آدمی ہیں!" داؤد نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر میں تمہاری حویلی میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں رہے گی۔ لوگ دور دور تک کھیتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔"

"ان سب کو بُلالو، میں باہر دیوار کے ساتھ سیڑھی لگوادیتا ہوں۔"

داؤد کے ساتھیوں نے کھیتوں میں چھپے ہوئے آدمیوں کو آوازیں دیں۔ آس پاس چھپے ہوئے لوگ ان کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے ہوئے کھیتوں سے باہر نکلنے لگے۔ آدھ گھنٹے کے اندر حویلی میں کوئی تین سو مرد عورتیں اور بچے جمع ہو چکے تھے۔ کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ میرا سارا کنبہ مارا جا چکا ہے اور کوئی کہہ رہا تھا کہ میرے خاندان میں سے صرف ایک بوڑھے اور ایک بچّے کے سوا کوئی نہیں بچا!"

"سکھ ہمارے گاؤں کی اتنی عورتیں چھین کر لے گئے ہیں!"

"ہمارے گاؤں کی اتنی عورتوں نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی!"

"میرے دودھ پیتے بچّے کو نیزوں پر اُچھالا گیا!"

"فلاں گاؤں میں سکھ فوج نے سارے آدمیوں کو مار دیا اور عورتوں کے ساتھ یہ سلوک کیا!"

"اب کیا ہو گا۔ اب ہم کیا کریں۔ اب ہم کہاں جائیں؟"

"پاکستان بہت دور ہے!"

"کہتے ہیں کہ بلوچ رجمنٹ نے امرتسر میں ہزاروں مسلمانوں کی جان بچائی ہے، اسے ادھر کیوں نہیں بھیجا گیا؟"

"میاں سلیم! وہ میری بیوی کو چھین کر لے گئے ہیں۔ میں سر پر زخم کھا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے میری ماں کے ساتھ۔۔۔۔!"

غرض ہر عورت، مرد، بچّے اور بوڑھے کی ایک نئی داستان تھی۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے منہ میں الفاظ تھے نہ آنکھوں میں آنسو۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے اور ہلکی ہلکی سسکیاں بھر کر خاموش ہو جاتے۔

ایک شخص حویلی میں داخل ہوتے ہیں چلّایا۔ "دنیا میں اب میرا کوئی نہیں۔ میرے پانچ بیٹے تھے۔ تین لڑکیاں تھیں اور تین پوتے تھے۔ اب میں اکیلا ہوں!" یہ خیر دین کمہار تھا۔

غلام حیدر، مجید کے باپ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خیر دین صبر کرو!"

خیر دین غلام حیدر سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس کی دیکھا دیکھی عورتوں کی دبی اور گھٹی ہوئی چیخیں بُلند ہونے لگیں۔

☆☆☆☆☆

رات کے وقت مجید اور داؤد مسجد اور مکانوں کی چھتّوں پر مٹّی کی بوریوں کے مورچے بنوا رہے تھے۔ سلیم حویلی کے ایک کونے میں شہیدوں کو دفن کروا رہا تھا۔ کاکو قبریں کھودنے میں ان کی مدد کے لیے گاؤں کے چند عیسائیوں کو لے آیا تھا لیکن چالیس لاشوں کے لیے علیحدہ علیحدہ قبریں کھودنا ممکن نہ تھا۔ باہر سے آنے والے آدمیوں میں نصف سے زیادہ زخمی تھے اور باقی بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال۔ اس لیے ان کی طرف فوری توجّہ کی ضرورت تھی۔ سلیم نے چچا غلام حیدر کے مشورے سے ایک لمبی سی کھائی کھدوائی اور سب لاشوں کو ایک قطار میں لٹا کر مٹّی ڈال دی گئی۔

افضل اور اسماعیل کو سب سے آخر میں دفن کیا گیا۔ جب اسماعیل کی لاش پر مٹّی ڈالی جارہی تھی تو کاکو عیسائی نے کہا۔ ”آج ہمارا گاؤں مر چکا ہے۔ آج کے بعد اس بستی کے لوگ ہنسنا بھول جائیں گے۔ میاں سلیم!

چودھری رمضان کی لاش ابھی تک کچھمن سنگھ کے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔ میں دیکھ آیا ہوں۔ اسماعیل کہا کرتا تھا کہ ہماری قبریں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گی۔ ہم اسے لے آتے ہیں۔ اسے یہیں دفن کروا دیجیے۔"

سلیم کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "جاؤ ان سب کی لاشیں لے آؤ!"

رمضان کو اسماعیل کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ سلیم بالا خانے سے وہ ٹوٹا ہوا جھنڈا اُٹھا لایا جس کا ہلال اور ستارہ اسماعیل کے خون سے سُرخ ہو چکا تھا۔ اس نے پرچم کو ایک لاٹھی کے ساتھ باندھا اور اسماعیل کی قبر پر گاڑ دیا۔

گھر میں عورتیں بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے لیے کھانا تیّار کر چکی تھیں۔ مجید مورچے بنوانے کے بعد نیچے اُترا اور آدمیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھو بھئی میں جانتا ہوں کہ تم میں سے کسی کا کھانے کو جی نہیں چاہتا لیکن تمہیں دل پر جبر کر کے دو دو چار چار لقمے

ضرور کھا لینے چاہئیں۔ خدا معلوم صبح کو کھانے کا وقت ملے گا یا نہیں۔ اور بھوکے رہ کر ہم زیادہ دیر نہیں لڑ سکیں گے!"

مجید کے اشارے سے چند آدمیوں نے زمین پر چٹائی بچھا دی اور اس پر اُبلے ہوئے نمکین چاول کے چند طشت لا کر رکھ دیے۔ قدرے تذبذب کے بعد چند آدمیوں نے پہل کی اور باقی ان کی دیکھا دیکھی کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

باہر سے کسی نے پھاٹک کو دھکا دیتے ہوئے آواز دی۔ "پھاٹک کھولو!"

مجید نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "میں فجّو ہوں!"

"فجّو! تمہیں اُن کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں ابھی تمہاری طرف آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

"صوبیدار میں انہیں ساتھ لے آیا ہوں، میں پیاس سے مر رہا تھا!"

"بھئی ان کا خیال رکھو کہیں بھاگ نہ جائیں!"

"جی آپ فکر نہ کریں۔ یہ بھاگ نہیں سکتے۔ میں نے انہیں اچھی طرح باندھ رکھا ہے!"

"اب دروازہ نہیں کھل سکتا۔ ٹھہرو! میں آتا ہوں!" یہ کہتے ہوئے مجید دیوار پھاند کر باہر نکل گیا۔

رام چند اور کندن لال دونوں عام انسانوں سے بھاری تھے۔ تاہم مجید اور فجّو نے معمولی جدوجہد کے بعد انہیں اُٹھا کر دیوار کے اوپر سے اندر لڑھکا دیا۔

سلیم نے ان پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور لوگ انہیں پہچان کر اُن کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ سلیم اور مجید نے ابھی تک کسی سے ان کا ذکر نہیں کیا تھا اور لوگ حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"یہ رام چند ہے۔ یہ رام چندر ہے۔" ان کے گاؤں کا ایک نوجوان چلّاتا ہوا آگے بڑھا اور رام چند پر ٹوٹ پڑا۔ رام چند اس کے ایک ہی مکّے سے

گر پڑا۔ اس نوجوان کا ایک اور ساتھی کندن لال پر پل پڑا۔ سلیم اور مجید نے انہیں بڑی مشکل سے علیحدہ کیا۔ رام چندر پر حملہ کرنے والا نوجوان اپنے ساتھی کی نسبت زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجید نے اس کے بازو پکڑ رکھے تھے اور وہ چلّا رہا تھا۔

''صوبیدار جی! آپ کو اس کا پتہ نہیں۔ یہ ہمارا سب سے بڑا دُشمن ہے۔ آپ کے اپنے گاؤں پر حملہ کرنے والے سکھوں کو اسی نے جمع کیا تھا۔ اس نے انہیں بندوقیں لا کر دی تھیں۔ جتھّے کے ساتھ میں نے اس کی تقریر سُنی تھی۔ یہ انہیں کہہ رہا تھا کہ ایک مسلمان کو بھی زندہ مت چھوڑو۔ اگر یہ بدمعاشی نہ کرتا تو مہندر سنگھ نے سکھوں کو روک لیا ہوتا۔ اسے زندہ چھوڑنا گناہ ہے۔''

ایک بوڑھا آدمی غلام حیدر کی طرف متوجّہ ہو کر بولا۔ ''چودھری! میں نے بھی اس کی باتیں سُنی تھیں۔ یہ کہتا تھا: ''رحمت علی کے گھر سے ڈولیاں لے کر آؤ لیکن خدا بڑا کارساز ہے۔ ان سکھوں کی ایک ٹولی اس کے اپنے گھر سے ڈولیاں لے گئی ہیں۔'' پھر وہ رام چند کی طرف متوجّہ

ہوا۔ ”سیٹھ جی! آج ہم نے تمہارے گھر میں خالصتان دیکھا ہے۔ وہ تمہاری کو شلیا اور سرلا کو لے گئے ہیں اور تمہاری بیوی کو ادھ موا کر کے چھوڑ گئے ہیں۔ رام چند! تم انہیں کہتے تھے کہ مسلمانوں کو یہاں مت چھوڑو۔۔۔ ہم جانتے ہیں کہ اب ہم یہاں نہیں رہ سکیں گے لیکن تم کبھی یہاں نہیں رہو گے، جن کتّوں کو تم نے ہمارے پیچھے چھوڑا ہے، وہ تمہیں بھی کاٹیں گے۔“

رام چند کا خون اضطراب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ چلّایا۔ ”تم جھوٹ کہتے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم تمہارے قبضے میں ہیں اور تم ہمیں زندہ نہیں چھوڑو گے لیکن سکھ یہ جرأت نہیں کر سکتے۔“

بوڑھے آدمی نے طیش میں آ کر کہا۔ ”معاش! جو آگ پڑوسی کے گھر کو لگائی جائے وہ اپنے گھر کو بھی جلا دیتی ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو گاؤں کے دوسرے آدمیوں سے پوچھ لے۔“

ایک اور آدمی بولا۔ ”چودھری جی! اگر وہ اس کے گھر کا مال اسباب لوٹنے اور عورتوں کی آبروریزی میں مصروف نہ ہو جاتے تو ہمیں بچ کر نکلنے کا

موقع نہ ملتا۔ وہ ڈولیوں کے ساتھ اس کے گھر سے جہیز بھی لے گئے!"

رام چن تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد چلّایا۔ "میں نے اپنے کیے کا پھل پایا ہے۔ میاں سلیم میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس کے بعد تمہیں میرا اعتبار نہیں آئے گا۔ لیکن تم اگر چھوڑ دو تو میں سکھوں سے بدلہ لے سکتا ہوں۔ ہندوستان پر کانگریس کی حکومت ہے۔ وہ سکھوں کی اس حرکت کو برداشت نہیں کرے گی۔ میں مشرقی پنجاب کے ہندو وزیروں اور گورنر کے پاس جاؤں گا۔ میں انہیں سمجھاؤں گا کہ تم سانپوں کو پال رہے ہو۔ میں سردار پٹیل اور نہرو کے پاس جاؤں گا۔ تم دیکھو گئے کہ وہ ان کتّوں کو تھپکیاں دینے کی بجائے ان کے آگے زہر ڈالنے کی لیے تیار ہو جائیں گے!"

سلیم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "سیٹھ رام چند کوئی بات نہیں۔ گوشت کھانے والے کتّے کبھی کبھی مالک کے ہاتھ سے بھی بوٹی چھین لیتے ہیں۔ تمہارے وزیر تمہارا گورنر، تمہارے پٹیل اور نہرو مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو ختم کروانا چاہتے ہیں اور یہ کام انہوں نے سکھوں کے سپرد کیا

ہے۔ جب تک یہ کام پورا نہیں ہو جاتا، وہ سکھوں کی ہر حرکت برداشت کریں گے۔ تمہاری سرلا اور کوشلیا کو وہ اپنی خدمات کا انعام سمجھ کر لے گئے ہیں۔“

مجید نے کہا۔ ”وقت ضائع نہ کرو سلیم۔ یوسف تم انہیں کھانا اور پانی دو۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ انہیں قتل نہیں کریں گے لیکن مسلمانوں کو ایک بِل سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا۔ میں یہ ماننے کے لیے تیّار نہیں کہ اگر انہیں چھوڑ دیا جائے تو یہ دوبارہ شرارت نہیں کریں گے۔ ان کے پاؤں میں گھوڑوں کی زنجیریں ڈال دو اور انہیں گنڈیال کے اندر بند کر دو۔“

☆☆☆☆☆

باہر سے آنے والے آدمیوں میں سات سابق فوجی تھے۔ مجید کے کہنے پر ناتجربہ کار آدمیوں نے اپنی بندوقیں ان کے حوالہ کر دیں۔ ایک عمر رسیدہ آدمی جس کے جسم پر ایک تہہ بند کے سوا کچھ نہ تھا، آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ ”مجھے بھی ایک رائفل دے دو!“

مجید کے تذبذب سے وہ پھر بولا۔ ”میں ایک ریٹائرڈ جمعدار ہوں۔“

مجید اور بھی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک اور آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ یہ ہمارے گاؤں کے ہیں۔ جب حملہ ہوا تھا، یہ گاؤں سے باہر نہر میں نہا رہے تھے۔ فجّو پہلوان نے آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ ”ارے یہ تو جمعدار عنایت علی ہیں!“

سلیم اور مجید نے مسجد کی چھت کا مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ غلام حیدر اور گھر کے دوسرے نوجوان مکانوں کی چھتوں ہر پہرا دے رہے تھے۔ داؤد چند آدمیوں کے ساتھ حویلی سے باہر گشت کر رہا تھا۔ بشیر نے ایک ٹولی کے ساتھ گاؤں میں چکر لگانے کے بعد اسے اِطّلاع دی۔ ”سکھوں کے تمام گھر خالی ہو چکے ہیں لیکن اِندر سنگھ کے گھر میں کسی عورت کے رونے کی آواز آ رہی۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ شاید اِندر سنگھ کے بیٹے اندر چھپے ہوئے ہوں۔ آج وہ جتھے کے ساتھ تھے اور وہ شیر سنگھ جس پر افضل جان دیا کرتا تھا آج نظر ہی نہیں آیا!“

داؤد نے اپنے ساتھیوں سے طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”تم یہیں رہو، میں

ابھی آتا ہوں۔ آؤ بشیر میرے ساتھ!" تھوڑی دیر بعد بشیر اور داؤد اِندر سنگھ کے مکان کی چار دیواری سے باہر کھڑے تھے۔ اندر سے کسی عورت کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ داؤد ایک لمحہ توقّف کے بعد دیوار پر چڑھا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ صحن میں کوئی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور رونے والی عورت اس کے قریب زمین پر بیٹھی تھی۔

داؤد نے مُڑ کر بشیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مجھے رائفل اور ٹارچ دے دو اور جب تک میں نہ بُلاؤں تم یہیں ٹھہرو!"

بشیر نے دونوں چیزیں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ داؤد نے ٹارچ کی روشنی میں اندر کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی اور ایک سفید ریش بوڑھے کے سوا کوئی نہ تھا۔ لڑکی نے اچانک گردن اوپر اٹھائی اور خوفزدہ ہو کر کہا۔ "کون ہے؟"

داؤد نے اس کے جواب میں ٹارچ کی روشنی اُس کے چہرے پر ڈال دی۔ لڑکی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی لیکن بستر پر لیٹا بوڑھا جوں کا توں پڑا رہا۔

داؤد نے دیوار پر کھڑے ہو کر چھت پر روشنی ڈالی اور پھر مُڑ کر بشیر کی طرف اشارہ کرنے کے بعد نیچے کودا۔

"تم کون ہو؟" لڑکی بُلند آواز سے چلاّئی اور خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔

"شور مت کرو۔ یہاں تمہاری آواز سُننے والا کوئی نہیں۔" داؤد یہ کہتے ہوئے چارپائی کے قریب پہنچ کر لیٹے ہوئے آدمی کی طرف متوجّہ ہوا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے صحن کے ایک کونے میں پہنچ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اسے کچھ نہ کہو۔ یہ پہلے ہی مر چکا ہے۔ اسے لقوہ ہو گیا ہے!" بشیر نے دیوار کے اوپر سے کودتے ہوئے کہا۔ "یہ اِندر سنگھ ہے۔ اس نے آج بابا رحمت علی سے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ یہ انہیں کہتا تھا کہ آج تمہارے گھر بارات آئی ہے۔"

داؤد نے کچھ کہے بغیر اپنی رائفل بشیر کے ہاتھ میں دے دی اور لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی دوڑ کر دیوار کے ساتھ مویشیوں کی کھرلی پر چڑھ گئی اور وہاں سے دیوار پھاندنے کی کوشش کرنے لگی لیکن داؤد نے تیزی سے

آگے بڑھ کر اسے کھینچ لیا۔ لڑکی داؤد کے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں بے بس ہو کر چیخیں مار رہی تھی۔ داؤد اُسے گھسیٹتا ہوا اِندر سنگھ کی چارپائی کے قریب لے آیا اور بولا۔ ”اِندر سنگھ! تو نے صرف دوسروں کے گھروں میں آگ لگانا سیکھا ہے، اپنا گھر جلتا نہیں دیکھا؟“

لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہاری دُشمن نہیں ہوں۔ میں گلاب سنگھ کی بہن ہوں۔ میں شیر سنگھ کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ مسلمانوں کا دوست ہے!“

”ہم تمہاری دوستی دیکھ چکے ہیں!“ داؤد نے لڑکی کو دھکّا دے کر زمین پر پھینک دیا اور اپنی جیب سے چاقو نکال لیا۔

بشیر نے رائفلیں زمین پر رکھ دیں اور آگے بڑھ کر داؤد کے ساتھ لپٹ گیا۔ داؤد چلّایا۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ تم نہیں جانتے، انہوں نے میری ماں، میری بیوی، میری بہنوں اور میرے باپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ میرے گھر پر حملہ کرنے والے ہمارے وہ پڑوسی تھے جن کے گھروں پر میں نے ڈیڑھ مہینہ پہرہ دیا تھا۔ میں نے ان کی خاطر اپنی چھٹیوں کی تمام

راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ آج میرا باپ مر رہا تھا اور میں اس کے لیے شہر سے دوائی لینے گیا تھا اور وہ جتھّا لے کر آ گئے۔ انہوں نے میرے باپ کو قتل کیا۔ میری ماں اور میرے تین بچّوں کو کوٹھری میں بند کر کے آگ لگا دی۔ میری بہنوں نے آبرو بچانے کو کوشش کی مگر وہ انہیں پکڑ کر مسجد میں لے گئے۔۔۔۔ اور وہاں۔۔۔۔۔! مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔"

داؤد نے جوش میں آ کر بشیر کی کلائیاں مروڑ ڈالیں اور اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ اتنی دیر میں لڑکی دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی اور کنڈی کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کنڈی نہ کھول سکے اور داؤد نے آگے بڑھ کر پھر اسے پکڑ لیا۔ وہ اب پوری طاقت سے چیخیں مار رہی تھی اور داؤد نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر دروازے کے ساتھ بھینچ رکھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی مجھے سلیم کے گھر لے چلو۔ میں نے اسے بھائی بنایا تھا۔ وہ مجھے بہن کہا کرتا ہے۔ چچا افضل مجھے بیٹی کہا کرتا ہے۔"

داؤد نے ایک ہاتھ اُس کی گردن پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے چاقو بُلند کیا۔ لڑکی اچانک خاموش ہو گئی اور پھر گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس سے تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو مجھے مار ڈالو۔ دیکھتے کیا ہو؟ جلدی کرو؟''

داؤد نے قدرے متاثر ہو کر کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتا جو انہوں نے میری بیوی سے کیا ہے۔ تمہیں مرتے وقت اتنی تکلیف نہیں ہو گی۔۔۔''

لڑکی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ داؤد نے چاقو کی نوک اُس کے سینے پر رکھ دی لیکن اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے پسینے کے قطرے گر رہے تھے۔ لڑکی نے کہا۔ ''اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تو تم یوں نہ کرتے!'' داؤد نے اچانک کپکپی لی اور پیچھے ہٹ کر چاقو ایک طرف پھینک دیا۔ بشیر نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

کسی نے دروازے کو دھکّا دیتے ہوئے آواز دی۔ ''داؤد۔۔۔بشیر!''

"کون؟ سلیم؟" بشیر نے سوال کیا۔

"ہاں، دروازہ کھولو۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

بشیر نے دروازہ کھول دیا۔ سلیم چند آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ لڑکی نے جلدی سے سلیم کا بازو پکڑ لیا اور روتے ہوئے کہا۔ "بھائی دوسروں کو یہاں بھیجنے کی بجائے تم نے خود یہاں آکر میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ ڈالا؟"

"کون؟ روپا! تو یہ تمہاری چیخیں تھیں؟"

لڑکی کی خاموشی پر داؤد نے جواب دیا۔ "ہاں اس کی چیخیں تھیں۔ میں اسے قتل کرنے آیا تھا۔ میں اپنے باپ، اپنی ماں، اپنی بہنوں اور اپنے بیوی بچّوں کا انتقام لینے آیا تھا لیکن مجھ میں ہمّت نہ تھی۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ میں کسی پر رحم نہیں کروں گا۔ میں نے اسے بوڑھے کا گلا گھونٹنا چاہا لیکن میرے ہاتھ نہ اُٹھ سکے۔ میں نے اس لڑکی سے اپنی بیوی اور بہنوں کا انتقام لینا چاہا لیکن میرے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔ داؤد! کیا

کر رہے ہو، یہ بھی کسی کی بہن ہے۔ سلیم میں بُزدل ہوں!"

سلیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم بزدل نہیں ہو داؤد! میں چیخیں سُن کر باہر نکلا تو مجھے پتہ چلا کہ اس طرف تم آئے ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ تم کسی عورت پر ہاتھ اٹھاؤ گے۔ یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں!" پھر قدرے توقّف کے بعد اس نے جوش میں آ کر کہا۔ "ہم انسانیت کے ان دُشمنوں سے انتقام لیں گے۔ ہم اس قوم کو معاف نہیں کریں گے جس نے ہمارے احسانات کا یہ بدلہ دیا لیکن ہماری تلواریں مردوں کی تلواروں سے ٹکرائیں گی، بے کس عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں پر نہیں اُٹھیں گی۔ ان مظالم کا جواب کسی دِن پانی پت کے میدان میں دیا جائے گا لیکن ابھی شاید وہ وقت نہیں آیا۔"

سلیم نے آگے بڑھ کر ٹارچ کی روشنی میں اِندر سنگھ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن ان میں آواز نہ تھی۔

بشیر بولا۔ "اس پر فالج گرا ہے۔"

سلیم لڑکی کی طرف متوجّہ ہوا۔ ”روپا! گاؤں کے تمام سکھ چلے گئے ہیں۔ میں صبح تک تمہاری حفاظت کا ذمّہ لے سکتا ہوں لیکن اس کے بعد خدا معلوم کیا ہو۔ دور دور سے مسلمان ہمارے گاؤں کی طرف آ رہے ہیں، ان کے دل جلے ہوئے ہیں۔ تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے تھا؟“

”بھیّا! میرے چچا، بابا کو اس حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے لیکن میں ان کے ساتھ نہ جا سکی۔ وہ مجھے کھینچتے تھے لیکن میرے بھائی کی لاش یہاں پڑی ہوئی تھی اور بابا کی یہ حالت تھی۔ باپو کا کچھ پتا نہیں، کہتے ہیں وہ کہیں شراب میں بے ہوش پڑا ہے۔ اگر وہ چچا افضل کے ساتھ ہوتا تو شراب نہ پیتا۔ میں چچیوں کے ساتھ باہر نکلتے ہی گنّوں کے کھیت میں چھپ گئی تھی۔ وہ چلے گئے تو یہاں آ گئی۔“

سلیم نے کہا۔ ”تمہاری ماں کہاں ہے ؟“

”وہ تو پہلے ہی اپنے میکے چلی گئی تھی ؟“

سلیم نے کہا۔ ”روپا! تمہارا بھائی ہماری خاطر مارا گیا ہے۔ میں اس کی لاش

یہاں پہنچادیتا ہوں!“

”نہیں! نہیں! میں اس کی لاش نہیں دیکھ سکوں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو!“

”لیکن تمہارا دادا؟“

لڑکی خاموش ہو گئی۔ سلیم نے کہا۔ ”دیکو روپا! گلاب سنگھ کی بہن کے لیے میرے گھر کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا لیکن تم وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکو گی۔ تم ان بچّوں کو نہیں دکھ سکو گی جو تمہاری قوم کے ہاتھوں یتیم بن گئے ہیں۔ تم بیواؤں اور زخمیوں کی آہیں نہیں سُن سکو گی۔۔۔ اور اب وہ گھر محفوظ بھی نہیں۔ ہم شاید صبح کا سورج دکھ سکیں اور اگلی رات کے ستارے نہ دیکھ سکیں۔ تم یہیں رہو میرے آدمی گلی میں پہرا دیتے رہیں گے۔۔۔“

روپا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ چچا افضل آئے گا اور مجھے کہے گا۔ روپا بیٹی! تمہیں یہاں اکیلی بیٹھے ڈر نہیں

لگتا۔ چلو میرے گھر چلو۔ تم خود ہی کیوں نہ آ گئیں وہاں۔۔۔"

سلیم نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "چچا افضل اب ضبط تمہیں بلانے نہیں آسکتے!"

روپا دم بخود ہو کر سلیم کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہو کر بولا۔ "چلو داؤد!" جب وہ باہر نکل رہے تھے تو روپا نے اچانک آگے بڑھ کر سلیم کا بازو پکڑ لیا۔ "سلیم! سلیم! مجھے بتا کر جاؤ، چچا افضل کو کیا ہوا؟"

"وہ شہید ہو چکے ہیں!"

روپا سلیم کا ہاتھ چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "روپا دروازہ اندر سے بند کر لو!"

☆☆☆☆☆

طلوعِ آفتاب تک سلیم کے گاؤں میں پناہ گزینوں کے تین اور قافلے آ چکے تھے اور ان کی مجموعی تعداد سات سو تک پہنچ چکی تھی۔ آخری قافلے

کے ساتھ چند آدمی ایسے بھی تھے جو دریائے بیاس عبور کر کے ساری رات چلنے کے بعد یہاں پہنچے تھے اور وہ یہ اِطّلاع دے چکے تھے کہ ان کے پیچھے دو ہزار آدمیوں کا ایک قافلہ اس طرف آرہا ہے اور وہ دوپہر تک پہنچ جائے گا!"

آٹھ بجے سکھوں نے حملہ کیا۔ اکال سینا کے ہراول میں باؤنڈری فورس کے وہ سکھ، گورکھا، ڈوگرہ اور مرہٹہ سپاہی تھے، جنہیں مسلمانوں کے خون سے آزاد ہندوستان کی تاریخ کا پہلا باب لکھنے کا کام سونپا گیا تھا۔ ان کے ساتھ پولیس کے آدمی بھی تھے اور ان رائفلوں اور اسٹین گنوں سے مسلح حملہ آوروں کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی۔ جتھے میں کوئی دو ہزار کے قریب آدمی تھے۔ جن میں سے پندرہ بیس کے پاس بندوقیں، دیسی اور ولائتی رائفلیں اور پستول تھے۔ باقی تمام نیزوں، کرپانوں اور برچھیوں سے مسلح تھے۔ ماجھے کے علاقے کے پچاس آدمی گھوڑوں پر سوار تھے۔ فوج کے سپاہیوں نے دو فوجی ٹرک جن کا آگے لانا مشکل تھا، سڑک پر چھوڑ دیئے اور تین جیپیں سڑک سے نیچے اُتار کر گاؤں سے دو

تین فرلانگ کے فاصلے پر لے آئے۔

مشرقی پنجاب کے دیہات میں اکال سینا کے حملہ آوروں کا ایک طریق کار یہ تھا کہ پہلے فوج اور پولیس مسلمانوں کے گھروں کے دروازے کھلوا کر اُن کی تلاشی لیتی تھی۔ پھر انہیں حکم دیا جاتا کہ وہ اتنی دیر کے اندر اندر گاؤں خالی کر دیں۔ لوگ گاؤں سے نکلتے تو باہر سے سکھوں کے جتھّے ان پر ٹوٹ پڑتے۔ اگر کہیں مزاحمت ہوتی تو فوج اور پولیس جدید ترین آلاتِ حرب سے کام لینے سے دریغ نہ کرتی۔

بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں فوج کرفیو لگا دیتی۔ فوج کے سپاہی گلیوں اور بازاروں میں گشت لگاتے اور اس بات کا خیال رکھتے کہ کوئی مسلمان گھر سے باہر جھانک کر بھی نہ دیکھے۔ اس کے بعد سکھوں کے جتھّے حملہ کرتے اور لوگوں کے گھروں میں یا تو آگ لگا دیتے یا انہیں قتل کر ڈالتے۔ جو بھاگنے کی کوشش کرتے، ان پر فوج گولیاں برساتی اور جو اندر رہتے وہ جل جاتے۔

چھوٹی چھوٹی بستیوں پر جہاں سے مزاحمت کی توقع بہت کم ہوتی، سکھ فوج

کی مدد کے بغیر بھی حملہ کر دیتے تھے۔ رات کے وقت ایک ٹولی گاؤں میں داخل ہوتی اور مٹّی کا تیل یا پٹرول چھڑک کر چند گھروں کو آگ لگا دیتی۔ لوگ چیختے چلّاتے باہر نکلتے تو ان پر گاؤں کے ارد گرد چھپا ہوا جتھا حملہ کر دیتا۔ سلیم کے گاؤں پر حملہ کرنے والا لشکر جس نے گزشتہ دو دن ارد گرد کی بستیوں میں کوئی قابلِ ذکر نقصان اٹھائے بغیر نہتوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی، اب ایک تلخ حقیقت کا سامنا کر رہا تھا۔ تارا سنگھ اور پٹیل کے ان سورماؤں کے سامنے لڑنے سے زیادہ قتل کرنے کا پروگرام تھا لیکن ان کے سامنے اب ایک نیا ہدف تھا جہاں گولیوں کا جواب گولیوں سے ملنے کی توقع تھی۔

لڑائی شروع ہونے سے پہلے ایک سوار گھوڑا بھگاتا ہوا مکان کے پچھواڑے کی طرف نمودار ہوا۔ کوئی دو سو گز کے فاصلے پر اس نے گھوڑا روکا اور ایک لمحہ توقّف کے بعد اپنا ایک ہاتھ بُلند کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

نچلی چھت پر مٹّی کی بوریوں کے مورچوں میں بیٹھے ہوئے آدمی اس کی

طرف اپنی رائفلیں سیدھی کر کے بالا خانے سے مجید کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔

سوار وہی تھانیدار تھا جو ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد علاقے میں اکال سینا کے جتھے دار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر بُلند آواز میں کہا۔ ”میں صوبیدار مجید سے بات کرنے آیا ہوں!“

مجید نے منڈیر سے باہر جھانک کر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”آگے مت آؤ، وہیں سے بات کرو!“

جتھے دار نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔ ”میرے ہاتھ خالی ہیں، تم دیکھ سکتے ہو!“

”کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ مجید بولا۔

”میں تمہیں حفاظت سے پاکستان تک پہنچانے کے لیے فوج لے کر آیا ہوں۔ تم اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دو تو تمہاری جانیں بچ سکتی ہیں۔ ورنہ تم دیکھ سکتے ہو کی اکال سینا کے دو ہزار آدمی چند منٹ میں تمہارے

گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔"

مجید نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم فوج کو لے جاؤ اور اکال سینا کے ساتھ ہم نپٹ لیں گے!"

جتھے دار نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم بہت ضدّی ہو لیکن اگر تم نے جتھے کا مقابلہ کیا تو شاید فوج بھی تم پر حملہ کر دے۔ تم جانتے ہو کہ تم زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"میں جانتا ہوں کہ فوج جتھے کی راہ نمائی کے لیے آئی ہے!"

"صوبیدار! یہ غلط ہے۔ فوج کو میں لایا ہوں اور اس لیے لایا ہوں کہ تمہارے خاندان نے اس سے پہلے علاقے کے سکھوں کی حفاظت کی ہے۔ تمہارے آدمیوں نے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے اپنی بندوقیں بھی میرے حوالے کر دی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ کل مجھے بہت دیر کے بعد اطلاع ملی، ورنہ میں کل بھی سکھوں کو حملہ کرنے سے روکتا!"

"تم کل رام چند کے گاؤں میں انہیں روکنے کے لیے گئے تو تھے؟"

جتھے دار بدحواس ہو کر مجید کی طرف دیکھنے لگا اور پھر سنبھل کر بولا۔ "آخر کب تک مقابلہ کرو گے۔ باؤنڈری فورس کا کوئی مسلمان سپاہی اس علاقہ میں نہیں!"

"ہم ان کا انتظار کریں گے۔"

"صوبیدار! میں سمجھتا تھا کہ تم سپاہی ہو اور بے فائدہ اپنے آدمیوں کی جانیں گنوانا پسند نہیں کرو گے۔ فوج تمہیں چند منٹ کے اندر اندر ختم کر دے گی اور اس کے بعد عورتوں اور بچّوں کا انجام بہت ہی بُرا ہو گا۔ فوج کا کپتان تمہیں اپنا ورڈ آف آنر دینے کے لیے تیّار ہے۔ کہو تو میں بھی گرنتھ پر ہاتھ رکھ کہ تمہاری حفاظت کا ذمّہ لینے کو تیّار ہوں!"

مجید نے قدرے سختی سے کہا۔ "تم یا تو خود احمق ہو یا مجھے احمق سمجھتے ہو۔ جاؤ اپنے کپتان سے کہو کہ ہم پیٹھ پر گولیاں کھانے کی بجائے انہیں اپنے سینوں پر روکنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اسے کہو کہ میں اپنے ہاتھ میں ٹوٹی

ہوئی تلوار کو ساری سکھ قوم کے ورڈ آف آنر پر ترجیح دوں گا!"

جتھے دار نے گھوڑے کی باگ موڑ کر باڑ لگا دی۔ داؤد نے اپنی رائفل اس کی طرف سیدھی کر دی لیکن مجید نے اس کا ہاتھ پڑتے ہوئے کہا۔ "نہیں داؤد، وہ ایلچی بن کر آیا تھا۔"

جتھے دار کے واپس لوٹتے ہی حملہ آوروں میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور آٹھ دس منٹ کے بعد مکان پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ بارود کی کمی کے پیشِ نظر مجید اپنے آدمیوں کو ہدایات دے چکا تھا کہ جب تک دُشمن اُن کی زد میں نہ آئے، وہ فائر نہ کریں۔ چنانچہ کوئی ایک گھنٹے تک انہوں نے حملہ آوروں کی گولیوں کا جواب نہ دیا۔

سلیم چند آدمیوں کے ساتھ مسجد کا مورچہ سنبھالے ہوا تھا۔ اچانک اسے ساتھ والے کھیت میں گنّوں کے پتّے ہلتے ہوئے دکھائی دیے۔ اپنے ساتھیوں کو اس طرف متوجّہ کرنے کے بعد اس نے ایک کنکر اُٹھا کر باہر کی حویلی میں مویشیوں کے ایک کمرے کی چھت پر پھنکی۔ وہاں سے چند آدمی اس کی طرف متوجّہ ہوئے اور اس نے ہاتھ سے کھیت کی طرف

اشارہ کر دیا۔ انہوں نے اگلی چھتوں پر یہ اِطّلاع پہنچا دی۔ مجید نے بالا خانے کی چھت سے یہ اندازہ لگایا کہ گنّوں کے کھیتوں کی طرف سے حملہ آوروں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس طرف آ رہی ہے۔ وہ داؤد کو چند ہدایات دینے کے بعد بالائی منزل کی چھت سے نچلی چھت پر آ گیا۔ گولیوں کی بارش میں وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اُس کونے پر جا پہنچا جو کھیت سے قریب تر تھا۔ سلیم مسجد کی چھت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجید نے اپنے تھیلے سے دستی بم نکال کر اُسے دکھایا اور کھیت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس کے جواب میں سلیم نے بھی اُسے دستی بم دکھایا۔

کھیت میں اب پتّوں کے ہلنے کے علاوہ ہلکی ہلکی سرسراہٹ بھی سُنائی دے رہی تھی۔ اچانک پندرہ بیس آدمیوں کی ایک ٹولی کھیت کی منڈیر پھاند کر ”ست سری اکال“ کے نعرے لگاتی ہوئی آگے بڑھی۔

”فائر!“ مجید بُلند آواز میں چلّایا۔

دس آدمی کھیت سے باہر نکلتے ہی ڈھیر ہو گئے۔ تین آدمیوں نے آگے بڑھ کر دستی بم پھینکنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ایک

آدمی بم پھینکتے پھینکتے سینے میں گولی کھا کر گرا اور بم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھٹ گیا، اس کے ساتھ ہی اڑھائی تین سو آدمی منڈیر کی آڑ سے نمودار ہوئے۔ مجید نے یکے بعد دیگرے دو دستی بم پھینکے اور وہ پندرہ بیس لاشیں چھوڑ کر چیختے چلاّتے پھر کھیت میں جا گھُسے۔ مجید کے حکم سے چھت کے مورچوں میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے کھیت میں اندھا دُھند فائر شروع کر دیے اور وہاں سے زخمی ہونے والوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ گنّوں کے پتّوں کی سرسراہٹ اور ٹوٹتے ہوئے گنّوں کی آواز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کھیت میں مویشیوں کے ریوڑ بے تحاشا اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔

مسجد کی طرف سلیم کوئی دس گز کے فاصلے پر کھیت کے کونے میں چند آدمیوں کو جمع ہوتے دیکھ چکا تھا۔ جب چھت سے فائر شروع ہوئے تو آدمیوں کی ایک اور ٹولی اس طرف آگئی۔ پانچ آدمی پیٹ کے بل رینگتے ہوئے کھیت سے باہر نکلے اور اچانک اُٹھ کر باہر کی حویلی کی طرف بھاگنے لگے۔ سلیم کے ساتھیوں نے مسجد کی چھت سے ان پر گولیاں برسائیں۔

دو آدمی گر پڑے، لیکن تیسرے نے گرتے گرتے حویلی کے اندر دستی بم پھینک دیا۔ باقی دو آدمیوں نے دیوار کے قریب پہنچ کر بم پھینکے۔ ایک بم مویشیوں کے ایک کمرے کی چھت اور دوسرا حویلی کے صحن میں گرا۔ مسجد کی چھت سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور یہ دونوں سکھ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ کھیت میں جمع ہونے والے باقی آدمیوں نے باہر آنے کی جرأت نہ کی۔ کسی نے وہاں سے مسجد کی طرف بم پھینکا لیکن وہ مسجد سے چند قدم دور ہی گر کر پھٹ گیا۔

سلیم نے یکّے بعد دیگرے دو بم کھیت میں پھینکے اور ان کے گرتے ہی زخمیوں کی چیخیں اور بھاگنے والوں کا شور سنائی دینے لگا۔ حملہ آوروں کے فوجی مددگار مغرب کی طرف کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر مورچے بنا کر اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔ اس کا صرف یہ اثر ہوا کہ چند جوشیلے نوجوان جنھوں نے حویلی سے باہر نکل کر کھیت میں چھپنے والوں کا تعاقب کرنے کی کوشش کی، وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے نہ جا سکے۔

مجید اور ان کے ساتھی فوج کی گولیوں کا جواب دینے کی بجائے زیادہ تر

کھیت کی طرف توجّہ دے رہے تھے۔ کھیت میں جہاں بھی کوئی پتّا ہلتا، وہ بے دریغ فائر کر دیتے۔ کھیت میں چھپا ہوا ایک سکھ چلّا چلّا کر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ ''گیان سنگھ، کرتار سنگھ، بڈھا سنگھ یہاں سے بھاگ جاؤ، یہ گاؤں کے لوگ نہیں اس مکان میں بلوچ رجمنٹ کے سپاہی چھپے ہوئے ہیں۔ ہماری فوج اور پولیس خود پیچھے ہے اور ہمیں آگے کر کے مروا رہی ہے!''

اس کا یہ کہنا تھا کہ کھیت میں مختلف اطراف سے بلوچ رجمنٹ، بلوچ رجمنٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی میں آس پاس کے تمام کھیتوں میں چھُپے ہوئے آدمی اپنے آدمیوں کو یہ پیغام پہنچا رہے تھے۔ ''بلوچ رجمنٹ آگئی، بلوچ رجمنٹ آگئی۔ بھاگو یہاں سے۔''

بلوچ رجمنٹ[۸] کا نام بموں اور گولیوں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔ تھوڑی

---

[۸] جب پاکستان کے حصّے کی بیشتر فوج ہندوستان سے باہر پڑی ہوئی تھی تو باؤنڈری فورس میں زیادہ تر بلوچ رجمنٹ مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی تھی۔ جب مشرقی پنجاب میں وحشت اور بربریت کا طوفان اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا تو شاید ذاتِ باری نے قوم کا تمام درد ان مُٹھّی بھر سپاہیوں کے سینوں میں بھر دیا تھا۔ یہ سپاہی سڑکوں اور راستوں پر پڑے ہوئے زخمیوں کو اُٹھاتے تھے۔ شہروں اور بستیوں کے مسلمانوں کو اکال سینا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندوستانی فوج اور پولیس کے محاصرے سے نکالتے تھے۔ پناہ گزینوں کی

دیر میں آس پاس کے کھیتوں میں زخمیوں کے کراہنے کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ اچانک کا کو عیسائی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے پھاٹک کے قریب پہنچ کر بُلند آواز میں کہا۔ ”ایک جتھا سکھوں کے محلّے کی گلی سے اس طرف آ رہا ہے۔ حویلی کے اندر جمع ہونے والے آدمیوں نے آن کی آن میں یہ اِطّلاع مجید تک پہنچا دی۔ وہ پانچ سات آدمیوں کو ساتھ لے کر باہر نکلا اور گلی کے موڑ پر سکھوں کے ایک خالی مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ دو آدمی بندوقوں کے ساتھ پہلے ہی اس جگہ پہرا دے رہے تھے۔ مجید نے اپنے تھیلے سے دستی بم نکالے اور ایک ایک بم اپنے ساتھ آنے والوں میں تقسیم کرنے کے بعد کہا۔ ”تم گلی کے آگے موڑ پر منڈیر کی آڑ میں لیٹے

گاڑیوں اور قافلوں کی حفاظت کرتے تھے۔ انہیں اپنی بھوک، پیاس، نیند اور تھکاوٹ کا احساس نہ تھا۔ وہ اپنی قلیل تعداد کے باوجود ہراساں نہ ہوئے۔ سکھوں کے جتھے انہیں دیکھ کر منتشر ہو جاتے۔ جہاں بلوچ رجمنٹ کے پانچ سپاہی پہنچ جاتے، وہاں تارا سنگھ اور پٹیل کے سورماؤں میں بھگدڑ مچ جاتی لیکن ہندوستان کا ڈیفنس منسٹر ایک سکھ تھا اور باؤنڈری فورس کی تشکیل میں اِس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا کہ مسلمان سپاہیوں کی قلیل تعداد بھی تعداد بھی قتل و غارت کے اس پروگرام میں رخنہ انداز نہ ہو جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مونٹ بیٹن نے پٹیل اور تارا سنگھ کی سرپرستی کی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے جس ایثار خلوص اور عزم و استقلال کا ثبوت دیا اور اس کے کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان کی دوسری افواج باہر نہ ہوتیں تو مشرقی پنجاب میں غیر مسلم فوج، پولیس، اکال سینا، سیوک سنگھ پٹیالہ، نابھ کپور تھلہ اور دوسری ہندو ریاستوں کے سپاہیوں کے مکمل اتّحاد کے باوجود لاکھوں مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح قتل نہ کیا جا سکتا۔ انتقالِ اختیارات میں لارڈ مونٹ بیٹن کی جلد بازی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پاکستان کو اس حصّے کا اسلحہ اور فوج مل جانے سے پہلے پہلے ہندوستان کی امن پسند حکومت کے جھنڈے کو مسلمانوں کے خون میں تیرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

رہو۔ جب تک میں پہل نہ کروں تم مت پھینکنا۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ آگے نکل جائیں۔ ہمارے پاس بہت تھوڑے بم ہیں۔ اس لیے جہاں رائفلیں کام دے سکیں وہاں انہیں استعمال نہ کرو۔"

یہ ہدایات دے کر مجید اُن دو آدمیوں کی طرف متوجّہ ہوا جو صبح سے وہاں پہرا دے رہے تھے۔ "تمہیں کسی نے دیکھ تو نہیں لیا؟"

ایک آدمی نے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر ہوئی ایک آدمی بیلا سنگھ کے مکان کی چھت پر کھڑا ہو کر یہ کہہ رہا تھا۔ اس طرف کوئی نہیں۔ ہم منڈیر کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔"

مجید نے کہا۔ "اس نے اگر تمہیں دیکھ نہیں لیا تو وہ گلی کے راستے ضرور آئیں گے۔"

کوئی پانچ منٹ کے بعد مجید کو گلی میں کچھ فاصلے پر پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے چھت سے سر اُٹھا کر دوسرے موڑ کی چھتّوں پر لیٹے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ اُن میں سے ایک نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور مجید

نے اس کے اشارے کا جواب دینے کے بعد پھر اپنا سر نیچے کر لیا اور اپنے قریب لیٹے ہوئے آدمیوں سے کہا۔ ”ہوشیار رہو۔ انشاء اللہ ہم ان سب کو ختم کر دیں گے۔ میرے خیال میں ان کے ساتھ فوج کے سپاہی نہیں ہیں ورنہ یہ چھتّوں پر قبضہ کرنے سے پہلے گلی میں نہ گھستے۔“

پاؤں کی آہٹ قریب آچکی تھی۔ کوئی دو سو کے قریب سکھ دبے پاؤں چلتے ہوئے دونوں موڑوں سے آگے نکل گئے۔ اچانک پیچھے سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کی ایک ٹولی آئی اور کسی نے بُلند آواز میں کہا۔ ”آگے مت جاؤ آگے مت جاؤ۔ وہاں بلوچ رجمنٹ ہے۔“

”بلوچ رجمنٹ۔ بلوچ رجمنٹ۔“ گلی کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک یہ آواز پہنچ گئی۔ سکھ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹھک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

مجید نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور ایک نوجوان نے گلی میں پچھلی طرف چند قدم دور دستی بم پھینک دیا اور باقی آدمیوں نے رائفلوں سے فائر شروع کر دیے۔ جتھے کے جو آدمی پیچھے تھے، وہ بلوچ رجمنٹ کے

نعرے لگاتے ہوئے اُلٹے پاؤں بھاگے اور جو آگے تھے وہ یہ سمجھ کر کہ بلوچ رجمنٹ پیچھے سے آرہی ہے۔ ایک دوسرے کو دھکیلتے اور شور مچاتے ہوئے آگے کی طرف بھاگے۔ مجید کے ساتھی چھتوں پر سے گولیاں برساتے ہوئے اُن کے ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ جب وہ دوسرے موڑ سے آگے نکلے تو مجید نے ایک بم پھینک دیا اور اس کے ساتھ باقی دو آدمیوں نے بھی فائر شروع کر دیے۔

سکھ بڑ کے بڑے کھلی جگہ پر پہنچ تو سلیم نے مسجد کی چھت سے دستی بم پھینکا۔ اس کے ساتھیوں نے فائر کیے اور اس کے ساتھ ہی برچھیوں، تلواروں اور لاٹھیوں سے مسلح مسلمانوں کا ہجوم حویلی کی دیوار پھاند کر ان پر ٹوٹ پڑا اور آن کی آن میں لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ چند سکھوں نے حویلی کے شمال کی طرف سے گلی کے راستے بھاگنے کی کوشش کی لیکن بالا خانے سے داؤد نے ایک دستی بم پھینکا اور دوسرے آدمیوں نے نچلی چھت سے اینٹیں برسانا شروع کر دیں۔ پچاس سکھ بدحواسی کی حالت میں جوہڑ میں کود پڑے۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو گولیوں سے بچ کر

دوسرے کنارے پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

دوسرے طرف ملٹری اور پولیس اصل محاذ سے منہ پھیر کر اکال سینا کی منتشر ٹولیوں کو جمع کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہی تھی۔ جتھے دار انہیں پنتھ کی عزّت کا واسطہ دے رہا تھا۔ فوجی انہیں بزدلی کے طعنے دے رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے گاؤں سے ایک میل دور جمع ہوئے۔ سکھ کپتان اور جتھے دار گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کے لیے تیّار تھے کہ اس علاقے میں بلوچ رجمنٹ کا ایک سپاہی بھی نہیں آیا لیکن سکھ ان کی باتوں پر یقین کرنے کے لیے تیّار نہ تھے۔ نہنگوں کے جتھے کا لیڈر بہت جوش میں تھا اور کہہ رہا تھا کہ ”ہم نے فوج کی بزدلی کی وجہ سے نقصان اٹھایا ہے۔“ ابھی بحث ہو رہی تھی گلی کے راستے حملہ کرنے والے جتھے کے بچے کھچے آدمی بھی ان کے ساتھ آ ملے۔

ان میں سے ایک آدمی نے، جس کے دو بھائی مارے جا چکے تھے، اس بحث میں حصّہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کپتان صاحب! تم کہتے ہو کہ ان کی حویلی میں بلوچ رجمنٹ کا کوئی سپاہی نہیں لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ سکھوں کے

تمام گھروں پر بھی اُن کا قبضہ ہے۔ ہم وہاں کئی سو لاشیں چھوڑ کر آئے ہیں۔" اس کے ساتھیوں نے اس بیان کی تصدیق کی تو باقی سکھ کپتان اور جتھے دار کے سر ہو گئے۔

ایک گیانی نے کہا۔ "تم لوگ ہمیں مروا رہے ہو، اگر وہاں بلوچ رجمنٹ نہیں تو تم آگے کیوں نہیں جاتے؟ ہم سینکڑوں آدمی مروا چکے ہیں اور تم ابھی تک ان کے مکان کی دیواروں پر نشانہ بازی کر رہے ہو!"

کپتان نے چلّا کر کہا۔ "میں گورو گرنتھ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ صرف دو گھنٹے کے اندر اندر اس گاؤں کو مٹّی کا ڈھیر بنا دوں گا۔ میں اپنے آدمیوں کو مشین گن اور مارٹر لانے کے لیے بھیج رہا ہوں۔

☆☆☆☆

دوپہر کے وقت سکھ گولیوں کی زد سے دور درختوں اور جھاڑیوں کی چھاؤں میں جمع ہو رہے تھے۔ فوج اور پولیس کے سپاہی اپنے مورچوں میں بیٹھ کر اِکا دُکا گولیاں برسا رہے تھے۔ مجید بالا خانے کی چھت سے ایک

جیپ کو واپس جاتے دیکھنے کے بعد کافی پریشان تھا۔ اس کے ساتھی جو اِدھر اُدھر پڑے ہوئے زخمیوں کی تین اسٹین گنیں، چار رائفلیں اور آٹھ دستی بم حاصل کر چکے تھے، اپنے گزشتہ کامیابی پر بہت خوش تھے۔

پانچ بجے کے قریب سلیم مسجد کی چھت سے اتر کر مجید کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ "مجید ایک جیپ واپس چلی گئی ہے۔"

"ہاں میں دیکھ چکا ہوں۔ اب وہ بہت کچھ لے کر آئیں گے۔ اب ہماری جنگ سکھوں سے نہیں بلکہ ہندوستانی فوج سے ہو گی اور ان سے بعید نہیں کہ وہ ہمارے مکان کو اس علاقے کا اسٹالن گراڈ سمجھ کر ٹینک اور ہوائی جہاز بھی میدان میں لے آئیں۔"

سلیم نے کہا۔ "شاید مسلمان سپاہیوں کا کوئی دوست اس طرف آ نکلے۔"

داؤد بولا۔ "اگر اس بات کا کوئی امکان ہوتا تو وہ اس طرح اطمینان سے بیٹھ کر فائر نہ کرتے۔ اب ہم کب تک لڑیں گے!"

مجید نے اطمینان سے جواب دیا۔ "جب تک فتح حاصل نہیں ہوتی۔"

داؤد ایک مغموم مُسکراہٹ کے ساتھ مجید کی طرف دیکھنے لگا۔

مجید پھر بولا۔ ”میں سچ کہتا ہوں داؤد۔ میں آخری فتح کے لیے لڑ رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ فتح کب ہو گی، کہاں ہو گی، لیکن میرا ایمان ہے کہ وہ جھنڈا جو ہم نے چچا اسماعیل کی قبر کے سرہانے گاڑا ہے کبھی سر نگوں نہیں ہو گا۔ داؤد تمہیں یاد ہے ایک دفعہ سکول میں میری اور تمہاری لڑائی ہوئی تھی۔ میں تم سے کمزور تھا لیکن مار کھانے کے باوجود میں پیچھے نہ ہٹا۔ بالآخر میری ضد نے تمہیں پریشان کر دیا۔“

داؤد نے کہا۔ ”کاش! ہماری قوم بھی اس قدر ضدی ثابت ہو؟“

سلیم نے کہا۔ ”قوم کو اپنی بقا کے لیے ضدّی بننا پڑے گا!“

مجید نے سوال کیا۔ ”سلیم، ہمارے آدمی بہت پریشان تو نہیں؟“

”پریشان تو نہیں، وہ بار بار پوچھتے ہیں کہ اب کیا ہو گا؟“

”انہیں کہو اب لڑائی ہو گی؟“

سلیم نے کہا۔ ”بعض آدمی یہ کہہ رہے ہیں کہ شاید پٹیالہ میں مسلمان سپاہیوں کا کوئی دستہ ہو۔ ہمیں وہاں اِطّلاع بھجوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

مجید بولا۔ ”بٹالہ کے ارد گرد مسلمانوں کے سینکڑوں گاؤں ہیں۔ یہ طوفان جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں، وہاں بھی ہو گا۔ اگر وہاں مسلمان سپاہی ہوئے بھی تو وہ ہم سے زیادہ نہتے اور بے بس مسلمانوں کو چھوڑ کر نہیں آئیں گے۔ تم گھبرا تو نہیں گئے سلیم۔“

سلیم کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اس کی پیشانی کی رگ ابھر آئی۔ ایک نے توقّف کے بعد وہ بولا۔ ”نہیں مجید میں گھبراتا نہیں۔ ہماری رگوں میں ایک ہی دادا کا خون ہے۔ میں تم سے یہ کہنے آیا تھا کہ ہم دُشمن کو زیادہ تباہی کا موقع دینے کا بہانے ان پر حملہ کیوں نہ کر دیں۔ اس وقت لوگوں کے حوصلہ بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم مل کر کے فوج کے سپاہیوں کو مار بھگائیں تو جتھا دوبارہ اس طرف دیکھے لگا بھی نہیں۔ مجھے اجازت دو میں چند آدمیوں کے ساتھ شمال کی طرف سے کھیتوں میں چھپ کر ان کے مورچے پر حملہ

کرتا ہوں۔ تم انہیں فائز کر کے اپنی طرف متوجّہ رکھو۔"

مجید نے مُسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "سلیم! بعض اوقات مورچے کے اندر بیٹھ کر لڑنا باہر نکل کر حملہ کرنے سے زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں میرا بھائی سینے پر گولی کھا سکتا ہے لیکن آج بہادری کی بجائے تمہارے صبر و استقلال کا امتحان ہے۔ آج جوش سے زیادہ ہمیں ٹھنڈے دماغ کی ضرورت ہے۔ فرض کرو کل ہم یہاں پہنچتے ہی دُشمن پر ٹوٹ پڑتے تو اس کا بھی کیا نتیجہ ہوتا؟ سلیم ہمارے پاس بندوقیں چلانے والے آدمی بہت کم ہیں، بارود بہت تھوڑی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری ایک گولی بھی رائیگاں جائے۔ ہمارا پہلا اور آخری مقصد زیادہ سے زیادہ دیر تک اس مورچے کی حفاظت ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "لیکن اگر فوج سچ مچ مارٹر یا آرمرڈ کاریں لے کر آگئی تو؟"

مجید نے جواب دیا۔ "ہم لڑیں گے۔ ہم ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے پیچھے بیٹھ کر لڑیں گے۔ ہم گرتی ہوئی چھتوں پر لیٹ کر فائر کریں گے!"

داؤد نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟“

”تمہیں ابھی تک معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ دیکھو ہماری وجہ سے دو اڑھائی ہزار آدمیوں کا جتھا اور فوج کے چالیس پچاس آدمی وہاں رُکے ہوئے ہیں۔ اگر ہم انہیں نہ روکتے تو صبح سے اب تک مسلمانوں کی کتنی بستیاں تباہ کر چکے ہوتے۔ وہ گولیاں جو ہمارے مکان کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہیں، ہزاروں بچّوں، عورتوں اور بوڑھوں کے سینے چھلنی کر تیں۔ ہم اس طوفان کو روک کر اس علاقے کے ہزاروں مسلمانوں کو پاکستان کی طرف بڑھنے کا موقع دے رہے ہیں۔ تُم سُن چکے ہو کہ بیاس کے اس پار سے بھی مسلمانوں کے قافلے آ رہے ہیں۔ اگر ہم انہیں چند گھنٹے اور روک سکیں تو وہ راوی تک پہنچ جائیں گے۔“

سلیم نے کہا۔ ”مجید! کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اگر موقع ملے تو ہم رات کے وقت سکھوں کے کسی گاؤں پر جوابی حملہ کر دیں۔“

مجید نے مُسکرا کر کہا۔ ”اب تم ایک سپاہی کی طرح بات کر رہے ہو۔ ہم یقیناً حملہ کریں گے۔ بادل آ رہے ہیں، خدا کرے رات کے وقت آسمان

صاف نہ ہو۔"

نچلی چھت سے بشیر نے آواز دی۔ "مجید سڑک پر دو جیپیں آ رہی ہیں۔"

مجید، داؤد اور سلیم گھٹنوں کے بل نیچے ہو کر منڈیر کے اوپر سے جھانکنے لگے۔ جیپیں سڑک سے اُتر کر گاؤں کا رُخ کر رہی تھیں۔ مجید نے کہا۔ "سلیم! تم سب اپنے اپنے مورچوں میں جاؤ۔"

☆☆☆☆☆

جیپیں مکئی کے کھیت کے پیچھے رُکیں اور سپاہیوں نے اُترتے ہی مارٹروں کے ساتھ گولہ باری شروع کر دی۔ جتھے کے آدمی جو دور دور بیٹھے ہوئے تھے، اُٹھ کر مختلف ٹولیوں میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ مورچوں میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں سے پندرہ آدمی اُٹھ کر جتھے والوں کی ٹولیوں کے ساتھ جا ملے۔

ایک گھنٹہ کی بے تحاشا گولہ باری سے دونوں حویلیوں کے چند کمروں کو پیوند زمین کر چکے تھے، دیواروں اور چھتوں میں شگاف پڑ گئے تھے۔

عورتوں اور بچّوں سے بھرے ہوئے دو کمروں کی چھتیں اُڑ گئی تھیں اور مرد زخمیوں کو نکال رہے تھے۔

مجید نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”داؤد ابھی چھ بجے ہیں۔ ہم شام کے اندھیرے میں حملہ کر کے ان کے مارٹر چھین لیں گے۔ اگر مکئی کا وہ کھیت الگ تھلگ نہ ہوتا تو میں اس وقت بھی کوشش کرتا۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”شام تک شاید ان مکانوں کی کوئی دیوار بھی سلامت نہ رہے!“

حویلی کے صحن میں یکے بعد دیگرے چند بم گرنے سے آدمیوں میں کھلبلی مچ گیا۔ ”یہاں سے بھاگو! یہاں سے بھاگو!“ بعض آدمی کمروں کے دروازے کھول کھول کر عورتوں اور بچّوں کو آوازیں دینے لگے۔ ایک جگہ دیوار میں شگاف پڑ گیا تھا۔ چیختے چِلّاتے آدمیوں کا ایک ہجوم باہر نکلا تو مسجد کی چھت سے سلیم چلّایا۔ ”اس طرف مت آؤ، پیچھے ہٹ جاؤ۔“ لوگوں نے اس کی آواز نہ سُنی لیکن سکھوں کے ایک مکان کی چھت سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں اُلٹے پاؤں لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

مجید بالا خانے کی چھت سے نچلی چھت پر آ کر چلّا رہا تھا۔ ”لیٹ جاؤ، خدا کے لیے زمین پر لیٹ جاؤ!“

جنوب کی طرف مویشیوں کا ایک کمرہ گر جانے سے گنّوں کے کھیت کی طرف نکلنے کا راستہ پیدا ہو گیا تھا۔ جب حویلی میں چند اور بم گرے تو لوگ بد حواس ہو کر اس سے نکلنے لگے۔ فوج نے اپنے مورچے سے گولیوں کی بوچھاڑ کی اور کئی عورتیں اور بچّے ڈھیر ہو گئے۔

سلیم چلّایا۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ! پیچھے ہٹ جاؤ!“

مجید نیچے اُتر کر بھاگتا ہوا حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے قمیص کی بائیں آستین خون سے بھیگی ہوئی تھی۔ خوف سے چیختی عورتیں اور بچّے اور زخموں سے کراہتے ہوئے آدمی اس کے گرد جمع ہو گئے۔

مجید نے دونوں ہاتھ بُلند کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو تم مفت میں جانیں گنوا رہے ہو۔ خدا کے لیے آس پاس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ لیٹ جاؤ!“

لوگوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ایک کمسن لڑکی مجید کے پاؤں کے

قریب لیٹ گئی۔ مجید نے اُسے اٹھا کر کھرلی میں لٹا دیا اور پھر لوگوں کی طرف متوجّہ ہو کر بولا۔ ”دیکھو، اگر ہمیں کسی کے بچ نکلنے کی اُمّید ہوتی تو میں تمہیں منع نہ کرتا۔ انہوں نے چاروں طرف سے گاؤں کو گھیر رکھا ہے۔ ہمیں شام کی تاریکی کا انتظام کرنا پڑے گا۔ بندوقیں چلانے والے چند آدمی زخمی ہو گئے ہیں۔ تم میں سے جو بندوقیں چلانا جانتے ہیں، وہ میرے ساتھ آئیں اور باقی اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔“

ایک چار سالہ بچہ اُٹھ کر آگے بڑھا اور اپنی توتلی زبان میں بولا۔ ”تھو بیدار تم بھی تھکوں کو دولے مارو۔ وہ دولے مارتے ہیں تم کیوں نہیں مارتے؟“

”ہم بھی ماریں گے۔“ مجید نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ لوگ اس آہنی انسان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہے تھے جو گولیوں اور بموں کی بارش میں کھڑا مسکرا سکتا تھا۔ شام کے سات بجے یہ لوگ شکستہ چھتوں پر چڑھ کر اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کی آڑ لے کر دُشمن پر گولیاں برسا رہے تھے۔ سکھوں نے یہ سمجھ کر حملہ کیا تھا کہ ان کی قوّتِ مدافعت گِرے ہوئے

مکانوں کے ملبے کے اندر دب چکی ہے لیکن مسلمانوں نے پھر ایک بار حرارتِ ایمانی کا ثبوت دیا اور حملہ آور پیچھے ہٹ گئے۔

یوسف بم کے ریزے لگنے سے بُری طرح مجروح ہو چکا تھا اور گھر کی عورتیں اُسے اُٹھا کر دالان کے اندر لے گئی تھیں۔ ان کی چھت کے ایک کونے میں شگاف ہو چکا تھا۔

جوں جوں شام نزدیک آرہی تھی، حویلی کے گرد حملہ آوروں کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا۔ مسجد کی ایک دیوار ٹوٹ چکی تھی اور اس کے ساتھ چھت کی چند کڑیاں بھی نیچے گر چکی تھیں۔ چھت کے دوسرے کونے میں سلیم اور اس کے ساتھ ابھی تک اپنے مورچے کے اندر ڈٹے ہوئے تھے۔

مجید چند آدمیوں کے ساتھ حملے کی تیّاریاں کرنے کے بعد باقی آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اچانک سلیم نے آواز دی۔ ”مجید سڑک کی طرف سے ایک چھوٹا سا ٹینک آرہا ہے!“

تھوڑی دیر کے لیے مجید کے منہ سے آواز نکل سکی۔ بالآخر اس نے گھٹی

ہوئی آواز میں کہا۔ ”ٹینک نہیں ہو سکتا۔ ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔“

داؤد نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”نہیں مجید تم ٹھہرو، میں درخت پر چڑھ کر دیکھتا ہوں۔“ داؤد باہر نکل کر برڑ کے درخت پر چڑھا تھا اور وہیں سے بولا۔ ”شاید برین کیریر ہے۔“

مجید اپنے ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہو کر بولا۔ ”اب ہم شام کی تاریکی کا انتظار نہیں کر سکتے۔“

اوپر سے داؤد پھر بولا۔ ”فوج کے سپاہی برین کیریر کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ وہ اسے ڈھال بنا کر یہاں تک پہنچیں گے؟“

مجید بولا۔ ”داؤد تم جلدی نیچے اُتر آؤ!“

داؤد اور فوج کے دوسرے تربیت یافتہ آدمیوں سے تھوڑی دیر مشورہ کرنے کے مجید نے کہا۔ ”میں صرف چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتا ہوں۔ اسٹین گنیں ہمیں دے دو۔ ہم برین کیریر کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ تم سب یہیں رہو اور یاد رکھو، بہادری کی موت بزدلی کی موت

سے بہتر ہے۔ سکھوں کا یہ حملہ آخری ہو گا۔ اگر ہم نے انہیں پسپا کر دیا تو رات کے وقت یہاں سے چند آدمیوں کے زندہ بچ کر نکل جانے کا امکان ہے۔ جب تک میں واپس نہیں آتا میری جگہ جمعدار عنایت علی لے گا!"

عنایت علی دِن بھر کی لڑائی میں یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ حکم ماننا اور حکم دینا جانتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک بکتر بند گاڑی گنّوں کے کھیت کے قریب سے گُزر رہی تھی اور پندرہ بیس پیادہ سپاہی اس کے پیچھے پیچھے پیدل آرہے تھے۔ جونہی گاڑی کھیت کے ایک کونے کے پاس پہنچی، مجید تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا کھیت سے باہر نکلا۔ دو آدمیوں نے فائر کیے، ایک گولی مجید کی ران اور دوسری بازو میں لگی لیکن اتنی دیر میں اس نے گاڑی کے قریب پہنچ کر بم پھینکا اور زمین پر لیٹ گیا۔ بم کیریر کے اوپر پڑا۔ پیشتر اس کے کہ اس کے ساتھ پیدل آنے والے آدمی مجید کی طرف متوجہ ہوتے، داؤد اور دوسرے آدمی نے جو کھیت کی منڈیر کے پیچھے لیٹے ہوئے تھے، اسٹین گنوں سے گولیوں کی

بارش شروع کر دی اور چند سیکنڈ میں سات آدمی ڈھیر کر دیے۔ مجید نے لیٹے لیٹے دوسرا بم پھینکا اور پسپا ہونے والے آدمیوں میں سے تین کو اور گرالیا۔ باقی آدمی بھاگ کر پندرہ بیس گز دور پانی کی کھائی میں لیٹ گئے۔ بکتر بند گاڑی بے تحاشا اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ مورچے میں بیٹھے ہوئے چند آدمی اُٹھ کر گاڑی کا پیچھا کر رہے تھے۔ گاڑی کوئی دو سو گز شیشم کے درختوں کے ایک جھنڈ میں جا پھنسی۔ پانی کی کھائی میں لیٹے ہوئے سپاہی مجید کی طرف گولیاں چلارہے تھے۔ کھیت سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر مجید کی ہمّت جواب دے گئی اور اس نے زمیں پر سر ٹیک دیا۔

داؤد نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”مجید زخمی ہے، میں جاتا ہوں، تم ان پر فائر کرتے رہو۔“

داؤد زمین پر رینگتا ہوا مجید کے قریب پہنچا۔ مجید چلّایا۔ ”داؤد تم جاؤ وقت ضائع نہ کرو، لیکن داؤد نے اس کا بازو پکڑ کر اس کی بغل میں اپنا سر دے دیا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔ چند گولیاں مجید کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گُزر گئیں۔ ایک گولی داؤد کے

بازو کے ساتھ مس کرتی ہوئی گزر گئی۔ جونہی وہ کھیت میں داخل ہونے سکھ شور مچانے لگے۔ ”دیکھو وہ صوبیدار ہے، بھاگنے نہ پائے۔ اس کا پیچھا کرو!“

تھوڑی دیر میں آس پاس سے جتھے کے آدمیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ”صوبیدار کھیت میں ہے۔ دیکھو نکلنے نہ پائے!“

داؤد نے مجید کو اٹھا کر اپنی کمر پر ڈال دیا اور اپنے ساتھی سے کہا۔ ”تم یہیں سے پانچ منٹ تک اکادُکا فائر کرتے رہو۔“

داؤد کو چاروں طرف سے آدمیوں کی آوازیں آرہی تھیں اور مجید کو لٹانے کے لیے اسے کوئی جگہ بھی محفوظ نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ گنّوں کے ایک کھیت سے نکل کر دوسرے اور تیسرے کھیت میں جا پہنچا۔ مجید کہہ رہا تھا۔ ”داؤد! خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ تم جاؤ۔“ لیکن وہ چلتا رہا۔ رہٹ کے قریب پہنچ کر امرود کے باغ کے آس پاس خاموشی تھی۔ داؤد نے اسے وہاں اُتار کر زمین پر لٹا دیا اور اپنی پگڑی پھاڑ کر اس کی ران اور بازو پر پٹیاں باندھ دیں۔

اچانک مجید چلّایا۔ ”سنو بے وقوف! وہ مشین گن چلا رہے ہیں۔ کاش ہم پر برین کیریر پر قبضہ کر سکتے!“

داؤد نے اُٹھ کر اپنی اسٹین گن اٹھائی اور گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔

☆☆☆☆☆

مجید اور داؤد کے باہر نکلتے ہی لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ صورتحال خطرناک ہے۔ عنایت علی نیم شکستہ چھت سے بکتر بند گاڑی پر داؤد اور مجید کے حملے کے نتائج دیکھ رہا تھا۔ جب گاڑی بے قابو ہو کر درختوں میں جا پھنسی تو وہ ”آفرین! آفرین!! کہتا ہوا نیچے اُترا اور سہمے ہوئے آدمیوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ ”دُشمن کا سب سے بڑا ہتھیار بے کار ہو چکا ہے، اب تم جوابی حملے کے لیے تیّار ہو جاؤ!“

دوسری طرف سلیم اور اس کے ساتھی نعرے لگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے دُشمن کے مارٹروں پر بھی خاموشی چھا گئی اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ سب سے بڑا خطرہ ٹل چکا ہے لیکن دس منٹ کے بعد گولہ باری پھر

شروع ہو گئی۔ اچانک سلیم نے آواز دی۔ ”ہوشیار! ہوشیار! وہ پھر آ رہا ہے۔“

عنایت علی دوبارہ بھاگتا ہوا چھت پر چڑھا۔ برین کیریر کو واپس آتے دیکھ کر وہ ایک لمحہ کے لیے مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ کیریر کے پیچھے آدمیوں کا ہجوم نعرے لگاتا ہوا آ رہا تھا۔ عنایت علی نے مُڑ کر آس پاس کی دیواروں اور چھتوں سے باہر جھانکنے والے آدمیوں کو دیکھا اور بُلند آواز میں کہا۔ ”ہمیں ہر قیمت پر اسے روکنا ہے۔“ اس نے سیڑھی کے راست اُترنے کی بجائے ساتھ والے کمرے کے ملبے کے ڈھیر پر چھلانگ لگا دی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بم گرا اور آن کی آن میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک یہ آواز پہنچ گئی۔ ”جمعدار شہید ہو گیا ہے۔“ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ آفتاب ٹوٹے ہوئے بازوں اور ڈوبتے ہوئے حوصلوں کا آخری منظر دیکھنے کے بعد روپوش ہو چکا تھا۔ شام کے دُھندلکے پر رات کی سیاہی غالب آ رہی تھی۔ بکتر بند گاڑی مشین گن سے آگ کے شعلے اگلتی ہوئی آگے بڑھی۔ ”پنتھ کی جے۔ خالصتان کی جے، واہگورو جی کی فتح“ کے

نعرے بُلند ہوئے۔ حملے کا بگل بجا اور وحشت اور بربریت کا سیلاب چاروں طرف سے پھوٹ نکلا۔

اقوامِ ایشیا کی رہنمائی کا دعویٰ کرنے والی سلطنت کی سرپرستی میں لڑنے والا لشکر بالآخر اپنے حریف پر غالب آچکا تھا۔ سکھوں کی کرپانوں کے لیے بچّوں، بوڑھوں اور عورتوں کی گردنوں تک پہنچنے کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ ہندوستانی فوج کے سورمانہتوں کے سینوں کو اپنی گولیوں کا ہدف بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

حویلی کے اندر داخل ہونے والے حملہ آور اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے لوگوں کا قتلِ عام کر رہے تھے۔ گاؤں کی تمام گلیوں کے راستے بند پا کر بھاگنے والے گنّوں کے کھیت کا رُخ کر رہے تھے لیکن بہت کم ایسے تھے جو مشین گن کی گولیوں سے بچ کر نکل سکے۔

مسجد کی چھت سے سلیم اور اس کے دو ساتھیوں کی گولیاں پھاٹک کی طرف سے آگے بڑھنے والوں کو روکے ہوئے تھیں۔ لیکن سلیم کے تھیلے میں صرف چند گولیاں باقی تھیں۔ اس نے میگزین میں آخری راؤنڈ

بھرنے کے بعد سنگین چڑھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ میرے پاس صرف ایک دستی بم ہے۔ میں برین کیریر پر حملہ کرنے جارہا ہوں۔ جب تک وہ بیکار نہیں ہوتا، سکھ میدان نہیں چھوڑیں گے!"

سلیم کے ایک ساتھی نے کہا۔ "تمہیں جان گنوانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا!"

"اب میری جان کی کیا قیمت ہے؟"

"لیکن تم کیسے اترو گے؟ سکھ چاروں طرف سے ہماری تاک میں ہیں۔ تم صرف گنّوں کے کھیت کی منڈیر کے پیچھے چھپ کر وہاں تک پہنچ سکتے ہو لیکن مشین گن کے فائر میں تم کھیت تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"میں جوہڑ کے کنارے کنارے سرکنڈے کی آڑ لے کر جا سکتا ہوں۔ مجھے اپنی پگڑی دو!"

ایک ساتھی نے اپنی پگڑی اُتار دی اور سلیم نے جلدی سے ماجھے کے سکھوں کی طرح ڈھاٹا باندھ لیا۔

دوسرے ساتھی نے سوال کیا۔ ”تم اُترو گے کیسے؟ وہ ہمیں دیکھتے ہی فائر کر دیں گئے۔“ سلیم اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پیٹ کے بل رینگتا ہوا مٹّی کی بوریوں کے مورچے سے نکلا اور چھت کے دوسرے کونے میں شگاف کے قریب پہنچ کر بولا۔ ”رحیم بخش! میں یہاں سے نیچے کودتا ہوں۔ تم میری رائفل پگڑی کے ساتھ باندھ کر نیچے لٹکا دو!“

”نہیں سلیم! تم اندر جا کر دروازے کے راستے نکلو گے تو کنوئیں کی منڈیر کے پیچھے چھپے ہوئے آدمی تم پر حملہ کر دیں گے!“

سلیم کچھ کہنے کو تھا کہ اس کے پاؤں کے پاس کوئی چیز گری۔ ”بم!“ اس کا ساتھی چلّایا اور سلیم نے کسی توقّف کے بغیر جھپٹ کر بم پکڑا اور چھت سے نیچے پھینک دیا۔ بم زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی پھٹ گیا۔ اس کے بعد سلیم نے ایک لمحہ کے لیے تذبذب کی حالت میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور اچانک ایک کڑی میں ہاتھ ڈال کر اندر لٹک گیا۔ اوپر سے ایک آدمی نے اس کی رائفل پگڑی کے ساتھ باندھ کر لٹکا دی۔ وہ تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر اُسے ڈھونڈ رہا تھا کہ چھت پر ایک، دھماکہ ہوا۔ کوئی وزنی

شے اس کے سر پر لگی اور لڑ کھڑ اتا ہوا ایک طرف جا گرا۔

حویلی میں ابھی تک ایسے سر فروشوں کا گروہ موجود تھا جو آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ لے کر بندوقیں چلا رہے تھے۔ چند آدمی شکستہ چھتوں اور دیواروں کے اوپر لیٹ کر اینٹیں پھینک رہے تھے۔ غلام حیدر نے بُلند آواز میں کہا۔ ”مسلمانو! آؤ انہیں دکھا دیں کہ بہادر کس طرح مرتے ہیں“ اور ”اللہ اکبر“ کا نعرہ لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی جن میں سے زیادہ تر سکھوں سے چھینی ہوئی کرپانوں اور برچھیوں سے مسلح تھے، باہر نکل کر دُشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے پُرجوش حملے نے پھر ایک بار سکھوں کے پاؤں اکھاڑ دیے لیکن یہ بجھتے ہوئے چراغ کی لَو تھی۔ فوج کی رہنمائی میں سکھوں کے ایک اور گروہ نے مغرب اور شمال کی سمتوں سے ِگری ہوئی دیواروں کو عبور کر کے حویلی پر دھاوا بول دیا۔

ایک ٹولی عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے کمروں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا رہی تھی۔ باہر نکل کر لڑنے والے آدمیوں نے آگ کے شعلے

دیکھے تو اُلٹے پاؤں مکانوں کی طرف بھاگے۔

وہ چلا رہے تھے۔ ”میری ماں، میری بیوی، میرے بچّے، میری بہنیں!“ اور اس کے جواب میں وہ آگ کے شعلوں کو دیکھ رہے تھے۔ آگ میں جلنے والوں کی چیخیں سن رہے تھے۔

حملہ آوروں نے ماؤں، بہنوں، بیویوں، بچّوں اور زخمیوں کو آوازیں دینے والوں کو تھوڑی دیر میں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا لیکن آگ دیر تک جلتی رہی۔ چیخیں دیر تک سنائی دیتی رہیں اور آگ لگانے والے ان چیخوں کا جواب قہقہوں سے دیتے رہے اور پھر وہ نعرے لگا رہے تھے۔ ”پنتھ کی جے، خالصتان کی جے۔“

آسمان پر کہیں کہیں بادل کی پھٹی ہوئی ردا سے جھانکنے والے ستارے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ”پنتھ کی جے“ نہیں ”پٹیل کی جے، خالصتان کی جے“ نہ کہو ”مونٹ بیٹن اور ریڈ کلف کی جے“ کہو!

☆☆☆☆☆

سلیم نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں۔ وہ مسجد کے صحن میں فرش پر لیٹا ہوا تھا اور چند آدمی تاریکی میں جھک جھک کر اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسی نے اس کے چہرے پہ ٹارچ کی روشنی ڈالی اور وہ اچانک اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم، تم کون ہو؟" اس نے اپنے زخمی سر کو دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے کہا۔ اس کے جواب میں ایک لڑکی چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ ایک لمحہ کے اندر اندر گزشتہ تمام واقعات سلیم کی آنکھوں میں پھِر گئے۔ اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے ٹارچ چھین لی اور روشنی میں اپنے گرد جمع ہونے والوں کو ایک نظر دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

حویلی اور اس کے آس پاس مسلمانوں کے تمام گھروں میں آگ کے شعلے بُلند ہو رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے سلیم بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر اچانک بھاگتا ہوا مسجد کے صحن سے باہر نکل گیا۔ حویلی میں جمع ہونے والے آدمی اس کے پیچھے ہو لیے۔ "سلیم! سلیم! ٹھہرو۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ اسے آوازیں دے رہے تھے۔

سلیم باہر کی حویلی کے صحن میں پہنچ کر آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کے سامنے رُک گیا۔ اندر کی حویلی آگ کا وسیع الاؤ بنی ہوئی تھی۔ عورتوں، بچّوں اور زخمیوں سے بھرے ہوئے دالانوں اور کمروں کی رہی سہی چھتیں جل کر نابود ہو رہی تھیں۔ باہر کی حویلی میں آگ کے شعلے، غلّے کے گوداموں اور مویشی خانوں کو جلانے کے بعد برآمدے کے چھپر تک پہنچ چکے تھے۔ بڑ کے درخت کے وہ ٹہنے جو باہر کی حویلی کے کونے والے کمروں پر جھکے ہوئے تھے، جل چکے تھے۔ دوسری طرف بھوسے کے گودام اور اس کے ساتھ گنڈیال میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ تمام صحن لاشوں سے پٹا پڑا تھا لیکن یہ لاشیں نہ تھیں، گوشت کے لوتھڑے تھے جن پر حملہ آوروں نے فتح کے بعد اپنی کرپانوں کی تیزی کا امتحان لیا تھا۔ کسی کا سر علیحدہ تھا، کسی کے بازو اور کسی کی ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ ڈیوڑھی کے سامنے ان عورتوں اور بچّوں کی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جنہوں نے جلتے ہوئے مکانوں سے نکل کر باہر کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

سلیم ایک سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ اس کے گرد جمع ہونے والے آدمیوں میں سے کسی نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سلیم نے اس کی طرف توجّہ نہ دی اور بدستور آگ کے شعلوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر توقّف کے بعد اس نے سلیم کو آہستہ سے جھنجھوڑ کر اپنی طرف متوجّہ کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سلیم! سلیم!“

یہ مہندر سنگھ تھا۔ اچانک سلیم نے ایک جھرجھری لی اور مہندر کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور چلّایا۔ ”مہندر وہ کہاں ہیں؟ وہ سب کہاں گئے؟ میری خاندان کی عورتیں، میری بہنیں، میری چچیاں، میری ماں، اُن پر کیا گزری؟ بتاؤ! خدا کے لیے بتاؤ!“ وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا لیکن مہندر کے پاس بہتے ہوئے آنسوؤں اور سسکیوں کے سوا ان سوالات کا کوئی جواب نہ تھا۔

کاکو عیسائی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”سلیم وہ سب جل چکے ہیں۔ تمہارے خاندان کوئی بچّہ اور عورت باہر نہیں نکلی۔ جب انہوں نے مکانوں پر دھاوا بولا تھا، میں بڑ کے درخت کے اوپر چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ آگ

لگانے کے بعد جو عورتیں اور بچّے کمروں سے نکل کر اِدھر اُدھر بھاگے تھے، انہیں سکھوں نے یا تو قتل کر دیا تھا یا واپس آگ کی طرف دھکیل دیا تھا۔ بہت تھوڑے ایسے تھے جو کھیت تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ کے خاندان کی کوئی عورت یا بچّہ باہر نہیں نکلا۔" مہندر نے کہا۔ "میں جتھے کے آدمیوں سے پوچھ چکا ہوں۔ جتھے دار کی خواہش تھی کہ۔۔۔ تمہارے خاندان۔۔۔ تمہارے خاندان کی سب عورتیں زندہ پکڑ لی جائیں۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ وہ دروازہ توڑ رہے تھے کہ روشن دان سے کسی نے بندوق سے فائر کیے۔ ان سے چند آدمی زخمی ہوئے۔ چند چھرے جتھے دار کے منہ پر لگے۔ دو آدمی چھت کے شگاف کے راستے نیچے کودے، انہیں شاید عورتوں نے مار ڈالا۔ اس کے بعد انہوں نے آگ لگادی۔"

سلیم نے دوسرے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے آٹھ دس گاؤں کے عیسائی اور تین باہر کے مسلمانوں تھے جن میں سے ایک سپاہی تھا جس نے بکتر بند گاڑی پر حملہ کرنے کے لیے مجید اور داؤد کا ساتھ دیا تھا۔

ایک نوجوان چند قدم دور سب سے الگ تھلگ کھڑا آگ کے شعلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کون !بشیر ؟" سلیم نے اسے پہچان کر کہا۔

بشیر نے گردن اوپر اٹھائی لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

سلیم آگے بڑھا۔ "بشیر !بشیر !! خدا کے لیے بتاؤ کیا وہ سب۔۔۔؟" سلیم کی آواز بیٹھ گئی۔

بشیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا اور وہ بے اختیار سلیم سے لپٹ گیا۔ وہ ہچکیاں بھرتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "سلیم! آؤ اس آگ میں کود پڑیں۔ اب ہمارے لیے ان انگاروں کے سوا کوئی جگہ نہیں۔ ہم تمام عمر سلگنے کی بجائے ان کی طرح ایک ہی بار کیوں نہ بھسم ہو جائیں۔ دیکھو اب وہاں کوئی فریاد، کوئی چیخ، کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سلیم میں موت سے ڈر کر بھاگا تھا لیکن اب مجھے زندہ رہنے کا خوف ہے۔"

سلیم نے کہا۔ "بشیر خدا کے لیے میرے سوال کا جواب دو۔ میں صرف یہ

پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کسی کو پکڑ کر تو نہیں لے گئے۔“

”نہیں۔ مہندر نے جو کچھ کہا ہے سب درست ہے۔ وہ دروازہ توڑ رہے تھے لیکن قدرت نے ان کی عزّت بچا لی۔ یوسف زخمی ہو کر ان کے پاس چلا گیا تھا۔ اس نے روشن دان سے فائر کیے اور انہوں نے طیش میں آ کر آگ لگا دی۔ وہ بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہی تھیں۔“

سلیم نے قدرے توقّف کے بعد پوچھا۔ ”اور ہمارے آدمیوں میں سے بھی کوئی نہیں بچا؟“

بشیر نے جواب دیا۔ ”میں جتھے کے واپس ہوتے ہی مسجد کے ملبے کے ڈھیر میں تمہیں تلاش کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے میری طرح کوئی اور بھی بچ کر نکل آیا ہو۔“

کاکو نے کہا۔ ”داؤد پھاٹک کے پاس دیوار کی اینٹوں کے نیچے دب کر کراہ رہا تھا۔ میں نے درخت سے اُتر کر سب سے پہلے اُسے نکالا۔ اس نے بتایا کہ صوبیدار زخمی تھا اور میں اسے امرود کے باغ میں چھوڑ آیا ہوں۔ وہ اس کا

حال دیکھنے گیا ہے۔"

سلیم نے کہا۔ "مسجد کی چھت پر میرے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ جب میں اُتر رہا تھا تو شاید اوپر بم گرا تھا۔ تم نے انہیں نہیں دیکھا؟"

کا کو نے جواب دیا۔ "ان کی لاشیں ملبے کے اوپر پڑی ہوئی تھیں اور جتھے والے دیکھ کر چلے گئے۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ تم نیچے دبے ہوئے ہو اور ہم یہ سمجھ کر واپس آرہے تھے کہ تم بم گرنے سے پہلے کہیں نکل گئے ہو گے لیکن مہندر نے ٹارچ کی روشنی میں تمہاری بندوق کی سنگین دیکھ لی۔"

سلیم نے کہا۔ "میری بندوق کہاں ہے؟"

"وہ وہیں پڑی ہوئی ہے۔"

نوجوان لڑکی جو چند قدم پیچھے کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی، بندوق کا نام سنتے ہی آگے بڑھی اور ملتجی نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "بھائی خدا کے لیے اب اپنی جان بچاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ مجید کو یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔"

یہ روپا تھی۔ شیر سنگھ کی بیٹی اور گلاب سنگھ کی بہن۔ سلیم نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”روپا تم اپنے گھر جاؤ!“

لیکن روپا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔ ”تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے۔ تم کتنوں کو مارو گے؟ تم کس کس سے لڑو گے؟ خدا کے لیے اب پاکستان چلے جاؤ۔ رات کے وقت تم نکل سکتے ہو!“

سلیم چلّایا۔ ”روپا جاؤ!“

روپا ایک لمحے کے لیے سلیم کی گرجتی ہوئی آواز سے سہم گئی اور پھر آگ کی روشنی میں سلیم کے چہرے پر آنکھیں گاڑتے ہوئے بولی۔ ”سلیم میری التجا، ایک بہن کی التجا ہے۔ اسے مت ٹھکراؤ۔ اگر تم بھی مارے گئے تو اس گھرانے کا نام مٹ جائے گا!“

سلیم جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ”اب میرا کوئی خاندان نہیں۔ کوئی گاؤں نہیں، کوئی گھر نہیں۔ اب میں کسی کا بھائی نہیں۔ اب میں صرف انتقال ہوں!“

مہندر نے کہا۔ ”اگر ایک انسان کا خون اس قوم کے گناہوں کو دھو سکتا تو میں تم سے کہتا، سلیم میری گردن پر چھری پھیر دو۔ میں اپنا بلیدان دینے کے لیے تیّار ہوں لیکن ایک قوم کے پاپ کا بوجھ ایک قوم ہی اُٹھا سکتی ہے۔ میرے متعلّق تمہیں غلط فہمی نہ ہو۔ میں تم سے ان بھیڑیوں کے لیے رحم کی درخواست نہیں کروں گا۔ اگر تم تنہا بندوق لے کر انہیں ختم کر سکتے تو میں تمہیں روکنے کی بجائے آگے دھکیلتا لیکن تم جانتے ہو کہ تُم تنہا اس طوفان کو نہیں روک سکتے۔ سلیم اب تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ اگر یہ رات گزر گئی تو شاید تمہیں موقع نہ ملے۔ مجید زخمی ہے۔ کم از کم تم اسے بچا سکتے ہو۔ مجید کے لیے میں تمہیں اپنا گھوڑا دے سکتا ہوں۔ تم اگر ہمّت کرو تو صبح تک راوی عبور کر سکو گے۔“

گاؤں کے ایک عیسائی نے کہا۔ ”ان کے تین گھوڑے سارا دِن اِدھر اُدھر بھاگتے رہے ہیں۔ ان کے ساتھ کسی کا ایک اور گھوڑا بھی ہے۔“

دوسرے آدمی نے کہا۔ ”میں نے انہیں ابھی دیکھا ہے۔ مسجد کے قریب جامن کے درختوں کے پاس کھڑے تھے۔“

سلیم نے مہندر کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر ایک بار شعلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ اچانک اسے ایک اور حویلی کا خیال آیا اور اس مکان میں رہنے والوں کی صورتیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔ ”اس وقت وہاں کیا ہو رہا ہو گا؟“ اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ ”عصمت اور راحت کس حال میں ہوں گی؟ وہ پاکستان سے نزدیک ہیں۔ وہ دریا پار کر کے پاکستان پہنچ گئے ہوں گے لیکن اگر وہ وہیں ہوئے تو؟ اگر سکھوں نے وہاں بھی حملہ کر دیا ہو تو۔۔۔؟“ سلیم انتہائی مایوسی کی حالت میں زندگی کا سمٹتا ہوا دامن پکڑ رہا تھا۔ وہ تاریک آندھی اور بھیانک طوفان میں ایک مشعل جلا رہا تھا۔ وہ ایک بار ڈوبنے کے بعد پانی کی سطح پر آ کر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ”عصمت! عصمت!! عصمت!! عصمت!!“ اس کے دل کی دھڑکنیں پکار رہی تھیں اور عصمت جیسے آگ کے شعلوں کے درمیان کھڑی کہہ رہی تھی۔ ”سلیم مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!“

ایک عیسائی نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ ”شیر سنگھ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سکھوں کے گھروں کے میں آگ لگانے کے بعد وہ ہمارے

محلے میں آ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے میں اس گاؤں کے تمام مکان جلا دوں گا۔ تم بھی نکل جاؤ، اب اس گاؤں میں کوئی نہیں رہے گا۔"

کاکو اور اس کے ساتھی یہ سُنتے ہی اپنے محلّے کی طرف بھاگے۔ سلیم نے مُڑ کر گاؤں کی دوسری طرف دیکھا۔ سکھوں کے گھروں سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔

مہندر نے کہا۔ "وہ اب کسی کا کہا نہیں مانے گا۔ وہ آتے ہی پہلے اس آگ میں کودنے لگا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے روکا۔ اس کے بعد وہ چیخیں مارتا ہوا بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹّی کے تیل کی ایک بوتل تھی۔ اس نے اپنی پگڑی کو لاٹھی کے ایک سِرے پر لپیٹ کر اس پر تیل چھڑکا، پھر اس آگ سے اسے روشن کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اب سارے گاؤں کو راکھ کا ڈھیر بنا دوں گا۔ گاؤں کے سکھ واپس آ کر صرف افضل کے گھر کی راکھ نہیں دیکھیں گے۔" وہ کل سے ہمارے گاؤں میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ کل رات ہمارے گاؤں کے آدمی جو یہاں سے مار کھا کر گئے تھے، اسے قتل کرنا چاہتے تھے، میں نے اسے اُٹھا

کر اپنے مکان کی کوٹھری میں بند کر دیا تھا۔ وہ سارا دِن دروازہ توڑ تا رہا اور مجھے گالیاں دیتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ باہر نکلتے ہی سیدھا اس طرف آئے گا اور سکھوں کی گولیوں کا نشانہ بنے گا۔ شام کے وقت روپا اسے ہمارے گاؤں میں تلاش کر رہی تھی۔ ہمارے گاؤں کے آدمی جو جتھے کے ساتھ تھے، واپس آئے اور مجھے معلوم ہوا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کوٹھری سے نکلتے ہی سیدھا اس طرف بھاگا۔ میں اور روپا اس کے پیچھے تھے۔"

سلیم نے کہا۔ "نہیں مہندر! کھیل ختم نہیں ہوا۔ کھیل ابھی شروع ہوا ہے۔ قوموں کے کھیل اس طرح ختم نہیں ہوتے۔ وہ دِن دور نہیں جب راکھ کے ان ڈھیروں سے بجلیاں نمودار ہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے سلیم نے آگے بڑھ کر ایک کونے سے بجھی ہوئی راکھ کی ایک مٹھی اُٹھالی اور اسے رومال سے باندھتے ہوئے کہا۔ "یہ میری قوم کی پونجی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس راکھ سے نئے مورچے اور نئے قلعے تعمیر ہوں گے۔ اس راکھ سے ایک نئی قوم جنم لے گی۔ کھیل ابھی ختم

نہیں ہوا مہندر!"

عیسائیوں کے محلّے میں آدمی عورتیں اور بچّے دہائی مچا رہے تھے اور شیر سنگھ کی آواز برابر آرہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو! ہٹ جاؤ، بدمعاشو! تم نے ایک طرف بیٹھ کر تماشا دیکھا ہے، اب اس گاؤں میں کوئی نہیں رہے گا!" روپا روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

سلیم نے بشیر اور باقی آدمیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "تم دیکھو! اگر گھوڑے یہیں ہیں تو انہیں پکڑ لو اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر تمہیں جتنا بارود مل سکتا ہے، وہ جمع کر لو۔ مسجد سے میری رائفل بھی اُٹھا لاؤ، میں ابھی آتا ہوں!"

ایک آدمی بولا۔ "میں نے کھیت میں ایک زخمی سکھ سے ٹامی گن اور گولیوں سے بھرا ہوا تھیلا چھینا تھا اور میں اسے جوہڑ کے کنارے اُپلوں کے ڈھیر میں چھپا آیا ہوں۔"

دوسرا آدمی جو مجید اور داؤد کے ساتھ برین کیریر پر حملہ کرنے کے لیے

گیا تھا، بولا۔ ”دو آدمیوں نے کھیت میں میرا پیچھا کیا تھا۔ ایک زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا اور دوسرے کو میں نے گرا لیا تھا۔ اس کے پاس اسٹین گن تھی۔“

سلیم نے کہا۔ ”وہ سب لے آؤ!“

بشیر بولا۔ ”کھیت میں ہمیں شاید اور بھی بہت کچھ مل جائے لیکن فالتو ہتھیاروں کو ہم کیا کریں گے۔“

”سلیم نے جواب دیا۔ ”ہمیں راستے میں ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والے بہت مل جائیں گے۔ جاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔ داؤد مجید کو لے کر آ جائے تو انہیں کہو کہ تیّار ہو جائیں۔“ یہ کہ کر سلیم بھاگتا ہوا عیسائیوں کے محلّے میں داخل ہوا۔

عیسائیوں نے شیر سنگھ کو ایک چارپائی پر ڈال کر رسّیوں سے جکڑ رکھا تھا۔ سلیم مردوں عورتوں اور بچّوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ شیر سنگھ انہیں بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا اور روپا اس کے پر کھڑی رو رہی تھی۔

کاکو عیسائی نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اسے مجبور ہو کر باندھا ہے۔ یہ مکھر کے گھر کو آگ لگا رہا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ سے مشعل چھینی ہے۔ اس نے ایک آدمی کو مکّا مار کر چھت سے نیچے گرادیا تھا۔

شیر سنگھ چلّایا۔ ”میں سب کو مار ڈالوں گا۔ اب اس گاؤں میں کوئی نہیں رہے گا۔“

روپا نے کہا۔ ”باپو! دیکھو سلیم آیا ہے۔ باپو ہوش میں آؤ۔“

وہ چلّایا۔ ”روپا کی بچّی خاموش رہو۔ اگر تم نے پھر یہ بات کہی تو میں تمہارا گلا گھونٹ ڈالوں گا۔ مجھے معلوم ہے سلیم پاکستان گیا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے فوجیں لے کر آئے گا!“

روپا نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سلیم! ان سے کوئی بات کرو۔ انہیں سمجھاؤ!“

سلیم نے جھک کر شیر سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گاؤں کے

عیسائیوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔ انہوں نے ہماری مدد کی ہے۔ ان غریبوں کے گھر مت جلاؤ چچا!"

شیر سنگھ نے گرج کر کہا۔ "تم کون ہو؟ چلے جاؤ یہاں سے!"

روپا نے سلیم کے ہاتھ سے ٹارچ چھین کر اس کے چہرے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ "باپو دیکھو! سلیم ہے۔ اسے پہچانتے نہیں تم؟"

وہ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ یہ سلیم کہاں ہے۔ میں نے تمہیں ایک بار کہا ہے کہ وہ فوج لے کر آئے گا۔ وہ افضل اور گلاب سنگھ کے خون کا بدلہ لے گا۔"

سلیم نے کاکو سے کہا۔ "کاکو میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ تم اس کا خیال رکھو۔ شاید اسے شراب میں کوئی زہریلی شے پلا دی گئی ہے۔"

پھر وہ روپا کے ہاتھ سے ٹارچ لیتے ہوئے بولا۔ "روپا! جب انہیں ہوش آ جائے تو کہہ دینا کہ میں کسی دِن ضرور آؤں گا!"

چند قدم چل کر وہ رکا۔ روتی ہوئی عورتیں اور مرد اس کے گرد جمع ہو

گئے۔ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں تمہاری نیکی کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر تم سے ہو سکے تو ان لاشوں پر مٹّی ڈال دینا۔“

☆☆☆☆☆

رات کے دو بجے سلیم اور اس کے ساتھی گاؤں سے کوچ کرنے کے لیے تیّار ہو چکے ہیں۔ گولی لگنے سے ایک گھوڑی کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور وہ چلنے کے قابل نہ تھی۔ ایک گھوڑے کی پچھلی ران پر معمولی زخم تھا۔ باقی دو گھوڑے جن میں سے ایک سلیم کا تھا اور ایک وہ تھا جو فجّو پہلوان نے رام چند سے چھینا تھا ٹھیک تھے۔ مجید گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھنے کے قابل نہ تھا۔ اس لیے سلیم دو آدمیوں کو ساتھ لے کر وہ زینیں اُٹھالایا جو ابھی تک گنّوں کے کھیت میں بیری کے نیچے پڑی تھیں۔ مہندر گاؤں سے اپنا گھوڑا لینے کے لیے گیا تھا لیکن سلیم کے ساتھیوں نے اس کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ داؤد نے کہا۔ ”سلیم! مجید کو ایک گھوڑے پر سوار کرا دو اور باقی دو گھوڑوں پر تم اور بشیر دو آدمیوں کو لے کر سوار ہو جاؤ۔ میں اور مختار تمہارے ساتھ پیدل چلتے ہیں۔ جب ہم تھک جائیں گے اور تم پیدل

چلنا۔"

سلیم نے مجید سے کہا۔ "مجید! اگر تمہیں زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ بٹھالیتا ہوں!"

مجید کسی اور دنیا میں تھا۔ اب تک اس نے کسی کے ساتھ بات نہ کی تھی۔ اس کی نگاہیں آگ کے ان شعلوں پر مرکوز میں جو اس کی متاعِ حیات کو بھسم کر چکے تھے۔ سلیم کے سوال پر وہ چونکا۔ "نہیں! ابھی میں تمہاری مدد کے بغیر گھوڑے پر بیٹھ سکتا ہوں!"

وہ سوار ہو رہے تھے کہ مہندر بھی گھوڑا بھگاتا ہوا پہنچ گیا۔ وہ گھوڑے سے اُترا اور اس کی باگ سلیم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ "اب جلدی کرو!"

سلیم نے کہا۔ "مجید! تم اور مختار اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ!"

گاؤں کے عیسائی پھر اُن کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ جب وہ رُخصت ہو رہے تھے کاکو نے آگے بڑھ کر سلیم کے گھوڑے کی باگ پکڑی اور کہا۔

"تمہارے جانے کے بعد یہاں سے انسانیت ختم ہو جائے گی۔ ہم اگر یہاں رہے تو مرتے دم تک تمہاری راہ دیکھیں گے اور ہمارے بیٹے اور پوتے تمہاری راہ دیکھیں گے۔ یہ زمین تمہارے لیے ترستی رہے گی!"

سلیم نے جواب دیا۔ "کاکو! ہم ضرور آئیں گے، اگر ہم نہ آسکے تو ہماری آئندہ آنے والی نسل میں سے کوئی ضرور آئے گا۔ ان کے لیے اس گھر کی راکھ مقدّس ہو گی!"

مہندر سلیم کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ سلیم نے کہا۔ "تم جاؤ مہندر! تم روپا کو تسلّی دو۔ اگر شیر سنگھ کا دماغ ٹھیک نہ ہو تو تو اسے اپنے گھر لے جاؤ!"

مہندر نے کہا۔ "میں تھوڑی دور تک تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں، ایک ضروری بات ہے!"

کاکو مجید کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اب بچّوں کی طرف پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ مجید چلّایا۔ "کاکو خدا کے لیے جاؤ۔ یہ آگ آنسوؤں سے بجھنے

والی نہیں۔" پھر اس نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ "مہندر تم بھی جاؤ۔ ہم کسی دِن واپس آ کر تمہارا شکریہ ادا کریں گے!"

مہندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔ جب میں تمہارے گاؤں میں پہنچا تھا تو میرا خیال تھا کہ تم مجھے دیکھتے ہی گولی مار دو گے! کاش تم ایسا کرتے، میرے لیے وہ موت اس زندگی سے کم تکلیف دہ ہوتی۔"

سلیم نے کہا۔ "اس علاقے کے سکھوں میں تین انسان تھے۔ ایک گلاب سنگھ جسے انہوں نے مار ڈالا۔ ایک شیر سنگھ جو شاید پاگل ہو چکا ہے اور ایک تم ہو مہندر!"

مہندر نے کہا۔ "اگر میں بھی گلاب سنگھ کی طرف مارا نہ گیا تو شیر سنگھ کی طرح پاگل ہو جاؤں گا!"

مجید کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ وقت ضائع کر رہے ہو۔ اب تین بجنے

والے ہیں۔" لیکن اچانک اسے چند قدم دور پگڈنڈی پر کوئی دکھائی دیا اور اس نے گھوڑا روک کر اپنی اسٹین گن سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو! کون ہے؟"

مہندر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "یہ بسنت ہے مجید، میری بہن۔ وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔"

لڑکی کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ "میں مہندر کی بہن ہوں۔"

مجید نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ "مہندر ہمیں معلوم ہے تمہاری بہن تم سے مختلف نہیں لیکن اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

مہندر نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ "ایک منٹ ٹھہرو مجید! کل صبح حملے سے پہلے بسنت نے بلونت کی ایک ٹامی گن نکال کر چھپائی تھی۔ اس کے ساتھ بارود کا تھلا بھی ہے۔ بلونت نے ہم سب کو پیٹا لیکن اس نے اسے اِن چیزوں کا پتہ نہیں بتایا۔ مجھے بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ٹامی گن اس نے چھپا رکھی ہے۔ جب میں گھوڑا لینے گیا تو اس نے مجھے

بتایا۔"

اتنی دیر میں لڑکی قریب آچکی تھی۔ سلیم نے گھوڑا آگے بڑھا کر اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ بسنت کا چہرہ زخموں سے سوجا ہوا تھا۔ سلیم کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔

مجید نے کہا۔ "سلیم روشنی مت کرو!"

مجید نے سلیم نے ٹارچ بجھادی۔ بسنت نے ٹامی گن اور گولیوں کا تھیلا اس کے سامنے پیش کر دیا۔

مہندر نے مجید کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "مجید یہ چیزیں میں خود لے کر آتا لیکن بسنت کو مجھ پر اعتبار نہ تھا۔"

تھوڑی دیر بعد سلیم اور اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں غائب ہو چکے تھے۔ مہندر اور بسنت ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سُن رہے تھے۔ بسنت کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ بالآخر سسکیاں لیتے ہوئے مہندر کے ساتھ لپٹ گئی۔ "بھیّا! بھیّا!" اس نے کہا۔ "تمہیں یقین

ہے کہ وہ زندہ پاکستان پہنچ جائیں گے۔"

"مجھے یقین ہے، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ کسی دِن واپس آئیں گے۔ پاپ کی آگ انصاف کی آگ کو جنم دے گی اور وہ اس وقت تک نہیں بجھے گی جب تک کہ ظلم ختم نہیں ہو جاتا!"

مغرب کی طرف بجلی چمک رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اب تیز ہو رہے تھے۔ آگ کے شعلے آہستہ آہستہ تمام گاؤں میں پھیل چکے تھے، عیسائیوں کے محلے سے بھی اب چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اور بسنت اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "مہندر! یہ آگ نہیں بجھے گی۔۔۔ یہ آگ جس نے زبیدہ، صغریٰ، عائشہ، طاہرہ اور انوری کو جلایا ہے کبھی نہیں بجھ سکتی۔"

☆☆☆☆☆

راستے میں ان کے ساتھ پاکستان کا رُخ کرنے والے پناہ گزینوں کی ٹولیاں شامل ہوتی گئیں۔ ایک قافلے میں چند ایسے آدمی عورتیں اور بچّے بھی

تھے جنہوں نے سلیم کے گھر میں پناہ لی تھی اور سکھوں کی آخری یلغار کے وقت اِدھر اُدھر بھاگ کر اپنی جانیں بچائی تھیں لیکن سلیم کے خاندان کا کوئی آدمی ان کے ساتھ نہ تھا۔ صرف اس کے گاؤں کا ایک سقّہ اور اس کی بہن تھی۔ یہ دونوں زخمی تھے اور بڑی مشکل سے قافلے کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے۔ سلیم نے اپنا گھوڑا ان کے حوالے کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے باقی ساتھیوں نے اپنے گھوڑوں پر زخمیوں کو لاد دیا اور خود پیدل چل پڑے۔ مجید نے ایک زخمی بچّے کو اپنے پیچھے بٹھالیا۔

ایک ٹولی میں سلیم کو چند نہتے سپاہی مل گئے جو باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کے اعلان کے ساتھ ہی ملازمت سے سبکدوش کر دیے گئے تھے۔ سلیم نے چار رائفلیں ان میں تقسیم کر دیں۔ مجید گھوڑے کی زین پر نڈھال سا ہو کر کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف جھک رہا تھا۔ سلیم نے ایک آدمی سے کہا۔ ”تم اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لو، یہ بہت تکلیف میں ہے۔ مجید لاؤ یہ ٹامی گن مجھے دے دو!“

مجید نے چونک کر سلیم کی طرف دیکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں، مجھے صرف پیاس لگ رہی ہے۔"

سلیم نے کہا۔ "بس اب نہر بالکل نزدیک ہے!"

مجید دوسرے ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ "تم لوگ ہوشیار رہو، شاید پل پر کوئی خطرہ ہو!"

راستے میں نہر کے قریب مسلمانوں کا ایک گاؤں جل رہا تھا اور سڑک اور آس پاس کے کھیتوں میں لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک زخمی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "آگے مت جاؤ۔ وہ نہر کے پل پر کھڑے ہیں۔"

سلیم نے اس کے قریب آکر پوچھا۔ "ان کے ساتھ فوج کے آدمی بھی ہیں؟"

"ہاں! وہ لوگوں کو روک کر تلاشی لیتے ہیں اور پھر نہر کے دوسرے کنارے چھپا ہوا جتھا مل کر حملہ کر دیتا ہے!"

قافلے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بعض لوگ تین چار میل نیچے جا کر اگلا پل عبور کرنا چاہتے تھے لیکن سلیم نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ "تم پاگل ہو،

وہ نہر کے ہر پُل پر موجود ہوں گے۔ تم اس طرح بچ کر نہیں نکل سکتے۔ تم اگر بھیڑوں کی طرح بھاگو گے تو سب مارے جائیں گے۔ ہم اس پل پر سے گزریں گے اور تم دیکھو گے کہ وہ ہمارا بال بیکا نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہمیں تمہارا خیال نہ ہوتا تو اب تک ہم راوی کے پار پہنچ چکے ہوتے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتے لیکن یاد رکھو جو پیچھے رہ جائے گا ہم اس کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھیں گے۔ ہم خودکشی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو نہیں بچا سکتے!"

سلیم نے چند اور باتیں کیں اور بد حواس لوگوں کے دلوں میں ایک نیا ولولہ زندہ کر دیا۔

مجید کو اب پیاس اور درد کا احساس نہ تھا۔ اپنے گھوڑے سے زخمی بچّے کو اتار کر اس نے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک قافلے کے آدمیوں کو ہدایات دیں اور بالآخر اپنے مسلح ساتھیوں کو چند باتیں سمجھانے کے بعد قافلے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ پل سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر اس نے چند آدمیوں سے کہا کہ وہ زخمیوں کے گھوڑوں کو لے کر ایک طرف

ہو جائیں اور راستہ صاف ہونے کا انتظار کریں۔

جب وہ پُل کے قریب پہنچے تو ڈوگرہ فوج کے آٹھ سپاہیوں سے اُن کا راستہ روک لیا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ’’ٹھہرو! ہم تمہاری تلاشی لے گا۔ ہمارا ڈیوٹی ہے کہ تلاشی لینے کے بعد تم کو پاکستان پہنچا دیا جائے۔ ڈرو نہیں ہم سکھ نہیں ہے۔ تم دیکھ سکتا ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹارچ کی روشنی اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور پھر کہا۔ ’’اب تمہارا تسلّی ہو گیا۔ اچھا ہم لوگ عورت کی تلاشی نہیں لے گا۔ عورت سب کی ماں بہن ہے۔ ہم ان کی عزّت کرتا ہے۔ وہ اس طرف ہو جائے۔ ہم صرف آدمی لوگ کی تلاشی لے گا۔ جلدی کرو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ سرکار نے ہم کو تمہاری حفاظت کے لیے بھیجا ہے!‘‘

مجید چند قدم دور ایک درخت کی آڑ میں کھڑا تھا۔ سلیم تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور دبی زبان میں بولا۔ ’’مجید ہم انہیں ایک منٹ میں ختم کر سکتے ہیں۔‘‘

مجید نے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’ابھی نہیں، لوگوں سے کہو کہ وہ

عورتوں کو ایک طرف نکال دیں۔ ٹھہرو! اپنی بندوق اور تھیلا یہیں رکھ دو اور پھر آگے بڑھ کر اطمینان سے بات کرو۔"

سلیم نے رائفل اور تھیلا درخت کی آڑ میں رکھ دیا اور آدمیوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بھائیوں ڈرو نہیں، کپتان صاحب کا حکم مانو!"

ڈوگرہ سپاہی نے کہا۔ "ہم کپتان نہیں ہے، ہم جمعدار ہے۔ تم اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ بہت ڈر گیا ہے، ان کو سمجھاؤ!"

سلیم نے قافلے کے آدمیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "دیکھو تم غلطی کر رہے ہو۔ تم نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میرا کہا مانو گے۔ اگر تم بھول گئے ہو تو میں پھر یہ کہتا ہوں کہ ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ عورتیں اطمینان سے دائیں طرف آ کر بیٹھ جائیں۔"

باقی مسلح آدمی بھی قافلے میں گھُس کر لوگوں کو سمجھا رہے تھے۔ مردوں نے بادل نخواستہ لرزتے اور کانپتے اور سہمے ہوئے بچّوں اور عورتوں کو

ایک طرف دھکیل دیا۔

تھوڑی دیر میں آدمی اور عورتیں دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر پڑی پر بیٹھ گئے اور پل کے سامنے خالی سڑک ان کے درمیان حدِّ فاصل بن گئی۔ ڈوگرہ سپاہی اطمینان سے کھڑے تھے۔

ڈوگرہ جمعدار نے اپنا لہجہ قدرے تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو تمہارے پاس اگر کوئی ہتھیار ہے تو خود ہی نکال کر ہمارے حوالے کر دو ورنہ تلاشی کے بعد اگر کسی سے کوئی چیز نکلا تو ہم گولی مار دے گا!“

جمعدار کے اشارے پر باقی ڈوگرے پٹڑی سے نیچے درختوں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ان کا منہ پل کی طرف اور پیٹھ درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے آدمیوں کی طرف تھی۔ ڈوگرہ جمعدار نے جو پوزیشن سنبھالی تھی، اس کے مطابق بہت کم آدمیوں کے ان کی گولیوں سے بچ کر سڑک یا کھیتوں کی طرف بھاگ نکلنے کا امکان تھا۔ اس نے پل کے پار دوسرے کنارے چھپے ہوئے جتھے کو ٹارچ کے ساتھ سگنل دیا۔ پھر قافلے کے آدمیوں سے کہا۔ ”معلوم ہوتا کہ تمہارے پاس کچھ نہیں۔ اب پہلے آدمی

لوگ پل پر سے گزر جائیں، پھر ہم عورت کو گزارے گا!“

لیکن قافلے کے آدمیوں میں سے کسی کو جنبش تک نہ ہوئی۔ ڈوگرہ جمعدار نے حیران ہو کر کہا۔ ”تم نے ہمارا حکم نہیں سُنا۔ ہم تم کو پُل کے پار پہنچنے کے لیں دو منٹ دیتا ہے۔۔۔ وہ تمہارا آدمی کدھر ہے جو ہم کو کپتان بولتا تھا؟“

جمعدار کے اشارے پر اس کے ساتھیوں نے لوگوں کو ڈرانے کے لیے اپنی رائفلیں سیدھی کر دیں۔ اچانک درختوں کی آڑ سے مجید کی آواز آئی۔ ”لیٹ جاؤ!“ اور ساتھ ہی اسٹین گنوں اور ٹامی گن کی ٹرٹر سنائی دینے لگی۔ ڈوگرے آن کی آن میں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

اکال سینا کا جتھا جو دوسرے کنارے پٹڑی کے نیچے گھات لگائے اپنے شکار کا انتظار کر رہا تھا، غالباً یہ سمجھا کہ یہ فائر اُن کے فوجی رہنماؤں نے کیے ہیں، وہ ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ جب انہوں نے پل کا نصف حصّہ عبور کر لیا تو داؤد، سلیم اور باقی آدمی گولیاں برساتے ہوئے آگے بڑھے۔ سکھ ایک دوسرے کو دھکیلتے اور گراتے

ہوئے واپس مُڑے، بعض نے نہر میں چھلانگیں لگا دیں۔ تھوڑی دیر میں پل لاشوں سے پٹ گیا۔ مجید گھوڑا بھگا کر لاشوں کو روندتا اور ٹامی گن سے فائر کرتا ہوا آگے بڑھا اور باقی آدمی بھی گولیاں برساتے ہوئے پل سے کچھ دور آگے نکل گئے۔

☆☆☆☆

نہر کے نیچے سڑک پر سکھوں کے پانچ چھکڑے کھڑے تھے۔ ان پر لوٹ مار کے سامان کے علاوہ رسّیوں میں جکڑی ہوئی چند عورتیں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ چھکڑوں کے آس پاس درختوں کے ساتھ دس بارہ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ان عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ زخمیوں اور بچّوں کو سوار کر دیا گیا جو کئی کوس سفر کرنے کے بعد تھکاوٹ سے چُور ہو چکی تھیں۔ قافلے کے آٹھ اور آدمی ڈوگرہ سپاہیوں سے چھینی ہوئی رائفلوں کے ساتھ مسلح ہو چکے تھے۔ سلیم ٹارچ جلا کر ایک چھکڑے پر بندھی ہوئی عورتوں کے ہاتھ پاؤں کی رسّیاں کاٹ رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ۔۔۔ آپ بہت دیر سے آئے۔ کاش آپ

اس وقت آتے جب ہمارے گاؤں پر حملہ ہوا تھا!"

گاؤں کا لفظ سن کر سلیم کی آنکھوں کے سامنے آگ کے شعلے رقص کرنے لگے۔ اس نے لڑکی کے پاؤں کی رسّیاں کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہارا گاؤں کہاں ہے؟"

"میرا گاؤں! آپ نے پُل کے پار سڑک کے کنارے آگ کے شعلے نہیں دیکھے؟ وہ میرا گاؤں تھا۔"

"تمہارے ساتھ کوئی اور؟" سلیم کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔

"میرا باپ تھا۔ میرے چار بھائی تھے۔ میرے دو چچا تھے۔ اب کوئی بھی نہیں۔ میری تین بہنیں آگ میں جل گئیں۔ میں اور ماں کنوئیں کی طرف بھاگی تھیں لیکن انہوں نے پکڑ لیا۔ اب آ گئے لیکن اب کیا فائدہ۔۔۔۔!" لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایک ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔ "عابدہ! عابدہ! بیٹی صبر کرو!"

چھکڑے قافلے کے آگے آگے چل پڑے اور مسلح آدمی سڑک کے دائیں اور بائیں کنارے قافلے کی حفاظت کر رہے تھے۔ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اور مجید بار بار قافلے کو تیزی سے قدم اٹھانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ گھوڑے کو بھگاتا ہوا کبھی قافلے کے آگے اور کبھی پیچھے ہو لیتا۔ ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک لوگوں کو یہ علم ہو چکا تھا کہ ان کا رہنما کون ہے۔ وہ پوچھتے۔ "صوبیدار! اب دریا کتنی دور ہے؟ ہم کب پہنچیں گے؟ آگے کوئی خطرہ تو نہیں؟" اور وہ گھوڑا روک کر کسی کو نرمی سے جواب دیتا اور کسی کو جھڑکتا ہوا آگے گزر جاتا۔

چھ بجے کے قریب اس کی ہمّت جواب دے چکی تھی۔ اچانک اس نے ہتھے پر سر ٹیک دیا اور اس کے ہاتھ سے ٹامی گن ِگر پڑی۔ گھوڑا رُک گیا۔ لوگوں کے شور مچانے پر سلیم اور داؤد بھاگتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ اسے گھوڑے سے اُتارا اور عورتوں کے درمیان ایک چھکڑے پر لِٹا دیا۔ سلیم نے دیکھا اس کا جسم بخار سے جل رہا تھا۔

جب مجید کو ہوش آیا تو عابدہ اس کے زخموں پر پٹیاں باندھ رہی تھی اور

اس کی جگہ سلیم گھوڑے کو اِدھر اُدھر بھگاتا ہوا قافلے کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق کی بجائے ٹامی گن تھی۔

سلیم نے چھکڑے کے قریب پہنچ کر مجید کی طرف دیکھا۔ عابدہ نے کہا۔ ”اب یہ ہوش میں ہیں۔“

لڑکی کی ماں بولی۔ ”بیٹا! یہ تمہارا بھائی ہے نا؟“

”جی ہاں!“

ایک عورت بولی۔ ”یہ سب کا بھائی ہے!“

مجید نے سر اُٹھا کر سلیم کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر ایک مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”ایک شاعر کو سپاہی بنانے کے لیے کتنے بڑے انقلاب کی ضرورت تھی۔“

راستے میں قافلے کے آدمیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب آٹھ بجے تک ان کی تعداد تین ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ سڑک پر جگہ جگہ مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ڈیرہ بابا نانک تک سکھوں کے چار

اور جتھوں نے یکّے بعد دیگرے اُن پر حملہ کیا لیکن نہتوں کی بجائے مسلح آدمیوں کا سامنا کرنا ان کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ وہ قافلے کے آدمیوں کو نہتا سمجھ کر آندھی کی طرح آتے فضا "ست سری اکال"، "پنتھ کی جے" اور خالصتان کی جے" کے نعروں سے گونج اُٹھتی۔ جب وہ قریب آجاتے تو اچانک گولیوں کی تڑاخ اور اس کے ساتھ "اللہ اکبر"، "پاکستان زندہ باد" کے نعرے بُلند ہوتے اور حملہ آور چیختے چِلّاتے بھاگ نکلتے۔ "ان کے ساتھ فوج ہے، ان کے ساتھ مسلمانوں کی فوج ہے، ان کے ساتھ بلوچ رجمنٹ ہے۔ بھاگو! بھاگو!!"

راستے میں سب سے زیادہ خطرناک مقام ڈیرہ بابانانک تھا۔ وہاں گوردوارہ اور پولیس اسٹیشن اکال سینا کے مرکز تھے۔ ہندو سب انسپکٹر بلوائیوں کا رہنما تھا لیکن اسے قافلے کی آمد سے پہلے یہ اِطّلاع مل چکی تھی کہ نہتے لوگوں کی حفاظت کے لیے فوج بھی آئی ہے۔ چنانچہ قافلے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر شہر سے گُزر گیا۔

جب وہ پولیس اسٹیشن کے سامنے سے گُزر رہے تھے، تھانیدار سکھوں کی

ایک ٹولی کے ساتھ بند دروازے کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قافلہ گزر گیا تو تھانیدار نے غضب ناک ہو کر ایک سکھ کی داڑھی پکڑلی۔ ”بد معاش! ان کے ساتھ فوج کہاں ہے؟“

اس نے کہا۔ ”جی میں جھوٹ نہیں کہتا، بچن سنگھ سے پوچھو، یہ ہمارے گھوڑوں پر سوار ہیں، ہمارے چھکڑے لے جا رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے نہر پر ہمارے ساٹھ ستّر آدمی مادیے تھے۔ ڈوگروں کو انہوں نے ایک منٹ میں صاف کر دیا تھا۔ فوج شاید ان کے پیچھے ہو۔“

دوسرے سکھ نے کہا۔ ”ہم نے ان پر کرن کے پل کے قریب حملہ کیا تھا۔ ان کے ساتھ جو سپاہی ہیں، وہ وردیوں کے بغیر ہیں۔ اگر آپ ان کی تلاشی لے سکتے تو آپ کو نصف سے زیادہ آدمی مسلح ملتے!“

تیسرے نے کہا۔ ”میں آپ کے لیے بہت بڑا تحفہ لایا تھا۔ میرے چھکڑے پر عظیم خان کی لڑکی تھی۔ اب وہ اس کے ساتھ میرا چکرا اور آٹھ سو روپے کے بیل بھی لے جا رہے ہیں۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”اب تم دریا کے پل پر جا کر تلاش کرو۔۔۔۔۔۔ اگر بیل تمھیں زندہ نہ ملے تو کم از کم ان کی کھالیں اُتار سکو گے۔“

”لیکن سردار جی! وہ لڑکیاں، خاص کر عظیم خان کی لڑکی تو بڑی خوبصورت ہے۔“

ڈیرہ بابا نانک سے آگے کی سڑک دریا کے پل تک لاشوں سے پٹی ہوئی تھی۔ قافلہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ سڑک کے کنارے ایک چوی کے کھیت میں چھپے ہوئے دو مسلمان سپاہی نمودار ہوئے اور انھوں نے آگے بڑھ کر قافلے کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ سلیم گھوڑا بھگاتا ہوا اُن کے قریب پہنچا تو ایک سپاہی نے کہا۔ ”پل پر ڈوگرہ رجمنٹ کا قبضہ ہے۔ آپ لوگ آگے مت جائیں۔“

سلیم نے پیچھے مُڑ کر داؤد کی طرف دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”ہم ضرور جائیں گے۔ اگر آگے خطرہ ہے تو ہمارے لیے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں!“

”لیکن تم ان عورتوں اور بچّوں کو مشین گنوں کے ساتھ کھڑا نہیں کر سکتے۔ ان کے پاک آرمرڈ کاریں ہیں۔ اِدھر دیکھو!“

یہ کہتے ہوئے سپاہی نے سڑک پر بکھری ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ ”گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں وہ کوئی پانچ ہزار آدمیوں کو شہید کر چکے ہیں!“

سلیم نے کہا۔ ”لیکن آپ نے باؤنڈری فورس کے ہیڈکوارٹر میں اِطّلاع نہیں دی؟“

”ہم اِطّلاع دے چکے ہیں لیکن وہاں زیادہ تعداد ہندو اور سکھ افسروں کی ہے۔ وہ ہمیں ایک طرف بھیج دیتے ہیں اور دوسری طرف حملہ کروا دیتے ہیں۔ جو تھوڑے بہت مسلمان افسر ہیں، وہ اس طرح بکھیر دیے گئے کہ وہ کچھ کر ہی نہ سکیں۔ کل شام تک ہماری رجمنٹ کے سپاہی بٹالہ سے ایک بہت بڑا قافلہ لے کر آئیں گے، پھر آپ دیکھیں گے کہ ان ڈوگروں کو کسی اور جگہ حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔ جب تک ہماری رجمنٹ پل کی حفاظت کرے گی، ان کی کوشش یہ ہو گی کہ زیادہ سے زیادہ قافلے

ان سڑکوں پر سے گزریں جہاں مسلمان سپاہی نہیں۔ اب آپ کے لیے ایک ہی راستہ ہے۔ دریا کے نیچے چند میل کے فاصلے پر ہزاروں مسلمان جمع ہیں۔ وہاں آپ کو کشتیاں مل جائیں گی۔

☆☆☆☆☆

ڈیرہ بابانانک کے پُل سے آٹھ میل نیچے کی طرف دریا کے کنارے قرب وجوار کے دیہات کے کوئی بیس ہزار لوگ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اور ہر آن نئے قافلوں کی آمد سے ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دوپہر کے وقت یہ قافلہ بھی وہاں پہنچ گیا اور اس کے ساتھ چند مسلح آدمیوں کو دیکھ کر لوگوں کے مایوس چہروں پر اُمّید کی روشنی جھلکنے لگی۔ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک ایک دوسرے سے لٹی ہوئی عصمتوں، خاک اور خون میں کھیلتی ہوئی جوانیوں، اور جلے ہوئے گھروں کی داستانیں ہی سُنی تھیں، اب اس قافلے کے مردوں اور عورتوں کی زبانی یہ سُن رہے تھے کہ فلاں جگہ ان بہادروں نے فوج کا یوں مقابلہ کیا اور فلاں فلاں مقام پر جتھوں کو اس طرح بھگایا۔ سلیم اور مجید کے خاندان کی داستان قافلے کا ہر بچّہ، ہر عورت

اور ہر مرد اپنی اپنی معلومات کے مطابق نئے انداز میں بیان کر رہا تھا۔

قرب و جوار کی بستیوں کے لوگ اپنے مال مویشی اور ایک خاصی مقدار میں خورد و نوش کا سامان چھکڑوں پر لاد کر لے آئے تھے۔ اور وہ بڑی فراخ دلی سے ان لوگوں میں راشن تقسیم کر رہے تھے جو دور دور سے بے سر و سامانی کی حالت میں آئے تھے۔ سلیم اور اس کے ساتھی بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال تھے۔ تھوڑی دیر میں ان کے لیے اس قدر پکا پکایا کھانا جمع ہو گیا جو ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ مجید کے لیے ایک عورت اپنی بھینس کا دودھ لے آئی۔ اور اس نے سلیم کے اسرار پر چند گھونٹ پی لیے۔ ایک آدمی نے اپنے چھکڑے پر لدی ہوئے سامان سے ایک لحاف اتار کر ایک جھاڑی کے نیچے بچھا دیا اور مجید کو اس پر لٹا دیا۔ عابدہ اور اس کی ماں اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

ملّاحوں اور کشتیوں کا معاملہ سلیم کی توقع کے خلاف تھا۔ دوسرے کنارے پر کشتیاں موجود تھیں۔ ملّاح ذرا دور ہٹ کر ایک کیکر کے درخت کی چھاؤں میں حقّے پی رہے تھے۔ لوگوں نے سلیم کو بتایا کہ

دوسرے کنارے سے **بعض** لوگ ملّاحوں کے ایجنٹ بن کر آتے ہیں اور اگر انہیں کوئی پانچ سو یا ہزار روپیہ دے دیتا ہے تو رات کے وقت اس کے بال بچّوں کو کشتی پر بٹھا کر پار لے جاتے ہیں۔“

سلیم نے پوچھا۔ ”اس وقت ان کا کوئی ایجنٹ یہاں ہے؟“

ایک آدمی نے جواب دیا۔ ”نہیں وہ شام کو آتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے زیادہ آدمیوں کو نکالنا شروع کر دیا تو ان کی قیمت گھٹ جائے گی!“

ایک سفید ریش آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میرے پاس کل دو سو روپیہ نقد اور کوئی چار سو کا زیور تھا۔ وہ سب میں نے ان کے حوالے کر دیا لیکن اب وہ کہتے ہیں کہ تمہارے کنبے کے گیارہ آدمی ہیں، پانچ سو روپیہ اور دو!“

سلیم نے کہا۔ ”لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ اس وقت بھی مسلمانوں میں ایسے آدمی ہو سکتے ہیں۔“

بوڑھے نے کہا۔ ”انہیں اسلام کا کیا پتہ؟ ہمارے لیے تو وہ سکھوں سے بھی بدتر ثابت ہوئے ہیں۔“

سلیم نے کہا۔ ”بابا جی یہ ہمارا قصور ہے۔ ہم نے انہیں قومی اور اجتماعی زندگی کی ذمّہ داریوں سے روشناس ہی نہیں کیا۔ میں جاتا ہوں۔“

ایک نوجوان نے کہا۔ ”اصل میں یہ سارا قصور ملّاحوں کا نہیں، پار کے گاؤں کا ایک چودھری ان سے حصّہ وصول کرتا ہے۔ ملّاح اس کی مرضی کے خلاف نہیں جاسکتے۔ ہم نے اسے سمجھایا ہے لیکن وہ بہت بڑا آدمی ہے اور بدمعاشوں کی ایک ٹولی اس کے ساتھ ہے۔ اگر آپ اسے سمجھائیں تو ملّاح بھی ٹھیک ہو جائیں گے!“

سلیم نے کہا۔ ”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”میں پار سے آیا ہوں۔ میں بھی ایک ملّاح ہوں۔ میں نے کسی معاوضے سے بغیر لوگوں کو نکالنا شروع کیا تھا، میں نے تین پھیرے لگائے لیکن جب چوتھی بار کشتی لے کر آیا تو ایک دم ڈیڑھ سو آدمی میری کشتی پر

ٹوٹ پڑے۔ میں نے ان کی منّتیں کیں، ہاتھ جوڑے لیکن انہوں نے پروانہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشتی ڈوب گئی۔ مجھے کشتی کا افسوس نہیں لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ اب میں اپنے بھائیوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا!"

"تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میرے ساتھ آؤ!"

اڑھائی بجے کے قریب سلیم، داؤد اور یہ نوجوان ملّاح جس کا نام فقیر دین تھا، تیر کر دریا کے دوسرے کنارے پہنچ چکے تھے۔ ملّاحوں نے پہلے کورا جواب دیا پھر ذرا روکھے پن سے سلیم کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ لیکن کوئی پندرہ منٹ کی تقریر کے بعد سلیم ان میں سے چند آدمیوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا۔ اس کی تقریر، سُننے والوں کے دِلوں پر تیر و نشتر کا کام کر رہی تھی۔ ایک نوجوان نے جذبات سے بے قابو ہو کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ "لعنت ہے ایسی کمائی پر۔" پھر وہ آگے بڑھ کر کشتی کا رسّہ کھولتے ہوئے سلیم کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ "قوم کی عزّت برباد ہو رہی ہے اور ہم دوزخ کی آگ سے جھولیاں بھر کر خوش ہو رہے ہیں۔"

ایک بوڑھے ملّاح نے اپنا حقّہ اٹھا کر دریا میں پھینک دیا اور کہا۔ ”بابو جی! مسلمان کا پیسہ ہمارے لیے سور کا گوشت ہو گا۔ صادق اٹھو، ورنہ میں تمہارا حقّہ بھی توڑ دوں گا!“

تھوڑی دیر میں پانچ کشتیاں دوسرے کنارے کا رُخ کر رہی تھیں۔

ایک ہٹّا کٹّا سیاہ فام ملّاح قدرے پریشان ہو کر کبھی اپنے ساتھیوں اور کبھی سلیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والا سفید پوش پہنچ گیا اور اس نے آتے ہی کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان کو دِن کے وقت دریا میں کشتیاں ڈالنے کے لیے کس نے کہا ہے؟“

سیاہ فام ملّاح نے اُٹھ کر جواب دیا۔ ”چوہدری جی! یہ بابو تو ہم پر تھانیدار سے بھی زیادہ رُعب ڈال رہا ہے۔“

چوہدری سلیم کی طرف متوجّہ ہو کر بولا۔ ”یہ کسی کے نوکر نہیں کہ سارا دِن کشتیاں چلاتے رہیں۔ اگر ادھر سے سکھ حملہ کر دیں تو ان کی جان کا ذمّہ دار کون ہے؟“ پھر وہ کنارے کی طرف بڑھ کر چلّایا۔ ”او حرام زادو!

کشتیاں واپس لے آؤ۔"

"حرام زادے وہ نہیں تم ہو۔" سلیم نے آگے بڑھ کر ٹامی گن اس کی توند کے ساتھ لگا دی۔ چوہدری کے پانچ ساتھی جو چند قدم پیچھے آ رہے تھے۔ بھاگ کر آگے بڑھے لیکن داؤد نے پستول دکھا کر انہیں روک لیا۔ چوہدری اب بُری طرح کانپ رہا تھا۔

سلیم نے کہا۔ "تم جیسے قوم کے دُشمن کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں لیکن کاش میرے پاس فالتو بارود ہوتی۔ میں جانتا ہوں کہ تم صرف ڈنڈے کی زبان سمجھ سکتے ہو لیکن پھر بھی میں تمہیں ایک بار موقع دیتا ہوں۔ اگر میں نے دوسرے بار تمہیں یہاں دیکھا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ بدمعاشوں کی ٹولی تمہاری مدد نہیں کر سکے گی اور یہ بھی یاد رکھو تمہیں لوگوں سے وصول کی ہوئی ایک ایک کوڑی کا حساب دینا پڑے گا۔ اب یہاں سے بھاگ جاؤ!"

چوہدری اور اس کے ساتھیوں نے دوبارہ مُڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ داؤد نے ہوا میں ایک فائر کر دیا اور ان کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی۔

سیاہ فام ملّاح چُپکے سے اُٹھ کر کنارے کی طرف بڑھا اور اپنی کشتی کے قریب پہنچ کر کہنے لگا۔ ”آؤ بابو جی!“

کشتیاں ابھی کچھ دور ہی تھیں کہ بہت سے لوگ اپنے بچّوں اور سامان کی گٹھریوں کو اُٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ بعض لوگ دریا میں اُتر کر گھٹنے اور بعض کمر کے برابر گہرے پانی میں جا کھڑے ہوئے۔ ملّاحوں نے یہ دیکھ کر کشتیاں روک لیں۔ سلیم اور داؤد کشتی سے اُترے اور لوگوں کو دھکیل دھکیل کر واپس کنارے کی طرف ہٹانے لگے۔ ان کے باقی ساتھیوں میں سے پولیس کے آدمی اس موقع پر بہت کار آمد ثابت ہوئے۔ انہوں نے لوگوں کو اِدھر اُدھر دھکیل کر دریا کے کنارے کچھ جگہ خالی کرا دی۔

سلیم نے کنارے پہنچ کر نہیں سمجھایا۔ ”دیکھو! جب تک تم لوگ مجھے یہ یقین نہیں دلاؤ گے کہ تم صبر سے کام لو گے، یہ کشتیاں آگے نہیں آئیں گی۔ تمہاری بدحواسی کے باعث ایک کشتی دریا میں ڈوب چکی ہے۔ اگر تم اس طرح کرتے رہے تو ایک آدمی بھی دوسرے کنارے نہیں پہنچے گا۔ تم یہ جانتے ہو کہ سب آدمی ایک ہی بار کشتی پر سوار نہیں ہو سکتے۔ ہم

سب سے پہلے عورتوں، بچّوں اور زخمیوں کو دوسرے کنارے پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد دوسروں کی باری آئے گی۔ میں اس بات کا ذمّہ لیتا ہوں کہ کشتیاں اب چلتی رہیں گی لیکن ایسے بے قاعدگی میں ملّاحوں کا کام مُشکل ہو جائے گا۔ میں تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ جب تک یہ کام ختم نہیں ہو گا میں یہیں رہوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھی بھی تمہیں چھوڑ کر بھاگنا گوارا نہیں کریں گے۔ جب تک ہم زندہ ہیں سکھوں کو اس طرف نہیں آنے دیں گے۔

☆☆☆☆☆

پانچ بجے کے قریب مجید آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ سلیم اس کے قریب پہنچ کر خاموش کھڑا رہا۔ عابدہ نے کہا۔ ”آپ انہیں جلدی پار پہنچا دیجئے۔ انہیں بہت تکلیف ہے۔“

سلیم نے کوئی جواب دیے بغیر جھُک کر مجید کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجید نے آنکھیں کھولیں۔ سلیم نے کہا۔ ”کشتیاں عورتوں اور بچّوں کو ایک پھیرا لے کر گئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گی۔“

مجید نے کہا۔ ”سلیم تم جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا۔ تم میری فکر نہ کرو!“

سلیم نے مُضطرب ہو کر کہا۔ ”مجید تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ کر جا سکتا ہوں؟“

مجید نے محبّت بھرے لہجے میں کہا۔ ”بھائی خفا ہونے کی کوئی بات نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ تم پاکستان بھاگ جاؤ! میرا مطلب تھا کہ تم ڈاکٹر شوکت سے گھر کا حال معلوم کرو۔ میرا خیال تھا کہ ہم ان لوگوں کو یہاں پہنچاتے ہی ان کے گاؤں کا رُخ کریں گے لیکن کاش مجھ میں تھوڑی سی طاقت اور ہوتی۔ اب تم جاؤ، میں جانتا ہوں تمہارا دل اور دماغ وہاں ہے۔ تم چند گھنٹوں تک انہیں لے کر یہاں پہنچ سکتے ہو۔“

سلیم نے کہا۔ ”مجید! تم داؤد اور بشیر کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ داؤد تمہیں دریا کے پار کسی ڈاکٹر کے سپرد کر کے واپس آجائے گا۔ تم سفر کے قابل ہو جاؤ تو بہن امینہ کے پاس جاؤ۔ میں تمہارے لیے گھوڑے بھی پار پہنچا دیتا ہوں!“

اس کے بعد سلیم نے عابدہ اور اس کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی تیّار ہو جائیں۔'' عابدہ کی ماں نے کہا۔ ''بیٹا نارووال میں ہمارے رشتہ دار ہیں، ہم تمہارے بھائی کو وہاں لے جائیں گی اور جب تک یہ درست نہیں ہو گا ہمارے پاس رہے گا۔ اگر نارووال میں اچھا ڈاکٹر نہ ملا تو میرا بھائی سیالکوٹ میں ہے، میں اسے وہاں لے جاؤں گی۔ تم یہی سمجھو کہ میں اس کی ماں ہوں!''

سلیم نے مجید کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ ''اب وقت ضائع نہ کرو سلیم! اس آگ سے جو کوئی بچ سکتا ہے، اسے بچا لو۔۔۔! میں جانتا ہوں تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میں ان کے ساتھ جانے کے لیے تیّار ہوں لیکن ہمارے ساتھ صرف بشیر کافی ہے۔ داؤد کی یہاں ضرورت ہے۔ یہاں ہر آدمی کی جان میری جان سے زیادہ قیمتی ہے۔''

ایک گھنٹے کے بعد سلیم اور داؤد دریا کے پار مجید، بشیر، عابدہ اور اس کی ماں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

مجید گھوڑے پر سوار تھا اور بشیر اس کی باگ پکڑے ہوئے تھا۔ رخصت

کے وقت مجید نے اپنی بش بُشرٹ کی جیب سے پستول نکال کر سلیم کو دے دیا اور کہا۔ ”یہ بھی اپنے پاس رکھو اور دیکھو، اگر بارود ختم ہو جائے تو ہتھیار پھینک نہ دینا۔ پاکستان کو ان کی ضرورت ہے۔“

سلیم نے کیمپ کے ہزاروں آدمیوں کو کسی حفاظت کے بغیر چھوڑ کر جانا گوارانہ کیا۔ اس نے داؤد کے علاوہ فقط ان تین آدمیوں پر اپنا ارادہ ظاہر کیا جو گاؤں سے اس کے ساتھ آئے تھے اور جو اس کا ساتھ دینے کے لیے تیّار ہو چکے تھے۔ باقی مسلح آدمیوں کو اس کیمپ سے ایک طرف جمع کر کے سمجھایا کہ ہم چند گھنٹوں کے لیے کہیں جارہے ہیں، میری غیر حاضری میں ان لوگوں کو حفاظت تمہارے ذمّہ ہے۔ اگر میں نہ آسکوں تو تم آخری دم تک ان لوگوں کی حفاظت کرنا اور انہیں چھوڑ کر بھاگ نہ جانا۔ میں تم سے اس بات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں۔ کیمپ سے ایسے لوگوں کی تلاش کرو جو کشتیاں چلانا جانتے ہیں۔ جب ملّاح تھک جائیں تو وہ ان کی جگہ لے لیں۔ ہمارے پاس بارود بہت تھوڑی ہے، اسے بہت احتیاط سے استعمال کرنا!“

پولیس کے ایک کانسٹیبل نے کہا۔ ”ہم بے غیرت نہیں بنیں گے، جب ہمارے ہاتھ خالی تھے تو بھی ہم نے ان عورتوں اور بچّوں کو چھوڑ کر بھاگنا گوارانہ کیا، اب ہمارے پاس رائفلیں ہیں۔ جب تک ہمارے ہاتھ کٹ نہیں جاتے، ہم لڑیں گے لیکن آپ کا یہاں رہنا ضروری تھا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کی جگہ کوئی اور چلا جائے؟“

”نہیں!“

”تو پھر چند آدمی اور ساتھ لیتے جائیں۔“

”نہیں! آدمیوں کی یہاں ضرورت ہے!“

ایک اور آدمی نے سوال کیا۔ ”آپ کہاں جارہے ہیں؟“

”یہاں سے دس بارہ میل دور ایک گاؤں ہے اور وہاں۔۔۔ وہاں۔“ سلیم کی آواز بیٹھ گئی اور وہ افق کی طرف دیکھنے لگا۔ حدِّ نگاہ پر چند بستیوں سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ سلیم اچانک ایک طرف بھاگا اور ایک چھکڑے کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کا رسّا

کھول کر اس پر سوار ہو گیا۔

”سلیم ٹھہرو! ٹھہرو!“ داؤد نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”تم تنہا نہیں جاسکتے۔“

جلدی آؤ! داؤد!“

ایک منٹ کے اندر داؤد اور ان کے باقی تین ساتھی گیندوں پر سوار ہو گئے۔ ان کے راستے میں اُجڑی ہوئی بستیاں تھیں، جلتے ہوئے گھر تھے۔ مردوں، عورتوں اور بچّوں کی لاشیں تھیں۔ جنہیں کہیں کہیں گدھے نوچ رہے تھے۔ بعض جگہوں پر گِدھوں کی ٹولیاں لاشوں کے پاس بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھیں۔ بھارت کے بھیڑیے ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ شکار مار چکے تھے۔ وہ شاید ایک دوسرے سے یہ کہہ رہے تھے۔ ”ہم نے چنگیز اور ہلاکو کی دعوتیں اُڑائی ہیں۔ لیکن اہنچا پر مودھر کی وسیع دستر خوان پر ہم نے جو فراوانی دیکھی ہے، وہ پہلے کبھی نہ تھی۔ چنگیز اور ہلاکو تو میزبانی کے آداب سے واقف ہی نہ تھے۔ وہ بسا اوقات ہمارے سامنے آہن پوش آدمیوں کی لاشیں پھینک دیتے تھے اور ان

کے آہنی لباس کے باعث ہمارا کام بہت مشکل ہو جاتا تھا لیکن ہمارے یہ میزبان لاشوں کے کپڑے بھی نوچ ڈالتے ہیں، پھر اُن کے ٹکڑے کر دیتے ہیں تاکہ ہمیں تکلیف نہ ہو اور پھر اس زمانے میں تو زیادہ تر سخت گوشت والے مردوں کو ہی قتل کیا جاتا تھا لیکن بھارت ماتا کے دستر خوان پر عورتوں اور بچّوں کے گوشت کی فراوانی ہے۔۔۔ وہ تاریک زمانہ تھا مگر اب دنیا بدل چکی ہے۔ اب بھارت کے بیٹے گِدھوں کے مزاج سے واقف ہو چکے ہیں۔۔۔ کہو بھارت ماتا کی جے!"

راستے میں ان لوگوں کی ٹولیاں ملیں جو دریا کا رُخ کر رہے تھے۔ سلیم گھوڑا روکتا اور ان سے ڈاکٹر شوکت کے گاؤں کا حال پوچھتا لیکن کسی کو اپنا ہوش نہ تھا۔۔۔ اسے عام طور پر اس قسم کے جواب ملتے۔

"میرا باپ اندھا ہے اور میں اسے فلاں جگہ چھوڑ آیا ہوں۔"

"میرے اتنے بچّے تھے، ایک کرن میں ڈوب گیا اور باقی دوسرے کنارے پر پڑے ہوئے ہیں۔"

”میں اپنے خاندان کی لاشیں دفن نہیں کر سکا۔“

”مجھے تو اپنے گھر کے کسی آدمی کا پتہ نہیں!“

”تم نے راستے میری بہن تو نہیں دیکھی؟ اس کے دوپٹے کا رنگ یہ تھا۔ اس کی شکل ایسی تھی۔“

”آگے مت جاؤ۔ آگے مت جاؤ!“

ایک گاؤں کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں عورتوں اور بچّوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ شام ہونے کو تھی۔ سلیم نے گھوڑے کو روکا۔ اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ ”اب ہر گاؤں میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ شام ہونے والی ہے۔ ہم سب کو نہیں بچا سکتے۔ ہمیں پہلے ان کی خبر لینی چاہیے۔“

”نہیں ہم انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔“ یہ کہتے ہوئے سلیم نے گھوڑے کی باگ گاؤں کی طرف موڑ لی۔ گاؤں کے لوگ چند مکانوں کی چھتوں پر جمع ہو کر حملہ آوروں پر اینٹیں برسا رہے تھے اور سکھوں اور ہجوم ان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ دو سکھ کچھ دور پیچھے ہٹ کر بندوقوں سے فائر کر

رہے تھے۔ داؤد نے ان کے عقب میں نمودار ہو کر ٹامی گن سے فائر کیے، ایک گر پڑا اور دوسرا بھاگ کر ایک مکان کی آڑ میں روپوش ہو گیا۔ سلیم اور باقی آدمی گھوڑے بھگا کر آگے بڑھے اور جتھے پر گولیاں برسانے لگے۔ سکھ بھاگ نکلے۔ چند لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح مسلمانوں نے انہیں پسپا ہوتے دیکھ کر اللہ اکبر کا نعرہ بُلند کیا اور چھتوں سے چھلانگیں لگا کر اُن کا تعاقب کرنے لگے۔

باقی عورتیں اور مرد اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئے لیکن سلیم اور اس کے ساتھ ایک لمحہ توقّف کے بغیر گھوڑے دوڑاتے ہوئے گاؤں سے نکل گئے۔ لوگ حیران ہو کر ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے۔ ”یہ کون تھے؟ یہ ٹھہرے کیوں نہیں؟“

ایک سفید ریش آدمی انہیں سمجھا رہا تھا۔ ”یہ رحمت کے فرشتے تھے۔ یہ پاکستان کے سپاہی تھے۔“

اس گاؤں سے آگے کوئی ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سلیم نے

ایک چوراہے پر اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور اپنے ساتھیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ وہی راستہ ہے جو پکی سڑک سے اُترتا ہے، اب ہمیں دائیں طرف مُڑنا چاہیے۔“ داؤد نے کہا۔ ”رات ہونے والی ہے ہمیں تسلّی کر لینی چاہیے۔“

تھوڑی دور موٹروں کی آواز آرہی تھی۔

داؤد بول۔ ”ہم سڑک کے بالکل قریب آ نکلے ہیں۔“

سلیم نے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو، میں پانچ منٹ میں سڑک پر میل کا نشان دیکھ کر آتا ہوں۔ وہاں سے مجھے اندازہ ہو جائے گا۔“

سلیم نے گھوڑے کی باگ موڑی ہی تھی کہ اس کا ایک ساتھی چلّایا۔ ”ٹھہرو! کوئی سوار اس طرف آرہا ہے۔“

پگڈنڈی پر تیز رفتار گھوڑے کی ٹاپیں سُن کر سلیم اور اس کے ساتھی کسی غیر متوقع خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیّار ہو گئے۔ شام کے دُھندلکے میں انہیں ایک سوار دکھائی دیا۔ اپنے ساتھیوں کو اس کی طرف بندوقیں

سیدھی کرتے ہوئے دیکھ کر سلیم نے کہا۔ ”ٹھہرو! وہ شاید کوئی مسلمان ہو۔ ایک سکھ اس طرح پانچ آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

تھوڑی دیر میں وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر ایک بیس بائیس سالہ نوجوان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی باگ اور دوسرے میں برچھی تھی۔ سوار نے قریب پہنچ کر گھوڑے کی باگ کھینچی اور گھوڑا اور دو تین بار سیخ پا ہونے کے بعد رُک گیا۔ سوار نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”تم نے میرے گاؤں کو بچایا ہے، میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا۔“

سلیم نے جواب دیا۔ ”ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے، تم پر احسان نہیں کیا۔“
”میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ بندوقیں کہاں سے ملتی ہیں؟ گاؤں سے ایک زخمی سکھ کی بندوق ہمیں مل گئی ہے۔ اگر ہمیں پانچ چھ اور بندوقیں مل جائیں تو ہم آخری دم تک سکھوں کا مقابلہ کریں گے۔ اگر کہیں سے قیمت پر بھی ملتی ہوں تو ہم اپنی عورتوں کا تمام زیور اتار کر دینے کے لیے تیّار ہیں۔“

سلیم نے کہا۔ ”کاش! ہم چند مہینے پہلے اس طرح سوچ سکتے۔“

نوجوان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”چند مہینے پہلے ہمیں علم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ یہ فریب ہوں گے۔ ہمارے علاقے کے لیڈر تو اعلان سے ایک دِن پہلے بھی یہ کہتے پھرتے تھے کہ ہماری تحصیل پاکستان میں جائے گی۔ ہم یہاں سکھوں اور ہندوؤں سے دو گنا زیادہ تھے۔ لیکن اب باتوں سے کیا فائدہ؟ ہم بندوقیں لینا چاہتے ہیں اور ان کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیّار ہیں۔ ہماری غیرت میں ان وحشیوں کے آگے بھاگنے کی اجازت نہیں دے گی۔ تم لوگوں نے چند فائر کیے اور وہ بھیڑوں کی طرح بھاگ نکلے۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ، بندوقیں کہاں سے ملتی ہیں؟ لو میری بیوی، میری بہنوں اور میری ماں کا زیور ہے اور اگر تم کہیں سے پانچ رائفلوں کا بندوبست کر سکو تو میں اپنے گاؤں کی ہر عورت کا زیور اتروا کر دینے کے لیے تیّار ہوں۔“

نوجوان اپنی جیب سے ایک پوٹلی نکال کر سلیم کی طرف بڑھا رہا تھا۔ سلیم نے کہا۔ ”میرے بھائی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم قوم کی عزّت کا سودا

کرنے والوں میں سے نہیں۔ ہمیں بندوقوں کی منڈی کا علم نہیں۔ اب بندوقیں حاصل کرنے کے لیے صرف ہمّت کی ضرورت ہے۔ ہم نے یہ بندوقیں سکھوں اور ہندوستانی فوج کے سپاہیوں سے چھینی ہیں۔ میں تمہیں اس وقت ایک پستول دے سکتا ہوں۔ یہ بھرا ہوا ہے۔ میرے پاس اس وقت اور گولیاں نہیں لیکن اگر اس کا صحیح استعمال کر سکو تو شاید تمہیں ان پانچ گولیوں کے عوض پانچ بندوقیں مل جائیں۔ اب تم جاؤ، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

”آپ کہاں جائیں گے ؟“

”تم ڈاکٹر شوکت کو جانتے ہو ؟“

”انہیں کون نہیں جانتا!“

”ان کے گاؤں کا یہی راستہ ہے ؟“

”نہیں! وہ راستہ آپ کو آگے چل کر ملے گا۔ لیکن سوچنے کی ضرورت نہیں، آپ میرے پیچھے آئیں۔“

”تم ہمارے ساتھ چلو گے ؟“

نوجوان نے مُسکرا کر کہا۔ ”میں بندوق حاصل کرنے سے زیادہ تمہارا ساتھ دینے کے لیے تمہارے پیچھے آیا ہوں۔“

نوجوان نے تھوڑی دور جا کر سلیم کی طرف مُڑ کر دیکھا اور سوال کیا۔ ”آپ کہاں سے آئے ہیں ؟“

”ہم ضلع گورداسپور سے آئے ہیں !“

”میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ہاں الیکشن کے دنوں میں !“

”ہاں ان دِنوں میں نے اس علاقے کا دورہ کیا تھا۔“

”آپ کا نام سلیم ہے ؟“

”ہاں !“

”میرا نام امیر علی ہے، آپ کو یاد نہیں رہا۔ میں دو دِن آپ کے ساتھ رہا تھا۔ڈاکٹر صاحب آپ کے رشتہ دار ہیں ؟“

"ہاں! اب گاؤں کتنی دور ہو گا؟" سلیم نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے ایک کوس ہو گا۔"

سلیم کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ وہ تصوّر میں گاؤں کے مختلف مناظر دیکھے رہا تھا۔ کبھی اسے عصمت کی آنکھوں میں تشکّر کے آنسو دکھائی دے رہے تھے، کبھی وہ اس کی جگر دوز چیخیں سُن رہا تھا۔ بھی وہ تصوّر کر رہا تھا کہ وہ سب کھلے صحن میں اُس کی گرد جمع ہو کر طرح طرح کے سوال پوچھ رہے ہیں۔ کبھی وہ ملبے کے ڈھیر پر کھڑا ہو کر انہیں آوازیں دے رہا تھا۔

"ٹھہرو!" امیر علی نے اچانک گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔

سلیم نے چونک کر باگ کھینچ لی۔ امیر علی نے جھک کر نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اُدھر دیکھو!"

سلیم جو چند قدم آگے نکل گیا تھا، گھوڑا موڑ کر اس کے قریب آیا۔ اسے

زمیں پر ایک لاش دکھائی دی۔ سلیم نے جلدی سے تھیلے سے ٹارچ نکال کر اس پر روشنی ڈالی۔ داؤد نے گھوڑے سے اُتر کر لاش کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”یہ لاش آج کی نہیں، اس سے بُو آ رہی ہے!“

امیر علی نے کہا۔ ”ادھر دیکھو، وہ گاؤں ہے۔ وہ اونچا درخت ڈاکٹر شوکت کے گھر کی نشانی ہے۔“

سلیم نے پُر اُمّید ہو کر کہا۔ ”گاؤں محفوظ ہے، وہاں آگ نہیں۔ چلو جلدی کرو!“

امیر علی نے کہا۔ ”اب گھوڑے آہستہ کر لو۔ ممکن ہے گاؤں سے باہر دشمن گھات لگا کر بیٹھا ہوا ہو۔“

چند قدم اور چلنے پر انہیں اور لاشیں نظر آئیں۔ امیر علی نے گھوڑا روکتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا۔ ”میرے دوست گاؤں پر حملہ ہو چکا ہے؟“

سلیم چلّایا۔ ”نہیں نہیں!“ تاہم وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کے خیال کی تردید کرنے سے زیادہ اپنے آپ کو تسلّی دے رہا ہے۔

تھوڑی دور آگے چل کر انہیں گاؤں سے باہر ڈاکٹر شوکت کے مکان کی چار دیواری نظر آنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی آس پاس کے کھیتوں میں جگہ جگہ لاشیں دکھائی دینے لگیں۔

امیر علی نے قبرستان کے پاس بیری کے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے گھوڑا روک کر کودتے ہوئے کہا۔ "گھوڑے یہاں باندھ دو۔ ہم آگے پیدل جائیں گئے۔ ایک آدمی گھوڑوں کے پاس رہے۔"

سلیم نے کہا۔ "تم یہاں ٹھہرو۔ ہم جاتے ہیں۔" امیر علی نے جواب دیا۔ "میں آپ کی حکم عدولی نہیں کرتا لیکن میرا ساتھ جانا ٹھیک ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں بندوق چلانا نہیں جانتا!"

سلیم نے اپنے ایک ساتھی کو گھوڑوں کے پاس ٹھہرا دیا اور امیر علی سے کہا۔ "تم اس کی رائفل لے لو اور پستول اسے دے دو!"

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر شوکت کے مکان سے باہر بھی کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ صحن کے

پھاٹک کا دروازہ کھلا تھا لیکن سلیم کو آگے بڑھنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ چند ثانیے وہ پھاٹک کے سامنے کھڑا رہا۔ پھاٹک سے آئے صحن میں بھی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ سلیم کی آنکھوں کے سامنے شاہراہِ حیات کی آخری مشعل بجھ چکی تھی۔ اس کے آسمان کے ستاروں کی گردش میں ایک ٹھہراؤ آچکا تھا۔ آس پاس بکھری ہوئی لاشوں کا سکوت اس کے لیے آگ کے شعلوں، بندوقوں کے شور اور تلواروں کی چمک سے زیادہ بھیانک تھا۔ اس کی زبان گنگ تھی لیکن اس کے دل کی خفیف دھڑکنیں عصمت! عصمت!! عصمت!!!" پکار رہی تھیں۔ عصمت کے نام میں ابھی تک زندگی کی حرارت تھی۔ سلیم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ ملنے لگے۔ "عصمت! عصمت!!" وہ اچانک بُلند آواز میں چلّایا اور بھاگتا ہوا ان صحن میں داخل ہو گیا۔ چند کتّے جو ایک لاش کو جھنجوڑ رہے تھے، اچانک بھاگ کر صحن سے باہر نکل گئے۔ سلیم نے تھیلے سے ٹارچ نکالی اور جھک جھک کر صحن اور برآمدے میں بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ مسلمانوں کے ساتھ کہیں کہیں سکھوں کی لاشیں بھی پڑی ہوئی

تھیں۔ اچانک سلیم کے ہاتھ میں اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی ٹارچ کی روشنی ایک چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ امجد کی لاش بر آمد کے ستون کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بازو دھڑ سے علیحدہ تھے۔ شاہ رگ اس طرح کٹی ہوئی تھی جیسے اسے لٹا کر ذبح کیا گیا ہو۔ دونوں باچھیں جبڑوں کے کونوں تک چیر دی گئی تھیں لیکن اس کی کشادہ پیشانی، اس کی خوبصورت ناک، اس کی آنکھیں جو ابھی تک کھُلی تھیں، یہ کہہ رہی تھیں۔ ”مجھے غور سے دیکھو میں امجد ہوں۔ میں عصمت اور راحت کا بھائی ہوں، میں وہ معصوم مُسکراہٹ ہوں جسے زندگی کے ہونٹوں سے نوچ لیا گیا ہے!“

بر آمدے سے آگے کمرے کے دروازے کا ایک کواڑ ٹوٹا ہوا تھا۔ دہلیز سے باہر اور اندر چند اور لاشیں پڑی تھیں۔ عورتوں اور بچّوں کی لاشیں۔ سلیم کانپتے ہوئے ہاتھ سے ان پر روشنی ڈال رہا تھا۔ عورتیں زیادہ تر عمر رسیدہ تھیں۔ سلیم نے ٹارچ بجھا دی۔ اس کے منہ سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز آرہی تھی۔ ”عصمت! راحت!!“ اس کے جواب میں ایک مکان کی چھت سے کتّے کے رونے کی آواز آرہی تھی۔

داؤد نے کہا۔ ”چلو اندر دیکھیں۔“

سلیم بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ داؤد نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ کمرے میں ان عورتوں کی لاشیں تھیں جنہیں سلیم نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اس سے آگے بیٹھک میں کھلنے والا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ سلیم کے دل اور دماغ کے وہ حصّے مفلوج ہو چکے تھے جنہیں درد کا احساس ہوتا ہے۔ اب اس کے لیے کوئی چیز بھیانک نہ تھی۔ اس نے اچانک داؤد کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور بیٹھک کے اندر داخل ہوا۔ بیٹھک میں کوئی نہ تھا۔ فرش کی دری پر کہیں کہیں خون کے دھبّے تھے۔ بغل کے کمرے کا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی دہلیز کے آگے سکھوں کی دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں ایک اور لاش تھی۔ سلیم نے ایک ہی نظر میں اسے پہچان لیا اور اسے دوسری نظر دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ عریانی، بے بسی اور مظلومیت کی یہ تصویر زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔ ”میری طرف مت دیکھو میرے قریب مت آؤ۔ دنیا کے تمام چراغ بجھا دو۔ سورج، چاند اور ستاروں سے کہو کہ وہ ہمیشہ کے لیے

روپوش ہو جائیں تاکہ مجھے کوئی اس حال میں نہ دیکھ سکے۔

سلیم نے داؤد کو دھکا دے کر باہر نکال دیا اور باقی آدمیوں سے جو ابھی تک بیٹھک میں کھڑے تھے، کہا۔ ”تم یہیں رہو!“

ایک لمحہ توقّف کے بعد اس نے لاش کی طرف پیٹھ کر کے ٹارچ جلائی۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک صندوق کھلا پڑا تھا لیکن وہ خالی تھا۔ چند کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن سلیم ان میں اپنے مطلب کی کوئی چیز تلاش نہ کر سکا۔ صندوق کے ساتھ ایک پلنگ پر پرانی دری بچھی ہوئی تھی۔ سلیم نے دری اٹھائی اور ٹارچ بجھا کر تاریکی میں ٹٹول ٹٹول کر پاؤں رکھتا ہوا پیچھے مڑا، اچانک اس کے پاؤں سے کوئی شے لگی اور وہ جھک کر ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ اس کے بازو اور سر کے بالوں کو چھونے کے بعد اس نے دری کو اس کے اوپر ڈال دیا۔

اس کے بعد وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ باہر نکلنے کے ارادے سے اس نے ٹارچ دوبارہ جلائی لیکن اس کے دل میں اچانک یہ خیال آیا، شاید کوئی اور ہو۔ شاید میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہو۔ اس نے جھک کر

کانپتے ہوئے ہاتھ سے دری کا ایک سرا اُٹھا کر چہرے پر روشنی ڈالی۔ یہ وہی تھی، عصمت اور راحت کی ماں۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ بری طرح نوچا گیا تھا۔ امجد کی طرح اس کی آنکھیں بھی کھُلی تھیں۔ ان میں ایک التجا تھی۔ ایک پیغام تھا۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں قوم کے بیٹوں سے کہہ رہی تھیں۔

"میں تمہاری غیرت ہوں۔۔۔ تم میری عصمت کی قسم کھا سکتے ہو۔ میں وہ بہن ہوں، جس نے دمشق کے ایوانوں پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ محمد بن قاسم کی تلوار کو میں نے بے نیام کیا تھا۔ سندھ میری خاطر فتح ہوا تھا۔ میں وہ ماں ہوں جس نے محمود غزنوی کو دودھ پلایا تھا۔ سومنات کے بُت توڑنے والے مجاہد کو میں نے لوریاں دی تھیں۔ میں وہ بیٹی ہوں جس کی رگوں میں تیمور کا خون ہے۔ لال قلعہ میرے لیے تعمیر ہوا تھا۔ میں نے اس سرزمین پر صدیوں تک تیری فتح و نصرت کے گیت گائے ہیں۔ اے قوم! دیکھو میں کون ہوں!!"

سلیم نے دوبارہ اس کے چہرے پر دری ڈال دی اور کمرے سے باہر نکل

آیا۔ اس نے ایک بار پھر تمام کمروں میں چکر لگایا۔ ایک ایک لاش کو غور سے دیکھا۔ بعض چہروں کو کرپانوں کی ضربوں سے اس طرح مسخ کر دیا گیا تھا کہ اُن کے اصلی خدوخال کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ تاہم سلیم کے دل کی دھڑکنیں گواہی دے رہی تھیں کہ عصمت اور راحت ان میں نہیں ہیں۔ ان میں جوان لڑکیوں کی لاشیں بہت کم تھیں۔ مکان کا کونہ کونہ دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ صحن میں پڑی ہوئی لاشیں دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ خاموشی سے اس کے ساتھی گھوم رہے تھے۔ داؤد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سلیم! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے گھر کی طرح یہ گھر بھی اس گاؤں کے مسلمانوں کا آخری قلعہ تھا۔ اس کمرے میں۔۔۔۔ تمہاری۔۔۔۔۔“

”نہیں، وہ اس کی ماں تھی۔“ سلیم نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”چلو سلیم!“

”ٹھہرو میں چھت پر دیکھ آؤں۔“ سلیم سیڑھی کی طرف بڑھا اور اس کے ساتھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ چھت پر مسلمانوں کے ساتھ تین سکھوں

کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ عصمت اور راحت وہاں بھی نہ تھیں سلیم کے ہاتھوں سے سہارے کا آخری تنکا چھوٹ چکا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہیں کہیں پھٹے ہوئے بادلوں میں سے ستارے جھانک رہے تھے۔ چاند کو ایک سیاہ بادل کا لحاف اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ اچانک سلیم چلّایا۔ "امجد! تمہارے خون کی قسم! ماں تمہارے بکھرے ہوئے بالوں کی قسم! اب میرے ہاتھ نہیں کانپیں گے۔ اب میرے پاؤں نہیں ڈگمگائیں گے۔ تمہارا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ شہیدوں کی روحو! بارگاہِ الٰہی میں دعا کرو کہ وہ تمہاری قوم کے جوانوں کے سینے آگ کے انگاروں سے بھر دے۔ وہ اس خاک کی تقدیس کو بھول نہ جائیں جس پر تمہارا خون گرا ہے، جس پر تمہاری عصمتیں لُٹی ہیں۔ زمیں و آسمان کے مالک، مجھے ہمّت دے کہ میں یومِ حساب کا انتظار کر سکوں۔"

یہ کہہ کر سلیم سجدے میں گر پڑا۔

وہ رُکے ہوئے آنسو جنہیں کسی انسان کے سامنے بہانا اسے گوارا نہ تھا، اچانک اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ یہ اس کی ہچکیوں کا اثر تھا یا دُعا کے

الفاظ کی تاثیر تھی۔ امیر علی، داؤد اور اس کے باقی ساتھی بھی سجدے میں گِر پڑے۔

اچانک گاؤں کے ایک طرف شور سن کر سلیم اُٹھا اور اس کے ساتھی بھی سجدے سے سر اُٹھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ شراب سے بدمست آدمیوں کی چیخیں تھیں۔

امیر علی نے کہا۔ ”وہ گاؤں سے باہر مان سنگھ کی حویلی میں ہوں گے۔ تم یہیں ٹھہرو! میں پتہ لگا کر آتا ہوں۔“

”نہیں ہم سب چلتے ہیں۔“ سلیم اپنے دل میں نئی دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا۔ امیر علی ان کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ وہ گاؤں کے اوپر سے چکّر کاٹتے ہوئے دوسری طرف پہنچے۔ اب چیخوں کے ساتھ قہقہوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ چری کے کھیت کی طرف حویلی کی دیوار کے ساتھ آم اور شیشم کے درختوں کی ایک قطار تھی۔ امیر علی نے اپنے پیچھے آنے والوں کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ ایک لمحہ چار دیواری کے اندر جھانکنے کے بعد اس نے نیچے اترتے ہوئے اپنے

ساتھیوں سے کہا۔ ”آدمیوں کی تعداد تیس چالیس سے زیادہ نہیں لیکن باہر سے اور آدمی داخل ہو رہے ہیں۔ آگے دیوار کے ساتھ ایک چھپر ہے، ہم اس کی چھت پر لیٹ کر فائر کر سکتے ہیں۔“

☆☆☆☆☆

حویلی کے اندر سکھ اپنی گزشتہ بارہ گھنٹے کی فتوحات کا جشن منا رہے تھے۔ تیس چالیس سکھ زمین پر بیٹھے شراب اڑا رہے تھے۔ آٹھ دس آدمیوں کی ایک ٹولی نے شراب سے بدمست ہو کر ہڑبونگ مچا رکھی تھی۔ کوئی ناچ رہا تھا، کوئی فحش گانے گا کر اپنے ساتھیوں سے داد حاصل کر رہا تھا۔ دیوار میں کھونٹیوں کے ساتھ دو لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ ناچنے والے آدمیوں نے اپنے دو ساتھیوں کو پکڑ کر لالٹین کی روشنی میں کھڑا کر دیا۔ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ مان سنگھ کے گھر کی عورتیں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ یہ دونوں سکھ اپنے چار گرہ مذہبی لباس سے بھی لباس آزادی حاصل کر چکے تھے۔

ایک عورت چلّائی۔ ”اُنہیں ان کے سامنے کرو!“

ٹولی کے باقی آدمی اُنہیں لیتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔ یہاں دھندلی روشنی میں چند عورتیں سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک آدمی لالٹین اُتار کر ان کے قریب لے گیا۔

ایک عورت کی آواز آئی۔ ”گیان سنگھ، تمہاری دلہنیں شرماتی ہیں، انہیں شراب پلاؤ!“

”ہاں بھابی، شراب لاؤ!“

ایک اور آدمی نے کہا۔ ”ہاں سب کو شراب پلاؤ۔“ باقی سکھ اس کی تائید کر رہے تھے۔

ایک آدمی نے ایک عورت کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”گیان سنگھ ایک گلاس ادھر دینا؟“

دو آدمیوں نے تڑپتی اور چیختی ہوئی عورت کے بازو اور سر کے بال پکڑ لیے اور ایک اسے زبردستی شراب پلانے کی کوشش کرنے لگا۔ عورت کہہ رہی تھی۔ ”کتّو! سورو! مجھے مار ڈالو۔۔۔ مجھے مار ڈالو!“

"ٹھہرو! یہ اس طرح نہیں پیے گی؟" ایک سکھ آگے بڑھ کر اس کا لباس نوچنے لگا۔

دروازے کے پاس پڑا ہوا کوئی آدمی چلّایا۔ "ظالمو! خدا سے ڈرو۔ مان سنگھ مان سنگھ! خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔"

"ارے اس کتّے کی جان بڑی سخت ہے۔ اسے پھر ہوش آ گیا ہے۔" مان سنگھ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا اور رسّیوں میں جکڑے ہوئے آدمی کو پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر! تم پرائی عورتوں کو دیکھ کر مرے جا رہے ہو۔ ابھی تو تمہاری لڑکیوں کی باری بھی آئے گی۔ تم اپنی بیوی کو بھی دیکھ کر چیخیں مار رہے تھے۔ اب تمہاری لڑکیوں کا خالصتان بننے والا ہے۔ اب بھی اگر یہ بتا دو کہ تم نے زیور کہاں رکھا ہوا تو میں تمہاری لڑکیوں کو بچا سکتا ہوں!"

"میں نے سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا تھا!"

"بدمعاش! وہ تمہاری بیوی کا زیور تھا، میں لڑکی کے زیور سے متعلّق پوچھتا

ہوں۔ تم نے اس کی شادی کے لیے جو زیور بنوایا تھا، وہ کہاں ہے؟“

”وہ میں امرتسر سے نہیں آیا تھا؟“

”بہت اچھا ڈاکٹر! میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن تم بھی میری ایک بات مان لو۔ میں نے اب تک تمہاری لڑکیوں کی حفاظت کی ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ان کے ساتھ وہ سلوک نہ ہو جو تمہاری بیوی کے ساتھ ہوا ہے تو تم ان سے کہو وہ امرت چکھ لیں۔ میں تمہارا داماد بننے کے لیے تیّار ہوں۔ بڑی لڑکی میرے گھر کی رانی ہو گی۔ چھوٹی لڑکی کو سرودل سنگھ اپنے گھر لے جانے کے لیے تیّار ہے۔ تم بھی امرت چکھ لو ڈاکٹر! ہمارے گاؤں کو ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے!“

ڈاکٹر چلّایا۔ ”تم کتّے ہو تم سؤر ہو۔“

ایک آدمی نے لاٹھی اُٹھائی لیکن مان سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دھکیل کر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں ابھی نہیں گیان سنگھ! پچھلی کوٹھڑی سے ڈاکٹر کی لڑکیوں کو نکال لاؤ!“ ایک آدمی اندر داخل ہوا اور تھوڑی دیر

میں دو لڑکیوں کو دھکیلتا ہوا باہر لے آیا۔ مان سنگھ نے کہا ”گیانی جی! امرت کا کٹورا لے آؤ۔“

گیانی بولا۔ ”سردار جی! انہوں نے پہلے دوبار امرت گرادیا ہے۔ اب تسلّی کرلو!“

”لاؤ گیانی جی! یہ ان کے لیے آخری موقع ہے۔ اب انہوں نے امرت گرایا تو ہمارے پاس شراب موجود ہے۔ ڈاکٹر ابھی بھی وقت ہے، انہیں سمجھاؤ۔“

ڈاکٹر لڑکیوں کی طرف متوجّہ ہونے کی بجائے آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھا کر کہہ رہا تھا۔ ”پروردگار! اب میں تجھ سے عزّت کی موت مانگتا ہوں۔“

لڑکیاں۔ ”ابّا جان!!“ کہتی ہوئی اس کی طرف بڑھیں لیکن مان سنگھ ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور چلّایا۔ ”ٹھہرو! اگر اب بھی امرت چکھ لو تو تمہارے باپ کی جان بچ سکتی ہے۔ ڈاکٹر میں آخری بار تم سے کہتا ہوں کہ ان کو سمجھاؤ۔۔۔“

ڈاکٹر گڑگڑا کر اپنی دعا دہرا رہا تھا۔ مان سنگھ نے گیلانی کے ہاتھ سے کٹورا لے کر ایک لڑکی کی طرف بڑھایا اور کہا۔ ”لو یہ پی لو۔ میں تم سے آخری بار کہتا ہوں۔ تم نہیں پیو گی۔ ٹھہرو! مکھن سنگھ او مکھن سنگھ! ذرا ان کے سامنے تو آ!“

ایک ننگ دھڑنگ، شراب سے بد مست سکھ آگے بڑھا اور لڑکیاں خوفزدہ ہو کر دیوار کی طرف سرکنے لگیں۔

مان سنگھ کے اشارے سے اس نے ایک لڑکی کو سر کے بالوں سے پکڑ لیا اور اس کا لباس نوچنے لگا۔ دوسری لڑکی اس کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھی لیکن مان سنگھ نے اسے دھکا دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ لڑکی چیخیں مار رہی تھی۔ ڈاکٹر کی گڑگڑاتی ہوئی آواز بُلند ہو رہی تھی۔ ایک طرف بیٹھی ہوئی مسلمان عورتیں رو رو کر خدا سے دُعائیں کر رہی تھیں کہ اچانک تڑ تڑ تڑ کی آواز آئی اور مکھن سنگھ، مان سنگھ اور ان کے گرد چند اور سکھ زمین پر ِگر پڑے۔

”وہ آ گئے! مسلمان فوج آ گئی!“ سکھ چیختے چلّاتے باہر کے دروازے کی

طرف بڑھے۔ پھاٹک اندر سے بند تھا۔ انہوں نے گولیوں کی بارش میں کنڈی کھولی تو معلوم ہوا کہ کوئی باہر سے بھی کنڈی لگا چکا ہے۔

سلیم چھپر سے چھلانگ لگا کر حویلی میں داخل ہوا اور بُلند آواز میں چلّایا: ”فائر بند کرو!“ بندوقیں اچانک خاموش ہو گئیں۔

سلیم نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ”بھاگنے کی کوشش بے سود ہے۔ فوج نے اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ تم لوگ ایک طرف ہو جاؤ۔ ہم اس مکان کی تلاشی لیں گئے۔ تھوڑی دیر میں پولیس آجائے گی، ہم تم کو ان کے حوالے کر دیں گے لیکن اس وقت تک اگر کسی نے ہاتھ بھی ہلایا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“

سکھ جس قدر اچانک حملے سے بد حواس ہوئے تھے، اسی قدر پولیس کی آمد کی خبر سے مطمئن تھے۔ اس علاقے کا تھانیدار اُن کے جتھے دار کا دستِ راست تھا۔

ایک کونے سے پانچ چھ آدمی دیوار پھاندنے کی کوشش کر رہے۔ وہ سب

کے سب وہیں ڈھیر ہو گئے۔ سلیم نے باقی آدمیوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اب کوئی اور ہے جو بھاگنا چاہتا ہے؟“ سکھ جواب دینے کی بجائے سمٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

سلیم نے بُلند آواز میں کہا۔ ”جمعدار داؤد! تم دو نوجوانوں کے ساتھ اندر آ جاؤ۔ صوبیدار امیر علی! تم وہیں اپنی ڈیوٹی پر رہو۔ اگر وہاں کوئی آدمی نظر آئے تو اسے گولی مار دو۔۔۔ جب تک پولیس نہیں آتی، ہم یہاں سے نہیں جائیں گے!“

داؤد دو آدمیوں کے ساتھ چھپر سے چھلانگ لگا کر اندر آ گیا اور فوجی انداز میں سلام کرنے کے بعد سلیم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

سلیم نے کہا۔ ”جمعدار تم ان لوگوں کا خیال رکھو!“

ایک سکھ نے کہا۔ ”سرکار ہم بے قصور ہیں۔ یہ تمام لُچائی مان سنگھ کی ہے۔“

”یہ باتیں پولیس والوں کو بتانا۔ مان سنگھ کون ہے؟“

"ماں ادھر پڑا ہوا ہے۔"

"اس کے گھر کا کوئی اور آدمی ہے؟"

"اس کا لڑکا ہے سرکار، ہم بے قصور ہیں۔"

"کون ہے اس کا لڑکا؟ ادھر آؤ، جلدی کرو، ڈرو نہیں۔"

ایک سولہ سال کا لڑکا جس کی شراب کسی حد تک اتر چکی تھی، کانپتا ہوا آگے بڑھا۔" سلیم نے اس کے چہرے پر روشنی ڈالی اور کہا۔ "چلو مجھے مکان دِکھاؤ!"

لڑکا اس کے آگے چل دیا۔ دروازے کے قریب ایک عورت ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "پرماتما کے لیے میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔۔۔ میں تمھیں سب کچھ دینے کے لیے تیّار ہوں۔ میرے پاس جس قدر سونا ہے لے لو۔"

سلیم نے کہا۔ "تم نے بندوقیں کہاں رکھی ہوئی ہیں؟"

"وہ اندر ہیں۔ صندوق میں۔ بھگوان کے لیے، خدا کے لیے میرے بچّے کو چھوڑ دو!"

سلیم نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "چلو اندر!"

دالان سے آگے کوٹھری میں ٹھکا ٹھک کی آواز آ رہی تھی۔ سلیم نے اچانک ٹارچ بجھا دی اور دبے پاؤں آگے بڑھا۔ کوٹھری کے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے ٹارچ دوبارہ جلائی۔ دو آدمی صندوق توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک شخص نے کرپان اٹھائی لیکن اتنی دیر میں سلیم کی ٹامی گن سے چند گولیاں نکل چکی تھیں۔ ایک ثانیہ کے بعد سلیم نے دالان سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "داؤد میں ٹھیک ہوں، تم ان آدمیوں کا خیال رکھو۔"

مان سنگھ کے لڑکے نے دوسری کوٹھری میں گھُس کر اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ سلیم نے واپس مُڑ کر دروازے کو دھکّا دیا۔ لڑکے کی ماں نے چیخیں مارتے ہوئے اس کا دامن پکڑ لیا۔ "گورو مہاراج کی قسم! اس کوٹھری میں کچھ نہیں۔ میرے لڑکے کو چھوڑ دو۔ میں تمہیں بندوقیں نکال دیتی

ہوں۔“

سلیم نے کچھ سوچ کر دروازے کی کنڈی باہر سے بند کر دی اور عورت کو دوسری کوٹھری میں دھکیلے ہوئے کہا۔ ”جلدی کرو؟“

عورت دوسری کوٹھری کے دروازے کے قریب کر پہنچ کر دیوار ٹٹول رہی تھی۔ سلیم نے اس کی طرف ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کیا کر رہی ہو تم؟“

”صندوق کی چابی تلاش کر رہی ہوں۔ یہ ہے۔“ اس نے طاقچے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

عصمت اور راحت سلیم کی آواز پہچان چکی تھیں لیکن جب وہ چند قدم دور اندھیرے میں کھڑا فوجی افسر کے لب و لہجہ سے باتیں کر رہا تھا تو وہ یہ سمجھے لگیں کہ یہ کوئی اور ہے۔ پھر جب وہ جمعدار اور صوبیدار کو ہدایات دینے لگا تو راحت نے مُرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپا میں سمجھی تھی کہ یہ سلیم بھائی ہیں۔“

”یہ وہی ہیں راحت! یہ وہی ہیں۔“ عصمت نے راحت کو سمجھانے سے زیادہ اپنے دل کو تسلّی دیتے کہا۔

اور پھر جب وہ اور قریب آ کر مان سنگھ کی بیوی سے باتیں کر رہا تھا اور دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے لیمپ کی دھیمی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی راحت اپنے لباس کے پھٹے ہوئے چیتھڑوں کو سمیٹتی ہوئی عصمت کے پیچھے چھُپنے کی کوشش کرنے لگی۔ عصمت کے لیے اپنے دل کی دھڑکنیں نا قابلِ برداشت ہو چکی تھیں۔ وہ ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخوں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھنا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ ”سلیم! سلیم! تم آ گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گئے۔ میں نے دُعائیں مانگی تھیں۔ میں نے خواب دیکھے۔ سلیم سلیم! میری طرف دیکھو۔ تم مجھے نہیں پہچانتے؟“ لیکن اس کے پاؤں کو جنبش نہ ہوئی اور الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اب وہ اپنے دل سے پوچھ رہی تھی۔ ”کیا اس نے مجھے نہیں دیکھا؟ اس نے مجھے نہیں پہچانا؟“ پھر وہ ایک گِرے ہوئے سکھ کی کرپان نکال کر اپنے باپ کی رسّیاں کاٹنے لگی۔ وہ

ہاتھوں کی رسّیاں کاٹنے کے بعد پاؤں کی رسّیاں کاٹ رہی تھی کہ اندر سے ٹامی گن چلنے کی آواز آئی۔ عصمت کے ہاتھ سے کرپان گر پڑی اور راحت خوفزدہ ہو کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ ایک ثانیہ کے بعد جب سلیم نے دروازے سے جھانکتے ہوئے داؤد کو آواز دی تو عصمت کے ڈوبتے ہوئے دل کی دھڑکنیں پھر بیدار ہو گئیں۔ راحت نے اس کے ہاتھ سے گری ہوئی کرپان اٹھائی اور ڈاکٹر کے پاؤں کی رسّیاں کاٹ ڈالیں۔ رسّیوں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی ڈاکٹر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دبا کر بیٹھ گیا۔ راحت سمٹتی ہوئی باقی عورتوں کے پاس چلی گئی۔ کسی نے اپنی اوڑھی اتار کر اس کی طرف پھینک دی اور وہ اسے اپنے کندھوں کے گرد لپیٹ کر بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ عصمت نے چند منٹ کے توقّف کے بعد دیوار کی کھونٹی سے لالٹین اتاری اور اندر چلی گئی۔

اس عرصہ میں سلیم، مان سنگھ کی بیوی سے صندوق کھلوا کر دو رائفلیں، ایک اسٹین گن اور ایک ٹامی گن، دو بارہ بور کی بندوقیں، ایک پستول، دو نئی ٹارچیں اور کوئی بیس سیر کے لگ بھگ بارود نکلوا چکا تھا۔ ایک کونے

میں جہاں سکھوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، پٹرول کے پندرہ بیس ٹین رکھے ہوئے تھے۔

باقی کوٹھری لوٹ مار کے سامان سے بھری ہوئی تھی اور مان سنگھ کی بیوی کہہ رہی تھی۔ "خدا کے لیے یہ سب کچھ لے جاؤ اور میرے بچّے کو کچھ نہ کہو۔" "تم نے ابھی تک ساری بندوقیں ہمارے حوالے نہیں کیں؟"

وہ کہہ رہی تھی۔ "گرو مہاراج کی قسم! میں جھوٹ نہیں کہتی۔ انہوں نے باقی تمام ہتھیار تقسیم کر دیے تھے۔ صرف یہی تھے جو چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔"

سلیم نے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بارود اس میں ڈال دو۔ جلدی کرو!"

عورت کسی حیل و حجت کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور سلیم ٹارچ کی روشنی میں کوٹھری کے ساز و سامان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کپڑے جو عورت نے سوٹ کیس سے نکال کر فرش پر پھینک دیے تھے تقریباً

سب کے سب سلک اور کاٹن کے نئے سوٹ تھے۔ ان بکھرے ہوئے کپڑوں کے درمیان اس کو ایک تصویر دکھائی دی۔ اس نے جھک کر تصویر کو اُٹھالیا۔ یہ امجد، ارشد، عصمت اور راحت کے بچپن کی تصویر تھی۔ اس نے بارود کے لیے ایک اور سوٹ کیس خالی کر دیا اور کپڑے اکٹھے کر کے دوبارہ چمڑے کے سوٹ کیس میں ڈال دیے۔

عصمت ہاتھ میں لیمپ لیے دروازے کے قریب پہنچی۔ سلیم نے ٹارچ بجھا کر ٹامی گن سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”کون ہے؟“

عصمت نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں ہوں عصمت!“

سلیم نے ٹامی گن نیچے کر لی اور عصمت دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سلیم نے کپڑوں کا سوٹ کیس اُٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں راحت اور چند عورتوں کو کپڑوں کی ضرورت ہے۔ آپ یہ لے جائیں!“

عصمت نے سوٹ کیس لے کر سلیم کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز

میں سوال کیا۔ ”آپ کے گھر کے لوگ کہاں ہیں؟“

سلیم نے جواب دینے کی بجائے بارود سے بھرا ہوا بکس اُٹھا کر دہلیز سے باہر رکھ دیا اور کہا۔ ”آپ پہلے اپنا سوٹ کیس چھوڑ آئیں اور پھر یہ لے جائیں!“

عصمت نے کہا۔ ”لیکن میں نے آپ کے خاندان کے متعلّق پوچھا تھا؟“

سلیم بولا۔ ”عصمت! باتوں کا وقت نہیں۔“ اور عصمت کو دوبارہ سوال کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ یکے بعد دیگرے دونوں سوٹ کیس اُٹھا کر باہر لے گئی۔ دوسرے پھیرے میں ڈاکٹر اور چند عورتیں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر نے ہتھیار اُٹھا لیے اور عورتیں سلیم کے کہنے پر پٹرول کے ڈبّے اُٹھا کر باہر لے گئیں۔

سلیم نے باہر نکل کر ڈاکٹر شوکت سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ عورتوں کو لے کر ایک طرف ہٹ جائیں۔“

ڈاکٹر نے دبی زبان میں کہا۔ ”آپ احتیاط کریں، شاید ان میں سے کسی کے

پاس پستول ہو!"

"آپ فکر نہ کریں۔" یہ کہنے کے بعد سلیم ایک طرف ہٹ کر سکھوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ "اپنی عورتوں سے کہو کہ یہ اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ جائیں۔ پولیس نے دیر لگا دی ہے، شاید وہ صُبح کو آئے۔ اس لیے تم لوگ اندر جا کر بیٹھ جاؤ!"

سکھ تذبذب کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سلیم نے کہا۔ "جمعدار داؤد! تم ان آدمیوں کو اندر بند کر دو اور دروازے پر دو آدمیوں کا پہرہ بٹھا دو۔ آٹھ آدمی حویلی کے گرد پہرہ دیں گے۔ میں نے مکان سے اسلحہ نکال لیا ہے۔ اس لیے انہیں اندر بھیج دینے میں کوئی خطرہ نہیں۔"

سکھ اب ایک دوسرے سے دبی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

داؤد نے گرج کر کہا۔ "بد معاشو! جلدی کرو ورنہ ہم ایک آدمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

چند آدمی دروازے کی طرف بڑھے اور آٹھ دس قدم دور جا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ سلیم بولا۔ ”جمعدار! یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔ میں تیس تک گنتی گنتا ہوں۔ اس کے بعد تم گولی چلا دو۔ اگر یہ پولیس کے آنے سے پہلے ہی مارے جائیں تو غلطی ان کی ہو گی۔“

سلیم نے گنتی شروع کی۔ ”ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔“

مان سنگھ کی بیوی نے بُلند آواز میں کہا۔ ”بھائیو ڈرو نہیں! انہوں نے ہر دیپ کو کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے باوا سنگھ اور ہر نام سنگھ کو مارا ہے، وہ کوٹھری میں ہمارا صندوق توڑ رہے تھے۔“

باقی عورتیں بھی اپنے باپوں، خاوندوں، بھائیوں اور بیٹوں کو اندر جانے کی ترغیب دینے لگیں۔

سلیم نے بارہ تک گنتی گنی تو آٹھ دس سکھ اندر چلے گئے۔ جب وہ پچیس تک پہنچا تو تمام سکھ اندر جا چکے تھے۔ دالان کے دو دروازے تھے، داؤد ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے اسٹین گن دکھا کر سکھوں کو پیچھے

ہٹا دیا، اور اس کے ایک ساتھی نے جلدی سے دروازہ بند کر کے باہر کی کنڈی لگا دی۔ دو دروازوں کے درمیان ایک آہنی سلاخوں والی کھڑکی تھی اور چند سکھ اس کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر باہر جھانک رہے تھے۔ امیر علی چھپر سے اُتر کر آگے بڑھا اور اس نے آتے ہی کھڑکی میں سے جھانکنے والے ایک سکھ کے منہ پر سنگین ماری۔ وہ گرا اور باقی سکھوں نے شور مچاتے ہوئے کھڑکی بند لی۔

جب سلیم کے ساتھ کھڑکی اور دروازے پر پٹرول چھڑکنے لگے تو مان سنگھ کی بیوی دھاڑیں مار مار کر رونے گی۔ ”خدا کے لیے! میرے ہر دیپ کو نکال لو!“ اس نے سلیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مسلمان عورتوں میں سے ایک لڑکی بھاگتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے مان سنگھ کی بیوی کو دھکا دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”اس کتیا کے لڑکے نے امجد کی لاش کے ٹکڑے کیے تھے اور اس کے خاوند نے امی جان کو۔۔۔!“ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ راحت تھی۔

داؤد نے مشین گن کی نالی مان سنگھ کی بیوی کے منہ پر رکھ دی لیکن سلیم

نے چلا کر کہا۔ ”نہیں داؤد، اسے چھوڑ دو۔ ہم جنگ میں دوسروں کے اصولوں کی پیروی نہیں کریں گے۔“

سلیم نے جلتا ہوا لیمپ اُٹھا کر دروازے کے ساتھ دے مارا۔ اچانک آگ کا ایک مہیب شعلہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ سکھوں کی عورتیں اور بچّے چیخ رہے تھے۔ سلیم نے آگے بڑھ کر کہا۔ جس زمین پر تمہاری قوم نے آگ بوئی ہے، وہ تمہارے لیے پھول پیدا نہیں کرے گی۔“کسی نے اندر سے کھڑکی کھولی اور اچانک پستول کے فائر کی آواز آنے لگی۔ ایک گولی سلیم کے بازو کے ساتھ مس کرتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری مان سنگھ کی بیوی کے سینے میں لگی۔ سلیم اور داؤد نے بیک وقت ٹامی گن اور اسٹین گن سے فائر کیے اور آگ کے شعلے کے پیچھے چند سکھ ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

عصمت نے آگے بڑھ کر سلیم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”میں ٹھیک ہوں عصمت! میں ٹھیک ہوں؟“

دالان کی ایک دیوار کے ساتھ اُپلوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ سلیم نے اس پر بھی پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ صحن میں چند شراب کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ امیر علی انہیں اٹھا اٹھا کر جلتی ہوئی کھڑکی کی طرف پھینک رہا تھا۔ آگ کی روشنی میں صحن چکا چوند ہو چکا تھا۔ ایک طرف بندھے ہوئے چار گھوڑے بدحواس ہو کر آگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سلیم نے کہا۔ ''چلو داؤد! یہ سب گھوڑے لے لو۔ امیر علی! یہ تمام ہتھیار تمہارے ہیں، ہم صرف آدھا بارود لیں گے۔''

امیر علی نے جواب دیا۔ ''ان ہتھیاروں کے ساتھ میں ارد گرد کے تمام گردواروں کا سارا بارود یہاں جمع کرلوں گا۔''

سلیم نے کہا۔ ''تم ٹامی گن اور اسٹین گن چلانا جانتے ہو؟''

''ہمارے گاؤں کے چار آدمی سپاہی ہیں۔''

وہ حویلی سے باہر نکلے تو عصمت نے کہا۔ ''آپ ہمارے گھر سے ہو کر آئے تھے؟''

"ہاں!" سلیم نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ نے امّی اور امجد۔۔۔" اس کی آواز بیٹھ گئی۔

"میں سب کچھ دیکھ آیا ہوں۔ ارشد ابھی تک دہلی میں ہے؟"

"جی ہاں!" عصمت نے جواب دیا۔

راحت نے سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! امی اور امجد کی لاشیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

سلیم بولا۔ "وہاں بہت سی لاشیں تھیں۔ وہ تنہا نہیں۔ میں نے ہر قدم پر لاشوں کے انبار دیکھے ہیں۔ یہ وہ مقدس امانتیں ہیں جو ہم اس سرزمین پر چھوڑے جا رہے ہیں۔"

راحت نے کہا۔ "بھائی جان آپ کے خاندان کے لوگ۔۔۔۔"

سلیم نے راحت کے سوال کا جواب دینے کی بجائے ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "ڈاکٹر صاحب! آپ زخمی ہیں۔ آپ ایک گھوڑے پر سوار ہو

جائیں۔"

"نہیں۔ میں چل سکتا ہوں۔ آپ ان عورتوں کو۔۔۔۔"

"آپ ان کی فکر نہ کریں۔ گاؤں سے باہر ہمارے گھوڑے کھڑے ہیں۔ وہاں پہنچ کر عورتیں سوار ہو جائیں گی۔"

گاؤں سے باہر ان کا ساتھی جسے وہ گھوڑوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ گئے تھے، بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ چار تازہ دم گھوڑے مل جانے سے ان کے پاس نو گھوڑے ہو چکے تھے۔ امیر علی کا گھوڑا ان کے علاوہ تھا۔ عورتوں کی تعداد تیرہ تھی۔ اس لیے چند گھوڑوں پر دو دو عورتوں کو لاد دیا گیا۔ جو گھوڑے ذرا سرکش نظر آئے، ان کی باگیں مردوں نے پکڑ لیں۔

چاند غروب ہو چکا تھا اور ستاروں کو تاریک بادل اپنی آغوش میں لے چکے تھے۔ امیر علی اس قافلے کا رہنما تھا اور وہ انہیں ان راستوں سے بچا کر لے جا رہا تھا، جہاں سکھوں کے حملے کا خطرہ ہوتا تھا۔ امیر علی کے گھوڑے

پر ڈاکٹر صاحب سوار تھے اور انہوں نے امیر علی کے حصّے کا اسلحہ اور بارود سنبھال رکھا تھا۔ سلیم کے گھوڑے پر عصمت اور راحت تھیں اور وہ باگ پکڑ کر آگے آگے چل رہا تھا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر امیر علی نے سلیم سے کہا۔ ”یہ سب بہنیں بھوکی ہیں۔ دریا پر کیمپ سے شاید اس وقت آپ کو کچھ نہ ملے۔ اسی لیے آپ تھوڑی دیر ہمارے گاؤں میں ٹھہریں جو کچھ اس وقت ہو گا، ہم حاضر کر دیں گے۔“

سلیم نے کہا۔ ”بھئی! اب ہماری ہمّت جواب دے چکی ہے۔ اگر تمہارے گاؤں میں بیٹھ گئے تو اٹھنا مشکل ہو گا۔“

”میں آپ کو ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہراؤں گا۔ گھر میں اچار اور مکھن ضرور ہو گا۔ اگر باسی روٹیاں نہ ملیں تو آدھے گھنٹے میں تازہ پک جائیں گی۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“

عورتوں کی خاموشی ان کی بھوک کا پتا دے رہی تھی۔ سلیم نے کہا۔ ”بہت اچھا۔“

امیر علی کے گاؤں سے کھانا کھانے کے بعد یہ لوگ کوئی دو بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔ امیر علی انہیں کیمپ میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ کیمپ میں دو ہزار نے انسانوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ پہرا دینے والے نوجوانوں سے باتیں کرنے کے بعد سلیم کو معلوم ہوا کہ ملّاحوں نے رات کے بارہ بجے تک کشتیاں چلائیں ہیں اور اب تھکاوٹ سے چور ہو کر دوسرے کنارے سو رہے ہیں۔

سلیم نے کہا۔ ”لیکن میں نے کہا تھا کہ جب وہ تھک جائیں تو اُن کی جگہ کیمپ کے وہ آدمی کام کریں جو کشتیاں چلانا جانتے ہیں۔“

پولیس کے ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ”میاں صاحب! انہوں نے تھوڑی دیر کام کیا۔ لیکن ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم نے اُن کو بال بچّے پار لے جانے کی اجازت دے دی۔ جب ان کے بال بچّے پار پہنچ گئے تو انہوں نے اس طرف مُڑ کر دیکھنا بھی گوارانہ کیا۔ فقیر دین ملّاح نے دیر تک کام کیا ہے۔ وہ آپ کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے آخری پھیرا لے گیا ہے۔ تھکاوٹ سے اس کا بُرا حال تھا۔ میں نے اسے خود کہا ہے کہ وہ اب جا کر

آرام کرے۔“

سلیم ڈاکٹر کی طرف متوجّہ ہوا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اگر یہ خواتین ابھی پہنچ جاتیں تو میرے دل سے ایک بوجھ اُتر جاتا۔ میں جا کر کشتی لاتا ہوں، آپ کنارے پر کھڑے رہیں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”سلیم! تم بہت تھکے ہوئے ہو، آرام کرو۔ صبح دیکھا جائے گا۔“

”نہیں ڈاکٹر صاحب، صبح اور بہت سے کام ہوں گے۔“

ایک جفاکش سپاہی ہونے کے باوجود داؤد کی ہمّت جواب دے چکی تھی۔ تاہم اس نے کہا۔ ”سلیم! اگر کشتی لانا اسی وقت ضروری ہے تو میں جاتا ہوں۔ تم بہت زیادہ تھک گئے ہو۔“

سلیم نے جواب دیا۔ ”میں اپنے گھوڑے کے ساتھ دریا عبور کرتا ہوں۔“

راحت نے کہا۔ ”نہیں بھائی جان! اس وقت نہ جایئے۔“

لیکن سلیم کا فیصلہ اٹل تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگ پکڑی اور دریا میں اتر گیا۔ گہرے پانی میں پہنچ کر اس نے گھوڑے کی زین پر ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ اندھیرے میں روپوش ہو چکا تھا۔

ایک گھنٹہ نہیں گزرا تھا کہ اس کے ساتھی ایک کشتی کو کنارے کی طرف آتا دیکھ رہے تھے۔ کشتی کنارے پر آ لگی۔ داؤد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا فقیر دین کے ساتھ ایک اور ملّاح تھا۔ اس نے سوال کیا۔ ”سلیم وہیں رہ گیا؟“

فقیر دین نے جواب دیا۔ ”سلیم کشتی میں بے سدھ پڑا ہوا ہے۔ وہ کشتی پر بیٹھتے ہی سو گیا تھا۔“

داؤد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، سلیم کشتی کے ایک کونے میں پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔

فقیر دین نے کہا۔ ”اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ جگاؤ مت۔ میں صبح اپنے ساتھ ہی لے آؤں گا۔ یہ بہت تھکا ہوا ہے۔“

"بہت اچھا، ڈاکٹر صاحب! آپ کشتی پر سوار ہو جائیں!" یہ کہہ کر داؤد اونگھتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ دو تین بار جمائی لینے کے بعد اس نے بھی ٹانگیں زمین پر پھیلا دیں۔ عورتیں کشتی پر بیٹھ گئیں۔ عصمت نے کشتی پر پاؤں رکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ "ابّا جان! اس آدمی سے پوچھیے۔"

ڈاکٹر شوکت نے داؤد کے قریب آ کر کہا۔ "آپ کو سلیم کے خاندان کے متعلّق کچھ معلوم ہو تو مجھے بتایئے!"

داؤد اس سوال کا جواب دینے کی بجائے سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے بڑبڑایا۔ "اگر حملہ ہوا تو مجھے جگا دینا۔"

ڈاکٹر نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ "دیکھنے میں سلیم کے خاندان کے متعلّق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں!"

"وہاں صرف سلیم کا خاندان نہیں تھا۔ وہاں بہت سے خاندان تھے۔ حملہ ہو تو مجھے جگا دینا۔۔۔" اور بڑبڑاتا ہوا منہ کے بل لیٹ گیا۔ سلیم کے باقی تمام ساتھی دریا کے کنارے پہنچتے ہی سو گئے تھے۔

پولیس کے سپاہی نے کہا۔ ”کوئی اچھی خبر ہوئی تو سلیم خود آپ کو بتا دیتا۔“

”تمہیں کچھ معلوم ہے؟“

سپاہی نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! یہ سُننے اور سنانے کی باتیں نہیں، یہ لوگ اپنے پیچھے صرف راکھ چھوڑ کر آئے ہیں۔“

ملّاح آوازیں دے رہا تھا۔ ڈاکٹر کوئی اور بات کہے بغیر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہو کشتی پر سوار ہو گیا۔

راحت نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”ابّا جان! کیا کہتا ہے وہ؟“

”کچھ نہیں۔“ ڈاکٹر نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

آسمان پر اُمڈے ہوئے بادلوں سے ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں۔ سلیم کروٹ بدل کر منہ کے بل لیٹ گیا۔ کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”سلیم!!“

سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجید! مجھے تنگ نہ کرو۔ میں ابھی سویا ہوں۔ چچی جان! مجید کو منع کرو۔“

”سلیم اب دس بجنے والے ہیں۔“

”اونہہ! دس بجنے والے ہیں۔ تم ہمیشہ مجھے تنگ کرتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے سلیم نے دوبارہ کروٹ بدل کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ دریا کے کنارے ریت پر پڑا ہوا تھے۔ ڈاکٹر شوکت عصمت اور راحت اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔

”میں کہاں ہوں؟“ اس نے گھبرا کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”اف! شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ میں شاید کشتی لینے آیا تھا۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔ میں شاید کشتی پر سو گیا تھا!“

کچھ ہی آنکھیں ملنے کے بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ملّاح دوسرے کنارے سے کشتیاں بھر بھر کر لا رہے تھے۔ قریب ہی دریا کے کنارے اس کا گھوڑا چر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”سلیم بیٹا! تم کشتی پر سو گئے تھے۔ ہمیں اس پار لانے کے بعد ملّاحوں نے تمہیں اُٹھا کر یہاں لٹا دیا تھا!“

سلیم نے کہا۔ ”ہمارے ساتھ جو عورتیں تھیں، وہ۔۔۔۔“

”وہ ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئی ہیں!“

”آپ کیوں نہیں گئے؟“

”تم بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ میں نے تمہیں آٹھ بجے کے قریب جگانے کی کوشش کی لیکن تم نیند میں بے ہوش تھے۔ وہ عورتیں اگلے گاؤں میں ہمارا انتظار کریں گی۔ ہم تھوڑی دیر میں ان کے ساتھ جا ملیں گے۔ اب اُٹھو!“

سلیم نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب آپ میرا گھوڑا لے جائیں!“

راحت نے کہا۔ ”بھائی جان! آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟“

”نہیں راحت، میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا!“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں بھی نہیں جانا چاہتا سلیم! میں ان کے لیے سواری کا بندوبست کر کے واپس آجاتا ہوں۔“

”یہ جگہ آپ کے لیے نہیں ڈاکٹر صاحب، اب تک لاہور اور دوسرے شہروں میں ہزاروں زخمی پہنچ چکے ہوں گے، آپ کے لیے وہاں بہت کام ہو گا۔ یہاں ہمیں بندوقوں کی ضرورت ہے۔ یہاں میں لوگوں کو پار پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ کشتیوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مغربی پنجاب کے وزیروں اور لیڈروں سے مل کر کوئی بندوبست کریں تو یہ بہت بڑا کام ہو گا۔ ہندوستانی فوج اور سکھوں کے جتھے اگر آج نہیں تو کل حملہ کریں گے، ہمیں اگر دو مشین گنیں اور سپاہیوں کا ایک دستہ مل جائے تو ہم اس کیمپ کی حفاظت کر سکیں گے۔ لیڈروں سے یہ بھی کہیے کہ راوی کے پل پر مسلمان سپاہی متعیّن ہونے چاہیں۔ ڈوگرہ اور سکھ سپاہیوں کے ہاتھوں پاکستان کی عین سرحد پر مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔“

”میں کوشش کروں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ مغربی پنجاب کے لیڈر اب بیان بازی میں مشغول ہوں گے۔ اب تک خدا معلوم مشرقی پنجاب سے

کتنے پناہ گزین وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ اگر وہ ان کو سنبھال سکے تو یہ ایک بہت بڑا کام ہو گا۔"

"آپ فوج کے مسلمان افسروں سے ملیں۔ انہیں بتائیں کہ باؤنڈری فورس کے ہندو اور سکھ اب اکال سینا اور راشٹر یہ سیوک سنگھ کے لیے ہراول کا کام دے رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "باؤنڈری فورس کی تشکیل میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کا عنصر ماؤنٹ بیٹن، ریڈ کلف، پٹیل اور تارا سنگھ کے پروگرام کی تکمیل میں مزاحم نہ ہو۔۔۔ چند دِنوں تک شاید بلوچ رجمنٹ کو بھی مشرقی پنجاب سے تبدیل کر دیا جائے۔"

سلیم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! یہ طوفان مشرقی پنجاب کے بعد کشمیر کا رُخ کرنے والا ہے۔ کشمیر کے متعلّق کسی اقدام کی ضرورت ہے۔ انہیں جھنجھوڑنے، انہیں جگائیے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ پٹیل اور تارا سنگھ کے بھیڑیوں کے لیے کشمیر کا راستہ صاف کیا جائے۔"

عصمت نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف متوجّہ کیا اور وہ ایک لمحہ توقّف کے بعد بولا۔ ”سلیم! میں جانتا ہوں کہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تمھیں تکلیف ہو گی لیکن میں تم سے پوچھے بغیر نہیں جا سکتا۔۔۔ اب کوئی خبر میرے لیے ناقابلِ برداشت نہیں۔ بتاؤ تم اپنے گاؤں سے کب روانہ ہوئے اور باقی لوگ کہاں ہیں؟“

سلیم ایک ثانیہ کے لیے خاموشی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر نے پھر کہا۔ ”تم نے عصمت اور راحت کے سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیا تھا اور میں نے غیروں کے سامنے پوچھنے کی جرأت نہ کی۔ تم عصمت کی ماں کی لاش دیکھ آئے ہو۔ سکھوں سے کچھ بعید نہیں۔ سلیم جو کچھ ہوا ہے، مجھے بتاؤ!“

سلیم نے جواب دیا۔ ”آپ ایک فرد کی سرگزشت پوچھ رہے ہیں لیکن میں اب ایک فرد نہیں ہوں، ایک قوم ہوں۔ مجھ سے قوم کے متعلّق پوچھیے۔ آج قوم کی داستان کا عنوان خاک اور خون ہے اور یہی میری سرگزشت ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اگر میرے پاس کوئی جواب ہوتا تو میں

خاموش کیوں رہتا۔“

سلیم کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ اس نے منہ پھیر کر اپنا چہرہ آستین میں چھپالیا۔

ڈاکٹر نے سلیم کو کھینچ کر اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ ”آنسوؤں کو بہنے دو بیٹا! اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہونے دو۔“

”میرے دل میں صرف آگ ہے۔ میں ایک جلتی ہوئی چِتا ہوں۔“ سلیم ڈاکٹر سے الگ ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ عصمت نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لیے بتائیے، وہ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ آپ کی دادی، آپ کی ماں، زبیدہ اور خاندان کی دوسری لڑکیاں، آپ کے والد، آپ کے چچا، چچیاں، دادا جان اور یوسف۔۔۔؟“

سلیم خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عصمت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلیم نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور راکھ کی چھوٹی سی پوٹلی کھول کر عصمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے پاس ان کی

ایک نشانی لے آیا ہوں۔ اس راکھ میں ان سب کی زندگی سو رہی ہے، یہ اپنے پاس رکھو!“

وہ تینوں مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر ڈاکٹر نے کہا۔ ”ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا؟“

”میرے اور مجید کے سوا کوئی نہیں!“

”تمہارے والد۔۔۔۔“

”وہ بھی چھٹی لے کر آئے تھے، انہیں موٹر سے اُترتے ہی شہید کر دیا گیا تھا۔“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”مجید کہاں ہے؟“

”وہ زخمی تھا۔ میں نے کل اسے اپنے گاؤں کے ایک آدمی کے ساتھ نارووال بھیج دیا ہے۔“

عصمت نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”امینہ تو شاید اپنی سسرال گئی ہوئی

تھی؟۔“

”ہاں۔ وہ وہیں ہے۔“

ڈاکٹر عصمت اور راحت کے سوالات کے جواب میں سلیم نے مختصراً اپنی سرگزشت بیان کر دی۔

گیارہ بجے کے قریب وہ انہیں خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ سلیم نے ڈاکٹر کو اپنا گھوڑا دینے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا۔ ”نہیں! تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ میں نارووال تک پیدل جا سکتا ہوں، وہاں میرے ایک دوست کے پاس موٹر ہے، وہ ہمیں لاہور تک پہنچا دے گا۔“

رخصت کے وقت ڈاکٹر نے کہا۔ ”بیٹا! ان حالات میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کر سکتا لیکن اپنا خیال رکھنا۔ جس قدر تمہیں قوم عزیز ہے، اسی قدر قوم کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہے۔ اچھا خدا حافظ!“

راحت روتی ہوئی سلیم کے ساتھ لپٹ گئی۔ ”بھائی جان! وعدہ کیجیے کہ آپ جلدی آئیں گے۔“

سلیم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”راحت میرا کام بہت لمبا ہے۔“

عصمت انتہائی کرب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زبان گُنگ تھی۔ اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ وہ اس کائنات سے دُور جا چکی تھی جہاں سود و زیاں کا احساس ہوتا ہے۔ سلیم کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”اب میں ایک فرد نہیں ایک قوم ہوں۔“

ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔ ”چلو عصمت!“

اپنے باپ کے ساتھ چند قدم اُٹھانے کے بعد عصمت نے ایک بار مُڑ کر دیکھا۔ سلیم اور اس کی نگاہوں کے درمیان آنسوؤں کا نقاب حائل ہو چکا تھا۔ اچانک سلیم کے دل میں کوئی نیا خیال آیا اور اس نے جلدی سے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہریے!“ وہ رُک گئے اور سلیم جیب سے ہاتھ نکال کر آگے بڑھا۔ ”یہ لیجیے!“ اس نے عصمت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ انگوٹھی ابّا جان آپ کے لیے بنوا کر لائے تھے۔ انہوں

نے مرتے وقت مجھے دی تھی۔“

عصمت نے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا اشارہ پا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انگوٹھی پکڑ لی۔

سلیم نے دوسرا ہاتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہ چند پرانے نوٹ ہیں۔ شاید آپ کو راستے میں ضرورت ہو گی۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”نہیں بیٹا! تم اپنے پاس رکھو۔ مجھے راستے میں سب کچھ مل جائے گا۔“

”اچھا خدا حافظ!“ سلیم یہ کہہ کر مُڑا اور دریا کی طرف چل دیا۔ عصمت کچھ دیر اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ ملّاح ایک کشتی سے سواریاں اُتار کر واپس لوٹنے کو تھے۔ سلیم نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کشتی میں سوار ہو گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”چلو بیٹی!“

عصمت روتی ہوئی اپنے باپ کے ساتھ لپٹ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے سر پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! حوصلے سے کام لو، وہ ایک مجاہد ہے۔“

☆☆☆☆☆

مشرقی پنجاب میں وحشت و بربریت کا سیلاب پھیلتا گیا۔ مسلمان اس قیامت کا سامنا کرنے کے لیے تیّار نہ تھے۔ ہندو فاشزم کے تدریجی ارتقاء اور تقسیم سے قبل راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکال سینا کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر یہ کہنا غلط ہو گا کہ مسلم عوام کی طرح ان کا اہلِ الرائے طبقہ بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ لیکن انہوں نے آخری وقت تک دنیا کے سامنے اپنی صلح جوئی اور امن پسندی کا ثبوت دینے کی کوشش کی۔ جب کانگرس کی سرپرستی میں یہ جماعتیں منظّم اور مسلح ہو رہی تھیں۔ دردمندانِ قوم کی تمام سرگرمیاں نمائشی بیان بازیوں اور قراردادوں تک محدود تھیں۔ وہ آخری وقت تک اپنے آپ کو یہ فریب دے رہے تھے کہ تقسیم کا اصول تسلیم کر لینے کے بعد ہندوستان کی حکومت مسلم اقلیّت کے متعلّق اپنی ذمہ داری محسوس کرے گی۔ یہ ایک خود فریبی تھی اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ماؤنٹ بیٹن نہرو اور پٹیل کی کشتی میں سوار ہو چکا ہے تو یہ

خود فریبی ان کے لیے ایک مجبوری بن گئی۔ ۱۵اگست کے بعد دُشمن کی تلوار ایک نئے انداز میں بے نیام ہوتی اور پنجاب کے لیڈروں نے دیکھا کہ جو ہاتھ مدافعت کے لیے اُٹھ سکتے ہیں، وہ خالی ہیں۔۔۔۔ پاکستان کی فوجیں باہر ہیں۔۔۔۔ پاکستان کا اسلحہ ہندوستان میں پڑا ہوا ہے۔۔۔۔ ماؤنٹ بیٹن کی ہندو نوازی اور ریڈ کلف کی بد دیانتی نے وحشت کے سیلاب کے سامنے کوئی چٹان باقی نہیں چھوڑی۔ پاکستان کی اپنی یہ حالت تھی کہ ابھی تک یہاں نصف کے لگ بھگ غیر مسلم فوج پڑی ہوئی تھی۔

مشرقی پنجاب کے بیشتر لیڈروں کا عوام کے ساتھ اس وقت تک رابطہ تھا جب تک نہیں اسمبلیوں میں پہنچنے کے لیے ووٹوں کی ضرورت تھی پھر وہ اس وقت عوام کی طرف متوجہ ہوئے جب ملت فروش یونینسٹوں کی وزارت کے خلاف تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بہت کم ایسے لوگ تھے جنہوں نے عوام کے ساتھ رابطہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۵اگست سے پہلے مشرقی پنجاب کے عوام سکھ اور سیوا سنگھی بلوائیوں کا مقابلہ کر رہے تھے بعض علاقوں میں غیر مسلم فوج اور پولیس کی

جانبداری کے باوجود وہ ہراساں نہ تھے۔ امرتسر میں فوج اور پولیس کے منظّم حملوں نے بدحواسی پھیلادی تھی، تاہم وہ نوجوان جنہوں نے گزشتہ چھ ماہ تک اکال سینا، سیوا سنگھ اور شہریوں کے اس میں سکھ سپاہیوں کے حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن پندرہ اگست کے بعد مشرقی پنجاب کی حکومت، غیر مسلم افواج اور غیر مسلم عوام ایک ہو چکے تھے۔ ایک غیر مسلم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے لے کر ایک چپڑاسی اور کانگریس کے ایک بڑے عہد بہار سے لے کر سیوا سنگھ اور اکالی سینا کے ایک معمولی رضا کار تک سب کا ایک ہی پروگرام تھا۔ مسلمانوں کا عام مشرقی پنجاب کے وہ مسلم لیڈر جو ہر میدان کے لیے قراردادوں اور بیانوں کے تیر و نشتر کافی سمجھتے تھے، اپنے خاندانوں کے ساتھ مغربی پنجاب پہنچ چکے تھے۔ انہیں مسلم عوام کے لٹے پٹے تباہ حال قافلوں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ عوام کی حالت بھیڑوں کے اس گلے کی طرح تھی جسے اچانک چاروں طرف سے بھیڑیوں نے گھیر لیا ہو۔ شہر اور بستیوں کے جو مسلمان فوج اور پولیس کی گولیوں سے بچ نکلتے، انہیں سڑکوں، پگڈنڈیوں، نہروں اور دریاؤں کے پلوں پر سکھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ

کے جتھوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسلمانوں کی ہر آبادی کے با اثر لوگوں، بالخصوص پاکستان کے حامیوں کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتارا جاتا۔

پناہ گزینوں کی گاڑیاں پاکستان میں لاشوں کے انبار لے کر جاتی پہنچ رہی تھیں۔ مشرقی پنجاب میں ریلوے کے غیر مسلم ملازمین بلوائیوں کو باخبر رکھتے کہ پناہ گزینوں کی فلاں گاڑی فلاں وقت پہنچ رہی ہے اور وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے راستے کے کسی اسٹیشن پر جمع ہو جاتے۔ مردوں کو قتل کر دیا جاتا اور عورتیں چھین لی جاتیں، اگر جتھوں کی آمد میں دیر ہوئی تو راستے کے اسٹیشنوں کے ملازم گاڑیوں کو روک لیے، جو سکھ، ڈوگرہ اور گورکھا سپاہی ان گاڑیوں کی حفاظت پر متعیّن ہوتے، خود بھی اس قتل و غارت میں شریک ہو جاتے۔ صرف وہ گاڑیاں پاکستان تک سلامت پہنچتیں جو مسلمان سپاہیوں کی حفاظت میں لائی جاتی تھیں۔

دور افتادہ دیہات کی داستان اس سے بھی زیادہ المناک تھی۔ جب ایک بستی پر حملہ ہوتا، لوگ دوسری بستی کو محفوظ سمجھ کر اس طرف چل

پڑتے۔ راستے میں انہیں دوسری بستی کے لوگ بتاتے کہ وہاں بھی حملہ ہو چکا ہے اور وہ ان کے ساتھ کسی اور بستی کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اسی طرح انہیں کبھی شمال، کبھی جنوب کبھی مشرق اور کبھی مغرب کا رُخ کرنا پڑتا اور پھر بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پاکستان کا راستہ کس طرف ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی سینکڑوں کربلاؤں میں گھِرے ہوئے تھے۔ چاروں طرف آگ اور خون کا طوفان دیکھ بدحواس انسانوں کی ٹولیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں۔ پھر وہ ایک قافلے کی صورت میں قریب ترین شہروں کا رُخ کرتے۔ راستے میں ان پر قدم قدم پر حملے ہوتے اور جب وہ اپنے پیچھے لاشوں کے ڈھیر چھوڑتے ہوئے شہروں میں داخل ہوتے تو وہاں مسلمانوں کے محلوں میں بے گور و کفن لاشوں اور بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا اور ان کے استقبال کے لیے اکال سینا کی کرپانوں کے ساتھ فوج اور پولیس کی سنگینیں بھی ہوتیں۔

جالندھر، ہوشیار پور، فیروز پور اور امرتسر وغیرہ اضلاع کے مسلمانوں کو

یہ یقین تھا کہ ان کی اکثریت کی تحصیلیں پاکستان کو مل جائیں گی اور وہ خطرے کے وقت غیر مسلم اکثریت یا ہندوستانی علاقوں سے نکل کر وہاں پناہ لے سکیں گے لیکن ریڈ کلف ایوارڈ ان کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گرا۔

ضلع گورداسپور کی ٹریجڈی صرف وہاں کے مسلمانوں تک محدود نہ تھی، یہ تین اور اضلاع کے مسلمانوں کے لیے بھی موت کا پیغام تھی۔ کانگرہ، ہوشیار پور اور امرتسر کے اضلاع کی سرحدیں گورداسپور سے ملتی تھیں۔ اگر کشمیر سے متعلّق نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے عزائم کی خاطر مسلم اکثریت کا یہ ضلع ہندوستان کو نہ دیا جاتا تو ہوشیار پور کے مسلمان بیاس عبور کر کے یہاں پناہ لے سکتے تھے۔ امرتسر کی نصف مسلم آبادی لاہور کی نسبت یہاں زیادہ آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔ ضلع کانگڑہ اور ریاست چمبہ کے دور افتاد علاقوں میں بکھری ہوئی مسلم آبادی کو یہ سہارا تھا کہ وہ خطرے کے وقت گورداسپور کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ جب ضلع گورداس پور وحشت اور بربریت کے طوفان کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تو یہ لوگ ایک ایسے

تاریک غار میں بند ہو کر رہ گئے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

پاکستانی اخبارات میں ہر روز اس قسم کی خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ ”آج غیر مسلم فوج اور پولیس نے مشرقی پنجاب کے اس شہر پر حملہ کیا ہے۔ آج سکھوں کے جتھے اور شہری لباس میں مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے سپاہی فلاں علاقہ میں مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔ فلاں سڑک اور فلاں پل پر پناہ گزینوں کے قافلے پر حملے ہوئے ہیں۔ سکھوں نے اتنے آدمیوں کو قتل کیا ہے اور اتنی عورتیں چھین کے لے گئے ہیں۔ فلاں فلاں اسٹیشنوں پر پناہ گزینوں کی گاڑیوں پر حملے ہوئے ہیں۔ مغربی پنجاب کی حکومت نے احتجاج کیا ہے اور مشرقی پنجاب کے لیڈروں نے تمام الزامات کی تردید کر دی ہے۔ فیروز پور میں قتلِ عام ہو رہا ہے۔ میانی پٹھاناں کے مسلمان اتنے دِنوں سے حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔۔۔۔ میانی پٹھاناں پر ہندوستانی فوج نے ٹینکوں اور مشین گنوں سے حملہ کر دیا۔۔۔۔ جالندھر میں فوج نے مسلمانوں کے محلوں پر کرفیو آرڈر لگا دیا تھا۔۔۔۔ فوج اور پولیس کے سپاہی مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا

دیتے تھے۔ جب وہ بات نکلتے تھے تو ان پر گولی چلا دی جاتی تھی۔۔۔۔ فلاں تاریخ کو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر اپنے مکان خالی کر دیں، ورنہ انہیں گولی مار دی جائے گے۔۔۔۔ ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا کہ وہ حفاظت سے پاکستان پہنچا دیے جائیں گے۔ پھر ریلوے اسٹیشن اور پناہ گزینوں کے کیمپ تک ان پر حملے کیے گئے۔۔۔ اتنے مرد، عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ ان عورتیں چھین لی گئیں۔۔۔۔ آج فلاں شہر میں سکھوں نے عورتوں کو ننگا کر کے ان کا جلوس نکالا۔ حکام اور پولیس تماشا دیکھ رہے تھے۔۔۔۔ آج فلاں اسٹیشن اور فلاں کیمپ میں مشرقی پنجاب کے پناہ گزینوں کی تلاشی لی گی اور لوگوں کے کپڑے اُتار لیے گئے۔ مغربی پنجاب کے لیڈروں نے پھر احتجاج کیا ہے۔

پناہ گزینوں کو جو راشن ملتا ہے، اس میں زہر ملا دیا جاتا ہے۔ فلاں فلاں کیمپ کے آس پاس تمام کنوؤں کے پانی میں زہر ملا دیا گیا ہے۔ آج ہندوستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے مشرقی پنجاب کے

فلاں فلاں شہر کا دورہ کرنے کے بعد یہ بیان دیا ہے کہ صورتِ حال پر قابو پا لیا گیا ہے۔۔۔ بدامنی، لوٹ مار اور قتل و غارت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔۔۔ فلاں وزیر اور فلاں لیڈر نے کہا ہے کہ حالات اعتدال پر ہیں۔۔۔ آج پٹیل نے فلاں شہر پہنچ کر سکھوں اور ہندوؤں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے پاکستان کو دھمکی دی ہے۔۔۔۔ آج مغربی پنجاب کے فلاں فلاں لیڈروں نے پُرزور احتجاج کیا ہے۔۔۔"

انسانیت کے دُشمنوں کو معلوم تھا کہ پاکستان اب صرف احتجاج یا اپیلوں کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔۔۔ وہ مغربی پنجاب کے لیڈروں کی درخواست پر مصالحانہ گفت گو کے لیے مغربی اور مشرقی پنجاب کے وزرا کی کانفرنس بلاتے، بحث ہوتی، فسادات کی مذمت ہوتی، ایک مشترکہ بیان جاری کیا جاتا، مغربی پنجاب کے نمائندے مطمئن ہو کر واپس آ جاتے لیکن اگلے دِن پھر خبریں آنے لگتیں کہ اب فلاں شہر پر حملہ ہوا ہے۔ فلاں جگہ پاکستان کے سرکاری عملہ کی گاڑی روک دی گئی اور فلاں سڑک پر اتنے ہزار آدمیوں کا قافلہ مارا گیا۔

امن کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ مشترکہ بیانات نکلتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام بھی جاری رہا۔ بھارت کے بیٹوں نے جہاں وحشت اور بربریت کی تاریخ میں ایک نئے اور اچھوتے باب کا اضافہ کیا تھا، وہاں وہ مکر وفریب اور جھوٹے پروپیگنڈا کے فن میں بھی دنیا بھر کی اقوام سے سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ مشرقی پنجاب میں نہرو کی حکومت کا سفینہ مسلمانوں کے خون میں تیر رہا تھا لیکن وہ مغربی پنجاب میں رائی کو پہاڑ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مغربی پنجاب کے لیڈروں کی سادہ دلی کا یہ عالم تھا کہ وہ دنیا کے سامنے امن پسندی کا ثبوت دینے کے لیے ناکردہ گناہوں کا بوجھ اپنے سر لینے کے لیے تیّار تھے۔ یہاں تک کہ جب لاہور میں سکھ اور گورکھا فوج متعیّن تھی اور وہ کسی روک ٹوک کے بغیر مسلمانوں پر گولیاں چلارہی تھی، یہ لوگ پریشان حال لوگوں کے سامنے جاکر اپیلیں کرتے رہے کہ تم پُرامن رہو۔ مغربی پنجاب کے لیڈر اپنی کاروں میں پٹرول ڈال کر اطلاعات کے منتظر رہتے۔ اگر کہیں سے اِکا دُکا واردات کی خبر آتی تو وہ آدھی رات کے وقت بھی روانہ ہو جاتے۔ پھر اگلے دِن اخباروں میں ان کے بیان اور تقریریں جلی

حروف میں شائع ہوئیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل سے بھیڑیوں کو انسانیت کا درس دینا چاہتے تھے لیکن امن پسندی اور نیک نیّتی کے ان مظاہروں کا اثر فقط ہندوستان کے اس پروپیگنڈے کو تقویت دینے تک محدود رہا کہ مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مغربی پنجاب کا ردِّ عمل ہے۔

مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ لدھیانہ، رہتک کرنال، حصار اور گڑ گاؤں کے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کی داستان دوسرے اضلاع کے مسلمانوں کی سرگزشت سے مختلف نہ تھی، ہر شہر اور بستی سے لٹے ننگے، بھوکے انسانوں کے قافلے قدم قدم پر لاشوں کے انبار چھوڑتے ہوئے پاکستان کا رُخ کر رہے تھے۔ بیوی کو شوہر کا علم نہ تھا۔ بھائی کو بہنوں کا پتہ نہ تھا۔ مائیں دودھ پیتے بچّوں کو پھینک کر بھاگ رہی تھیں اور وحشت اور بربریت کا طوفان ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ مشرقی پنجاب ایک جنگل تھا اور اس جنگل کی بادشاہت پر بھیڑیوں کا لشکر قابض ہو چکا تھا۔

لدھیانہ میں قتلِ عام شروع ہوتا تو خبر آ جاتی کہ مشرقی پنجاب کے گورنر

نے جالندھر کا دورہ کرنے کے بعد بیان دیا ہے کہ اب صورتِ حال پر قابو پالیا گیا۔ گڑ گاؤں اور حصار پر سکھ اور ہندو ریاستوں کے مسلح گروہ حملہ کرتے تو دہلی ریڈیو سے اعلان ہوتا کہ فلاں وزیر نے لدھیانہ کے مسلمانوں کو اطمینان دلایا ہے کہ اب انہیں کوئی خطرہ ہیں۔ ایک دِن گورنر اعلان کرتا کہ مشرقی پنجاب کی یہ پالیسی ہر گز نہیں کہ مسلمانوں کو زبر دستی نکالا جائے اور اگلے دِن خبر آ جاتی کہ فلاں فلاں شہر کے مسلمانوں کو اتنے گھنٹے کے اندر اندر اپنے گھر خالی کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

مشرقی پنجاب کی ریاستیں مسلمانوں کے قتلِ عام میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہی تھیں۔ کپور تھلہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس لیے وہاں کئی ماہ پیشتر سکھوں اور راشٹر یہ سیوک سنگھ کے جتھوں کو فوجی ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ بھرت پور اور الور میں راشٹر یہ سیوک سنگھ کے جتھے میواتی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد

رہتک، حصار اور گُڑ گاؤں میں داخل ہو چکے تھے۔ نابھہ کا حکمران بھی اپنی ہمّت اور استعداد کے مطابق سکھوں اور اکالیوں کو فوج، اسلحہ اور بارود مہیّا کر رہا تھا۔

پٹیالہ کا مہاراجہ جو مدّت سے مشرقی پنجاب میں قتلِ عام کی سازش میں شریک تھا۔ اس نے پندرہ اگست سے چند ماہ پیشتر ہی اپنے تمام ذرائع پنجاب کی اکال سینا کو مسلح کرنے کے لیے وقف کر دیے تھے۔ پٹیالہ کے سکھوں کو مسلح کرنے اور فوجی تربیت دینے کے بعد در پردہ مشرقی پنجاب کے مختلف اضلاع میں بھیجا جا رہا تھا۔ راجہ کی اپنی فوج کے آدمی شہری لباس میں سکھ جتھوں کی رہنمائی کر رہے تھے تاہم پٹیالہ کی مسلمان رعایا آخری وقت تک خود فریبی میں مبتلا رہے۔ قتلِ عام سے صرف چند دِن قبل پٹیالہ شہر میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ میٹنگ بلا کر ان کے لیڈروں سے حلف لیے گئے تھے کہ وہ ہر قیمت پر امن قائم رہیں گے۔

مسلمانوں کو اور زیادہ اطمینان دلانے کے لیے راجہ نے ہندو مسلم اور سکھ

نمائندوں کے سامنے بذاتِ خود یہ اعلان کیا تھا کہ بدامنی پھیلانے والے خواہ کسی مذہب یا قوم تعلق رکھتے ہوں، حکومت ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا تہیّہ کر چکی ہے۔ حکومت کی فوج اور پولیس بدامنی کی روک تھام کے لیے تیّار کھڑی ہے۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر قیمت پر امن قائم رکھیں۔

انتہائی مایوسی کی حالت میں انسان خود فریبی کا سہارا لیتا ہے۔ یہی حالت پٹیالہ کے مسلمانوں کی تھی، وہ راجہ کے دامِ فریب میں آ گئے۔ صرف پٹیالہ کے مسلمان بلکہ ریاست کی سرحدوں کے آس پاس کے مسلمان بھی اپنے گھر بار چھوڑ کر پٹیالہ میں پناہ لینے لگے۔ یہاں تک کہ لدھیانہ، کرنال اور پڑوس کے دوسرے شہروں اور بستیوں سے بھی بعض مسلمان پٹیالہ کا رُخ کرنے لگے۔ اس کے بعد ایک منظّم پروگرام کے ماتحت مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا۔ پہلے مسلح دوستوں اور جتھوں نے پٹیالہ کی سرحدوں سے باہر نکل کر حملے شروع کیے۔ مسلمان بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگتے تو سکھ اور ہندو لیڈر انہیں مشورہ دیتے کہ پٹیالہ کی حدود

کے اندر امن ہے۔ اب تمہیں صرف وہاں پناہ مل سکے گی۔ پھر انہیں ڈرایا جاتا کہ پاکستان بہت دور ہے۔ تم راستے میں مارے جاؤ گے۔۔۔۔ بعض قافلے ان کے جھانسوں میں آ جاتے۔

اس کے بعد راجہ کے سورماؤں نے سرحد کی بستیاں مسلمانوں سے خالی کروائیں اور باہر کی دنیا سے رسل و رسائل کے مسلسل منقطع کر دیے۔ اب شکار چاروں طرف سے گھِر چکا تھا۔ تقریباً دس دِن تک راجہ کی فوج اور پولیس اور سکھوں کے تربیت یافتہ جتھے مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے رہے۔ راجہ اور اس کے حکام قریباً ہر روز یہ بیان دیتے رہے کہ ریاست میں کسی بدامنی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔۔۔۔ مسلمانوں کی جان، مال اور عزّت کو کوئی خطرہ نہیں۔

مہاراجہ پٹیالہ نے ایک بھیڑیے کی درندگی کے علاوہ ایک مکڑی کی فراست کا مظاہرہ کیا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے راج پر مکھ کی گدّی سنبھالنے کے لیے پٹیل کو کوئی اور آدمی اس سے زیادہ موزوں دکھائی نہ دیا۔

پھر دہلی کی باری آئی۔ یہ تاریخی شہر عدم تشدّد کے علمبرداروں کا دارالحکومت تھا۔ یہاں برلا مندر اور بھنگی کالونی میں مہاتما گاندھی اپنے پجاریوں کو اہنسا کا درس دیا کرتے تھے۔ یہاں وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی قیام گاہ تھی۔ جنہوں نے چند ہفتے پیشتر یہ اعلان کیا تھا کہ انتقالِ اختیارات کے بعد باؤنڈری فورس کی موجودگی میں کسی بدامنی کا خاطر نہیں۔ یہاں ہندوستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور سکھشا منتری[9] کا سردار بلدیو سنگھ جی اور وزیرِ داخلہ سردار لبھ بھائی پٹیل براجمان تھے۔ حکومت، پریس، پلیٹ فارم اور ریڈیو کے ذریعے بارہا اس بات کا اعلان کر چکی تھی کہ دہلی میں بدامنی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ باہر سے جو سکھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے رضاکار جمع ہو رہے تھے۔ وہ مسلح تھے، اس لیے امن پسند حکومت نے فساد کے خطرے کے پیشِ نظر لوگوں کی تلاشیاں لینی شروع کر دی۔ سکھوں اور ہندوؤں کی نہیں۔۔۔۔ مسلمانوں کی تلاشیاں، امن پسندوں کی حکومت سکھوں اور ہندوؤں کی اسٹین گنوں، ٹامی گنوں اور رائفلوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے گھروں

[9] وزیرِ دفاع

میں قلم تراش، چاقو، سبزی کاٹنے کی چھریاں اور جلانے کی لکڑیاں تک چھوڑنا خطرناک سمجھتی تھا۔ چنانچہ اس قسم کی خطرناک چیزیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ پھر ''جے ہند'' اور ''ست سری اکال'' کے نعرے بُلند ہوئے اور آل انڈیا ریڈیو یہ اعلان کرنے لگا کہ آج اِکا دُکا حملے ہوئے، حالات پر قابو پا لیا گیا ہے۔۔۔۔ آج کرفیو آرڈر لگا دیا گیا ہے۔۔۔۔ آج ایک جگہ فساد ہو چلا تھا لیکن پنڈت نہرو نے موقع پا کر ہجوم کو منتشر کر دیا۔۔۔ آج امن کمیٹی نے یہ اعلان کیا ہے آج وزیرِ اعظم پنڈت نہرو نے غیر ملکی اخبار نویسوں اور خبر رساں ایجنسیوں کے متعلق شکایت کی ہے کہ وہ دہلی کی خبروں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔

لال قلعہ کی دیواروں اور جامع مسجد کے نیچے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ وحشت اور بربریت کے ساتھ انسانیت کا دامن تار تار کرتے رہے۔ گاندھی کے چیلوں کے عہدِ حکومت میں دہلی کی تاریخ کا پہلا باب مسلمانوں کے خون سے لکھا جا رہا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اب بھی وائسرائے تھا۔ پنڈت نہرو اب بھی وزیرِ اعظم تھا لیکن دہلی پر غنڈوں کی حکومت تھی۔ شاید اس وقت وائسرائے اپنی لاج کی چھت پر کھڑا اپنی آنکھوں سے آگ اور خون کے اس طوفان کا مشاہدہ کر رہا تھا اور ابلیس اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔۔۔ ”میں اس دنیا میں کئی انسانوں کا بھیس بدل کر آیا ہوں۔ میں نے باغِ آدم کو کئی بار آگ لگائی ہے۔ میں سمرقند اور بخارا پر چنگیز خان کی صورت میں نازل ہوا تھا۔ میں بغداد میں ہلاکو خان بن کر آیا تھا لیکن تو میرا شاہکار ہے۔“ جب دہلی میں تشدّد کے دیوتا کے پجاری اپنا کام ختم کر چکے تو عدم تشدّد کا دیوتا بھی وہاں پہنچ گیا۔

☆☆☆☆☆

پاکستان اب لاکھوں بھوکے، ننگے اور بے سر و سامان انسانوں کی جائے پناہ اور ہزاروں زخمیوں کا ہسپتال بن چکا تھا۔ اب مشرقی پنجاب سے شہر اور بستیاں خالی ہو چکی تھیں۔ اب حملہ آوروں کے سامنے کیمپ تھے یا قافلے تھے۔ باؤنڈری فورس توڑی جا چکی تھی اور مسلمانوں کے قتل عام کے

راستے میں جو رہی سہی رکاوٹیں تھیں، وہ بھی دور ہو چکی تھیں۔ دہلی سے لے کر واہگہ تک پناہ گزینوں کے قافلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بیشتر قافلوں کی منزلِ مقصود لاہور تھی۔ لاہور میں روزانہ کئی کئی میل لمبے قافلے روانہ ہو رہے تھے، لاہور کی سڑکوں، لاہور کی گلیوں، لاہور کے اسٹیشن اور لاہور کے کیمپوں میں تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔

راستے میں کئی کئی راتیں جاگنے اور سینکڑوں میل چلنے کے بعد بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال لوگ واہگہ پہنچ کر پاکستان کی سرحد پر پاؤں رکھتے ہی پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتے اور زمیں پر لیٹ کر سو جاتے۔ یہ وہ منزل تھی جہاں پہنچنے کے لیے یہ لوگ اپنی زندگی کی تمام پونجی لٹا کر آ رہے تھے۔ حکومت پریشان تھی، حکام بد حواس تھے۔ لاہور میں روزانہ آنے والے پناہ گزینوں کے لیے جگہ نہ تھی لیکن لاہور کے عوام کا ایثار و خلوص یہ ثابت کر رہا تھا کہ لاہور اس بوجھ کو اُٹھا سکتا ہے۔ لاہور کے ریڈیو سے یہ اعلان ہوتا کہ آج اتنے بجے اتنے ہزار اتنے لاکھ مہاجرین کا قافلہ لاہور پہنچ رہا ہے۔ انہیں کھانے کی ضرورت ہے اور عوام اپنی اپنی گلی کوچے اور

محلے سے پکا پکایا کھانا جمع کرتے اور چھکڑوں اور تانگوں پر لاد کر کیمپوں میں بھیج دیتے۔

ایثار پیشہ لوگوں کی دوسرے شہروں میں بھی کمی نہ تھی۔ اجتماعی مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے ایک اجتماعی شعور بیدار ہو چکا تھا لیکن جس سیلاب کو ہندوستان کی حکومت پاکستان کی بنیادیں ہلا دینے کے لیے کافی سمجھتی تھی، اسے روکنا معمولی بات نہ تھی۔ اس مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے ایک مضبوط و مستحکم حکومت کے لا محدود ذرائع کی ضرورت تھی اور پاکستان کی حالت اس بچّے کی سی تھی جسے پاؤں پر کھڑا ہونے سے پہلے بوجھ اٹھا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ مغربی پنجاب کی حکومت کے سامنے جس قدر بڑا کام تھا، اسی قدر کام چلانے والے ہاتھ ناتجربہ کار تھے اور بعض ہاتھ تو ایسے تھے جنھوں نے گلی ڈنڈا اچھینک کر وزارت کے قلمدان سنبھال لیے تھے۔ دفتری نظام کی مشینیں ابھی تک وہی تھیں جو دنوں کا سفر مہینوں میں طے کرتی ہیں۔ بلکہ ایک منظّم سکیم کے تحت غیر مسلم ملازموں کے انخلا کے باعث یہ دفتری نظام بھی درہم برہم ہو چکا تھا۔ مشرقی پنجاب اور

باقی ہندوستان سے آنے والے تجربہ کار ملازم جو اس خلا کو پُر کر سکتے تھے، ان میں سے اکثر قتل کیے جا چکے تھے اور جو پاکستان پہنچ رہے تھے، انہیں اپنا ہوش نہ تھا۔ کسی کی بیوی، کسی کی بہنیں، کسی کے بچّے اور کسی کے والدین مارے جا چکے تھے۔ کسی کے عزیز لا پتہ تھے اور وہ ان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ پاکستان کے دُشمن اور پاکستان سے زیادہ انسانیت کے دُشمن اپنے ترکش کے تمام تیر چلا رہے تھے۔ مشرقی پنجاب میں بے سرو سامان مسلمان اپنی بستیوں اور شہروں سے نکل کر کیمپوں میں جمع ہو رہے تھے۔ اور یہاں سے فوج کے سپاہی انہیں پاکستان لے جا رہے تھے۔ جن قافلوں کی حفاظت کے لیے مسلمان سپاہیوں کے دستے متعیّن ہوتے وہ آسانی سے پاکستان پہنچ جاتے، حملے ان پر بھی ہوتے، کھلی سڑکوں پر نہیں بلکہ شہروں سے گزرتے ہوئے۔ ان پر سڑک کے آس پاس کے مکانوں سے دستی بم پھینکے جاتے اور گولیاں برسائی جاتیں۔ پھر بھی جس قافلے کے ساتھ پانچ یا دس مسلمان سپاہی ہوتے، اس پر سینکڑوں بلوائیوں کو کھلے بندوں حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن سڑکوں اور شاہراہوں سے دور دیہاتی علاقوں سے پناہ گزینوں کے جو قافلے ہندوستانی فوج کی

حفاظت میں آ رہے تھے۔ ان کا حال اس کے برعکس تھا۔ کسی نہر یا دریا کے کنارے انہیں روک لیا جاتا اور ان سے حفاظت کا معاوضہ طلب کیا جاتا۔ لوگ اپنی پائی پائی ان کی نذر کر دیتے۔ پھر علاقہ کی پولیس کا افسر جتھالے کر پہنچ جاتا۔ جوان لڑکیاں چھین لی جاتیں اور باقی لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ بعض لوگ اپنی بہو بیٹیوں کے ساتھ دریا یا نہر میں چھلانگیں لگا دیتے اور حملہ آور کناروں پر کھڑے ہو کر ان پر نشانہ بازی کرتے۔ مشرقی پنجاب کے ہر دریا، ندی اور ہر نالے میں لاشیں تیر رہی تھیں۔

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے کئی کیمپوں کے آس پاس پانی کے کنوؤں میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ بعض کنوئیں لاشوں سے بھر دیے گئے تھے۔ بارش، کیچڑ اور آس پاس غلاظت کے ڈھیر لگ جانے سے کیمپوں کی فضا غایت درجہ متعفّن ہو چکی تھی۔ پناہ گزینوں کو ایک جگہ سے اُٹھ کر دوسری جگہ بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ مسلح سکھوں کے گروہ کیمپوں کے ارد گرد آٹھوں پہر گھیر اڈالے اس بات کے منتظر رہتے کہ مسلمان فوج کا حفاظتی

دستہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو اور وہ حملہ کریں۔

ہندوؤں کی تجارت پیشہ قوم ان حالات میں بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بعض کیمپ ابھی تک ان لوگوں کی دسترس سے بچے ہوئے تھے۔ جو تلاشیاں لے کر مسلمانوں کا رہا سہا سامان چھین لیتے تھے اور ان کیمپوں کے آس پاس بنیوں نے تجارت کی چھوٹی چھوٹی منڈیاں کھول دی تھیں۔ ان منڈیوں میں وہ ایک ایک سیر اناج کے بدلے کئی کئی روپے وصول کر رہے تھے۔ یہاں صرف خوراک کی ہی قیمت نہ تھی، پینے کا پانی بھی فروخت ہو رہا تھا۔ دیش بھگت، دیش کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے پانی کا ایک ایک مٹکا سو سو روپے میں فروخت کر رہے تھے۔ صاف پانی بیمار، بچّوں اور زخمیوں کے لیے دوا سمجھ کر خریدا جاتا تھا۔ ورنہ زیادہ تر لوگ جوہڑوں میں بارش کے گدلے اور سڑے ہوئے پانی پر گزارہ کر رہے تھے۔ بھوکوں مرتے لوگ درختوں کے پتّے اور گھاس کے تنکے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ اور مشرقی پنجاب کے جو قافلے مغربی پنجاب کا رُخ کر رہے تھے، زخمیوں کے علاوہ ہیضے کے

مریضوں کو بھی اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ اب پاکستانی پریس اور ریڈیو کی خبروں کا انداز یہ تھا:

”فلاں کیمپ سے اتنے ہزار مہاجرین کا قافلہ روانہ ہوا۔ راستے میں اتنے زخمی اور ہیضے کے مریض مر گئے۔۔۔۔ اب مغربی پنجاب کے فلاں فلاں کیمپ میں بھی ہیضے کی وبا پھیل گئی، اس لیے لوگوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ فوراً ٹیکے کروالیں۔ آج دہلی کی طرف سے آنے والی فلاں گاڑی لاہور پہنچی، گاڑی میں صرف لاشیں تھیں۔ فلاں افسر اور فلاں لیڈر نے بیان دیا ہے کہ گاڑیوں میں سفر کرنا قطعاً غیر محفوظ ہے۔

پاکستان ریڈیو صبح شام مہاجرین کے لیے پروگرام نشر کر رہا تھا۔ فلاں فلاں لڑکی کا باپ فلاں کیمپ سے اِطّلاع دیتا ہے کہ اگر وہ سلامت ہوں تو یہاں پہنچ جائیں، فلاں بانو اور فلاں بیگم کا عزیز اِطّلاع دیتا ہے کہ وہ زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ لاہور، سیالکوٹ، راولپنڈی اور پشاور وغیرہ سے فلاں فلاں آدمی اِطّلاع دیتے ہیں کہ اگر مشرقی پنجاب سے ان کے رشتہ دار اور عزیز مغربی پنجاب کے کسی کیمپ میں ہوں تو اطلاع دیں، بہت

تشویش ہے۔ فلاں صاحب اپنے خاندان کی فلاں فلاں خاتون، فلاں بانو اور فلاں بیگم کا پتہ دریافت کرتے ہیں۔ مسماۃ فلاں اپنے شوہر اور بھائیوں کی متلاشی ہیں۔ فلاں فلاں بچّے قافلے پر حملے کے دوران میں اپنے والدین سے بچھڑ گئے ہیں، اگر کسی کو علم ہو انہیں اطلاع دے۔"

یہ مختصر سے پیغامات ان لاکھوں طویل اور دِلخراش داستانوں کے عنوان تھے، جنہیں سُننے اور سنانے کی کسی کو ہمّت یا فُرصت نہ تھی۔

پاکستان ہزاروں مصیبتوں، ہزاروں نااُمّیدیوں اور ہزاروں پریشانیوں کا سامنا کر رہا تھا۔ افق پر تاریک آندھیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔۔۔ لیکن اس مہیب طوفان میں بھی روشنی کا ایک مینار اپنی جگہ قائم تھا۔۔۔ قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کے ملّاح قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے الفاظ کہتے ہوئے دلوں میں یقین اور ایمان کی مشعلیں روشن کر رہے تھے۔۔۔ پاکستان کو اب کوئی نہیں مٹا سکتا۔ ہم ان تاریکیوں اور طوفانوں سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔

اب ہندوستان سے پاکستان کے حصّے کی فوج آ رہی تھی۔ قوم اپنے سپاہیوں

کی پریشانیوں پر نئی زندگی کی ایک جھلک دیکھ رہی تھی۔ اب تک بلوچ رجمنٹ کے مُٹھّی بھر سپاہیوں نے جو کچھ کیا تھا، اس کے پیشِ نظر قوم پاکستان کی فوج سے بڑی سے بڑی توقع وابستہ کرنے میں حق بجانب تھی۔ عوام ان سپاہیوں کے راستے میں آنکھیں بچھا رہے تھے۔ قوم کی بیٹیاں محبت و عقیدت اور تشکّر کے آنسوؤں سے ان کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ گُنگ زبانوں سے پھر ایک بار پاکستان زندہ باد کی صدائیں نکل رہی تھیں۔

گاندھی کے امن پسند چیلوں کی تلواروں کی تیزی صرف نہتوں کی گردنوں پر آزمائی جا سکتی تھی۔ انہیں اپنے مدِّ مقابل کے ہاتھ میں تلوار دیکھنا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ پاکستانی افواج پر بھی پرانے حربے آزمانے کی کوشش کی گئی۔ راستے میں جگہ جگہ ان کی اسپیشل گاڑیاں روکی گئیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ تم اپنے ہتھیار ہماری تحویل میں دے دو۔ تمہاری حفاظت کے لیے گاڑی کے ساتھ ہندوستانی فوج کا دستہ جائے گا۔ لیکن مہاشوں کو معلوم ہوا کہ شہری اور فوجی کی ذہنیت میں بہت فرق ہے۔ مسلمان سپاہی جان سے پہلے ہتھیار دینے کے لیے تیّار نہ تھے۔ ان کے

پاس ایک ہی جواب تھا کہ ”ہم اپنی حفاظت آپ کر سکتے ہیں۔“ کہیں کہیں سکھوں کے جتھوں نے ان گاڑیوں کو بھی پناہ گزینوں کی گاڑیاں سمجھ کر حملے کیے لیکن ان کا انجام ان چڑی ماروں سے مختلف نہ تھا جو شکار کے شوق میں شیروں کی کچھار کے اندر گھُس گئے ہوں۔

☆☆☆☆☆

راوی کے کنارے پناہ گزینوں کی تعداد میں آئے دِن اضافہ ہو رہا تھا۔ ضلع گورداسپور اور امرتسر کی تحصیل اجنالہ کی بیشتر مسلم آبادی کا رُخ اب اس طرف تھا۔ ڈیرہ باب نانک کے پُل سے اوپر اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی پڑاؤ تھے۔ بعض مقامات پر کشتیاں لوگوں کو پار پہنچانے میں مصروف تھیں اور بعض جگہ لوگ مویشیوں، چھکڑوں سے تختوں اور پہیوں اور گھاس پھوس کے گٹھوں پر دریا عبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس قسم کے سہاروں سے پار پہنچنے والوں کی تعداد عام طور پر زیادہ ہوتی۔

شہروں اور بستیوں سے مسلم آبادی کے انخلا[10] کے بعد سکھوں کی توجہ راستوں، سڑکوں اور راوی کے کنارے پناہ گزینوں کے کیمپوں کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ لوگوں کے سامنے دریا تھا اور پیچھے آگ تھی۔ برسات کی جوانی کے دِن گزر چکے تھے لیکن اس سال اگست کے آخری دِنوں میں بھی بارش ہو رہی تھی۔ جب تھوڑی دیر کے لیے مطلع صاف ہو جاتا تو لوگ ایک دوسرے کو تسلّی دیتے۔ ”اب صرف دو چار دِنوں کی

---

[10] بٹالہ ضلع گورداسپور کا سب سے بڑا شہر تھا۔ ضلع کے حکام اور بلوائیوں کو خطرہ تھا کہ شہر میں کہیں آس پاس کی بستیوں کے مسلمانوں کا دفاعی مورچہ نہ بن جائے چنانچہ باؤنڈری کمیشن کے اعلان کے ساتھ ہی پولیس نے شہر کو مسلمانوں سے خالی کروانے کی مہم شروع کر دی تھی۔ قرب وجوار کے دیہات کے مسلمان شہر کا رُخ کر رہے تھے۔ اور شہر کے مسلمان سنگینوں کے پہرے میں اپنے گھر بار خالی کر کے کیمپوں میں پناہ لے رہے تھے۔ اس کے بعد بھی لوگوں کو مسلمان سپاہی فوجی ٹرکوں اور لاریوں میں بٹھا کر امرتسر کے راستے لاہور کی طرف لے گئے۔ اور باقی ہزاروں کی تعداد میں ڈیرہ بابا نانک کا راستہ اختیار کرنے لگے۔۔۔ اس کے بعد قادیان، حکومت، فوج اور بلواؤں کی توجہ کا مرکز بنا۔ احمدیہ جماعت کے لیڈروں کو ہندوستان کی حکومت یہ اطمینان دلا چکی تھی کہ انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ بٹالہ کی صورتِ حالات سے پریشان ہو کر قادیان کے اِرد گرد چند سات میل کے دائرے میں مسلم آبادی اپنے گھر بار خالی کر کے وہاں جمع ہوئی۔ اس کے بعد آگ کا دائرہ قادیان کے گرد ٹھیک ہونے لگا اور اس قسم کی خبریں آنے لگیں۔ ”آج احمدیہ جماعت کا وفد فلاں لیڈر سے ملا ہے اور انہوں نے یقین دلایا ہے کہ قادیان کی حفاظت کی جائے گی۔۔۔ آج قادیان کے مضافات پر حملے ہوئے۔ اتنے آدمی مارے گئے۔ اتنی عورتیں اغوا کر لی گئیں۔۔۔۔ ہندوستان کے فلاں وزیر نے بیان دیا ہے کہ قادیان کو کوئی خطرہ نہیں۔۔۔۔ آج قادیان میں کرفیو آرڈر لگا دیا گیا۔۔۔۔ قادیان کے باشندوں کی تلاشیاں کی جا رہی ہیں۔۔۔۔ قادیان کے فلاں فلاں محلّوں پر حملے ہوئے ہیں۔۔۔ قادیان کی خبروں کا بلیک آؤٹ۔۔۔۔ احمدیہ جماعت کے دو خانگی ہوائی جہازوں کو لاہور اور قادیان کے درمیان پرواز کرنے سے منع کر دیا گیا۔ قادیانت کے لوگوں کو زبردستی شہر سے نکالا جا رہا ہے۔۔۔ آج چالیس ہزار آدمیوں کا قافلہ پاکستان کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔۔ قادیان اور بٹالہ کے درمیان قافلے پر سکھوں کے حملے۔۔۔ قادیان میں بہت تھوڑے آدمی رہ گئے ہیں۔۔۔۔ پولیس اور ضلع کے حکام لوٹ مار میں حصّہ لے رہے ہیں۔۔۔ ہندوستان کے فلاں لیڈر اور فلاں وزیر نے بیان دیا ہے کہ قادیان میں بالکل امن ہے۔۔۔“

بات ہے دریا اُتر جائے گا اور ہم پار پہنچ جائیں گے۔ “لیکن اگلے دِن نئی گھٹائیں دیکھ کر وہ کہتے۔ ”دریا نہیں اُترے گا۔ یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔“ اندھیری راتوں اور موسلا دھار بارشوں میں ماؤں کے سینوں سے چمٹے ہوئے بچّے بلکتے، زخمی اور ہیضہ، ملیریا، نمونیا اور ٹائیفائیڈ کے مریض کراہتے۔ اچانک کہیں سے کسی کی چیخیں سنائی دیتیں۔ ”لوگو! میں لُٹ گئی۔ میرا بچّہ مر گیا۔۔۔“ یہ چیخیں ہچکیوں اور آہوں میں تبدیل ہو جاتیں تو کسی اور کونے سے ماتم کی صدائیں آنے لگتیں۔ پھر اچانک یہ شور اُٹھتا۔ ”پانی آ گیا۔ یہاں سے بھاگو۔ دریا چڑھ رہا ہے۔“ چاروں طرف کھلبلی مچ جاتی۔ بعض لوگ بدحواسی میں دور ہٹنے کی بجائے دریا کے اندر چلے جاتے اور پانی کا ریلا انہیں بہا کر لے جاتا۔ تاریکی میں لوگ اپنے اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو آوازیں دیتے۔ بارش تھم جاتی تو لوگوں کا شور آہستہ آہستہ کم ہو جاتا۔ لوگ اب بستروں کی بجائے کیچڑ اور پانی میں بیٹھ کر آرام کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

دریا کے کنارے سلیم کے لیے ہر دِن حشر کا دِن اور ہر رات قیامت کی

رات تھی۔ سرپھروں کے گروہ میں سے جس نے آخری دم تک اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا، آٹھ آدمی شہید ہو چکے تھے۔ تین آدمیوں کو سخت بخار کی حالت میں دوسرے کنارے پہنچا دیا گیا تھا اور دو ہیضے کا شکار ہو چکے تھے۔

سلیم کے سامنے کسی خاص مورچے کی حفاظت نہ تھی۔ کیمپ پر حملہ ہوتا تو اس کے ساتھی وہاں لڑتے۔ آس پاس کسی قافلے پر حملے کی اِطّلاع ملتی تو وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کی حفاظت کے لیے جاتے۔ انہوں نے چار بار سکھوں کو پسپا کیا تھا اور پانچویں دفعہ وہ فیصلہ کُن حملے کی نیّت سے آئے تھے۔ شام کے چار بجے کوئی دو سو سواروں اور قریباً ایک ہزار پیدل سکھوں کا جتھا نصف دائرے میں دریا کی طرف بڑھا۔ حملہ آور کیمپ سے کوئی چار سو گز کے فاصلے پر رُک کر رائفلوں سے گولیاں برسانے لگے سلیم کے ساتھی ایک طرف چند چھکڑوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ بارود کی کمی کے پیشِ نظر سلیم نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ صرف ضرورت کے وقت فائر کر دیں۔ ایک گھنٹہ گولیاں برسانے کے بعد سکھ

"ست سری اکال" کے نعرے لگاتے ہوئے کیمپ پر ٹوٹ پڑے۔ سوار آگے تھا اور کرپانوں سے مسلح ہجوم ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ کیمپ اور ان کے درمیان کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ رہ گیا تو سلیم نے اپنے ساتھیوں کو فائر کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کوئی ایک منٹ کے اندر اندر تیس چالیس سواروں کو ڈھیر کر دیا لیکن حملہ آور لوٹنے کی بجائے آگے بڑھتے گئے۔ کیمپ سے ایک گروہ سمٹ کر چھکڑوں کے گرد جمع ہونے لگے اور سلیم اور اس کے ساتھیوں کے لیے فائر کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ مجبوراً چھکڑوں کی آڑ سے نکل کر ان کے اوپر چڑھ کر فائر کرنے لگے۔ سلیم کی چیخ و پکار سے بدحواس لوگوں کا ہجوم زمین پر لیٹ گیا۔ اب اس کے ساتھی چھکڑوں پر پڑے ہوئے ساز و سامان کی آڑ لے کر فائر کر رہے تھے لیکن اتنی دیر میں حملہ آور کیمپ پر دھاوا بول چکے تھے اور مسلمان لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مدافعت کر رہے تھے۔ بعض نوجوان جو گزشتہ لڑائیوں میں سکھوں کی کرپانیں اور برچھیاں چھین کر مسلح ہو چکے تھے۔ انہوں نے حملہ آوروں کا ایک گروہ آگے لگا رکھا تھا۔ سکھ سواروں کا ایک گروہ چھکڑوں کی طرف بڑھا لیکن گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں منتشر کر دیا۔ پیدل جتھا مسلمانوں

کے ساتھ اس طرح گتھم گتھا ہو چکا تھا کہ ان پر فقط اِکّا دُکّا فائر کیے جا سکتے تھے۔

عورتیں اور بچّے سراسیمہ ہو کر پانی میں اُتر گئے تھے۔ جوں جوں مرد دریا کی طرف ہٹ رہے تھے عورتیں دریا میں گہرے پانی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سکھوں کے ایک زبردست حملے نے چند آدمیوں کو دریا کے اندر دھکیل دیا۔ اور عورتیں چلّاتی آگے بڑھ کر دریا کے تیز دھارے میں چلی گئیں۔ بعض مرد اب مقابلہ کرنے کی بجائے انہیں ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں بھی بیشتر ایسے تھے جو تیرنا نہیں جانتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں اور بچّوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب رہے تھے۔ جو لوگ چھکڑوں کے ارد گرد زمین پر لیٹے ہوئے تھے کیمپ کے باقی لوگوں سے کٹ چکے تھے۔ بندوقوں سے مسلح آدمیوں کی گولیاں حملہ آوروں کو قریب آنے سے روک رہی تھیں۔ سکھوں کی ایک ٹولی ایک طرف کوئی سو گز دور زمین پر لیٹ کر ان پر فائر کرنے لگی۔

حملہ آوروں کے جتھے کا لیڈر ایک مُشکی گھوڑے پر سوار جنگ کے میدان

سے کوئی ڈیڑھ فرلانگ دور کھڑا تھا، اس کے دائیں اور بائیں دو اور آدمی کھڑے تھے۔ برچھیوں اور تلواروں سے مسلح مسلمانوں کا گروہ سکھوں کی ایک ٹولی کو دھکیلتا ہوا جتھے دار سے کوئی پچاس گز کے فاصلے تک لے گیا۔ جتھے دار گھوڑا آگے بھگا کر چلّایا۔ ”بے غیرتو! تمہیں پیچھے ہٹتے شرم نہیں آتی۔“ سکھوں نے پلٹ کر جوابی حملہ کیا اور تھوڑی دیر میں سواروں کی ایک ٹولی میدان سے نکل کر مسلمانوں کے عقب میں پہنچ گئی۔ مسلمان اپنے پیچھے کئی لاشیں چھوڑنے کے بعد ایک جگہ سے سواروں کا گھیرا توڑ کر دوبارہ اپنے رہے سہے ساتھیوں سے آ ملے۔

سلیم کے اکثر ساتھی اب اپنی اپنی بندوقوں کا آخری راؤنڈ چلا چکے تھے۔ سلیم نے اپنا آخری راؤنڈ چلانے کے بعد ٹامی گن اپنے پاس لیٹے ہوئے آدمی کے سپرد کی اور تھیلے سے پستول نکال کر چھکڑے سے اُترا اور زمین پر رینگتا ہوا دوسرے چھکڑے پر داؤد کے پاس پہنچا۔ داؤد کے قریب لیٹا ہوا آدمی سر میں گولی لگنے سے شہید ہو چکا تھا اور اس کے ارد گرد سامان کی پیٹیاں اور بوریاں گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھیں۔ داؤد کی پیشانی پر خون کی

لکیر دیکھ کر سلیم نے کہا۔ ”داؤد تم زخمی ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”گولی میری کھوپڑی کے اوپر سے پھسل گئی ہے۔ مجھے معمولی خراش آئی ہے۔“

سلیم نے کہا۔ ”داؤد! میری بارود ختم ہو چکی ہے، صرف پستول کی چند گولیاں ہیں۔“

داؤد نے کہا ”میرے پاس شاید دو راؤنڈ اور ہوں گے۔“

سلیم نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دستی بم نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو!“

ایک گولی آئی اور سلیم کے کان سے مس کرتی ہوئی گزر گئی۔

داؤد چلّایا۔ ”اپنا سر نیچے کر لو!“

سلیم نے سر نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو داؤد جلدی کرو!“

داؤد نے اس کے ہاتھ سے دستی بم لے لیا اور سلیم چھکڑے سے اُتر کر نیچے لیٹے ہوئے آدمیوں کے درمیان چلا گیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" داؤد نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

سلیم نے جواب دیا۔ "باتوں کا وقت نہیں۔"

سلیم نے رینگتے ہوئے ایک آدمی کے پاس پہنچ کر اس کے سر سے پگڑی اتروائی اور جلدی سے اپنا سر اور نصف چہرے کے گرد لپیٹ کر سکھوں کی طرح ڈھاٹا باندھ لیا۔ پھر اپنی شلوار کے پائنچے گھٹنوں سے اوپر چڑھانے کے بعد وہ اُٹھا اور پوری رفتار کے ساتھ بھاگتا ہوا دست بدست لڑائی کرنے والے ہجوم میں جا گھُسا۔ ایک طرف سواروں کی ٹولی پر چھیوں اور نیزوں سے مسلمانوں کو دریا کی طرف دھکیل رہی تھی۔ سلیم نے ایک زخمی سکھ کی برچھی اُٹھائی اور ایک سوار کے عقب میں پہنچ گیا۔ جب سکھ سوار ایک گرے ہوئے مسلمان پر جھک کر برچھی کا وار کر رہا تھا، سلیم نے آگے بڑھ کر پوری قوّت کے ساتھ اس کی کمر میں برچھی ماری اور اسے دھکیل کر برچھی سمیت ایک طرف لڑھکا دیا۔ سوار کی برچھی نیچے پڑے ہوئے مسلمان کو لگنے کی بجائے ریت میں دھنس کر رہ گئی۔ سلیم نے بجلی

کی سی تیزی کے ساتھ بد حواس گھوڑے کی باگ پکڑلی اور کود کر اُس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک اور سکھ سوار ایک مسلمان پر نیزے سے حملہ کر رہا تھا اور وہ اپنی لاٹھی سے اس کے وار روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلیم نے جلدی سے ریت میں دھنسی ہوئی برچھی نکالی اور گھوڑے کو آگے بڑھا کر سکھ کی پسلی میں گھونپ دی۔ اس کے بعد اس نے ایک لمحہ کے توقّف کے بغیر گھوڑے کی باگ موڑ کر ایڑ لگائی اور میدان سے باہر نکل آیا۔ اس کا رُخ اس طرف تھا جہاں جتھے دار پنتھ کا جھنڈا لیے کھڑا تھا۔ سلیم بھاگتے ہوئے گھوڑے کی گردن کے ساتھ سر لگائے کبھی زین سے ایک طرف اور کبھی دوسری طرف اس انداز سے لڑھک رہا تھا کہ جن سکھوں نے اسے دیکھا بھی وہ یہی سمجھے کہ ان کا کوئی زخمی ساتھی ہے۔

گھوڑے کو دُور سے دیکھ کر جتھے دار نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یہ تو مہاراج سنگھ کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے۔۔۔" ارے وہ زخمی ہے گھوڑا روکو!"

جتھے دار کے دو ساتھی آگے بڑھ کر گھوڑے کو چمکارنے لگا لیکن سلیم ان

سے کترا کر آگے نکل گیا اور سیدھا جتھے دار کی طرف بڑھا۔ جتھے دار نے پریشان ہو کر اپنا گھوڑا ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی لیکن سلیم نے اچانک اپنا سر اٹھایا، ایک ہاتھ سے باگ موڑ کر گھوڑے کا رُخ دوبارہ جتھے دار کی طرف کیا اور دوسرے ہاتھ سے برچھی اُس کی طرف سیدھی کر دی۔ جتھے دار نے جھنڈا اچھینک کر اپنا پستول نکالا لیکن اتنی دیر میں سلیم کی برچھی اس کے سینے کے آر پار ہو چکی تھی۔ بدحواس گھوڑا جتھے دار کی تین من کی لاش لے کر ایک طرف بھاگا۔ اس کا ایک پاؤں رکاب میں پھنسا ہوا تھا اور سر زمین سے رگڑ کھا رہا تھا۔ سلیم نے اوپر سے چکر کاٹتے ہوئے اس کے گھوڑے کو گھیرا اور اس کا رُخ ہجوم کی طرف پھیر دیا۔ جتھے دار کا ایک ساتھی ِگرا ہوا جھنڈا اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلیم نے گھوڑا موڑ کر پستول نکالا اور اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ دوسرا آدمی پوری رفتار سے اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگتا ہوا یہ کہہ رہا تھا۔ ”جتھے دار مارا گیا۔ جتھے دار مارا گیا۔“ سکھ جن میں سے بعض اب چیختی چلّاتی لڑکیوں کو اُٹھا اُٹھا کر گھوڑوں پر ڈال رہے تھے، اس کی طرف اس وقت متوجّہ ہوئے جب بدحواس گھوڑا بھاری بھر کم لاش کو گھسیٹتا ہوا ہجوم کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ پانی کی

ایک کھائی پر سے کودتے ہوئے رکاب ٹوٹ گئی اور کیچڑ سے لت پت لاش زمین پر آ رہی۔

"جتھے دار مارا گیا۔ جتھے دار مارا گیا۔" آن کی آن میں یہ خبر میدان میں ہر سکھ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔۔۔۔ سلیم گھوڑا بھگاتا ہوا سکھیوں کے ہجوم کے قریب سے گزرا تو جتھے دار کا ساتھی چلّایا۔ "وہ دیکھو، وہ جا رہا ہے۔ جتھے دار کو اس نے مارا ہے۔" لیکن ہر سکھ اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ جتھے دار کا ساتھی محسوس کر رہا تھا کہ اس ہنگامے میں اس کی آواز صرف اس کے اپنے کانوں کو متاثر کر رہی ہے۔

شام ہو رہی تھی۔ مسلمانوں نے آخری بار پوری قوّت سے حملہ کیا اور سکھوں کو پیچھے ہٹانے لگے۔ بعض سکھ جو جتھے دار کی موت سے بہت زیادہ بدحواس تھے، میدان سے ایک طرف نکل کھڑے ہو گئے۔ رائفلوں سے مسلح سکھوں نے مدِّ مقابل سے اپنی گولیوں کا جواب نہ پا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

سلیم اوپر سے چکر لگا کر سرپٹ گھوڑے پر بُلند آواز میں یہ کہتا ہوا اُن کے

قریب سے گزر گیا۔ ”جتھے دار مارا گیا۔ پاکستانی فوج آ گئی۔۔۔ بلوچ رجمنٹ گھیر اڈال رہی ہے۔“

اپنے باقی ساتھیوں کو عین فتح کے وقت پیچھے ہٹتا دیکھ کر یہ گروہ پہلے ہی پریشان ہو رہا تھا۔ اب لیڈر کی موت کے ساتھ پاکستانی فوج کی آمد کی خبر سنی تو ان میں سے بعض آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کھسکنے لگے۔ سکھوں کو پسپا کرنے کے لیے اب آخری ریلے کی ضرورت تھی۔ اچانک ایک طرف سے گھوڑوں کی ٹاپ اور اس کے ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی پندرہ بیس آدمیوں کی ٹولی گھوڑوں پر نمودار ہوئی۔ سوار مار دھاڑ کرتے ہوئے میدان کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک جا پہنچے، ان کے پیچھے ایک پیدل گروہ نمودار ہوا۔

سلیم نے اپنا ڈھاٹا اُتار کر پھینک دیا اور گھوڑے سے چھلانگ لگاتے ہوئے چھکڑوں کے اِرد گرد لیٹے ہوئے آدمیوں کے پاس پہنچ کر کہا۔ ”دُشمن بھاگ رہا ہے۔۔۔ آج پھر خدا نے تمہاری سُن لی ہے۔ حملہ کر دو!“

وہ لوگ جنہیں تھوڑی دیر پہلے سو فیصدی اپنی موت کا یقین تھا۔ ایک نئی

اُمّید، نئے عزم او نئی قوّت کے ساتھ میدان میں پڑے ہوئے زخمیوں کے ہتھیار اُٹھا کر حملے کر رہے تھے۔۔۔ میدان خالی ہو گیا۔ سواروں کا دستہ ایک میل تک سکھوں کا پیچھا کرنے کے بعد واپس آیا تو سلیم کو معلوم ہوا کہ اس نئے گروہ کا لیڈر امیر علی ہے۔ امیر علی نے سلیم کو دیکھتے ہی کہا۔ ”بھائی! ہمیں بزدلی کا طعنہ نہ دینا۔ ہم نے تین حملے پسپا کیے۔ اب ہماری بارود ختم ہو چکی ہے۔ میں ایک گوردوارے سے آٹھ سو کارتوس اور دو رائفلیں چھین کر لایا تھا لیکن اب میرے پاس صرف دو کارتوس رہ گئے ہیں۔“

”عورتوں کا کیا حشر ہوا؟“

”وہ بھی آ گئی ہیں۔ ہم نے گولیوں کی آواز سُن کر انہیں چند آدمیوں کے ساتھ تھوڑی دور پیچھے دریا کے کنارے بٹھا دیا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس کتنی بارود ہے؟“

سلیم نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر پستول کی چند گولیاں نکالتے ہوئے کہا۔ ”صرف یہ! میرے باقی ساتھیوں کی بارود بھی تقریباً ختم ہو چکی

ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "میرے پاس شاید اسٹین گن کی کچھ گولیاں ہیں۔"

ایک اور آدمی نے کہا۔ "میرے پاس چار گولیاں باقی ہیں۔"

باقی سب خالی ہاتھ تھے۔ امیر علی نے مایوس ہو کر کہا۔ "وہ اب زیادہ تیّاری کے ساتھ واپس آئیں گے۔ ہمیں ہر قیمت پر بارود حاصل کرنا پڑے گی۔"

سلیم نے کہا۔ "امیر علی! آگر یہاں ہمارا مشن ختم نہیں ہو گیا تو خدا نئے وسائل پیدا کر دے گا۔"

☆☆☆☆☆

آدھی رات تک کیمپ کے لوگ ریت کے گڑھے کو دھو کر شہیدوں کو دفن کرتے رہے۔ شہیدوں کی تعداد سات سو سے اوپر تھی اور زخمیوں کی تعداد اس سے قریباً ڈیڑھ گنا زیادہ تھی۔ دریا میں کود کر ڈوبنے والی عورتوں اور لڑکیوں اور بچوں کی تعداد کا اندازہ پانچ سو کے لگ بھگ تھا اور قریباً ڈھائی سو آدمی انہیں بچانے کی کوشش میں ڈوب چکے تھے۔ سواروں

کی ایک ٹولی پندرہ کے قریب لڑکیاں چھین کر اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

حملوں کے دوران میں ملّاحوں کو دوسروں سے زیادہ اپنی جانوں اور اپنی کشتیوں کی فکر ہوئی۔ چند دِن قبل سکھوں نے کیمپ پر اس وقت حملہ کیا تھا جبکہ ملّاح اپنی کشتیوں پر سواریاں لاد چکے تھے۔ دو کشتیاں جتھے کی آمد سے پہلے پہلے دوسرے کنارے کی طرف نکل گئیں لیکن تیسری کشتی پر ملّاحوں کی چیخ پکار کے باوجود بد حواس انسانوں کا ایک ہجوم ٹوٹ پڑا۔ ہر آدمی اپنے اپنے گھر کی عورتوں کو کشتی میں گھُسیڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ عورتیں، مریض اور زخمی جو پہلے سوار ہوئے تھے، کشتی پر نئے حملہ آوروں کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ کشتی کمر کے برابر پانی میں رکی ہوئی تھی اور بوجھ سے اس کے کنارے پانی کی سطح کو چھُو رہے تھے۔ جو لوگ نیچے کھڑے تھے۔ وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کشتی کے ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوئی کشتی کے سواروں کے ہاتھ، کوئی ان کے گریبان اور کوئی ان کے پاؤں کے ساتھ لٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر شخص دوسرے کو سمجھا رہا تھا لیکن سب کہنے والے تھے، سُننے والا کوئی نہ تھا۔ کشتی کے دو

ملّاح لوگوں کو دھکے دے دے کر پیچھے ہٹا رہے تھے۔ کسی نے بدحواسی کی حالت میں ایک ملّاح کا گھٹنا پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ ملّاح جھک کر اس کی کلائیاں مروڑ رہا تھا کہ دوسرا آدمی ملاح کے بازو کے ساتھ لپٹ گیا اور ملّاح سر کے بل پانی میں آ رہا۔ اس افراتفری میں بعض آدمی کشتی کو دھکیلتے ہوئے گہرے پانی میں لے گئے۔ ایک لہر آئی اور کشتی کناروں تک پانی سے بھر گئی اور دوسری لہر کے ساتھ پانی میں ڈوب گئی۔

اس حادثہ کے بعد ملّاح کشتیاں کمر کے برابر پانی سے آگے نہیں لاتے تھے۔ آج بھی وہ جتھے کی آمد کے آثار دیکھتے ہی اپنی کشتیاں واپس لے گئے تھے اور حملے کی شدّت کے پیشِ نظر انہیں اُمّید نہ تھی کہ وہ دوبارہ واپس آ کر کسی زندہ انسان کو دیکھیں گے۔ دو ملّاحوں نے اپنی کشتیاں چند میل دور ایک اور کیمپ کے پاس لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جب سکھ پسپا ہوئے تو وہ اپنے دلوں میں ایک نیا ولولہ محسوس کر رہے تھے۔ فقیر دین نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور باقی ملّاح اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنی اپنی کشتیوں پر دوسرے کنارے کا رُخ کر رہے

تھے۔

جب سلیم زخمیوں، عورتوں اور بچّوں کو کشتیوں پر سوار کرانے میں مصروف تھا، امیر علی نے داؤد کا ہاتھ پکڑا اور اسے چند قدم ایک طرف لے جاکر سوال کیا۔ ”داؤد! اب کیا ہو گا؟“

”یہاں حملوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔“ داؤد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”لیکن بارود کے متعلّق تم نے کیا سوچا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ اب ہم نے کئی دِنوں سے سوچنا ترک کر دیا ہے۔ صرف سلیم سوچا کرتا ہے اور اب شاید وہ بھی سوچنا چھوڑ دے۔“

امیر علی نے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تمہارے پاس اسٹین گن کی کچھ گولیاں ہیں۔“

”ہاں!“

”وہ مجھے دے دو۔ مجھے ایک جگہ سے اسلحہ ملنے کی اُمّید ہے۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ ہمیں رائفل کی چند گولیاں بھی مل سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک دستی بم بھی ہے۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟“

”ابھی!“

”گھوڑوں پر؟“

”ہاں!“

”چلو!“

امیر علی نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”سلیم سے اجازت لینے کی اجازت ہو گی؟“

”اسے مت بتاؤ۔ وہ ہمیشہ خطرے میں اپنے ساتھیوں سے آگے رہنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”آؤ!“

☆☆☆☆☆

علی الصبح نماز کے بعد سلیم نے داؤد کو غیر حاضر پا کر اس کے متعلّق اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ ایک آدمی نے اسے بتایا کہ میں نے رات کے وقت داؤد اور امیر علی کو گھوڑوں پر سوار ہو کر کیمپ سے نکلتے دیکھا ہے۔ ایک اور ساتھی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ''میرے پاس رائفل کی جو گولیاں بچی ہوئی تھیں، وہ داؤد نے مجھ سے لے کر اپنے ساتھی کو دے دی تھیں۔ میں نے پوچھا تم کہاں جا رہے ہو؟ لیکن اس نے یہی جواب دیا کہ میں واپس آ کر بتاؤں گا!''

سلیم نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''مجھے معلوم ہے، وہ کہیں سے بارود حاصل کرنے گئے ہیں۔''

ایک آدمی نے کہا۔ ''اگر کہیں سے تھوڑی بہت لے بھی آئے تو ہم ایک یا دو حملوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اس شکست کے بعد ان کا تازہ حملہ یقیناً زیادہ شدید ہو گا۔ ہمیں ان لوگوں کی فکر کرنی چاہیے۔ جتنے آدمیوں کو کشتیاں روزانہ نکالتی ہیں، اس سے زیادہ نئے آدمی آ جاتے ہیں۔ بیماری زور پکڑ رہی ہے۔ راشن ختم ہو رہا ہے۔ اگر چند دِن تک حملہ نہ بھی ہوا تو بھی جو

بیماری سے بچ جائیں گے، وہ بھوک سے مر جائیں گے۔"

سلیم نے کہا۔ "پرسوں پاکستانی سپاہیوں کی حفاظت میں ہزاروں آدمیوں کا قافلہ پل پر سے گزر گیا، اوپر والے کیمپ کے لوگ بھی اس میں شامل ہو کر نکل گئے لیکن ہمیں بر وقت اطلاع نہ مل سکی۔ اب ہمیں مسلمان سپاہیوں کی حفاظت میں آنے والے کسی نئے قافلے کا انتظار کرنا پڑے گا۔۔۔ جونہی پل محفوظ ہو، وہاں پہنچ جانا چاہیے۔۔۔ غلام علی! تم ابھی صادق کے ساتھ روانہ ہو جانا۔ دیکھو اگر اپنے گھوڑوں میں سے کوئی آس پاس چر رہا ہے تو لے جاؤ ورنہ امیر علی کے آدمیوں سے دو گھوڑے لے لو۔ دوسرا کنارا محفوظ ہے۔ اس لیے تم یہیں سے دریا عبور کر کے پل کی دوسری طرف جاؤ اور ہمیں وہاں کے حالات سے باخبر رکھو۔ اگر مسلمان فوج کا کوئی افسر ملے تو اسے بتاؤ کہ اس پل پر مستقل پہرے کی ضرورت ہے۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اُدھر دیکھیے، شاید وہ آرہے ہیں!"

سلیم کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ اسے تین فرلانگ کے فاصلے پر دھان کے کھیتوں میں ایک سوار دکھائی دیا۔ گھوڑا معمولی رفتار سے آرہا تھا۔ سلیم نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنا سر جھکا لیا۔ سوار نے قریب آکر گھوڑا روکا۔ لوگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ امیر علی تھا اور اس کی گود میں ایک لاش تھی۔ داؤد کی لاش۔۔۔۔!

لوگوں نے لاش کو اُتار کر زمین پر ڈال دیا۔ امیر علی نیم خوانی کی حالت میں گھوڑے سے اُتر کر ایک لمحہ زین کے ساتھ سینہ لگائے کھڑا رہا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”امیر علی! امیر علی!!“

امیر علی کچھ کہے بغیر دو قدم پیچھے ہٹا اور لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اس کا قمیص خون میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی دھاڑیں مارتی ہوئی آگے بڑھی اور امیر علی کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ سلیم نے داؤد کی طرف دیکھا۔ اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی تھا۔

انا اللہ و انا الیہ راجعون

کہہ کر وہ امیر علی کی طرف متوجّہ ہوا اور ہجوم کو اِدھر اُدھر ہٹا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد سلیم نے جلدی سے اس کی قمیض اُٹھا کر دیکھی۔ اس کے پیٹ اور سینے میں گولیوں کے تین زخم تھے۔ سلیم نے دوبارہ نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس کی آنکھیں کھول کر دیکھیں اور ارد گرد جمع ہونے والوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ’’اس کا یہاں تک پہنچنا بھی ایک معجزہ تھا۔‘‘

جب آدمی دریا کے کنارے سے ذرا دور ہٹ کر قبریں کھود رہے تھے، امیر علی کی نوجوان بیوی سب کو یہ سمجھا رہی تھی۔ ’’وہ نہیں مرا، وہ زندہ ہے۔ تم سب پاگل ہو گئے ہو۔ خدا کے لیے اسے اچھی طرح دیکھو۔ تمہیں کیا ہو گیا۔ تم زندوں کو دفن کر رہے ہو۔‘‘ وہ سلیم کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی اپنے شوہر کی لاش کے پاس لے گئی۔ ’’بھائی! تم اچھی طرح دیکھو، یہ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ یہ زندہ ہے، میرا شوہر زندہ ہے۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا۔‘‘

’’تم ٹھیک کہتی ہو میری بہن۔ وہ زندہ ہے۔ شہید مرا نہیں کرتے۔‘‘

جب داؤد اور امیر علی کو دفن کر دیا گیا تو سلیم کچھ دیر بے حس و حرکت ان کی قبروں کے پاس کھڑا رہا۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”داؤد آپ کا بھائی تھا؟“

”داؤد اور امیر علی دونوں میرے بھائی تھے۔“ سلیم یہ کہہ کر قبروں کے پاس ایک جھاڑی کے نیچے نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا۔

مصیبتوں اور مایوسیوں کے مقابلے میں مدافعت کی وہ قوّت جسے اس نے چند دِنوں سے گرتی ہوئی صحت کے باوجود قائم رکھا تھا اب دم توڑ رہی تھی۔ گزشتہ چار دونوں سے اسے ہلکا ہلکا بخار ہوتا تھا۔ تاہم اجتماعی احساس کی شدّت نے اسے جسمانی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیا۔ اگر کشتیاں کنارے پر آتیں تو لوگ پار پہنچنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور افراتفری مچ جاتی۔۔۔ سلیم کو ہجوم پر قابو پانے کے لیے کئی کئی گھنٹے کنارے پر کھڑا رہنا پڑتا۔ وہاں سے اطمینان ہوتا تو وہ مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری کرتا۔ عشاء کی نماز کے بعد آدھی رات تک وہ کیمپ میں چکّر لگاتا۔ پہریداروں کو ہوشیار رہنے کی

تاکید کرتا۔ کھانے کے وقت بھی اپنا پیٹ بھرنے کی بجائے اس کی یہ خواہش ہوتی کہ کوئی بھوکا نہ رہے۔ پھر اسے جب یہ اطلاع ملتی کہ آس پاس کے کسی کیمپ یا قافلے پر حملہ ہوتا تو وہ مسلح ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ جاتا۔ داؤد اسے اکثر کہا کرتا تھا۔ ”سلیم! تم آرام کرو۔ تمہاری صحت گِر رہی ہے۔ تمہارا رنگ زرد ہو رہا ہے۔“لیکن وہ جواب دیتا۔ ”بھائی! میں ٹھیک ہوں تم میری فکر نہ کرو۔“

اور آج وہ داؤد کی قبر کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ”کاش! آج داؤد مجھے یہ کہتا۔ سلیم! تم لیٹ جاؤ۔۔۔۔ اسے شدّت کے ساتھ اپنی تنہائی اور بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔“

ایک شخص کھانا لے کر آیا لیکن اس نے کہا۔ ”مجھے بھوک نہیں۔“ اور زمین پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو رہا تھا۔ نیند کی حالت میں وہ وقت اور بعد کے پردوں کو اُٹھاتا ہوا شاہراہِ حیات کے اس کنارے پہنچ چکا تھا جہاں ماضی کی مُسکراہٹیں دفن تھیں۔۔۔ وہ داؤد، مجید، جلال اور بشیر کے ساتھ گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں کھیل رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ درختوں

میں پرندوں کے گھونسلے تلاش کر رہا تھا۔ وہ چمکتے ہوئے پروں والے موروں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ رنگا رنگ کے پھولوں کے گلدستے بنا رہا تھا۔ پھر وہ اپنے خاندان کے بچّوں کے ساتھ جھولا جھول رہا تھا۔ گھر کی عورتوں کے درمیان بیٹھا انہیں کہانیاں سُنا رہا تھا۔ آخر یہ منظر قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح روپوش ہوتے گئے۔ پھر وہ چچا اسماعیل کے قہقہے سُننے لگا۔ یہ خوش گوار قہقہے بُلند اور مہیب ہوتے گئے۔۔۔۔ اسماعیل کے ارد گرد اچانک آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ شعلے بُلند ہوتے گئے۔ اب اس کے ارد گرد سینکڑوں مرد، عورتیں اور بچّے قہقہے لگا رہے تھے۔ آگ کے شعلوں نے اُنہیں چھپا لیا لیکن قہقہے اسی طرح سنائی دیتے رہے۔

”سلیم! سلیم!!“ کسی نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”سلیم نے آنکھیں کھولیں اور اچانک اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند مرد اور عورتیں اس کے گرد جمع تھے۔ ایک شخص کے پانی کا کٹورا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیجیے آپ پانی مانگ رہے تھے۔“

سلیم کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے کٹورا لے کر منہ سے لگایا اور پانی پینے

کے بعد دوبارہ زمین پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ”میں نے خواب میں پانی مانگا ہو گا!“ ایک سفید ریش آدمی نے سلیم کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! تمہیں بخار ہے، چلو میں تمہیں اپنے گھوڑے پر لے چلتا ہوں۔“ یہ امیر علی کا چچا تھا۔

سلیم نے اس سے پوچھا۔ ”کہاں لے چلتے ہیں آپ مجھے؟“

امیر علی کے چچا نے جواب دیا۔ ”ہم پُل کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ کا آدمی بلوچ رجمنٹ کے چار سپاہی لے کر پہنچ گیا ہے۔“

اپنے اِرد گرد جمع ہونے والے آدمیوں میں غلام علی اور اس کے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے ایک حوالدار کو دیکھ کر سلیم دوبارہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

غلام علی نے کہا۔ ”ہمیں پُل پر پہنچتے ہی یہ مل گئے تھے۔“

حوالدار نے کہا۔ ”ہمارے کپتان صاحب نے حکم دیا ہے کیمپ کے لوگ شام سے پہلے پل پر پہنچ جائیں۔ وہ ایک قافلہ لینے کے لیے چلے گئے ہیں اور انہوں نے ہمیں آپ کی حفاظت کے لیے بھیج دیا ہے۔ آپ لوگ

جلدی چلیں۔"

ایک گھنٹے کے بعد تقریباً دس ہزار انسانوں کا قافلہ پل کی طرف کوچ کر رہا تھا لیکن ڈیڑھ ہزار کے قریب بیمار، بوڑھے، اپاہج اور زخمی جن کا پیدل چل کر پل تک پہنچنا دشوار تھا، مایوسی سے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ بعض کے عزیز انہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے لیکن سلیم نے انہیں اطمینان دِلایا کہ وہ کل صبح تک پار پہنچا دیے جائیں گے، آپ لوگ پل عبور کرنے کے بعد انہیں وہاں سے لے جائیں۔ سلیم کے مشورے پر اس کے ساتھیوں نے بعض عورتوں اور بچّوں کو سواری کے لیے اپنے گھوڑے دے دیے۔ بہت سے نوجوان سلیم کو بخار کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ عورتیں بھی اپنے محسن کو ساتھ لے جانے پر مصر تھیں لیکن سلیم اپنی ضد پر قائم رہا۔ اپیلوں اور التجاؤں کے جواب میں اس کا پہلا اور آخری جواب یہی تھا کہ "جب تک یہ کیمپ خالی نہیں ہوتا، میں یہیں رہوں گا۔"

غلام علی، صادق اور چار اور آدمی جنہوں نے مرتے دم تک سلیم کا ساتھ

دینے کا عہد کیا تھا، وہیں رہے۔ رخصت سے پہلے حوالدار نے سلیم سے کہا۔ ”میں آپ کے متعلّق بہت کچھ سُن چکا ہوں۔ آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے لیکن اب آپ ہمارے ساتھ چلیے! میں کپتان کی اجازت کے بغیر آپ کی جگہ اپنے دو آدمی چھوڑنے کے لیے تیّار ہوں۔“

سلیم نے کہا۔ ”آپ کے آدمیوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ اگر آپ ہمارے لیے کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو ہمیں بندوق کے چند راؤنڈ دے دیجئے۔“

حوالدار نے کچھ کہے بغیر اپنی پیٹی سے چند راؤنڈ نکال کر سلیم کو دے دیے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید کی اور ساٹھ ستّر گولیاں جمع کر کے سلیم کو پیش کر دیں۔

حوالدار نے کہا۔ ”یہ بارود بہت تھوڑی ہے۔ آپ جلد از جلد باقی آدمیوں کو پار پہنچانے کی کوشش کریں۔ اگر مجھے اجازت ملی تو میں خود یہاں آنے کی کوشش کروں گا۔“

سلیم نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں۔“ حوالدار نے کہا۔ ”میں ایک مسلمان ہوں اور جو کچھ آپ نے ان لوگوں کے لیے کیا ہے اس کے بعد آپ مجھے حکم دے سکتے ہیں۔“

سلیم نے کہا۔ ”آپ ہماری فالتو بندوقیں لے جایئے! اب شاید ہم ان کی حفاظت نہ کر سکیں۔ ہم نے ان میں سے ایک ایک کے بدلے کئی کئی جانیں دی ہیں۔ انہیں قوم کی امانت سمجھے۔ قوم کو اب ان چیزوں سے زیادہ کسی شے کی ضرورت نہیں۔“

جب قافلہ روانہ ہو گیا تو سلیم نے آگے بڑھ کر دریا کے کنارے ملّاحوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”بھائیو! اب تمہاری آخری دوڑ ہے۔ میں جانتا ہوں تم تھک گئے ہو۔ ہم سب تھک گئے ہیں۔“ سلیم یہ کہ کر زمین پر لیٹ گیا۔

صادق نے آگے بڑھ کر سلیم کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”غلام علی! یہ بخار سے جل رہے ہیں۔ انہیں پار پہنچا دیں۔“

سلیم بولا۔ ”نہیں! نہیں! تم ان لوگوں کی فکر کرو، میں ٹھیک ہوں۔ تم کام کرو۔ لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرو۔ اناج کی خالی بوریاں ریت سے بھر لو اور کنارے سے تھوڑے دور تین چار مورچے بنالو۔“

غلام علی اور صادق علی نے اُٹھا کر سلیم کو ایک جھاڑی کے سائے میں ڈال دیا اور مورچے بنانے میں مشغول ہو گئے۔

فقیر دین ملّاح اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ ”بھائیو! آج ہمارا امتحان ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ جب تک یہ لوگ پار نہیں پہنچ جاتے، مجھ پر نیند حرام ہے۔“ آدھی رات تک ملّاح ایک ہزار آدمیوں کو نکال چکے تھے۔ بعض آدمی قافلے کے ساتھ پُل عبور کرنے کے بعد اپنے اپنے عزیزوں کو لینے کے لیے دوسرے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اب کوئی پانچ سو آدمی باقی تھے اور ملّاحوں کو یہ یقین تھا کہ وہ تیسرے پہر تک انہیں بھی پار پہنچا دیں گے۔ لیکن بارہ بجے کے قریب ڈیڑھ سو مسلمانوں کا ایک نیا قافلہ وہاں پہنچ گیا اور انہوں نے اطلاع دی کہ سکھوں کا جتھا اُن کے تعاقب میں آرہا ہے۔ انہوں نے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نالہ کرن عبور

کیا تھا اور راستے میں زخمیوں اور شہیدوں کو چھوڑتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ وہ ملّاح جو اس کنارے پر تھے، یہ اطلاع ملتے ہی کشتیاں بھر کر واپس چلے گئے۔ فقیر دین نے سلیم کو لے جانے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا۔ ”نہیں! ابھی میرے ہاتھ بندوق چلا سکتے ہیں۔“

☆☆☆☆☆

ایک بجے کے قریب جب دوسرے کنارے پر بندوقوں کی تڑ تڑ سنائی دے رہی تھی تو تین آدمی بھاگتے ہوئے ملّاحوں کے پاس پہنچے۔ ان کی فوجی وردیاں دیکھ کر ملّاح ان کے گرد جمع ہو گئے۔

ایک نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہی پتن ہے۔“ پھر وہ ملّاحوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ ”ہمیں جلدی سے پار پہنچا دو۔“

ایک ملّاح نے جواب دیا۔ ”ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ تین آدمی وہاں جا کر کیا کر سکیں گے۔ آپ آئے بھی تو تین آدمی، اور وہ بھی دو رائفلوں کے ساتھ۔ اور وہاں شاید ایک پوری فوج گولیاں برسا رہی

ہے۔"

نوجوان نے کہا۔ "خدا کے لیے وقت ضائع نہ کرو۔"

نوجوان کے ایک ساتھی نے کہا۔ "کپتان صاحب! یہ اس طرح نہیں مانیں گئے۔ ان کے ساتھ ہمیں بات کرنے کی اجازت دیجیے۔"

فقیر دین ملّاح نے آگے بڑھ کر کہا۔ "بھائی صاحب! آپ ناراض نہ ہوں۔ کپتان صاحب کے سپاہی اس جگہ کی حالت دیکھ گئے تھے۔ وہاں صرف بیمار اور زخمی ہیں۔ وہ بارود کی چند گولیاں دے گئے تھے جن کی بدولت پانچ چھ آدمی جتھے کو روکے ہوئے ہیں۔ جب تک یہ پانچ چھ آدمی ڈٹے ہوئے ہیں، سکھ گولیاں برساتے رہیں گے۔ جب ان کی بارود ختم ہو جائے گی تو وہ چند منٹوں میں کیمپ کا صفایا کر دیں گے۔ کپتان صاحب کو اگر آنا تھا تو کچھ ساتھ لے کر آتے۔"

نوجوان نے کہا۔ "بھائی! میں سیدھا لاہور سے آرہا ہوں۔ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر جیپ کا راستہ نہیں تھا۔ ہمیں

وہاں سے پتہ چلا کہ فوج کیمپ کے آدمیوں کو نکال کر پل کی طرف لے گئی ہے اور جو آدمی رہ گئے ہیں، انہیں تُم لوگ کشتیوں کے ذریعے پاکستان لا رہے ہو۔ میں اپنے ایک عزیز کی تلاش میں آیا ہوں اور اس کے متعلّق میں جانتا ہوں کہ ہم آخری وقت تک وہاں ڈٹا رہے گا۔۔۔ میں سلیم کا عزیز ہوں۔ شاید تم میں سے کسی کو اس کا علم ہو۔"

سلیم کا نام سن کر بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ فقیر دین نے کہا۔ "کپتان صاحب! وہ بیمار ہے لیکن آپ ایک پہاڑ کو اُٹھا کر اس طرف لا سکتے ہیں، اُسے نہیں لا سکتے۔ اسے یہاں لانے کے لیے جتھے کو شکست دینا ضروری ہے۔"

نوجوان نے کہا۔ "میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ مجھے پار پہنچا دو۔ شاید اس کی جان بچا سکوں۔"

"آیئے!"

فقیر دین نے آگے بڑھ کر کشتی کا رسّا کھولا اور کپتان اور اس کے دو ساتھی

کشتی پر سوار ہو گئے۔ ابھی وہ کوئی دس گز دور گئے تھے کہ فقیر دین کو چاند کی دھندلی روشنی میں کنارے کے ساتھ آدمیوں کی ایک ٹولی دکھائی دی اور اس نے کہا۔ ”کپتان صاحب! شاید بلوچ رجمنٹ کے سپاہی آ رہے ہیں۔“

کپتان بولا۔ ”اب پیچھے مت دیکھو۔ جلدی پہنچو۔“

تھوڑی دور اور آگے جانے کے بعد فقیر دین کنارے سے اپنے ایک ساتھی کی آوازیں سُن رہا تھا۔ ”فقیر دین! فقیر دین! ٹھہرو! سپاہی آ گئے ہیں۔“

فقیر دین نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا۔ ”انہیں دوسری کشتی پر لے آؤ! میں اب منجدھار میں پہنچ چکا ہوں۔“

فقیر دین نے کچھ دور کشتی روک لی اور کہا۔ ”یہاں ران کے برابر پانی ہے۔ آپ یہاں اتر جائیں، میں کشتی کو تھوڑی دور نیچے روک کر آپ کا انتظار کرتا ہوں۔“

کپتان ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں دوائیوں کا تھیلا لیے کشتی سے اُتر پڑا۔

کیمپ کے مرد اور عورتیں کنارے پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان سے ذراہٹ کر تھوڑے فاصلے پر ریت کی بوریوں کے تین مورچے تھے۔ سامنے کوئی ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے حملہ آوروں کی بندوقیں آگ اُگل رہی تھیں اور مورچے میں بیٹھے ہوئے آدمی ان کی گولیوں کے جواب میں اِکا دُکا فائر کر رہے تھے۔

کپتان اور اس کے ساتھی ریت پر رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ کنارے پر لیٹے ہوئے مایوس انسان قدرے پُر اُمّید ہو کر لیٹے لیٹے ایک دوسرے کی طرف اشارے کرنے لگے۔ ایک آدمی کو غلط فہمی ہوئی اور اس نے جھپٹ کر کپتان کے ایک ساتھی کی رائفل کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہو؟“

سپاہی اس کی اس حرکت پر حیران ہو کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کپتان جو آگے جا چکا تھا، جلدی سے مُڑا اور بولا۔ ”بھائی! ہم دوسرے

کنارے سے آئے ہیں۔ اور دیکھو، دوسری کشتی پر فوج آرہی ہے۔"

لوگ دوسرے کنارے کی طرف دیکھنے لگے۔ آٹھ دس گز دور دُشمن کے مارٹر کا بم پھٹا۔ چند عورتوں اور بچّوں کی چیخیں سنائی دیں۔ بدحواس آدمی نے بندوق چھوڑتے ہوئے کہا۔ "بھائی! معاف کرنا، میں سمجھا تھا تم دُشمن کے آدمی ہو اور مورچے پر حملہ کرنے جارہے ہو۔"

کپتان نے ایک مورچے کے قریب پہنچ کر آواز دی۔ "سلیم! سلیم!!"

"کون ہے؟" ایک آدمی نے پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

کپتان نے کہا۔ "میں سلیم کو تلاش کر رہا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟"

"سلیم اس مورچے میں ہے۔" اس نے اپنے دائیں ہاتھ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم فوجی ہو! ٹھہرو! مجھے بھی بارود دیتے جاؤ!"

کپتان کے اشارے سے اس کا ایک ساتھی مورچے میں بیٹھ گیا اور کپتان دائیں ہاتھ دوسرے مورچے کی طرف بڑھا۔ ایک گولی اس کے سر کے بالوں اور دوسری بیٹی کے ساتھ چھوتی ہوئی گزر گئی۔

مارٹر کے دو گولے یکے بعد دیگرے چند قدم کے فاصلے پر پھٹے اور لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے ساتھی کے بازو میں پیوست ہو گیا۔

"سلیم! سلیم!" کپتان نے مورچے کے پاس پہنچ کر کہا لیکن سلیم کی بجائے کسی اور آدمی کی آواز سن کر اس کا دل بیٹھ گیا۔

"سلیم بے ہوش ہے۔ تم کون ہو۔۔۔؟" مورچے سے ایک آدمی نے کہا۔

کپتان جواب دیے بغیر آگے بڑھا۔ سلیم بوریوں کی آڑ میں لیٹا ہوا تھا۔ کپتان نے جلدی سے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ کب سے بے ہوش ہے؟"

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی، بم کا ٹکڑا اس کی ٹانگ پر لگنے سے زخم آ گیا ہے لیکن بے ہوشی کی وجہ زخم سے زیادہ اس کا بخار ہے۔ اسے صبح سے بہت تکلیف ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"میں بہت دور سے آیا ہوں۔"

"آپ نے کشتی پر دریا عبور کیا ہے؟"

"ہاں!"

"اگر کشتی واپس نہیں چلی گئی تو خدا کے لیے انہیں لے جایئے۔ ہماری بارود ختم ہونے والی ہے۔"

"میرے پاس کافی بارود ہے۔" کپتان کے ساتھی نے مورچے میں بیٹھ کر اپنی بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! اگر پچھلی کشتی پر فوج کے آدمی آرہے ہیں تو بہت جلد میدان خالی ہو جائے گا۔ اس وقت گولیوں کی بارش میں انہیں یہاں سے نکالنا خطرناک ہے۔"

مورچے میں بیٹھنے والے دو آدمیوں نے یک زبان ہو کر سوال کیا۔ "فوج آرہی ہے؟"

"ہاں!" کپتان نے جواب دیا اور سلیم کی رائفل اُٹھا کر مورچے میں بیٹھ گیا۔

مورچے سے ایک آدمی نے گھٹنوں کے بل ہو کر دریا کی طرف دیکھا اور

اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”کشتی نیچے جارہی ہے۔ وہ شاید دائیں بازو سے حملہ کریں گے۔“

پندرہ منٹ کے بعد فوج کے سپاہیوں نے فضا میں روشنی کا گولا پھینکا اور اس کے ساتھ ہی مارٹر کے چند گولے پھینک دیے۔ دو منٹ کے بعد سکھ یہ کہتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ ”فوج آگئی! فوج آگئی! بلوچ رجمنٹ آ گئی؟“

☆☆☆☆☆

اے قوم!

سلیم کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک صاف سُتھرے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا پایا۔ کمرے میں چھت کے ساتھ لٹکا ہوا بجلی کا بلب روشن تھا۔ کچھ دیر سکتے کے عالم میں بتّی کی طرف دیکھتا رہا۔ ”میں کہاں ہوں؟“ اس کے دل میں خیال آیا اور اس پُر سکون فضا میں کئی ہنگامے بیدار ہو گئے۔ انتہائی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں سلیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دماغ پر پھر غنودگی طاری ہو گئی۔ وہ عورتوں اور بچّوں کی چیخ پکار اور بندوقوں کی تراخ پڑاخ سُننے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آگ کے مہیب شعلے رقص کرنے لگے۔ آگ کے شعلوں میں اسے اپنے گاؤں اور اپنے خاندان کے بچّوں، عورتوں اور مردوں کی صورتیں نظر

آنے لگیں۔ پھر آگ آہستہ آہستہ بُجھ گئی اور یہ صورتیں غائب ہو گئیں۔ سلیم دوبارہ ہوش میں آ چکا تھا۔ لوگوں کی چیخ و پکار، بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور بموں کے شور کی بجائے وہ میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کی ٹک ٹک سُن رہا تھا۔ کچھ دیر وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ ”میں کہاں ہوں؟ میں کہاں ہوں؟“ یہ سوال اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا بستر ٹٹولا۔ ”یہ خواب نہیں ہو سکتا۔“ اس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ بائیں ہاتھ گاڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ سامنے کی دیوار میں دو کھڑکیاں کھُلی تھیں اور ان میں سے پھولوں سے لدی ہوئی بیل کی شاخیں نظر آ رہی تھیں۔ کھڑکی کے قریب ایک اسٹول پر مٹّی کی ایک صراحی اور شیشے کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ باہر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے باعث درخت کے پتّوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سلیم نے بائیں کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن دایاں بازو ہلانے سے اُسے تکلیف محسوس ہوئی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنا بازو ٹٹول کر دیکھا۔ اس پر پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ دریا کے کنارے اس نے آخری منظر خواب کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ جب حملہ ہوا تھا تو وہ غلام

علی اور صادق کے ساتھ مورچے میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر شاید اسے گولی لگی تھی۔۔۔ نہیں، شاید اس کے نزدیک بم پھٹا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ دریا کہاں ہے؟ میرے ساتھی کہاں ہیں؟ میں کہاں ہوں؟ اُف! میں شاید سکھوں کی قید میں ہوں لیکن یہ بستر، یہ کمرہ، یہ بجلی کی روشنی، سکھ تو لاشوں کو بھی مسخ کر دیتے ہیں۔ اگر میں ان کے ہاتھ آتا تو وہ مجھے زندہ کیوں چھوڑتے؟ اس نے اپنے دائیں بازو کو دوسرے ہاتھ کا سہارا دے کر آہستہ سے کروٹ بدلی۔ اسے میز کے ساتھ کرسی پر کوئی جانی پہچانی صورت دکھائی دی۔ اس کے سر میں پھر ایک بار چکر آنے لگے۔ اس دفعہ بے ہوشی کا دورہ بہت مختصر تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ ہوش میں آکر اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا۔ ''یہ خواب ہے۔ نہیں، یہ خواب نہیں۔'' میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی جس کی سوئیاں سوا چار بجے کا وقت دکھا رہی تھیں۔ دوسری میز پر دوائی کی شیشیاں اور ٹیکے کا سامان پڑا ہوا تھا۔ بجلی کا بلب روشن تھا۔ کھڑکی سے بیل نظر آ رہی تھی۔ درخت کے پتّوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور اپنے دائیں بازو میں تکلیف محسوس کر رہا تھا اور زندگی کی

ایک جیتی جاگتی حقیقت اس کے سامنے تھی۔۔۔۔ عصمت اس سے صرف دو بالشت دور آرام کرسی پر سو رہی تھی۔ کرسی کے ایک بازو پر اس کا ایک ہاتھ سلیم سے اس قدر قریب تھا کہ وہ اسے چھو سکتا تھا۔ ''عصمت! میری عصمت! میری زندگی! میری روح!'' وہ بولنا چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔۔۔۔ وہ محویت کے اس عالم میں تھا جہاں وقت کے قدم رُک جاتے ہیں۔

ساڑھے چار بج گئے۔ پانچ بج گئے اور پھر اچانک ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔ عصمت نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ جلدی سے الارم بند کیا اور پھر سلیم کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک اس کے دل و دماغ کی تمام حیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ پھر اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلی۔ ''اللہ تیرا شکر ہے۔ تیرا شکر ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔۔۔۔۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا۔ ''اللہ تیرا شکر ہے۔ میرے اللہ تیرا شکر ہے۔'' عصمت سسکیاں لے رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں عصمت، میں ٹھیک ہوں۔“ سلیم نحیف آواز میں کہہ رہا تھا۔ عصمت آنسو پونچھتی ہوئی کرسی سے اُٹھی اور میز سے تھرمامیٹر اُٹھا کر سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی: ”میں آپ کا ٹمپریچر دیکھ لوں، لیجیے!“

سلیم کے ذہن میں کئی سوالات تھے۔ عصمت نے اس کے منہ میں تھرمامیٹر لگا کر اسے خاموش کر دیا اور کوئی دو منٹ کے بعد عصمت نے تھرمامیٹر نکال کر دیکھتے ہوئے کہا:

”اب آپ کا ٹمپریچر ایک سو ایک ہے۔“

سلیم نے کہا۔ ”اگر یہ خواب نہیں تو مجھے بتایئے میں کہاں ہوں؟“

”ہم لاہور میں ہیں۔“

”لاہور! لیکن میں یہاں کیسے پہنچا؟“

”میں آپ کو انجکشن دے لوں، پھر آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔“ عصمت یہ کہہ کر انجکشن کا سامان تیّار کرنے لگی۔

"عصمت!"

عصمت نے مُڑ کر دیکھا۔ سلیم نے پھر کہا۔ "عصمت ٹھہرو۔ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاؤ!"

ان الفاظ میں ایک درخواست تھی۔ ایک التجا تھی۔ ایک حکم تھا۔ عصمت کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلیم نے کہا۔ "مجھے بتاؤ عصمت! میں یہاں کیسے پہنچا؟"

آپ کو بھائی ارشد لے کر آئے تھے۔ وہ دہلی سے یہاں پہنچتے ہی آپ کی تلاش میں چلے گئے تھے۔ بھائی جان نے آپ کو بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے نکالا تھا۔"

"لیکن ان کا کیا حشر ہوا؟ ان عورتوں اور بچّوں کا کیا ہوا؟ اور وہ زخمی اور بیمار لوگ؟" سلیم نے انتہائی کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔

عصمت نے کہا۔ "بھائی جان کہتے ہیں کہ وہاں مسلمان سپاہی پہنچ گئے تھے اور وہ سکھوں کے جتھے کو بھگانے کے بعد سب کو حفاظت سے نکال کر لے آئے تھے۔"

"فوج کے سپاہی! کاش یہ درست ہو۔" سلیم نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

"میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتی۔ آپ کے ساتھیوں میں سے بعض آپ کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ شاید آج بھی کوئی آئے۔ آپ ان سے پوچھ لیجیے۔"

سلیم نے سوال کیا۔ "مجھے یہاں آئے ہوئے کتنے دِن ہوئے؟"

عصمت نے جواب دیا۔ "گیارہ دِن۔"

"گیارہ دِن! میں گیارہ دِن سے یہاں پڑا ہوا ہوں؟"

"نہیں۔ آپ کو یہاں ساتواں دِن ہے۔۔۔ پہلے آپ ہسپتال میں تھے۔ آپریشن کے بعد آپ کو بھائی جان لے آئے تھے۔ وہاں کسی ڈاکٹر یا نرس کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔ زخمیوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔"

سلیم نے پوچھا۔ "ارشد کہاں ہے؟"

”ارشد اور ابّا جان بر آمدے میں سو رہے ہیں۔ وہ رات کو دو بجے کیمپ سے ڈیوٹی دے کر آئے تھے اور اب نماز پڑھتے ہی پھر چلے جائیں گے۔ کئی دِنوں سے ان کی یہی حالت ہے۔“

”تو میں گزشتہ سات دِن سے بے ہوش ہوں؟“

”جی ہاں! آپ کا بخار بہت تیز تھا۔ کل شام تک آپ کا ٹمپریچر ایک سو چار تھا۔ رات کے دو بجے جب بھائی جان نے دیکھا تھا تو آپ کا ٹمپریچر ایک سو تین سے ذرا نیچے تھا اور انہیں پہلی بار تھوڑا سا اطمینان ہوا تھا۔“

”آپ کو اتنے دِن بہت تکلیف ہوئی ہو گی!“

”تکلیف! مجھے تکلیف!“ عصمت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے چہرے پر مُسکراہٹ تیر رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ راحت آنکھیں ملتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور ٹائم پیس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”آپا جان! سوا پانچ بج گئے۔ آپ نے مجھے کیوں نہ جگایا۔ آج پھر ساری رات جاگی ہیں۔ جایئے! آرام کیجیے۔“

عصمت نے کہا۔ ”راحت اب یہ ہوش میں ہیں۔“

راحت نے آگے بڑھ کر سلیم کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ راحت سلیم سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ ہر روز سوچا کرتی تھی کہ جب سلیم کو ہوش آئے گا تو میں انہیں کئی واقعات بتاؤں گی۔ ان سے کئی سوالات پوچھوں گی۔ میں انہیں بتاؤں گی بھائی جان! آپ اتنے دِن بے ہوش رہے۔ آپ بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑایا کرتے تھے۔ آپ فلاں فلاں نام کے لوگوں کو آوازیں دیا کرتے تھے۔ فلاں دِن آپ نے سخت بخار کی حالت میں میری طرف دیکھ کر کہا تھا ”زبیدہ بھاگ جاؤ! انہوں نے مکان کو آگ لگا دی ہے۔ اور فلاں دِن جب بھائی جان آپ کی نبض دیکھ رہے تھے تو آپ کہہ رہے تھے۔۔۔ داؤد لیٹ جاؤ۔ تمہیں گولی لگ جائے گی۔ فلاں دِن عصمت ساری رات سجدے میں سر رکھ کر دعائیں مانگتی رہی۔ لاہور میں اتنے لاکھ انسانوں کے قافلے آ چکے ہیں۔ کیمپوں میں اتنے ہزار زخمی اور بیمار مر چکے ہیں۔ ہندوستان سے اتنی گاڑیاں آئی ہیں جن میں صرف لاشیں تھیں۔ میں ان سے کیمپ کے

حالات پوچھوں گی۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ آپ سے جدا ہونے کے بعد عصمت کی کیا حالت تھی۔ وہ کس طرح رو رو کر دعائیں مانگا کرتی تھی لیکن اب سلیم آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ خاموش کھڑی تھی۔

عصمت نے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ راحت!“ اور وہ ایک کرسی گھسیٹ کر عصمت کے قریب بیٹھ گئی اور قدرے توقّف کے بعد بولی۔ ”بھائی جان! اب آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”میں ٹھیک ہوں راحت۔“ سلیم نے جواب دیا۔

صُبح ہو رہی تھی۔ ارشد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ انگڑائی لینے کے بعد آگے بڑھا۔ راحت اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ارشد نے کہا۔ ”تم دونوں جاگ رہی ہو! اب بخار کچھ کم ہوا؟“

راحت بولی۔ ”بھائی جان! اب ان کو آرام ہے۔ یہ ہوش میں ہیں۔“

ارشد نے آگے بڑھ کر سلیم کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”عصمت! تم نے ٹمپریچر لیا ہے؟“

”ہاں بھائی جان! اب ایک سو ایک ہے۔ آپ انجکشن لگا دیں۔“ عصمت یہ کہتے ہوئے اُٹھی اور انجکشن کا سامان درست کرنے لگی۔

ارشد نے نبض دیکھنے کے بعد سلیم کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے سلیم؟“

سلیم نے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ دریا کے کنارے جو لوگ میرے ساتھ تھے ان کا کیا حشر ہوا؟“

”وہ سب پاکستان پہنچ چکے ہیں۔“

”تم فوج کے سپاہی لے کر گئے تھے؟“

”میرے ساتھ صرف دو آدمی تھے لیکن میرے دریا عبور کرتے ہی بلوچ رجمنٹ کا ایک حوالدار آٹھ سپاہیوں کو لے کر آ گیا۔ وہ دِن کے وقت کیمپ سے قافلہ لے کر گیا تھا۔ تم نے اسے فالتو ہتھیار بھی دیے تھے۔“

ارشد نے انجکشن لگانے کے بعد سلیم کے زخم پر نئی پٹّی باندھی۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر شوکت بھی بستر سے اُٹھ کر اندر آ گئے۔ گزشتہ صدمات اور تکالیف کے باعث وہ اس قدر نحیف اور لاغر ہو چکے تھے کہ انہیں پہچاننا مشکل تھا۔ تاہم سلیم کو رو بہ صحت دیکھتے ہی ان کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر تازگی آ گئی۔ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔ ''عصمت بیٹی اب انہیں خط لکھ دو کہ سلیم ہمارے پاس ہے۔ وہ بہت پریشان ہوں گئے۔ پرسوں بھی اُن کا خط آیا تھا۔''

''کس کا خط؟'' سلیم نے چونک کر سوال کیا۔

''امینہ کا خط۔ وہ تمہارے متعلّق بہت پریشان ہے!''

''امینہ کو معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟''

ڈاکٹر شوکت نے جواب دیا۔ ''نہیں ابھی اسے معلوم نہیں۔ میں یہاں پہنچتے ہی ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو گیا تھا، اس لیے اسے تفصیلات سے آگاہ نہ کر سکا۔ بستر پر پڑے پڑے میں نے لیڈروں اور حکومت کے عہدیداروں کو

چند خطوط لکھے تھے لیکن کسی نے مجھے تسلّی بخش جواب نہ دیا۔ عصمت کا خیال تھا کہ تم دریا عبور کرنے کے بعد سیدھے امینہ کے پاس پہنچو گے۔ اس لیے اس نے وہاں خط لکھ کر تمہارے متعلّق پوچھا۔ کئی دِن تک امینہ کا کوئی جواب نہ آیا۔ تمہاری آمد سے دو دِن پہلے امینہ کے شوہر کا خط ملا اور ہمیں معلوم ہوا کہ تاخیر کی وجہ گھر سے ان کی غیر حاضری تھی۔ تمہارے گاؤں کے کسی آدمی نے انہیں اطلاع دی تھی کہ مجید سیالکوٹ میں کسی کے ہاں زیرِ علاج ہے اور وہ امینہ کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔"

سلیم نے پوچھا۔ "مجید کے متعلّق انہوں نے کچھ اور لکھا ہے؟"

"مجید کے متعلّق انہوں نے لکھا ہے کہ وہ ٹھیک ہے اور اسے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔"

سلیم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو مجید اب امینہ کے پاس ہے؟"

"ہاں!"

"آپ نے میرے متعلّق کیا لکھا ہے؟"

"تمہاری حالت ٹھیک نہ تھی۔ اس لیے میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میری خواہش تھی کہ تمہیں ہوش آجائے تو ان سب کو یہاں بُلالوں۔ عصمت تم آج ہی امینہ کو خط لکھ دو۔"

سلیم نے کہا۔ "نہیں، میں خود ہی وہاں جاؤں گا۔ امینہ کو مجید کے پاس رہنا چاہیے۔"

ارشد نے کہا۔ "ابّا جان! عورتوں کے لیے گاڑی میں سفر کرنا اب ناممکن ہو چکا ہے اور ہیضہ بھی زوروں پر ہے۔ میں انہیں تسلّی کا خط لکھ دیتا ہوں۔

دس دِن اور گزر گئے۔ سلیم کا زخم اب ٹھیک ہو چکا تھا۔ ایک صبح وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ عصمت اور راحت برآمدے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ کھڑکی کے سامنے درخت پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ دو چڑیاں درخت سے اُتر کر کھڑکی میں بیٹھ گئیں۔ سلیم ان کی طرف دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر میں چند چڑیاں اور آبیٹھیں۔

سلیم آہستہ سے اُٹھا اور سرہانے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چڑیاں اُڑ گئیں۔ برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ سلیم نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر بستر کے قریب پڑی ہوئی تپائی سے تھرمامیٹر اُٹھایا اور منہ میں رکھ کر بیٹھ گیا۔

عصمت اندر داخل ہوئی۔ سلیم کے منہ میں تھرمامیٹر دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ سلیم نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ چُپکے سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

راحت نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ”آپا! ناشتہ تیّار کروں؟“

”ہاں جلدی کرو!“

راحت نے سلیم سے پوچھا۔ ”بھائی جان! کیا حال ہے آپ کا؟“ سلیم نے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر عصمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں ٹھیک ہوں راحت!“

راحت چلی گئی۔ عصمت نے تھرمامیٹر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج بالکل ٹھیک

ہیں!"

"ڈاکٹر صاحب اور ارشد چلے گئے؟"

"وہ آج رات نہیں آئے۔ کیمپوں میں زخمیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ہیضہ بھی زوروں پر ہے۔۔۔ اس طرح بیٹھنے سے آپ کو تکلیف ہوتی ہو گی۔ میں آپ کے لیے تکئے لاتی ہوں۔" عصمت اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

کھڑکی میں چڑیاں دوبارہ جمع ہو رہی تھیں۔ عصمت تکیے لے کر آئی تو سلیم نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکنے کی کوشش کی۔ عصمت نے پریشان ہو کر دبے پاؤں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "کیا ہے؟" چڑیاں اچانک اُڑ گئیں اور سلیم نے کہا۔ "تم نے انہیں ڈرا دیا۔"

"یہ چڑیاں!" عصمت نے اس کے سرہانے تکیے رکھتے ہوئے کہا۔ "جب آپ بے ہوش رہا کرتے تھے تو یہ کبھی کبھی اندر آ کر آپ کے بستر پر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔"

سلیم نے کہا۔ ’’گاؤں کی چڑیاں مجھ سے بالکل نہیں ڈرتی تھیں اور بچپن میں کوّے تو میرے ساتھ اس قدر مانوس تھے کہ میرے ہاتھ سے روٹی چھین کر لے جایا کرتے تھے۔ چڑیوں کے بچّے کبھی کبھی گھونسلوں سے گر پڑتے تو میں انہیں دوبارہ وہاں رکھ دیا کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں بہت سے پرندے آیا کرتے تھے۔ برسات کی جھڑیوں میں چھت پر ان کے لیے دانے بکھیر دیا کرتا تھا۔ مجید کبھی کبھی انہیں پکڑنے کے لیے چھت پر پھندا لگا دیا کرتا تھا لیکن میں اس سے لڑا کرتا تھا۔ میں اس سے کہا کرتا تھا کہ یہ پرندے میرے ہیں۔ تم باہر سے پکڑو۔ عصمت! کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ وہ پرندے اب کیا سوچتے ہوں گے۔ ان کے چہچہے اب کون سُنتا ہو گا۔ وہ راکھ کے انبار دیکھتے ہوں گے۔۔۔ اور انہیں یقین نہیں آتا ہو گا کہ یہ وہی گاؤں ہے۔۔۔ یہ وہی مکان ہے۔‘‘ سلیم اچانک خاموش ہو گیا۔

عصمت کچھ دیر آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ سلیم آج تک اپنے گھر یا گاؤں کا ذکر چھیڑنے سے اجتناب کیا کرتا تھا۔ جب

کوئی یہ مسئلہ چھیڑ تا تو وہ مختصر سے جواب کے بعد اُسے ٹالنے کی کوشش کرتا لیکن آج وہ اپنے معمول کے خلاف بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ عصمت نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے پوچھنے کا حق ہے تو مجھے تمام واقعات سنائیے۔“

سلیم نے کہا۔ ”عصمت میں سمجھتا تھا کہ میں صرف دلکش کہانیاں سُنانے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ اور تم صرف پھولوں سے کھیلنے کے لیے پیدا ہوئی ہو۔ لیکن اب میری جھولی میں بجھی ہوئی راکھ کے سوا کچھ نہیں۔ تمہیں یاد ہے عصمت! جب بچپن میں مَیں تمہیں خوفناک کہانیاں سنایا کرتا تھا، تم ڈر جایا کرتی تھیں اور تمہارے چہرے پر پریشانی اور خوف دیکھ کر میں اچانک کہانی کا رُخ بدل دیا کرتا تھا۔ میں تمہارے چہرے پر صرف مُسکراہٹیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے جان بوجھ کر تمہیں پریشان کرنے کے لیے ایک کہانی کا انجام المناک بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی کہانی کے ہیرو کو اژدہے کے منہ میں ڈال دیا تھا لیکن تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور

میں نے یہ کہہ دیا کہ اژدہے پر بجلی گری اور ہیرو کی جان بچ گئی۔ میری کہانی بھی اژدھوں اور انسانوں کی کہانی ہے۔ انسان سو رہے تھے اور اژدہے ان پر ٹوٹ پڑے۔ کاش میں ان پر بجلیاں گرا سکتا اور اس کہانی کا انجام بدل سکتا۔ لیکن عصمت اس دِن کا انتظار کرو جب میں یہ کہتا ہوا تمہارے پاس آؤں کہ ہم نے خوفناک اژدہوں کے جبڑے چیر دیئے ہیں۔ ہم نے بھیڑیوں کو انسانوں کی بستی سے نکال دیا ہے۔''

عصمت نے کہا۔ ''میں اژدھوں اور بھیڑیوں کو دیکھ چکی ہوں۔ اب میں ہر کہانی سُن سکتی ہوں۔ آپ نے اُس دِن کہا تھا، یہ راکھ میری پونجی ہے لیکن وہ صرف آپ کی اپنی نہیں۔۔۔ ہم دونوں کی پونجی ہے۔ میں صرف آپ کی مُسکراہٹوں کی حصّے دار نہیں، آپ کے آنسوؤں میں بھی میرا حصّہ ہے۔ اگر آپ کے باغ کے پھول میرے لیے تھے تو آپ کے جلے ہوئے خرمن کے انگارے بھی میرے لیے ہیں۔ آپ تنہا نہیں ہیں۔۔۔ ابّا جان کہتے تھے کہ باتیں کرنے سے آپ کے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ میں آپ کے خاندان کے متعلّق دوسروں سے بہت کچھ سُن چکی

ہوں لیکن مجھے شکایت ہے کہ آپ نے اب تک مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ میں آپ سے وہ باتیں سُن سکوں جو انسان صرف اپنے لیے کرتا ہے۔"

"عصمت! میں نہیں چاہتا کہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میں تمہیں شروع سے آخر تک بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر سلیم نے قدرے توقّف کے بعد اپنی سرگزشت شروع کر دی۔ جب وہ اپنے گھر کا آخری منظر بیان کر رہا تھا، عصمت کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ سلیم نے کہا۔ "عصمت تم رو رہی ہو؟"

عصمت نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "یہ میری آنکھوں کے آخری آنسو تھے۔"

باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ دروازے کہ طرف دیکھنے لگے۔ ارشد نے دروازے میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا حال ہے سلیم؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

ارشد نے عصمت کی طرف دیکھا اور وہ بولی۔ "آج ٹمپریچر ننانوے سے

ذرااوپر ہے۔"

"انشاء اللہ کل تک یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ناشتہ تیار نہیں کیا؟"

باورچی خانے سے راحت کی آواز آئی۔"ناشتہ تیّار ہے بھائی جان! میں لاتی ہوں۔"

عصمت نے پوچھا۔"ابّا جان نہیں آئے؟"

ارشد نے جواب دیا۔"وہ شاید چند دِن اور نہ آئیں۔ کل دوپہر کو وہ واہگہ چلے گئے تھے اور وہاں سے اِطّلاع آئی تھی کہ شام کے پانچ بجے تک دو لاکھ انسانوں کا قافلہ واہگہ پہنچ جائے گا اور قافلے میں کئی ہزار انسان بیمار اور زخمی ہیں۔"

راحت ناشتہ اور چائے لے آئی۔ ارشد نے جلدی جلدی چائے کی ایک پیالی ختم کرنے کے بعد اُٹھتے ہوئے کہا۔"سلیم! تم اطمینان سے اپنا حصّہ ختم کرو۔ میں بارہ بجے کے بعد پھر آؤں گا۔"

سلیم نے کہا۔"ارشد! میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں؟" ارشد نے چونک کر پوچھا۔

"امینہ کے پاس۔ اب میں سفر کر سکتا ہوں۔"

ارشد نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سلیم! ابھی تم تندرست نہیں ہوئے۔ میں تمہیں ایک ہفتہ اور باہر نکلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تم یہاں بیٹھے سفر کی مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ عصمت تم امینہ کو خط لکھ دو کہ سلیم اب بالکل ٹھیک ہے۔ دس دِن تک تمہارے پاس آئے گا۔"

"نہیں! نہیں! اسے صرف اتنا لکھو کہ میں ٹھیک ہوں اور عنقریب وہاں پہنچوں گا۔"

☆☆☆☆☆

پانچ دِن کے بعد سلیم، ارشد اور ڈاکٹر شوکت دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ عصمت اور راحت کپڑوں کی چند لڑیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مکان سے باہر سڑک پر ایک فوجی ٹرک رُکا، ایک نوجوان اُترا اور اس نے پھاٹک میں کھڑے ہو کر آواز دی۔ "ڈاکٹر

صاحب!"

"کون ہے؟" نوکر نے باورچی خانے سے نکل کر پوچھا۔

نوجوان نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔ "ڈاکٹر شوکت صاحب یہیں رہتے ہیں؟" "ہاں۔ اندر کھانا کھا رہے ہیں۔ آپ برآمدے میں کرسی پر بیٹھ جائیں۔ وہ ابھی باہر نکلیں گے۔"

نوجوان نے برآمدے کے قریب پہنچ کر کہا۔ "مجھے جلدی ہے۔ میں سلیم سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔"

یہ آواز سلیم کے کانوں کے لیے نئی نہ تھی۔ روٹی کا نوالہ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا اور وہ جلدی سے اُٹھ کر مجید مجید کہتا ہوا باہر نکل آیا۔

مجید فوجی وردی پہنے ہوئے تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ نحیف اور لاغر نظر آتا تھا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگایا۔

ارشد اور شوکت بھی باہر نکل آئے۔ مجید نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! معاف کیجیے، میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی لیکن مجھے بہت جلدی تھی۔"

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیسی جلدی، چلو کھانا کھاؤ!“

”کھانا میں کھا چکا ہوں۔“

ارشد نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آیئے! اندر بیٹھیے!“

مجید نے کہا۔ ”میں یہیں سے اجازت لے لوں تو بہتر ہے۔ میرے ساتھی باہر کھڑے ہیں۔“

ارشد نے کہا۔ ”آپ چلیں، میں انہیں لے آتا ہوں۔“

”نہیں۔ میں واپسی پر آپ سے ملوں گا۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ سلیم نے سوال کیا۔

مجید نے کہا۔ ”میں نے آج میں یہاں پہنچتے ہی ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کی تھی اور وہاں سے مجھے کنوائے کے ساتھ لدھیانے پہنچنے کا حکم ملا ہے۔ لدھیانے کے نزدیک پچاس ہزار آدمیوں کا ایک قافلہ ہمارا انتظار کر رہا

ہے۔ میں ایک منٹ ضائع کیے بغیر وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ ہم دو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے اور اب ایک کر چالیس منٹ ہو گئے ہیں۔"

"تمہاری صحت اب ٹھیک ہے نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سلیم تم کیسے ہو؟"

"میں ہی ٹھیک ہوں۔"

مجید نے کہا۔ "داؤد۔۔۔۔؟"

"وہ شہید ہو چکا ہے۔" سلیم نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور دوسرے؟"

"صادق اور غلام علی بھی آخری وقت تک میرے ساتھ تھے۔ وہ پاکستان پہنچ چکے ہیں۔"

"اچھا سلیم! اب میں جاتا ہوں۔ تم جب سفر کے قابل ہو جاؤ تو امینہ کے پاس ضرور جانا۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ بشیر کو بھی میں وہیں چھوڑ آیا

ہوں۔"

"میں کل جارہاہوں۔" سلیم نے کہا۔

مجید نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا، اب میں جاتا ہوں۔ مجھے دو بجے سے پہلے واپس چھاؤنی پہنچنا ہے۔" مجید نے مصافحہ کے لیے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے کہا۔ "ہم سڑک تک تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔"

عصمت اور راحت دروازے میں کھڑی باہر جھانک رہی تھیں۔ جب ڈاکٹر شوکت، سلیم اور ارشد مجید کو الوداع کہنے کے لیے باہر نکل گئے تو وہ برآمدے میں آ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک کے انجن کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک لڑکی نے عصمت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کون تھا عصمت؟"

عصمت نے مُڑ کر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ وہی تھے جن کے متعلّق میں تمہیں ابھی بتارہی تھی۔۔۔"

☆☆☆☆

"مائی ڈیئر لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ میری ریاست میں تشویشناک صورتِ حالات پیدا ہو گئی ہے۔ اور میں آپ کی حکومت سے فوری امداد کا ملتجی ہوں۔ موجودہ صورت حالات میں میرے لیے ہندوستان سے اعانت طلب کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میری درخواست پر اس وقت تک مدد نہیں بھیج سکتا جب تک میری ریاست کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا میں نے الحاق کا فیصلہ کیا ہے اور متعلقہ درخواست آپ کی منظوری کے لیے دی ہے۔ اگر میری ریاست کو بچانا مقصود ہو تو سری نگر کے لیے فوری اعانت کی ضرورت ہے۔

آپ کا مخلص

ہری سنگھ"

”میرے پیارے مہاراجہ صاحب!

آپ کے بیان کردہ حالات کے پیشِ نظر میری حکومت نے ہندوستان کے ساتھ ریاست کشمیر کے الحاق کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔ آپ کی اپیل پر ہندوستانی فوج کے دستوں کو کشمیر بھیجنے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ آپ کی فوج کو ریاست کے دفاع اور آپ کی رعایا کے جان ومال اور عزّت کی حفاظت کے لیے مدد دیں۔

آپ کا بہت ہی مخلص

ماؤنٹ بیٹن آف برما

گورنر جنرل ہندوستان“

یہ دو خطوط اس شرمناک سازش اور اس ذلیل منصوبے کی رسمی کڑیاں تھیں جس کی تکمیل کے لیے دہلی سے لے کر واہگہ تک مسلمانوں کا قتلِ

عام ہو رہا تھا۔ جس کے لیے اسّی لاکھ انسانوں کو پاکستان کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔۔۔ جس کے لیے ریڈ کلف کا ضمیر خریدا گیا تھا۔ جس کے لیے پاکستان کی فوجیں عمداً باہر رکھی گئی تھیں اور جس کے لیے پاکستان کے حصّے کا اسلحہ ہندوستان میں روک لیا گیا تھا۔

راجہ ہری سنگھ کی رگوں میں اس ڈوگرے کا خون تھا جس نے چند لاکھ چاندی کے سکوں کے عوض کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کی آزادی خرید لی تھی اور ماؤنٹ بیٹن ان فرنگی تاجروں کا جانشین تھا جنہوں نے کشمیر کے مسلمانوں کی عزّت اور آزادی کی قیمت وصول کی تھی۔[11]

کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمان ایک بار پھر فروخت کیے جا رہے تھے لیکن اب یہ لین دین ڈوگرہ استبداد اور ہندو فاشزم کے درمیان تھا۔ ماؤنٹ بیٹن آف برما اس شرمناک سودے میں ایک دلال کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ہندوستان کی اسٹیج پر خونیں ڈرامے کا ایک نیا ایکٹ شروع ہو چکا تھا۔ ایک طرف نہرو اور پٹیل اپنے خون خوار بھیڑیوں کی فوجیں لیے

[11] معاہدہ امرتسر کی رو سے انگریزوں نے کشمیر کو جموں کے حکمرانوں کے پاس ۷۵ لاکھ روپے میں فروخت کیا تھا۔

کھڑے تھے، دوسری طرف ہری سنگھ اپنے درندہ خصلت ڈوگروں سے لشکر کی رہنمائی کر رہا تھا اور کشمیری مسلمان کے وجود میں بلکتی، تڑپتی، چیختی اور چلّاتی ہوئی انسانیت ان کے درمیان پابہ زنجیر کھڑی تھی۔ اسٹیج کے پردے کے پیچھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن آن برما اس ڈرامے کے ڈائریکٹر کی حیثیت میں کھڑا تھا۔۔۔ یہ بھیڑوں اور بھیڑیوں کا کھیل تھا اور بھیڑیوں نے بھیڑوں کے گلے پر حملہ کرنے سے پہلے انہیں مطمئن کرنے کے لیے ایک بھیڑ کو پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔۔۔ شیخ عبد اللہ جنہیں ہری سنگھ تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے بغاوت کے جرم میں قید کیا تھا، جن کی اعانت کے لیے دیش بھگت پنڈت نہرو کوہالہ کے پل تک تشریف لے گئے تھے اور پھر ڈوگروں کی سنگینیں دیکھ کر واپس تشریف لے آئے تھے۔ اب ہندو فاشزم اور ڈوگرہ استبداد کی ایک ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جیل سے باہر نکالے گئے تھے۔ ہری سنگھ کا شیخ عبد اللہ کو جیل سے نکال کر کابینہ کی تشکیل کی دعوت دینا اور ہری سنگھ کی ماؤنٹ میں کے ساتھ خط و کتابت محض ظاہری رسومات کو پورا کرنے کے لیے تھیں۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ مشرقی پنجاب اور دوسری ریاستوں کی طرح کشمیر کے مسلمانوں

کی تباہی اور بربادی کی تیّاریاں بہت پہلے مکمل ہو چکی تھیں۔ ماؤنٹ بیٹن کے رفیقِ کار ریڈ کلف نے مشرقی پنجاب میں مسلم اکثریت کے علاقے ہندوستان میں شامل کر کے کشمیر کا ایک کونہ ہندوستان سے ملا دیا تھا اور گاندھی کے چیلے لاکھوں مسلمانوں کی لاشوں پر سے ہندو فاشزم کا رَتھ دھکیلتے ہوئے کشمیر کے مسلمانوں کو آگ اور خون کا پیغام دے رہے تھے۔

۱۵ اگست سے قبل ہی مہاراجہ پٹیالہ اور کشمیر کے حکمران کے درمیان ساز باز ہو رہی تھی۔ کشمیر کی سرحدوں کے ساتھ مغربی پنجاب کے اضلاع سیالکوٹ، گجرات اور جہلم وغیرہ کی سکھ آبادی کو کشمیر میں منتقل ہونے کی ہدایات مل چکی تھیں۔ ستمبر میں مشرقی پنجاب اور ہندوستان سے راشٹر یہ سیوک سنگھ، آزاد ہند فوج کے سپاہی، اکال سینا اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے بلوائی جموں کے اضلاع میں داخل ہو کر لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر چکے تھے۔ جمّوں کے مسلمانوں کی بستیوں میں آگ کے شعلے سیالکوٹ سے دکھائی دے رہے تھے۔ ستمبر کے آخر تک ہزاروں پناہ

گزین مشرقی پنجاب میں داخل ہو چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس قسم کی خبریں مشتہر ہو رہی تھیں کہ راجہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر چکا ہے۔ کشمیر کا ایک کونہ ہندوستان کے ساتھ ملانے والے راستوں کو سڑکوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ راوی پر پل بنایا جا رہا ہے اور جب یہ انتظامات مکمل ہو جائیں گے کشمیر کی ڈوگرہ حکومت ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دے گی۔ کشمیر کی نوّے فیصدی مسلم آبادی اب زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ کشمیر کے ۳۵لاکھ مسلمان اب ان خون آشام تلواروں کو اپنی شاہ رگ کے قریب دیکھ رہے تھے۔ جنہوں نے مشرقی پنجاب، دہلی، کپور تھلہ، نابھ، پٹیالہ، بھرت پور اور الور میں لاکھوں نہتے اور بے بس مسلمانوں کو ذبح کیا تھا۔۔۔ ان کی بہو بیٹیوں کی طرف ان درندوں کے ہاتھ اُٹھ رہے تھے جنہوں نے کشمیر کی شکار گاہ میں داخل ہونے سے پہلے جمنا کے اس پار سے لے کر راوی کے ساحل تک مظلوم اور بے کس انسانیت کا تعاقب کیا تھا۔

کشمیر کی گُل پوش وادیوں اور زعفران کے کھیتوں کے ہندوستانی سوداگر بادِ

سموم کے تیز و تند جھونکوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ یہ جواہر لال نہرو کا آبائی وطن تھا اور چونکہ وہ بھارت کا وزیرِ اعظم بن چکا تھا، اس لیے گاندھی جی کے چیلے کشمیر کے ۳۵ لاکھ مسلمانوں کو آزادی سے محروم رکھنا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔

کشمیر کی سرحدیں تبّت، روس اور چین کے ساتھ ملتی تھیں اور اب ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے اس کا ایک کونہ ہندوستان کے ساتھ بھی ملا دیا تھا۔ اس لیے پنڈت نہرو کہتا تھا کہ ہندوستان کشمیر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ کشمیر کے مسلمانوں کے سامنے تاریک گڑھے اور پیچھے آگ کے مہیب شعلے تھے۔ ان کی آخری اُمّید پاکستان تھی لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان جن حوصلہ شکن مصائب کا سامنا کر رہا تھا، وہ نہرو، پٹیل، ہری سنگھ اور ماؤنٹ بیٹن کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھے کہ ہندوستان کسی دقّت کا سامنا کیے بغیر کشمیر کو ہڑپ کر سکتا ہے۔

ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں راجہ کو سب سے زیادہ

پونچھ کے مسلمانوں سے مخالفت کا اندیشہ تھا۔ پونچھ کی آبادی میں تقریباً ساٹھ ہزار وہ سابق فوجی تھے جو دوسری عالم گیر جنگ میں ملایا، برما، لیبیا اور اٹلی کے میدانوں میں لڑ چکے تھے۔ یہ سب لوگ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی صورت میں ان کا کیا حشر ہو گا۔۔۔۔ پونچھ کے وہ سپاہی جو پاکستانی فوج میں تھے اور وہ عوام جو مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں ملازمتیں کرتے تھے، ان ریاستوں کے مسلمانوں کے انجام سے بے خبر نہ تھے، جو ہندوستان میں شامل ہو چکی تھیں۔

کشمیر کی حکومت نے ان لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے اپنے ڈوگرہ سپاہیوں کو قتل وغارت اور لوٹ مار کا کام سونپ دیا۔ اس ظلم کے جواب میں پونچھ کے مسلمانوں کی زبان سے پاکستان کے حق میں آواز بلند ہوئی۔ ظلم بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ یہ آواز بھی بلند ہوتی گئی۔ پونچھ کے مسلمان اپنے بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کو خاک وخون میں لوٹتے اور اپنے گھروں کو جلتے دیکھ رہے تھے اور انہیں مستقبل کے متعلّق کوئی غلط

فہمی نہ تھی۔۔۔۔ راجہ فوج کو یہ اختیار دے چکا تھا کہ جو شخص اس کی حکم عدولی کرے یا جس پر انہیں شبہ ہو، اسے بلا تاخیر گولی مار دی جائے۔

پانی اب سر سے گزر چکا تھا۔ حالات نے پونچھ کے مسلمانوں کو آخری فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔۔۔ جب پاکستان کے لیڈر بیانوں، احتجاجوں اور قراردادوں کے نسخے آزما رہے تھے، پونچھ میں نہتے فرد مایہ اور تہی دست انسانوں کا ایک گروہ اٹھا اور جبر و استبداد کے طوفان کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔ وہ گمنام سپاہی یقیناً پاکستان کے سب سے بڑے محسن تھے، جنہوں نے سینوں پر گولیاں کھا کر ڈوگروں کی بندوقیں چھینیں تھیں۔ قوم ان شہیدوں کا احسان نہیں بھول سکتی جنہوں نے پہلی بار ڈوگرہ استبداد کے خلاف اعلانِ جہاد کیا تھا۔۔۔

قدرت پھر ایک بار اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتی تھی کہ مومن جب موت کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے تو زندگی اس کے قدم چومتی ہے۔ پونچھ کی جنگ کشمیر کے عوام کی جنگ اور کشمیر کے عوام کی جنگ بالآخر پاکستان کے عوام کی جنگ بن گئی۔ پونچھ کے مجاہدوں نے ایک قوم کی بقا

کی جنگ کی ابتدا کی تھی اور قوم کہہ رہی تھی کہ۔۔۔ میں زندہ ہوں۔۔۔۔ جو نعرہ پونچھ سے بُلند ہوا تھا، وہ چند دِنوں میں مغربی پنجاب اور سرحد کے میدانوں سے لے کر وزیرستان اور چترال کے پہاڑوں تک گونج رہا تھا۔ قبائلی مجاہدین نے اپنے بھائیوں کی پکار سنی اور ان کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ ڈوگرے بھاگ رہے تھے۔ سیوا سنگھ اور اکالی بھاگ رہے تھے مجاہدین کی منزلِ مقصود سری نگر تھی۔

حالات کی یہ تبدیلی، ہندوستان اور کشمیر کی حکومتوں کی توقع کے خلاف تھی۔ راجہ ہری سنگھ نے اپنے پیارے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ میں آپ کی فوری اعانت کا طلب گار ہوں، اور ماؤنٹ بیٹن نے فوراً جواب دیا کہ ہندوستانی فوج کو کشمیر بھیجنے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ آپ کی فوج کو ریاست کے دفاع اور آپ کی رعایا کے جان و مال اور عزّت کی حفاظت کے لیے مدد دے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن آف برما نے مشرقی پنجاب اور ریاستوں میں ہی نہیں بلکہ دہلی میں اپنے لاج کے اردگرد مسلمانوں کا قتلِ عام ایک تماشائی کی

حیثیت میں دیکھا۔۔۔ جب مہاجرین کے کیمپوں، قافلوں اور گاڑیوں پر حملے ہو رہے تھے، جب ہزاروں مسلمان لڑکیوں کی عصمت لٹ رہی تھی، ماؤنٹ بیٹن کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور پھر جب مشرقی پنجاب اور ریاستوں سے مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے بعد ہندوستان کے تخریبی عناصر جموں میں قیامت بپا کر رہے تھے اور ہری سنگھ کے ڈوگرے کشمیر کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک مسلمانوں کو تباہ وبرباد کر رہے تھے، ماؤنٹ بیٹن آف برماٹس سے مس نہ ہوا۔

کشمیر کے راجہ اور اس کے پیارے ماؤنٹ بیٹن کو اس وقت کشمیر کی رعایا کے جان و مال اور عزّت کی حفاظت کا خیال نہ آیا جب جموں سے چھینی ہوئی مسلمان لڑکیاں مشرقی پنجاب کے شہروں میں فروخت ہو رہی تھیں لیکن کشمیر کو ہندوستان کی جھولی میں ڈالنے اور ایک ظالم اور وحشی حکمران کے اقتدار کے ڈگمگاتے ہوئے محل کو سہارا دینے کے لیے ماؤنٹ بیٹن کے پاس فوج تھی، ٹینک تھے اور ہوائی جہاز بھی تھے۔ ولایت کا سفید دیوتا اپنے کالے پجاریوں سے اپنے بہترین مقاصد کو، بہترین الفاظ میں چھپانے

کے ڈھنگ سیکھ چکا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے غالباً دنیا کی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بھی اعلان کیا کہ جب کشمیر کے حالات پُر امن ہو جائیں گے تو الحاق کے بارے میں کشمیر کے عوام سے استصوابِ رائے کیا جائے گا۔۔۔ لیکن یہ حقیقت بھی ماؤنٹ بیٹن سے زیادہ کسی پر واضح نہ تھی کہ ڈوگرے، سکھ اور سیوا سنگھی، ہندوستانی افواج کے ٹینکوں، توپوں اور طیاروں کی مدد سے استصوابِ رائے کے سلسلہ میں ہندوستان کی پریشانیاں دور کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔

مر دے ووٹ نہیں دیا کرتے۔

☆☆☆☆☆

سلیم کئی ہفتوں سے لاپتا تھا۔ لاہور سے اس کی روانگی کے بعد عصمت نے امینہ کو خبر لکھ کر اس کی خیریت دریافت کی اور امینہ نے جواب میں لکھا کہ سلیم نے یہاں پہنچنے سے تین دِن بعد اخبار میں اپنے کسی دوست کے

متعلّق یہ اعلان پڑھا کہ وہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے قصور میں اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں پہنچ چکا ہے۔ اگلے دِن وہ میرے اصرار کے باوجود قصور چلا گیا۔ پندرہ دِن بعد ارشد کو سلیم کا مکتوب ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں قصور کے کیمپ میں رضاکاروں کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ یہاں مجھے اپنے ماموں کے گاؤں کے چند آدمی ملے ہیں، ان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ ماموں جان اپنے خاندان کے ساتھ بہاولپور پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے میں اب وہاں جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ وہاں سے سیدھا لاہور آؤں گا۔

اس کے بعد کئی دِن تک سلیم کا کوئی خط نہیں آیا اور عصمت کی پریشانی تشویش میں تبدیل ہونے لگی۔ ڈاکٹر شوکت اس کا مغموم چہرہ دیکھتا اور ہر بار اسے یہ کہہ کر تسلّی دیتا۔ ”بیٹی! مہاجرین کے کیمپوں کی بُری حالت ہے۔ ان حالات میں سلیم جیسے آدمی کو کیسے چین آ سکتا ہے۔ وہ بہاولپور کے کیمپوں میں کام کر رہا ہو گا۔ ایسے آدمیوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔“

عصمت کبھی کبھی زخمی اور مریض عورتوں اور بچوں کی تیمارداری کے لیے اپنے باپ کے ساتھ کیمپ میں جایا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کام میں

اس کی دلچسپی بڑھتی گئی اور اس نے باقاعدہ کیمپ میں کام کرنا شروع کر دیا۔

کیمپوں میں ہیضے کی روک تھام اور زخمیوں کی مرہم پٹّی کا مسئلہ ایک نازک صورتِ اختیار کر چکا تھا اور کام کی وسعت کے مقابلے میں سند یافتہ ڈاکٹروں کی کمی کے باعث تھوڑا بہت طبّی علم رکھنے والے رضاکاروں کو بھی غنیمت سمجھا جاتا تھا۔

جہادِ کشمیر شروع ہونے کے چند دِن بعد ارشد لاہور سے تبدیل ہو کر راولپنڈی چلا گیا۔ رخصت کے وقت عصمت نے جھجکتے ہوئے اس سے کہا۔ ”بھائی جان! مجھے یقین ہے کہ وہ کشمیر چلے گئے ہیں۔ شاید راولپنڈی سے آپ کو ان کا پتہ مل جائے۔“

ارشد نے کہا۔ ”عصمت، میں کئی دِن سے سوچ رہا تھا۔ اگر سلیم وہاں ہے تو راولپنڈی سے اس کا پتہ لگانا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہو گا۔ میں انشاء اللہ تمہیں بہت جلد اِطّلاع دوں گا۔“

عصمت نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان۔۔۔۔“

”کہو عصمت! کیا بات ہے؟“

”بھائی جان! میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔“

ارشد نے کہا۔ ”بہت اچھا عصمت! میں راولپنڈی پہنچنے کے بعد تمہیں خط لکھوں گا۔“

ایک روز عصمت دِن بھر کیمپ میں کام کرنے کے بعد گھر پہنچی تو راحت اسے دیکھتے ہی چلا اُٹھی۔ ”آپا جان! آپا جان! بھائی سلیم کا خط آیا ہے۔ وہ کشمیر میں ہیں۔“ راحت بھاگ کر اپنے کمرے سے خط لے آئی۔

ایک ثانیہ کے لیے عصمت بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کی قوّتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں خاموش تھیں۔ کائنات پر ایک سکوت طاری ہو چکا تھا۔ اس کا ایک پاؤں نیچے اور ایک پاؤں برآمدے کی سیڑھی پر تھا۔ ”اُن کا خط؟“ اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ ”سلیم کا خط؟“ اس کی

خاموش کائنات کے ہر ذرّے سے نغمے پھوٹنے لگے۔ وہ فضا میں نغموں کی ہلکی ہلکی گونج سُننے لگی۔۔۔ درخت جھوم رہے تھے۔ پھول کھل رہے تھے۔ کلیاں مُسکرا رہی تھیں۔ اس کی دنیا قوسِ قزح کی رنگینیوں سے لبریز تھی۔۔۔ ”سلیم کا خط؟“ وقت کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں میں پھر ایک بار ربط پیدا ہو رہا تھا وہ خط لے کر برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔ راحت کہہ رہی تھی ”آپا جان! میں نے ایڈریس سے اُن کی تحریر پہچان کر آپ کی اجازت کے بغیر لفافہ کھول لیا تھا۔“

”راحت تمہیں میری اجازت کی ضرورت نہ تھی۔“ یہ کہتے ہوئے عصمت خط پڑھنے میں منہمک ہو گئی۔ سلیم نے لکھا تھا۔

”میری عصمت!

میں تمہیں کشمیر کے محاذ سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں قصور سے ملتان جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کشمیر پر ہندوستان کے حملے کی خبر آئی اور میں نے جہاد میں حصّہ لینے کی نیّت سے ملتان جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ کشمیر جانے سے پہلے لاہور پہنچ کر ایک دِن تمہارے ہاں قیام کروں

لیکن لاہور کے پلیٹ فارم پر مجھے آفتاب مل گیا۔ آفتاب میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ تیس رضاکاروں کے سالار کی حیثیت میں کشمیر جا رہا تھا اور ان رضاکاروں میں پانچ نوجوان میرے ہم جماعت تھے۔ لوگ ان مجاہدوں کے گلے میں ہار ڈال رہے تھے۔

آفتاب اور باقی دوست میرے گرد جمع ہو گئے۔ آفتاب نے پوچھا تم کہاں جا رہے ہو سلیم؟ اور میں نے جواب دیا کہ میری منزل بھی وہی ہے، اور آفتاب نے اپنے گلے سے ہار اُتار کر میرے گلے میں ڈال دیے اور اس کی دیکھا دیکھی چند اور آدمیوں نے بھی میرے گلے میں ہار ڈال دیے۔ جب گاڑی چلنے میں دس منٹ تھے، وہ ڈبّے میں بیٹھ گئے۔ میں کچھ دیر دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ میں آفتاب سے کہنا چاہتا تھا کہ اگلے دن راولپنڈی میں ان سے آن ملوں گا لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔ آفتاب نے کہا۔ اندر آ جاؤ سلیم! گاڑی چلنے والی ہے۔ اور میں تذبذب کی حالت میں ایک پاوں پائیدان پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے غازیانِ کشمیر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک برقعہ پوش خاتون

آگے بڑھی اور اس نے میرے گلے میں ہار ڈال دیا۔ پھر ایک عمر رسیدہ بزرگ نے آگے بڑھ کر کہا۔ غازیوں کی فتح کی دُعا مانگو۔ لوگوں نے ہاتھ اُٹھائے اور میں نے بھی ہاتھ اٹھائے۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اور میں آفتاب کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اب میں کشمیر میں ہوں۔ میرا مقام یہی تھا۔ مشرقی پنجاب میں جو کچھ میں نے سیکھا تھا، وہ میرے کام آرہا ہے۔ گزشتہ تین ماہ سے میں آزاد کشمیر کی فوج کے ان چھاپہ مار دستوں کے ساتھ تھا جو ہندوستانی فوج کے عقب میں پہنچ چکے تھے۔ ان دستوں میں زیادہ تعداد سرحدی قبائل کے مجاہدین کی تھی۔ ہمارا سپہ سالا محسود قبیلے کا ایک نوجوان تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں محسوس کرتا تھا کہ میری قوم میں زندگی ہے۔ یہ لوگ سینے پر گولی کھا کر مُسکراتے ہیں۔ یہ موت کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ یہ دُشمن کی توپوں اور ہوائی جہازوں سے مرعوب نہیں ہوتے۔۔۔۔ برفانی پہاڑوں میں خون منجمد کر دینے والی سرد ہوائیں انہیں پریشان نہیں کرتیں۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کے پاس دیسی رائفلیں تھیں اور بعض دُشمن کے

ہاتھوں سے رائفلیں چھین لینے کی اُمّید میں صرف چاقو اور چھرّے لے کر چلے آئے تھے۔

ایک دِن پچاس مجاہدوں کا ایک نیا گروہ ہمارے پاس پہنچا۔ یہ سلیمان خیل پٹھان تھے، جو پنجاب کے شہروں میں محنت مزدوری سے پیٹ پالا کرتے تھے۔ اب یہ لوگ جہادِ کشمیر میں حصّہ لینے کے لیے آئے تھے۔ ان میں سے بعض کے پاس چاقو تھے اور بعض کے پاس وہ بھی نہ تھے۔ میں نے ایک نوجوان ہے جو ان کا لیڈر تھا سوال کیا۔ بھائی! رائفلوں کے بغیر تم کیا کروگے؟ اس نے کہا۔ تم پروا نہیں کرو۔ اگر ہمارے پاس ہتھیار نہیں تو دُشمن کے پاس بہت ہے۔ رات کو انھوں نے ہمارے سالار سے بیس رائفلیں ادھار لیں اور پندرہ میل دور ایک ہندوستانی چوکی پر حملہ کر دیا۔ علی الصبح جب وہ واپس آئے تو ان کے پاس اسّی رائفلیں اور تین مشین گنیں اور بارود اور سامان رسد سے لدے ہوئے دس خچّر تھے۔ اس مہم میں ان مجاہدوں میں سے بارہ شہید ہو چکے تھے۔ اگلے دِن جب ہم نے وہاں جا کر دیکھا تو سکھوں اور ڈوگروں کی ساٹھ لاشیں پڑی ہوئی تھیں

لیکن پٹیل اور نہرو کے سپاہی جس قدر بزدل ہیں، اسی قدر ظالم ہیں۔ چوکی سے جو سکھ اور ڈوگرے جانیں بچا کر بھاگے تھے، انہوں نے جاتے جاتے تین میل دور مسلمانوں کی ایک بستی کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

قبائلی مجاہدین دنیا کے بہترین نشانہ باز ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے انہوں نے رائفلوں سے ہندوستان کے تین ہوائی جہاز گرائے۔ دوسرے محاذوں پر بھی وہ ہندوستان کے کئی طیارے گرا چکے ہیں اور اب یہ حالت ہے کہ ہندوستانی ہوا باز ہمارے فوجی، ٹھکانوں کی بجائے صرف دیہات اور شہروں پر حملہ کرتے ہیں۔

میں مجاہدوں کے ساتھ بہت خوش تھا۔ ان کے درمیان مجھے کبھی اپنی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں خطرناک سے خطرناک مہم پر اُن کا ساتھ دینے کے لیے تیّار رہتا تھا۔ ہمارا کام ہندوستانی فوج کے رسد و کمک کے راستوں کو کاٹنا اور دُشمن کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنی طرف متوجّہ رکھنا تھا۔ ہمارا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔ اگر دُشمن کے کنوائے کی آمد کی خبر ملتی تو ہم کسی گھاٹی میں چھپ کر اچانک اس پر حملہ کر دیتے۔ اگر فوج

کی پیش قدمی کی اطلاع ملتی تو ہمیں راستے کے پُلوں کو اُڑانے کے لیے جانا پڑتا۔ ان حالات میں اگر میں نے تمہیں خط نہیں لکھا تو تمہیں شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اب میں ایک اہم چوکی کی حفاظت پر متعیّن ہوں۔ یہ چوکی نو ہزار فٹ کی بُلندی پر ہے۔ یہاں ہندوستانی فوج کی توپیں اور مشین گنیں نصب تھیں۔ جنوری کے آخری ہفتے میں ہمیں جنرل طارق کا حکم آیا تھا کہ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر اس چوکی پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اس مہم کی قیادت کے لیے انہوں نے ایک کیپٹن کو بھیج دیا تھا۔ کیپٹن ضلع میانوالی کا ایک سابق فوجی تھا۔ جو برما اور ملایا کے محاذوں پر لڑ چکا تھا۔ کیپٹن نے ہم سے کہا کہ اس مہم کے لیے مجھے چالیس ایسے رضا کاروں کی ضرورت ہے جو فتح سے زیادہ شہادت کی تمنّا رکھتے ہوں۔

بہت سے آدمیوں نے اپنے نام پیش کیے لیکن کپتان نے صرف چالیس آدمیوں کو منتخب کیا اور میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ ہم نے برف کے طوفان میں رات کے دو بجے اس چوکی پر حملہ کیا لیکن دُشمن غافل نہ تھا۔ ہم پہاڑ کی چوٹی سے ایک ہزار فٹ نیچے تھے کہ دُشمن نے گولہ باری

شروع کر دی۔ پانچ بجے تک ہم رینگتے ہوئے چوٹی کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن اس دوران میں ہمارے پندرہ ساتھی شہید ہو چکے تھے، چھ بجے کے قریب ہم ان کی تین توپوں اور دو مشین گنوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ دوسری مشین گن پر دستی بم پھینکنے کے بعد ہمارا کپتان گر پڑا اور ہمیں معلوم ہوا کہ وہ تین گولیاں کھا چکا ہے۔ ہم نے ابھی دم نہیں لیا تھا کہ پہاڑی کی اگلی چوٹی سے جو اس چوکی سے کوئی سو فٹ بُلند تھی۔ مشین گن اور مارٹر کے فائر ہونے لگے اور ہمارے سات اور ساتھی شہید ہو گئے۔ دم توڑتا ہوا کپتان چلّایا۔ اگر تم نے سورج کی روشنی سے پہلے اس چوٹی پر قبضہ نہ کیا تو ہماری قربانی رائیگاں جائے گی۔

ہم نے تین اطراف سے اس چوٹی پر چڑھنا شروع کیا۔ میرے آگے ایک آفریدی مجاہد تھا۔ اس نے چوٹی پر پہنچتے ہی بھاگ کر مشین گن کے مورچے پر دستی بم پھینکنے کی کوشش کی لیکن گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور وہ گر پڑا۔ دوسری طرف سے ہمارے دو اور ساتھی اور پہنچ گئے اور پتھّروں کی آڑ میں لیٹ کر فائر کرنے لگے۔ جب دُشمن مشین گن کا رُخ اس

طرف پھیر رہا تھا، میں نے آگے بڑھ کر دستی بم پھینک دیا۔۔۔۔ چوٹی پر قبضہ کرنے کے بعد میں بھاگتا ہوا نیچے پہنچا اور کپتان کو بتایا کہ ہم نے چوٹی پر قبضہ کر لیا ہے۔ کپتان نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ اب تمہیں ہر قیمت پر اس چوٹی کی حفاظت کرنی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ دس منٹ بعد یہ مجاہد آخری سانس لے چکا تھا۔ اس چوکی سے ہمیں چار وہ بدنصیب لڑکیاں ملیں جنہیں نہرو کے سپاہی وادی کشمیر سے اٹھا لائے تھے۔ ان کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ ان سے پہلے پانچ اور لڑکیاں وہاں لائی گئی تھیں۔ تین سکھوں اور ڈوگروں کی درندگی کا شکار ہوئیں اور دو نے پہاڑی پر سے کود کر جان دے دی۔ ان کی لاشیں برف میں دفن تھیں۔ یہ اس فوج کے سپاہیوں کا معمولی کارنامہ ہے۔ جسے ماؤنٹ بیٹن، گاندھی، نہرو اور پٹیل نے کشمیر کے عوام کے جان و مال، عزّت اور آزادی کی حفاظت کے لیے بھیجا ہے۔

تیسرے دِن اس محاذ پر آزاد کشمیر کی فوج کو ایک بہت بڑی فتح حاصل

ہوئی۔ جنرل طارق بذاتِ خود اس حملے کی قیادت کر رہے تھے۔ فتح کے بعد وہ ہماری چوکی کا معائنہ کرنے آئے اور مجھے ایک غیر معیّن عرصے کے لیے اس چوکی کی حفاظت پر تعیّن کر کے چلے گئے۔

اب میں یہاں ہوں۔ برف باری زوروں پر ہے۔ موسم بہار سے پہلے اس جگہ دُشمن کا ہوائی جہاز آجاتا ہے اور آس پاس اندھا دھند بم پھینک کر چلا جاتا ہے۔ آج تک جو بم اس چوک سے نزدیک ترین گرا ہے وہ ہم سے دو فرلانگ دور رہے۔ ہم ایک ہوائی جہاز گرا چکے ہیں۔

پہلے جب میں گوریلا دستوں کے ساتھ تھا تو مجھے خط لکھنے کی فرصت نہ تھی۔ اب مجھے وقت ملتا ہے تو خط لکھ کر بھیجنے کی کوئی صورت نہیں۔ آج ہمارے پاس چند سپاہی رسد لے کر پہنچے ہیں اور میں یہ مکتوب ان کے حوالے کر رہا ہوں۔ میرے پاس تمہارا خط پہنچنے کی سر دست کوئی صورت نہیں۔ تم آزاد کشمیر ریڈیو کی معرفت اپنے گھر کی خیریت کی اِطّلاع دے سکتی ہو۔ ہندوستانی سپاہی ہماری چوکی میں ایک بیٹری سیٹ ریڈیو بھی چھوڑ گئے ہیں اور ہم ہر شام خبریں اور فوجی پروگرام سُنا کرتے ہیں۔

فرصت کے لمحات گزارنے کے لیے میں نے ایک مضمون لکھنا شروع کر دیا ہے ممکن ہے کہ یہ مضمون ایک چھوٹی سی کتاب بن جائے۔ 'اے قوم!' اس مضمون کا عنوان ہے۔ لاہور سے آتے ہوئے گاڑی پر آفتاب نے میری زبانی مشرقی پنجاب کے واقعات سُننے کے بعد اس بات پر زور دیا تھا کہ میں قوم کے نام ایک پیغام لکھوں۔ آفتاب نے اس مضمون کو چھپوا کر مُفت تقسیم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ انشاء اللہ یہ چھوٹی سی کتاب بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔

خط بہت طویل ہو گیا ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا لیکن سپاہی جانے کے لیے تیّار کھڑے ہیں۔

عصمت! ہندوستان کا ہاتھی کشمیر کی دلدل میں پھنس چکا ہے۔ دُعا کرو کہ میں تمہارے پاس فتح کی خوش خبری لے کر آؤں۔

تمہارا سلیم"

مشرقی پنجاب اور ہندوستان میں شامل ہونے والی ریاستوں میں مسلمانوں

کا صفایا ہو چکا تھا۔ بھارت سے اسّی لاکھ انسان ہجرت کر کے پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اب گاندھی مہاراج دہلی میں بیٹھ کر عدم تشدّد کا درس دے رہے تھے اور ان کے چیلے باقی ہندوستان میں مسلمانوں کو آگ اور خون کا پیغام سُنا رہے تھے۔ جونا گڑھ پاکستان میں شامل ہو چکا تھا۔ وہاں کا حکمران مسلمان تھا لیکن رعایا کی اکثریت ہندو تھی، اس لیے وہاں ہندوستانی فوج بھیج دی گئی۔ کشمیر کی نوّے فیصدی رعایا مسلمان تھی لیکن راجہ ہندو تھا، اس لیے وہاں بھی ہندوستان کی فوج بھیج دی گئی۔ ہندوستان کے حکمران بھی ہندو تھے، اکثریت بھی ان کی تھی، اس لیے وہاں مسلم اقلیت کا مسئلہ اکال سینا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کو سونپ دیا گیا تھا۔

پٹیل کے منہ سے آگ برس رہی تھی۔ وہ ایک دِن کسی شہر میں تقریر کرتا اور اگلے دِن خبر آ جاتی کہ وہاں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو چکا ہے۔ جواہر لال نہرو کشمیر میں اپنی افواج کے شاندار کارناموں پر فخر کر رہا تھا اور گاندھی جی دنیا کو عدم تشدّد کی راگنی سُنا رہے تھے۔ ایک ہی ساز سے کئی سُر نکل رہے تھے۔ دیش بھگت گاندھی کی پوجا کرتے تھے۔ نہرو کی

عزّت کرتے تھے اور پٹیل کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو امن کے لیے گاندھی کی اپیلیں، فساد کے لیے پٹیل کی تقریریں اور جنگ کے سلسلے میں مہا منتری نہرو اور رکھشا منتری بلدیو سنگھ کے بیانات نشر کرتا تھا۔

گاندھی جی ابھی تک ہندو فاشزم کے جارحانہ مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں دنیا کی رائے عامہ کے سامنے ننگا ہونا پسند نہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ کشمیر کی جنگ میں نہرو کا پروگرام اب دونوں سے ہفتوں اور ہفتوں سے مہینوں میں تبدیل ہو رہا ہے۔ گاندھی نے سرحد کے شیروں کو پہلے چرخے کے منتر سے رام کیا تھا، اس کے بعد جب چرخے کا طلِسم ٹوٹا تو واردھا کے سامری نے پاکستان میں نسلیت کا بُت کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ سرحد میں ان کے چیلے نے پٹھانستان کا نعرہ لگایا اور چند دِنوں میں ہی یہ نعرہ ایک خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا۔ گاندھی کے مسلمان چیلے جو اکھنڈ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی غلامی کا طوق پہننے کے لیے بے قرار تھے، اب پٹھانوں کو پاکستان سے علیحدگی کا مشورہ دے

رہے تھے۔ طوفان سے پہلے آزاد خیال انسانوں کا یہ گروہ دس کروڑ مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے رسّے سے باندھ کر ہندو فاشزم کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا اور طوفان کے بعد یہ لوگ پاکستان کی چٹان کو نسلیت کے تیشوں سے پاش پاش کرنے کی فکر میں تھے۔

لیکن یہ سازش کامیاب نہ ہوئی۔ کشمیر کی جنگ کفر و اسلام کی جنگ میں تبدیل ہو گئی اور جب اسلام کی تلوار بے نیام ہوتی ہے تو سب سے پہلے نسلیت کے بُت توڑتی ہے۔ واردھا کے سامری کا نیا بُت کشمیر کی اس شاہراہ میں روندا گیا جہاں سرحدی قبائل، پنجابی، بلوچستان اور سندھی مجاہد کی ایک دوسرے سے کندھا ملائے آگے بڑھ رہے تھے۔

مہاتما گاندھی جنہوں نے ساری عمر ہندوؤں کو متحد کرنے اور مسلمانوں میں انتشار ڈالنے کے لیے جدوجہد کی تھی، اس صورتِ حالات سے پریشان تھے۔ وہ کشمیر میں فوجی اقدام سے پہلے پاکستان میں پٹھان اور غیر پٹھان کی تفریق ضروری سمجھتے تھے لیکن چیلوں کی جلد بازی نے ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑ ڈالا تھا۔ اب پٹھان کشمیر کی جنگ میں پیش پیش تھا۔ اب عالمِ

اسلام میں اضطراب کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اب کشمیر سے متعلّق وہ مقاصد ننگے ہو رہے تھے جن کی تکمیل کے لیے دہلی سے لے کر گورداسپور تک مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائی گئی تھیں۔

گاندھی جی زہر آلو خنجر پھولوں کی ٹوکری میں چھپانے کے قائل تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے چیلوں کا جوش و خروش اور ان کی جنگجُویانہ تقریریں مسلمانوں کی قوّتِ مدافعت کو بیدار کر رہی ہیں، اس لیے وہ قاتلوں کے منہ سے بھی ٹھنڈے اور میٹھے الفاظ سُننا چاہتے تھے۔ انہیں سانپ کے ڈسنے کا ملال نہ تھا لیکن سانپ کا پھنکارنا پسند نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پھنکارنے والا سانپ بالآخر مارا جاتا ہے۔ چنانچہ مشرقی پنجاب اور ریاستوں میں مسلمانوں کی مکمل تباہی اور دہلی سے لاکھوں مسلمانوں کی ہجرت کے بعد وہ برلا مندر میں امن شانتی اور عدم تشدّد کا درس دے رہے تھے۔

انہوں نے دنیا کی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے مرن برت بھی رکھا تھا لیکن ہندو قوم کے وہ تخریبی عناصر جنہیں گزشتہ برسوں میں

اسلام دُشمنی کے محاذ ہر متحد اور منظّم کیا گیا تھا، جنھوں نے پندرہ اگست کے بعد پوری آزادی کے ساتھ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی، اب کسی ظاہری یا رسمی رکاوٹ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیّار نہ تھے۔ چنانچہ ایک دِن خبر آئی کہ کسی سیوک سنگھ نے مہاتما جی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

ایک سپیرے نے ایک خوفناک اژدھا پالا تھا۔ شہر کے لوگ اس کے قریب جانے سے ڈرتے تھے۔ لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے یہ اژدھے کو شہر کے چوراہوں میں لے جاتا اور اپنی ٹانگیں اژدہے کے منہ میں ڈال کر لوگوں سے کہتا ”تم یونہی اس سے خوف کھاتے ہو۔ دیکھو وہ مجھے کچھ نہیں کہتا، میں اسے رام کر چکا ہوں، میں اس کی فطرت بدل چکا ہوں۔“

آہستہ آہستہ لوگوں کا خوف جاتا رہا۔ اس کے بعد سپیرا رات کے وقت اژدہے کو کھلا چھوڑ دیتا اور وہ جھونپڑی کے آس پاس بھولے بھٹکے مسافروں کو نکالنے کے بعد واپس آجاتا۔ اژدہے کی جرأت بڑھتی گئی اور

وہ کبھی کبھی لوگوں کے گھروں میں گھُس کر بھی اپنا شکار مار لیتا تھا۔ بالآخر شہر کے لوگوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے سپیرے سے شکایت کی۔ رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے سپیرے نے پھر ایک بار تماشائیوں کے سامنے اپنی ٹانگیں اژدہے کے منہ میں ڈال دیں لیکن اژدہا اب انسان کے گوشت اور خون کا ذائقہ چکھ چکا تھا اور سپیرے کا گوشت دوسرے انسانوں سے مختلف نہ تھا۔ وہ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے سپیرے کو نگل گیا۔

مہاتما گاندھی کا انجام اس سپیرے سے مختلف نہ تھا۔ گاندھی جی وحشت اور بربریت کے سیلاب کے بند ٹوٹ جانے کے بعد سرکش لہروں کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں ضبط و نظم کی تعلیم دے رہے تھے۔ ایک لہر آئی اور انہیں بھی اپنے ساتھ بہا لے گئی۔

☆☆☆☆☆

موسم بہار کی ایک صبح عصمت اور راحت راولپنڈی میں سڑک کے کنارے ایک مکان کے پھاٹک میں کھڑی کشمیر جانے والے مجاہدین کو دیکھ رہی تھیں۔ لوگ سڑک کے کنارے اللہ اکبر اور مجاہدینِ کشمیر زندہ

باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ لوگ مختلف مقامات سے کشمیر، پاکستان اور عالمِ اسلام کی طرف سے پٹیل اور نہرو کو جواب دینے آئے تھے، یہ لوگ اپنی دیسی رائفلوں سے دُشمن کے ٹینکوں، طیاروں اور توپوں کا مقابلہ کرنے آئے تھے۔ عصمت اور راحت ان بجلیوں کو دیکھ رہی تھیں جنہیں مشرقی پنجاب کی راکھ سے جنم دیا تھا۔

مجاہدین کا لشکر گزر گیا اور عصمت آبدیدہ ہو کر کہہ رہی تھی۔ ”میرے بھائیو! بڑھے چلو خدا تمہیں محمود غزنوی کا عزم اور محمد بن قاسم کی غیرت عطا کرے۔ تمہیں کشمیر میں بے گناہوں کا خون پکار رہا ہے۔ تمہیں مشرقی پنجاب کی مساجد بلا رہی ہیں۔ تمہیں لال قلعے کی دیواریں یاد کر رہی ہیں۔ میری قوم کے بیٹو تمہیں قوم بیٹیوں کی لٹی ہوئی عصمت کا واسطہ بڑھے چلو!“

ایک تانگہ مکان کے سامنے رُکا اور ڈاکٹر شوکت اُتر کر چمڑے کا ایک بیگ لیے پھاٹک کی طرف بڑھے۔

”ابّا جان! ابّا جان!“ راحت اور عصمت نے یک زبان ہو کر کہا۔

ڈاکٹر شوکت صحن میں داخل ہوئے۔ راحت نے ان کے ہاتھ سے بیگ پکڑ لیا اور قدرے حیران ہو کر کہا۔ ”ابّا جان! یہ بہت بھاری ہے۔ کیا ہے اس میں؟“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”بیٹی! اس میں تمہاری بہن کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔“

عصمت نے کہا۔ ”کیا ہے ابّا جان؟“

”ٹھہرو آپا جان! میں کھولتی ہوں۔“ راحت یہ کہتے ہوئے بیگ زمین پر بیگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ بیگ میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک کتاب نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو سب کتابیں ہیں!“

کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں ”اے قوم!“ لکھا ہوا تھا۔ عصمت نے دیکھتے ہی راحت کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”سلیم کا ایک دوست لاہور میں یہ کتابیں چھپوانے کے لیے آیا تھا۔ پچھلے ہفتے وہ مجھے پچاس جلدیں دے گیا تھا۔ کچھ میں نے تقسیم کر دی ہیں اور باقی تمہارے لیے لے آیا ہوں۔ انہیں تقسیم کر دو۔ پچھلے ہفتے سلیم کا خط آیا تھا، وہ میں نے تمہیں بھیج دیا تھا۔“

"جی ہاں! وہ مجھے مل گیا ہے۔"

"ارشد کہاں ہے؟"

"جی! وہ آج بہت سویرے ہسپتال چلے گئے تھے۔"

راحت نے کہا۔ "ابّا جان! چلیں اندر بیٹھیں۔"

"نہیں بیٹی! میں اب جا رہا ہوں۔"

"کہاں ابّا جان؟" عصمت نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"بیٹی! میں پانچ ڈاکٹروں کے ساتھ کشمیر کے محاذ پر جا رہا ہوں۔ لاہور کے چند تاجروں نے ہمیں دو ایمبولینس گاڑیاں اور دس ہزار روپے کی دوائیں خرید کر دی ہیں۔ ہمیں شام سے پہلے روانہ ہونا ہے۔ میرے ساتھی اسٹیشن کے قریب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اب میں کسی بڑی خدمت کے قابل نہیں رہا۔ لیکن سلیم کی اس تقریر نے مجھے پھر جوان بنا دیا ہے۔ میں اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

ڈاکٹر شوکت نہیں خدا حافظ کہہ کر دوبارہ ٹانگے میں بیٹھ گئے۔

عصمت کتاب کے صفحات اُلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی کمرے میں پہنچ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور شروع سے پڑھنے لگی۔ دوسرے کمرے میں راحت ذرا بُلند آواز سے پڑھ رہی تھی۔ عصمت نے اسے آواز دی

"راحت! آہستہ پڑھو!"

راحت چند منٹ خاموش رہی لیکن پھر اسی طرح بُلند آواز میں پڑھنے لگی۔ عصمت نے اسے پھر ٹوکا۔ راحت نے کمرے سے ایک کرسی اٹھائی اور صحن میں ایک درخت کے نیچے جا بیٹھی۔

اس کتاب کے پہلے حصّے میں پندرہ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کے واقعات پر تبصرہ تھا۔ دوسرے حصّے میں مصنف نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام کے چشم دید حالات بیان کیے تھے اور آخری حصّے میں قوم کے نام سلیم کا پیغام تھا۔ وہ پیغام یہ تھا:

"اے قوم! تو نے تاریخِ انسانی کا سب سے تاریک دور دیکھا ہے۔ دنیا میں

ظالم اور مظلوم کی داستان بہت پرانی ہے۔ انسانیت کے خرمن پر کئی بجلیاں ِگری ہیں۔ باغِ آدم میں کئی آندھیاں آئی ہیں۔ وحشت اور بربریت کے ہاتھوں نے بارہا انسانیت کا منہ نوچا ہے۔ لیکن آگ اور خون کا جو کھیل تو نے دیکھا ہے، وہ کسی اور نے نہیں دیکھا۔

تیرا ادیب اور تیرا شاعر تجھے دلکش افسانے اور میٹھے راگ سنانے کے لیے آیا تھا لیکن تو خاک اور خون میں لوٹ رہی تھی۔ وہ تیری محفل میں کلیوں کی مُسکراہٹوں اور قمریوں کے ترانوں کا طلب گار تھا لیکن اس کے سامنے خون کی ندیاں، راکھ کے انبار اور لاشوں کے ڈھیر تھے۔ وہ تیرے قدموں پر ستاروں کی مُسکراہٹیں، قوس قزح کے رنگ اور روئے زمین کی تمام دلفریبیاں اور رعنائیاں نچھاور کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے سامنے لُٹی ہوئی نعمتیں تھیں۔

اے قوم! میں تیرے لیے مشرقی پنجاب سے آگ کی چنگاریاں لے کر آیا ہوں جو تیرے بچّوں کو جلا چکی ہے۔ میں تیرے لیے ان کی پھٹی ہوئی قباؤں کے ٹکڑے لے کر آیا ہوں جو تیری بیٹیوں کی عصمت کے خون

سے داغ دار ہیں۔ میں تجھے دلکش نغمے نہیں بلکہ وہ جگر دوز چیزیں سُنانے آیا ہوں جو اب تک دہلی اور مشرقی پنجاب کی فضاؤں میں گونج رہی ہیں۔ میں تیرے ساتھ آگ سے کھیل چکا ہوں۔ خون میں نہا چکا ہوں۔ میرا ماضی اور حال تیرے ماضی اور حال سے وابستہ ہے اور میرا مستقبل تیرے مستقبل سے جدا نہیں۔ تیرے لیے میرا نام اس ادیب اور شاعر کا پیغام نہیں جو اپنی عقل کی تاریکیوں سے گھبرا کر منہ پھیر لیتا ہے اور غیروں کے عشرت خانوں میں سکون تلاش کرتا ہے۔ میں تیرے ساتھ گرا ہوں اور تیرے ساتھ اُٹھوں گا۔ میں تلخ حقائق پر تصوّرات کے حسیں پردے نہیں ڈالوں گا۔ دہلی سے لے کر مشرقی پنجاب کے آخری کونے تک ہمارے شہر برباد کیے گئے۔ ہماری بستیاں تباہ کی گئیں۔ ہمارے گھر جلائے گئے۔ معصوم بچّوں کو نیزوں پر اُچھالا گیا۔ لاکھوں انسان قتل ہوئے۔ ہزاروں عورتیں چھینی گئیں۔ وہ زمین جس پر ہم نے آٹھ صدیاں سطوت اور اقبال کے پرچم لہرائے تھے، ہماری بے گور و کفن لاشیں دیکھ رہی تھی۔ وہ آسمان جس نے غازی محمد بن قاسم کی غیرت کے سامنے راجہ داہر کو سرنگوں دیکھا تھا، جس نے محمود غزنوی اور غوری کا جاہ و جلال دیکھا تھا،

ہماری ذلّت، رسوائی اور بے بسی کا تماشہ دیکھ رہا تھا لیکن کیا یہ سب کچھ بلا وجہ تھا؟ کیا یہ اتّفاقی حادثہ تھا؟

نہیں۔ یہ بلا وجہ نہ تھا۔ یا اتّفاقی حادثہ نہ تھا۔ قانونِ قدرت میں اقوام کے عروج وزوال کی راہیں معیّن ہیں۔ عزّت اور سر بُلندی ان کے لیے ہے جو فلاح وترقّی کے راستوں میں گامزن ہوتے ہیں اور جو پستی کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ بالآخر ذلّت کے گڑھوں میں گِر جاتے ہیں۔ قانونِ قدرت میں کسی قوم کا اجتماعی عمل رائگاں نہیں جاتا۔ مشرقی پنجاب کی تباہی اور بربادی ہماری اپنی کوتاہیوں، غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں کی سزا تھی۔ ہم نے بھیڑوں کی زندگی اختیار کی اور بھیڑیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ ہماری کوتاہی اور خود فریبی کے باعث ایک ایسے دُشمن کی تلوار ہماری شاہ رگ تک پہنچ گئی تھی جس کے مذہب اور اخلاق میں کمزور کے لیے رحم یا انصاف کی گنجائش نہ تھی۔ ہمارا دُشمن وہ تھا جسے منوجی جیسے اُستادوں نے ملک گیری کے آداب سکھائے تھے۔۔۔ ہمارا دُشمن وہ تھا جس نے دنیا میں سب سے پہلے نسلیت کا بُت کھڑا کیا تھا، جس نے کمزور انسانوں کو

مغلوب کر کے اچھوت بنایا تھا اور ان کے خون اور ہڈیوں پر اپنے سماج کی بنیادیں کھڑی کی تھیں۔ صدیوں کے بعد انسانیت کا یہ دشمن ماضی کے کھنڈروں میں ایک نئے سماج کی بنیادیں کھود رہا تھا اور ان بنیادوں کو پُر کرنے کے لیے اس نے مسلمان کا خون اور ہڈیاں منتخب کی تھیں۔ ہندو کے نئے اتحاد و تنظیم کی بنیاد اسلام دُشمنی کے جذبہ پر رکھی گئی تھیں۔ ہم سب کچھ دیکھ رہے تھے لیکن ہم ماضی سے بے نیاز، حال سے غافل اور مستقبل سے بے پرواہ تھے۔

ہمیں مورچہ بنانے کی اس وقت فکر ہوئی جب دشمن گولہ باری شروع کر چکا تھا۔ ہمیں بند لگانے کا اس وقت خیال آیا، جب سیلاب آ چکا تھا۔

ہم دِن کے وقت سو رہے تھے، دُشمن آیا، اس نے ہمیں رسّیوں میں جکڑ دیا اور ہمارے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ ہم بے بس تھے۔۔۔ ہم مجبور تھے۔۔۔ ہم احتجاج کر رہے تھے۔ ہم التجائیں کر رہے تھے۔ ہم نے دنیا کی رائے عامہ سے اپیلیں کیں۔ ہم غیر جانب دار مبصرین کو اپنی مظلومیت کا حال دیکھنے کی دعوت دے رہے تھے لیکن ہمیں معلوم ہوا کہ

جہاں جنگل کا قانون ہو، وہاں فقط شیر کی گرج سُنی جاتی ہے، بھیڑ کی ممیاہٹ پر کوئی کان نہیں دھرتا۔

درد مندانِ قوم قراردادوں، احتجاجوں اور بیانوں کے نسخے آزما رہے تھے۔۔۔ بہار میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا تو انہوں نے احتجاج کیا۔ گڑھ مکھتیشر کی باری آئی تو انہوں نے سخت احتجاج کیا۔۔۔ پنجاب کی ریاستوں اور دہلی میں تباہی اور بربادی کا طوفان پھوٹ نکلا تو انہوں نے الفاظ کے تمام خزانے لُٹا دیے۔۔۔ احتجاج کرنے والوں کے گلے بیٹھ گئے، الفاظ کے ذخیرے ختم ہو گئے لیکن تباہی اور بربادی کے طوفان کی رفتار کم نہ ہوئی۔

ہمارے پاس الفاظ کی کمی نہ تھی۔ ہمارے پاس بین الاقوامی شہرت کے مقرر تھے لیکن ٹریجڈی یہ تھی کہ پاکستان کا اسلحہ ماؤنٹ بیٹن کے پاس امانت تھا۔ ٹریجڈی یہ تھی کہ پاکستان کی افواج باہر تھیں اور سب سے بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ انگریز کی سیاست انسانیت کے سب سے بڑے دُشمن کو دہلی کے تخت پر بٹھا چکی تھی۔

اے قوم! ہم بد دیانتی اور بے انصاف کا شکار ہوئے ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری کمزوری اور بے بسی نے ہمیں ان عدالتوں کے فیصلوں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا جن سے عدل و انصاف کی اُمّید رکھنا ایک خود فریبی تھا۔

ہم نے کفر کو اسلام کا دوست سمجھ کر صدیوں کے تاریخی حقائق کو جھٹلایا تھا۔ ماضی کی تاریخ شاہد ہے کہ غیر اسلامی نظام میں عدل و انصاف کی کرسیوں پر بیٹھنے والوں نے ہمیشہ مظلوم کے آنسوؤں سے ظالم کے قہقہوں کا سامان مہیّا کیا ہے۔ عدل و انصاف صرف ان کے لیے ہے جو بے انصافیوں کے خلاف لڑنے کی ہمّت رکھتے ہیں۔

اے قوم! تیرے درد کا علاج بین الملکی کانفرنسوں میں نہیں۔ تیرا دُشمن حالات کے مطابق اپنا طریقِ کار بدلتا رہتا ہے لیکن اس کے مقاصد میں تبدیلی نہیں آتی۔۔۔ وہ ہندوستان کی تقسیم پر رضامند نہ تھا لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ ماؤنٹ بیٹن اس کی کشتی میں بیٹھ چکا ہے اور اس کا طریقہ کار بالآخر تقسیم کے حقیقی مقصد کو فوت کر دے گا تو اس نے تقسیم

کا اصول مان لیا اور تو خوش ہو گئی کہ مجھے کسی قربانی کے بغیر پاکستان مل گیا ہے۔ دُشمن نے اپنے ترکش کا نیا تیر نکالا اور دہلی سے مشرقی پنجاب کے آخری کونے تک قتل و غارت کا طوفان برپا کر دیا اور اس کے ساتھ ریڈ کلف ایوارڈ کا خنجر تیرے سینے میں گھونپ دیا گیا۔ تیرے سپاہی باہر تھے، تیرا اسلحہ ہندوستان میں روک لیا گیا تھا اور تیرے وہ ہاتھ جو مدافعت کے لیے اٹھ سکتے تھے، پہلے ہی باندھ دیے گئے تھے۔ ان حالات میں تیرے لیے تاریخ انسانی کی سب سے بڑی بے انصافی اور ظلم کے سامنے سر جھکا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور پھر تجھے اُمّید تھی کہ یہ ریڈ کلف کا فیصلہ مان لینے کے بعد تیرا دُشمن تیری امن پسندی اور نیک نیّتی پر خوش ہو جائے گا۔ لیکن یہ ایک اور خود فریبی تھی۔ تو یہ سمجھتی تھی کہ مشرقی پنجاب کا طوفان وہیں رُک جائے گا لیکن وہ طوفان دہلی میں پہنچ گیا اور پھر امن پسندوں کا ایک گروہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلّیاں دے رہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کا کوئی امکان نہیں۔ یہ دونوں کے لیے خودکُشی کے مترادف ہو گا۔۔۔ لیکن ہندوستان نے دوسرا اقدم اٹھایا اور کشمیر پر حملہ کر دیا۔۔۔ تو دنیا کی رائے عامہ کے سامنے دُشمن کے

ظلم و استبداد اور اپنی صلح جوئی اور امن پسندی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھی کہ ہندوستان کی فوجیں جونا گڑھ میں داخل ہوئیں۔

اے قوم! تیرے فرزانے دنیا کی رائے عامہ سے اپیلیں کر رہے تھے۔ کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی پر دِن دہاڑے ڈاکہ ڈالا جا رہا تھا۔ لیکن امنِ عالم کے اجارہ دار خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر تیرے دیوانوں کو ہوش آیا۔ مظلومیت، بے بسی اور مجبوری کی انتہا دیکھنے کے بعد تیری ڈوبتی ہوئی نبضوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگا۔ تیرے شاہین صفت جوانوں نے تیری پکار سُنی۔ تیرے محمد بن قاسم، تیری بیٹیوں کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسوؤں کی تاب نہ لا سکے۔ ہندوستان میں سومنات کے نئے پجاریوں نے تیرے فرزندوں میں پھر ایک بار غزنوی کی روح بیدار کی۔۔۔۔ اور کشمیر کی وادیوں میں تیرے شیروں کی گرج سنائی دینے لگی۔ تیرے فرزانے ابھی ساحل سے محوِ تماشا تھے کہ تیرے دیوانے بے خطر دریا میں کود پڑے اور موجوں سے کھیلتے ہوئے منجدھار تک جا پہنچے۔ نہرو کی افواج چھ دِن کے اندر اندر مجاہدین کی قوّتِ مدافعت کچل دینے کے

عزائم سے میدان میں آئی تھیں لیکن وہ تلواریں جن کی تیزی مشرقی پنجاب میں نہتے اور بے بس انسانوں کی گردن پر آزمائی گئی تھی کشمیر میں کند ثابت ہو رہی تھیں۔

پٹیل، نہرو اور بلدیو ہر روز یہ اعلان کرتے تھے۔ "شاباش بہادرو! بھارت ماتا کو تم پر فخر ہے۔" لیکن بھارت ماتا کے قابلِ فخر بیٹے حیران تھے کہ ان کے سامنے نہتوں کو کیوں نہیں ڈالا گیا۔ ہندوستانی حکومت پاکستان سے شکایت کر رہی تھی کہ اس نے قبائلی اور سرحد کی رضاکاروں کو سرحد پر کیوں نہیں روکا۔ کوٹلی، میرپور اور اکھنور میں ہندوستانی فوج کے دانت کھٹّے ہو چکے تھے۔ اُڑی اور پونچھ کے محاذوں پر ہندوستانی فوج اپنی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے باوجود مار رکھا رہی تھی۔ مجاہدین کی بے سروسامان فوج اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اسلحہ چھین رہی تھی۔ اقبال کی روح کشمیر کی وادیوں اور پہاڑیوں میں غازیوں کا خیر مقدم کر رہی تھی اور ہندوستان کے مہاجن بہی کھاتے کھول کر اپنے نقصانات کا اندازہ لگا رہے تھے۔

سرحدی عتاب جموں سے صرف چند میل دور تھے۔ کشمیر کے طارق اور خالد پھر ایک بار اپنے اسلاف کی روایات زندہ کر رہے تھے۔ اب سنگینوں کے جواب میں احتجاج کی بجائے تلواریں تھیں۔ اب ہندوستان یو این او کے سامنے فریاد کر رہا تھا۔

جب پاکستان کہتا تھا کہ کشمیر کا معاملہ بین الاقوامی عدالت کو سونپ دیا جائے تو ہندوستان پاکستان کی آواز پر کان دھرنے کے لیے تیّار نہ تھا لیکن اب وہ سات سمندر پار جا کر یو این او کے سامنے فریاد کر رہا تھا۔۔۔۔ بھیڑیے کو یہ شکایت تھی کہ اسے مشرقی پنجاب، دہلی اور جونا گڑھ کی طرح کشمیر میں بھی بھارت ماتا کی آزادی کا جشن منانے کی اجازت کیوں نہیں دی گئی۔ بھیڑیوں کا نمائندہ امنِ عالم کے اجارہ داروں سے اپیل کر رہا تھا کہ تم پاکستان کو حکم دو کہ وہ آزاد کشمیر کی فوج کو ہماری شکار گاہ سے نکال دے۔ تم کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمانوں کو جکڑ کر ہمارے سامنے ڈال دو اور پھر ہمارے ہاتھ دیکھو۔

آج کشمیر کا مسئلہ سیکورٹی کونسل کے سامنے ہے۔ پاکستان کی وکالت اس

کے بہترین دماغ کر رہے ہیں۔ ہندوستان دنیا کی رائے عامہ کے سامنے ننگا کھڑا ہے، لیکن ہمیں نادانی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یو این او امنِ عالم کے اجارہ دار ہمارے ساتھ اسی صورت میں انصاف کریں گے، جب کہ ہم میں بے انصافیوں کے خلاف لڑنے کی ہمّت اور طاقت ہو گی۔ آج اگر یو این او میں ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی آواز بھی سنی جا رہی ہے تو ہمیں ان مجاہدوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر دنیا کے سامنے کشمیر کے مسئلے کی اہمیّت واضح کر دی ہے، جنہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستان جو بین الاقوامی دھڑے بندیوں کے باعث جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی رہنمائی کے خواب دیکھ رہا تھا، کشمیر کی دلدل میں پھنس چکا ہے۔۔۔ لیکن ابھی کشمیر کی جنگ ختم نہیں ہوئی اور ہمیں اس خود فریبی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوستان نے کشمیر کے منصفانہ حل کے لیے بین الاقوامی انجمن کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ ہندوستان نے مجبوری کی حالت میں فقط اپنا طریقِ کار بدلا ہے۔ گزشتہ نقصانات کے بعد اسے کشمیر پر فیصلہ کُن حملے کے لئے تیّاری کی ضرورت تھی۔ کشمیر کی برف باری اور سردی نے اس کے سپاہیوں کے حوصلے ٹھنڈے کر دیے

تھے۔

سردیوں میں ہندوستانی فوج سامانِ رسد اور بارود کے ذخیرے جمع کر رہی تھی۔ نئے پُل اور نئی سڑکیں تعمیر کر رہی تھی اور موسمِ بہار کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان اپنی پوری طاقت کے ساتھ نیا حملہ کر چکا ہے۔ جوناگڑھ کو ہڑپ کرنے کے بعد اسے یقین ہو چکا ہے کہ امنِ عالم کے اجارہ داران فیصلوں کو نہیں رد کر سکتے جو طاقت کے بل بوتے پر منوائے جاتے ہیں۔

پاکستان کو بالآخر کشمیر کی جنگ میں کودنا پڑے گا۔ مجاہدین کشمیر تیّاری کے لیے جو تھوڑا بہت موقع دے رہے ہیں، پاکستان کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی مظلومیت اور بے کسی کا ڈھنڈورا پیٹ کر یو این او کو کشمیر کے معاملہ میں عملی مداخلت پر مجبور کر دیں گے۔ انہیں فلسطین سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔۔۔ فلسطین میں امنِ عالم کے اجارہ داروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کمزور اقوام کو ان سے عدل و انصاف یا رحم کی اُمّید نہیں رکھنی چاہیے۔۔۔ عرب ممالک فلسطین پر یہود کی

یلغار کے سامنے مضبوط محاذ نہ بنا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیکورٹی کونسل نے بھی تقسیم فلسطین کی حمایت کی۔۔۔ اینگلو امریکن بلاک کی یہ یہود نوازی کے بعد دنیا کا خیال تھا کہ روس ان ناانصافی کی مخالفت کرے گا لیکن یہ پہلا فیصلہ تھا جس پر کمیونسٹ اور سرمایہ دار دونوں متّفق تھے۔ ایک اجنبی قوم کو مسلمانوں کے گھروں میں لاکر بٹھادیا گیا۔

فلسطین کے مسلمانوں کا جرم یہ تھا کہ ان کی منطق کمزور تھی۔ جرم تھا کہ وہ اپنے گھر کی حفاظت نہ کر سکے۔ ان کے پاس وہ تلوار نہ تھی جو غیر منصفانہ فیصلے کو رد کر سکتی۔

حالات اب پاکستان کو مفروضات کی دنیا میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کشمیر پر ہندوستان کے نئے حملے کی شدّت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اسے بھی جوناگڑھ کی طرح ایک فیصلہ شدہ امر بناکر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اور تلوار کا فیصلہ منطق سے نہیں، صرف تلوار سے رد کیا جاتا ہے۔۔۔ مجاہدین نے اپنی بے سر و سامانی کے باوجود جس عزم و استقلال کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر کی جنگ پاکستان کی جنگ ہے۔ یہ صرف کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمانوں کا نہیں بلکہ پوری قوم کی بقا کا مسئلہ ہے، یہ ہندوستان کے برصغیر میں کفر اور اسلام کا آخری معرکہ ہے۔ اس اجتماعی جنگ کی ذمہ داری صرف کشمیر کے مٹھی بھر بے سر و سامان مجاہدین پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ ہمیں مجاہدوں کے بازو شل ہو جانے اور ان کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک بہہ جانے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ آزاد کشمیر کی رائفلیں ایک لامتناہی عرصہ تک دُشمن کے ٹینکوں اور طیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔۔۔۔۔ کشمیر پاکستان کی بیرونی فصیل ہے۔ اگر دُشمن کی یلغار کو وہاں نہ روکا گیا تو وہ کشمیر کو ختم کرنے کے بعد پاکستان پر حملہ کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

ہندوستان نے دہلی اور مشرقی پنجاب سے لاکھوں مسلمانوں کو ملک بدر کیا تو وہ مغربی پاکستان آ گئے۔ بہار اور مغربی بنگال کے مسلمان مشرقی پاکستان میں پناہ لے رہے ہیں۔ ہندوستان نے جونا گڑھ پر چڑھائی کی تو وہاں سے مسلمانوں کے قافلے کراچی اور سندھ پہنچنے لگے۔ کشمیر میں ہندوستانی فوج

داخل ہوئی تو کشمیری مہاجرین کے لیے مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں کیمپ کھل گئے۔۔۔۔ پاکستان مہاجرین کی جائے پناہ ہے، پاکستان انصار کا قلعہ ہے۔ پاکستان وہ ساحل ہے جہاں ہم خون کے دریا عبور کرنے کے بعد پہنچے ہیں۔ پاکستان وہ منزل ہے جس کے راستوں کی کھائیاں ہم نے اپنی لاشوں سے پاٹی ہیں۔۔۔۔ پاکستان وہ چار دیواری ہے جس کے اندر قوم کی منتشر قوّتیں جمع ہو رہی ہیں اور پاکستان کے انصار اور مہاجرین کے لیے یہ سوچنے کے لیے بہت تھوڑا وقت ہے کہ اگر وہ کفر کے سیلاب کو اس چار دیواری سے دور نہ رکھ سکے تو اس کا انجام کیا ہو گا۔

اب تلخ حقائق پر تصوّرات کے حسین پردے ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب قوم کا دل بہلانے کے لیے لیڈروں کا یہ نعرہ کافی نہیں کہ ہم نے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست تو قائم کر لی ہے، بلکہ اب انہیں قوم کی آنکھیں کھولنی چاہئیں کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست انسانیت کے سب سے بڑے دُشمن کا سامنا کر رہی ہے۔ یہ اس قوم کی میراث ہے، اس کے اسلاف نے آٹھ صدیاں پشاور سے لے کر راس کماری تک اپنی

سطوت اور اقبال کے پرچم لہرائے ہیں۔۔۔۔ یہ دورِ زوال کی دو صدیوں میں رجعت قہقری کے بعد ہمارا آخری دفاعی مورچہ ہے۔۔۔۔ یہ ہماری اُجڑی ہوئی محفل کا آخری چراغ ہے۔۔۔ یہ ہمارے خزاں رسیدہ چمن کا آخری درخت ہے۔۔۔ اور اب دُشمن اس درخت کی جڑیں کاٹنے اور اس چراغ کو بجھانے کی فکر میں ہے۔۔۔ ہم اپنی تاریخ کے بھیانک ترین حوادث کا سامنا کر رہے ہیں اور ان حوادث کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اپنی تمام قوّتیں اور صلاحیتیں دفاع پر مرکوز کر دیں۔ پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو اپنی بقا کی جنگ میں ایک متحدہ محاذ پر لانے کے لیے وہ تمام خامیاں دور کرنی پڑیں گی جو غریب کو امیر سے دور رکھتی ہیں۔ جو محنت کش اور سرمایہ دار کی متحد مساعی میں مانع ہیں۔ مرمریں ایوانوں اور جھونپڑوں میں رہنے والوں کو ایک ہی خندق اور ایک ہی مورچے میں کھڑا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان طبقاتی اختلافات کو دور کریں جو اقتصادی وسائل کی غیر مساوی تقسیم کے باعث پیدا ہو چکے ہیں۔

اب ہم اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے پیچھے ہٹنا ہمارے لیے تباہ کُن ہو

گا۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم محاصرے کی صورت میں ہیں اور اگر دُشمن کو کشمیر پر قابض ہونے کی اجازت دی گئی تو یہ گھیرا اور تنگ ہو جائے گا۔ جو قوم صرف اپنے مورچے میں بیٹھ کر مدافعانہ طریق کار پر عمل کرتی ہے اور آگے بڑھ کر دُشمن کے جارحانہ اقدام کو نہیں روکتی ہمیشہ نقصان اُٹھاتی ہے، جنگ میں صرف دُشمن کا وار روکنے پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی ہر ضرب کے جواب میں ضرب لگائی جاتی ہے۔

ہندو کانگریس کے ساتھ بقا کی جنگ میں گزشتہ چند برس سے ہمارا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ ہر بار موقع ملنے پر وار کرتا رہا اور ہم روکنے پر اکتفا کرتے رہے۔ ہمارے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان ہماری پیش قدمی کا نقطۂ آغاز بننے کی بجائے ہماری پسپائی کا آخری نقطہ ان گیا۔۔۔۔ صلح اور امن کی خاطر ہم اتنا کچھ کھو کر بھی ہندو کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے اور اب گزشتہ تجربات کے باوجود بھی اگر ہم خوش فہمیوں اور غلط اندیشوں کا شکار ہوئے تو ہماری حالت ان لوگوں سے مختلف نہ ہو گی جو دِن کی روشنی میں بھی آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں اور اب ہمیں اس

بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ ہندو اپنے ترکش سے نیا تیر نکال لے۔ بلکہ ہمیں اپنے ترکش کے تیروں کا جائزہ لینا چاہیے۔

اے قوم! مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہوا، وہ فرقہ وارانہ فساد کا نتیجہ نہ تھا۔ تاریخ انسانی کے اس عظیم ترین قتلِ عام کے لیے فرقہ وارانہ فساد کا لفظ پروپیگنڈا کے فن کے ان اُستادوں کے دماغ کی اختراع ہے، جنہوں نے دنیا کی نگاہوں کے سامنے اہنسا پرمودھرم کا نقاب ڈال کر بدترین بھیڑیوں کی فوج تیّار کی تھی۔ مشرقی پنجاب، دہلی، بھرت پور اور پٹیالہ فرید کوٹ، نابھہ اور کپورتھلا کے اسٹیج پر جو خونیں ڈرامہ کھیلا گیا، اسے فرقہ وارانہ فساد سے کوئی نسبت نہ تھی۔

یہ وہ قتلِ عام تھا جس کی سرپرستی اور رہنمائی بھارت کی حکومت، بھارت کی فوج اور پولیس اور بھارت میں ریاستوں ہونے والی ریاستوں کے حکمران کر رہے تھے۔ نہرو اور پٹیل سے لے کر ایک سیوا سنگھی اور بلدیو سنگھ سے لے کر ایک اکالی رضاکار تک سب مسلمانوں کے قتلِ عام میں شریک تھے۔۔۔۔ یہ قتلِ عام ہندوستان سے مسلمانوں کے مکمل

استیصال کے منصوبے کی ایک کڑی تھی۔

لیکن پاکستان میں ابھی تک ایسے لوگ ہیں جو ہر حالت میں پٹیل اور نہرو کی قباؤں سے خون کے داغ دھونا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اس قوم کو پھر ایک بار تھپکیاں دے کر سُلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تقسیم سے پہلے جب کانگرس مسلمانوں پر آخری ضرب لگانے کے لیے ہندو اور سکھ قوم کے تخریبی عناصر کو منظّم کر رہی تھی تو غلط اندیش لوگوں کا ایک گروہ مسلمانوں کو یہ کہہ کر لوریاں دیا کرتا تھا کہ ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ارادوں کے متعلّق شک نہیں کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم رجعت پسندی ہے، تنگ نظری ہے، گاندھی بڑا اچھا آدمی ہے، اس لیے مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں۔۔۔۔ تقسیم کے بعد ان لوگوں کی جگہ ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ میدان میں آ گیا ہے۔ اب یہ لوگ ہندو فاشزم کی صفائی پیش کر رہے ہیں۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ اوّل تو مشرقی پنجاب کے عبرت ناک واقعات کا ذکر نہ کیا جائے، اگر کیا بھی جائے تو پچاس فیصد کی ذمہ داری

ہندوؤں اور سکھوں پر ڈال دی جائے اور پچاس فیصدی مسلمانوں پر اور یہ اس لیے کہ مسلمان مشرقی پنجاب کے بھیانک واقعات سے عبرت حاصل کر کے ہندو فاشزم کے سیلاب کے مقابلہ میں اپنی اجتماعی قوّت بروئے کار نہ لا سکیں۔ ہندوستان جوناگڑھ کو ہڑپ کر چکا ہے۔ کشمیر کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے اور ہندوستان سے مسلمانوں سے مکمل استیصال کے منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد پاکستان پر آخری ضرب لگانا چاہتا ہے۔

ان ادیبوں اور شاعروں کے لیے مسلمان کی عزّت اور آبرو، جان اور مال کا کوئی مسئلہ نہیں۔ دس پندرہ لاکھ انسانوں کا قتل بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔۔ قوم کی ہزاروں چھینی ہوئی بہو بیٹیوں کا مسئلہ ان کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ سیاسی، روحانی اور اخلاقی یتیم ادب کے نام سے کوکین کی تجارت کرتے ہیں اور پاکستان کے بعض ادارے صرف ہندوستان میں چند کتابیں بیچنے کے لیے ان کوکین فروشوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

اجتماعی آلام و مصائب کا سامنا کرنے کے لیے انتہائی جدوجہد کی ضرورت

ہے اور اجتماعی جدوجہد، اجتماعی شعور، اجتماعی فکر اور اجتماعی کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ مشرقی پنجاب کے تباہی کے بعد پاکستانی مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ اگر ہم ہندو فاشزم کی یلغار کے سامنے اپنی اجتماعی قوّت بروئے کار نہ لا سکے تو پاکستان کی سرزمین پر بھی مشرقی پنجاب، دہلی اور جوناگڑھ کی تاریخ دہرائی جائے گی۔۔۔ اجتماعی خطرے کا احساس قوم کے نوجوانوں کو کشمیر کے میدان میں لے آیا ہے۔ یہاں وہ جنگ لڑی جا رہی ہے جس پر کشمیر کے پینتیس لاکھ مسلمانوں کے علاوہ پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندوں کی زندگی کا دار و مدار ہے، یہاں انسانیت اور عالمِ اسلام کے لیے سب سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ صرف اس خطۂ زمین کا مسئلہ نہیں جو جغرافیائی طور پر پاکستان کا حصّہ ہے۔ جس کی وادیوں میں پاکستان کی زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں بلکہ یہ ایک پوری قوم کی بقا آزادی اور عزّت کا مسئلہ ہے۔ یہ آگ اور خون کے اس ڈرامے کا ایک سین ہے جس کا آخری ایکٹ ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور پٹیل پاکستان کے سٹیج پر کھیلنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں قوم کے سپاہی کی تلوار اور قوم کے ادیب کے قلم کا راستہ ایک ہے۔ متحدہ قومیت کے مارفیا

کا انجکشن دینے والے سیاست دانوں کی جماعت قوم کو اس وقت تھپکیاں دے کر سلایا کرتی تھی جب افق پر طوفان کے آثار ظاہر ہو رہے تھے لیکن کوکین فروش قسم کے ادیبوں اور شاعروں کی یہ جماعت طوفان کی تباہ کاریوں کے سامنے بھی قوم کی آنکھوں پر پٹّی باندھ رہی ہے۔ ان کے سیاسی پیش رو اُونگھتے ہوئے مسلمان کو خواب آور گولیاں کھلاتے تھے اور یہ جاگتے ہوئے مسلمان کے حلق میں کوکین ٹھونس رہے ہیں۔ ان کے لیے مسلمانوں کی آزادی کا مسئلہ نہ تھا اور اب ان کے اذہان کی نئ قدروں اور نئے زاویوں میں مسلمانوں کی زندگی اور موت کی کوئی حقیقت نہیں۔

نقالوں کے اس گروہ کو تقسیم سے پہلے بھی مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ ان کا نصب العین ان اخلاقی اور روحانی قدروں کی تخریب تھا جن پر دینِ اسلام کی بنیاد رکھی گئ تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے لیے تمام کفر ایک ہو چکا تھا۔ ظلمت کے طوفان اپنی پوری تُندی اور تیزی کے ساتھ پاکستان کا محاصرہ کر رہے تھے۔ حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی ایک

ہو جائیں اور ایک بار پھر توحید کی مشعل بُلند کر کے اس طوفان کے سامنے کھڑے ہو جائیں لیکن یہ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کی جو قوّتِ مدافعت اسلام کے نام پر بیدار ہو گی، وہ اپنے حصار کی بنیاد بھی اسلام کی روحانی اور اخلاقی قدروں پر رکھے گی اور پاکستان میں ایسے ادب کے لیے کوئی جگہ نہیں رہے گی جس کا مقصد صنفی انارکی، اخلاقی بے راہ روی اور دینی انتشار پھیلانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے یہ لوک نئے عزائم، نئ امنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ میدان میں آئے ہیں اور یہ عزائم، یہ اُمنگیں اور ولولے زیادہ تر پاکستانی مسلمانوں کی ان لوگوں ہر کو کین کی مالش کرنے تک محدود ہیں جن پر فسطائیت اپنے خنجر کی تیزی آزما رہی ہے تاکہ خنجر اپنا کام کر جائے۔ لیکن مسلمان کو محسوس نہ ہو کہ رگیں کٹ چکی ہیں اور خون بہ رہا ہے۔

ہندوستان کی بربریت کی صفائی پیش کر کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے علاوہ ان حضرات کے سامنے باقی مسائل اہلِ پاکستان کے پیٹ سے متعلّق ہیں۔ کچھ عرصہ سے انہیں پاکستان کے عوام اور مزدور کی غربت اور بد

حالی پریشان کر رہی ہے۔ پاکستان کے عوام اور مزدور کا مسئلہ یقیناً نہایت اہم ہے اور ہم اسے حل کیے بغیر فلاح و ترقّی کی منازل کی طرف گامزن نہیں ہو سکتے۔ لیکن پاکستان کے عوام اور مزدور اپنے ان کرم فرماؤں سے پوچھتے ہیں۔ ”کیا ہمیں ہندوستانی بھیڑیوں سے اپنے بچّوں اور اپنی بیٹیوں کی جانیں بچانے کا کوئی حق ہیں؟ جب مشرقی پنجاب میں مسلم عوام اور مسلم مزدوروں کا قتلِ عام ہو رہا تھا، تم کہاں تھے۔۔۔؟ آج تمہارے سینوں میں ہمارے پیٹ کی بھوک کا درد اُٹھا ہے لیکن جب اکال سینا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کی تلواریں ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بچّوں کی گردنیں کاٹ رہی تھیں، تمہاری حمیت کہاں گئی تھی؟ تمہاری آنکھوں کے سامنے لاکھوں انسان قتل ہوئے، عصمتیں لٹیں، عورتوں کو چھینا گیا اور تم نے قتل انسان کے سب سے بڑے دُشمن کی صفائی پیش کرنے کے لیے صرف یہ کہہ کر قصّہ ختم کر دیا کہ فرقہ وارانہ فساد تھا۔۔ آج ہندوستان کے ہوائی جہاز کشمیر کے مزدوروں کی بستیوں پر بم برسا رہے ہیں لیکن تم ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ کیا یہ بھی فرقہ وارانہ فساد ہے؟ کشمیر میں ہماری بقا کی جنگ لڑی جا رہی ہے لیکن تم اس سے منہ پھیر کر

پاکستان کے اندر طبقاتی جنگ چاہتے ہو۔ کہیں تمہارا مقصد ہماری مشکلات حل کرنے کی بجائے ہمارے دشمنوں کی مشکلات حل کرنا تو نہیں؟

ادیبوں اور شاعروں کا دوسرا گروہ وہ ہے جن کی امنگیں اور ولولے پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں لیکن ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو ابھی تک زلفوں کے پیچ و خم سے آزاد نہیں ہوئے۔ جب انگریز لال قلعہ کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے، دہلی کے شعراء کی محفلوں میں کوچۂ جاناں کی بھول بھلیوں کا رونا رویا جا رہا تھا۔ آج مسلمانوں کا انگریز سے کہیں زیادہ خطرہ کے دُشمن پاکستان کو محاصرے میں لینے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ہمارے شعراء کے دم خم وہی ہیں جو پہلے تھے۔

ادیبوں کا وہ طبقہ جو حقائق کے بھیانک چہرے پر تصوّرات کے حسین پردے نہیں ڈالنا چاہتا، اب اس پر بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ آج قوم کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر وہ مشرقی پنجاب کے قتلِ عام کے بعد بھی عبرت حاصل نہ کر سکی تو قدرت کے قانون میں اس کے لیے رحم کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔

قوم کے ادیب! تیرے سامنے راکھ کے ڈھیر ہیں۔ تیر شعلہ نوائی ان میں بجلیاں پیدا کر سکتی ہے۔ مشرقی پنجاب اور دہلی کے شہیدوں کا خون خاک میں جذب نہ ہونے دینا۔ تو اس کی روشنائی سے وہ تحریر لکھ سکتا ہے جو قوم کے جوانوں میں نئی زندگی، نئی روح اور نئی تڑپ بیدار کر دے۔

☆☆☆☆☆

اے قوم! ہمیں آزادی اور بقا کی جنگ کے لیے عوام کو مجاہدانہ کردار اور سیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ قوم میں احساس موجود ہے۔ پاکستان کے عوام اپنی عزّت اور آزادی کی بقا کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیّار ہیں۔ اب یہ کام حکومت کی کشتی کے ناخداؤں کا ہے کہ عوام کے احساس اور عوام کی تڑپ کو ایک ناقابلِ تسخیر قوّت میں تبدیل کر دیں۔ اینٹ اور گارا موجود ہے لیکن قلعہ تعمیر کرنا معماروں کا کام ہے۔۔۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر پاکستان کے دفاع کی ضرورت کا احساس حاوی کر دیا جائے۔ کارخانے میں کام کرنے والے مزدور اور کھیت میں ہل چلانے والے کسان کے دل

میں اجتماعی حیات کا ولولہ زندہ کر دیا جائے۔ مدارس میں ایسا نصابِ تعلیم رائج کیا جائے جس سے قوم کے بچّوں میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی سیرت بیدار ہو۔۔۔ ان عناصر کا سدِّباب کیا جائے جو تخریبی اور منفی رجحانات کی تبلیغ کرکے قوم میں ذہنی انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ قوم کے ہر اس فرد کے لیے جو بندوق اُٹھا سکتا ہو فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے۔

ہم بہت کچھ کھو چکے ہیں لیکن ایک بہت بڑی دولت ہمارے پاس ہے اور وہ یہ کہ ہمارے عوام کا عزم برقرار رہے۔ تاریخِ انسانی کے بڑے سے بڑے حوادث سے دوچار ہونے کے باوجود ان کے سینوں میں ایمان اور یقین کی مشعلیں روشن ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔ کفر کا سیلاب ان کے دِلوں سے عشقِ رسول کی چنگاریاں نہیں بجھا سکا۔ ان کی بے غرضی، ان کا ایثار، ان کا خلوص ہماری سب سے بڑی متاع ہے۔ لیکن پاکستان نے آج تک اس متاعِ گراں بہا سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کیا۔

جس دریا سے کھیتیاں سیراب نہیں کی جاتیں وہ یا تو کسی جھیل یا سمندر میں

جا گرتا ہے اور یا کسی ریگستان میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس طاقت کو بر وقت قوم کی تعمیر کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا، وہ وقت گزر جانے پر تخریب کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ پاکستان کے عوام میں زندگی ہے، تڑپ ہے، امنگیں ہیں، ولولے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے طبقہ اعلیٰ کی بے حسی اور جمود ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں کا کام دے رہا ہے۔ ہمارے لیڈروں کے ایک گروہ نے ابھی تک اس بات کا احساس نہیں کیا کہ ان پر ایک ایسی قوم کے بقا کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو انسانی تاریخ کے قدیم ترین خطرے کا مُقابلہ کر رہی ہے۔ ہمارے سیاست دانوں کی صفوں میں ابھی تک وہ لوگ موجود ہیں جو اپنا حال اور مستقبل عوام کے ساتھ وابستہ کیے بغیر عوام کی لیڈری فرما رہے ہیں۔ مشرقی پنجاب پر مصیبت آئی تو ان میں سے بہت کم ایسے لوگ تھے جنہوں نے عوام کے ساتھ جینا اور مرنا پسند کیا۔ اکثر کی یہ حالت تھی کہ ہوا کے پہلے جھونکے کے ساتھ ہی عوام کو اپنی قیادت کے بوجھ سے آزاد کر کے پاکستان پہنچ گئے۔ وہ جاتے جاتے عوام کو یہ بھی نہ بتا سکے کہ پاکستان کا راستہ کس طرف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مشرقی پنجاب کے عوام اس طوفان کا سامنا کرنے کے لیے تیّار نہ تھے لیکن جہاں بھی کسی کامل لیڈر نے ان کی رہنمائی کی تھی انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ بعض بستیوں میں ان کی قوّتِ مدافعت کُچلنے کے لیے دُشمن کو ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں استعمال کرنی پڑیں۔ لیکن عام لیڈروں کی یہ حالت تھی کہ ان میں سے بعض پہلے ہی لاہور پہنچ کر وزارتوں اور عہدوں کی کرسیوں کا طواف کر رہے تھے۔ بعض لاہور کو بے رونق سمجھ کر اچی کے جشن میں حصّہ لینے کے لیے چلے گئے تھے اور باقی حضرات کے متعلّق لاہور ریڈیو کے اعلانات نشر ہو رہے تھے کہ فلاں لیڈر، فلاں صدر، فلاں سیکرٹری اور فلاں ایم ایل اے بخیرو عافیت لاہور پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے بیان کیا کہ مشرقی پنجاب کی صورتِ حال تشویش ناک ہے۔ ان کے رشتہ داروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کوٹھی نمبر فلاں اور فلاں میں اُن سے ملیں۔

مشرقی پنجاب کے جس علاقے کے لوگ یہ سُنتے کہ ان کا لیڈر یا ایم ایل اے پاکستان پہنچ گیا ہے تو بلا توقّف پاکستان کی طرف چل پڑتے۔ قوم

کیمپوں میں سِسک رہی تھی اور لیڈر حضرات کو یا الاٹمنٹ کے دفتروں میں سر گرداں یا کسی الاٹ شدہ کوٹھی میں محوِ استراحت دیکھا جاتا تھا۔ مشرقی پنجاب کے لیڈر ہجرت کے بعد مغربی پنجاب میں اپنے بھائی بندوں سے جا ملے اور مشرقی پنجاب کے عوام کا بوجھ مغربی پنجاب کے عوام کے حصّے میں آ گیا۔

مغربی پنجاب کے سامنے مہاجرین کی آبادی کا مسئلہ تھا لیکن جس کارِ عظیم کے لیے انتہائی بے غرض، بے لوث، اَن تھک، محنتی اور تجربہ کار کارکنوں کی ضرورت تھی، وہ انتہائی ناتجربہ کار، تن آسان اور خود غرض لوگوں کو سونپ دیا گیا تھا۔ الاٹمنٹوں میں حق اور ناحق کا سوال نہ تھا۔ اصلی اور نقلی مہاجروں کی کوئی تمیز نہ تھی۔ جن لوگوں کی چھوٹے افسروں تک پہنچ تھی، وہ کوئی چھوٹا سا مکان یا چھوٹی دُکان حاصل کر لیتے تھے۔ جو بڑے افسروں کے دروازوں پر دستک دے سکتے تھے۔ وہ بڑی الاٹمنٹ حاصل کر لیتے تھے اور جن کی وزیروں کی کوٹھی تک پہنچ تھی، انہیں سب سے بڑی الاٹمنٹ کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔ وزیروں کی بدحواسی کا یہ عالم تھا

کہ وہ ایک ہی فیکٹری یا کارخانے سے متعلّق بیک وقت کئی آدمیوں کے حق میں سفارشی چِٹھیاں لکھ دیتے تھے اور متعلّقہ افسران چِٹھیوں کے احترام میں ایک ہی جائداد کئی آدمیوں کے نام الاٹ کر دیتے تھے اکثر وزرا سب کو خوش رکھو کے جمہوری مسلک پر کاربند تھے۔۔۔۔ عملی حیثیت سے ان کا کام کرنا یا نہ کرنا برابر تھا۔

قوم کے جو کارکن غرض کے بندوں کے لیے تازیانہ بن سکتے تھے، ان کے منہ پر ناجائز الاٹمنٹوں کی مہریں ثبت کر دی گئی تھیں۔

قوم کے عوام ہر آزمائش پر پورے اترے۔ جب ان سے کہا گیا کہ کیمپوں کے بھوکے اور ننگے پناہ گزینوں کو کپڑے اور روٹی کی ضرورت ہے تو انہوں نے اپنے بھائیوں کے تن ڈھانکنے کے لیے اپنے کپڑے اُتار دیے۔ انہیں روٹی مہیّا کرنے کے لیے خود بھوکا رہنا گوارا کیا۔۔۔۔ مشرقی پنجاب کی حکومت نے نہروں کا پانی بند کر دیا اور ہماری حکومت نے عوام سے نہر کھودنے کی اپیل کی تو عوام نے بیلچے اُٹھا کر دریا کا رُخ بدل دینے کے لیے میدان میں آ گئے لیکن اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے لیڈروں

کی یہ حالت تھی کہ جب کیمپوں میں لاکھوں انسان موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے، انہیں مالِ غنیمت سے حصّہ وصول کرنے کی فکر تھی۔ الاٹمنٹ کے چشمے سے اپنی کھیتیاں سیراب کر لینے کے بعد وہ اپنے رفقا اور احباب کی کھیتیوں کی طرف متوجّہ تھے، جہاں سے انہیں اپنی لیڈری کے لیے دونوں کے پھول حاصل کرنے کی اُمّید تھی۔ مہاجرین کے لیڈروں کو کچھ اپنا ہوش نہ تھا۔ پھر جب انہیں الاٹمنٹ کے دھندوں سے فرصت ملی تو ان کے سینوں میں قوم کا درد بیدار ہوا۔ مغربی پنجاب میں بعض ایم ایل اے حضرات کو یہ فکر تھی کہ اگر ان کے انتخابی حلقوں میں مہاجرین گھُس آئے تو مستقل لیڈری کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ اس لیے ان کی کوشش یہ تھی کہ ان کے علاقوں میں صرف ان کی برادری کے لوگ آباد ہوں۔ ان حضرات نے طوفان کو ساحل سے دیکھا تھا لیکن مشرقی پنجاب نے جو ایم ایل اے اور لیڈر حضرات خون کے دریا میں تیر کر پاکستان کے ساحل تک پہنچتے تھے، ان میں سے بھی بعض ایسے ہیں جن کی ذہنیتوں میں تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اس بات سے قطعاً شرمسار ہیں کہ وہ قوم کو آگ اور خون کے طوفان میں چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ وہ قوم

کے خرمنِ حیات کی سلگتی ہوئی چنگاریوں سے بھی اپنی لیڈری کے چراغ جلانے کی فکر میں ہیں۔ قوم ان لوگوں کے لیے وہ گھوڑا ہے جس پر وہ لیڈری کی زین ڈال کر صرف اپنی منازلِ حیات طے کرنا چاہتے ہیں۔ اب انہیں یہ شکایت ہے کہ ان کے ووٹروں کو مختلف اضلاع میں کیوں آباد کر دیا گیا ہے۔ ان کی لیڈری کا شیرازہ کیوں منتشر کر دیا گیا ہے۔ اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کے ووٹروں کو جگہ جگہ سے ہانک کر اُن کے گرد جمع کر دیا جائے۔ انہیں اس سے واسطہ نہیں کہ اب تک چالیس پچاس لاکھ انسان آباد ہو گئے ہیں انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ مُنتقل کرنا کس قدر تباہ کُن ہو گا۔ اس فارغ البال طبقہ کی لیڈر شپ کے لیے ہمیشہ اپنی بقا کا مسئلہ قوم کی بقا کے مسئلے سے زیادہ اہم ہے۔

مہاجرین اور انصار کا مسئلہ قوم کا اجتماعی مسئلہ ہے۔ قوم کو ان خود غرض لیڈروں سے خبر دار رہنا چاہیے جو اس مسئلہ کو اپنی لیڈری کا مسئلہ بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس اجتماعی آزمائش کے دور میں قوم کے مہاجرین کا صبر و استقلال اور انصار کا ایثار و خلوص ہی ہمیں کامیابیوں اور کامرانیوں کی اس

شاہراہ پر ڈال سکتا ہے جہاں بدر و حنین کی فتوحات نے مہاجرینِ مکّہ اور انصارِ مدینہ کا خیر مقدم کیا تھا۔ مشرقی پنجاب میں ہماری اَن گنت قربانیاں اس لیے نہ تھیں کہ وہ بوسیدہ اور متعفّن لاشیں جنہوں نے آزمائش کے دور میں قوم کو اپنی قیادت کے بوجھ سے آزاد کر دیا تھا اور قوم کی کشتی کے وہ واحد ناخُدا جنہوں نے مسائل پر کھڑے ہو کر قوم کی تباہی اور بربادی کا تماشا دیکھا ہے۔ اب انصار اور مہاجرین کے اختلافات کا مسئلہ کھڑا کر کے پھر ایک بار قوم کے کندھوں پر سوار ہو جائیں۔

ہمارے شہیدوں کے خون کا یہ مطالبہ ہے کہ اس سے کسی خالد اعظمؒ، کی طارق جانباز اور کسی غزنوی بُت شکن کی فتوحات کی داستانیں لکھی جائیں۔ اگر پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے عوام نے اس قسم کے تن آسان، لولے لنگڑے، اپاہج انسانوں کو مہاجرین اور انصار کے اختلافات میں اپنی لیڈری کے لیے گنجائش نکالنے کی اجازت دی تو ان کا ایک گروہ مہاجرین اور دوسرا انصار کے کندھوں پر سوار ہو کر پاکستان کے جمہور کو ہمیشہ کے لیے دو متحارب گروہوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرے گا۔۔۔ جن

لوگوں نے اس طوفان سے بھی اجتماعی حیات کا سبق نہیں دیکھا تو قوم کو ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟

مغربی پاکستان میں ہماری صوبائی سیاست ان شخصیتوں پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے جن کی ساری دوڑ دھوپ عہدوں اور وزارت کی کرسیوں تک پہنچنے کے لیے ہے۔ لیڈروں کا ایک گروپ چوبیس گھنٹے اپنی وزارت بچانے اور دوسرا گروپ وزارت توڑنے کی فکر میں رہتا ہے۔

مغربی پنجاب مغربی پاکستان کے صوبوں میں ریڑھ کی ہڈّی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں انتشار کی یہ حالت ہے کہ ہر ایم ایل اے وزیر بننے کی فکر میں ہے اور وزیر وزیر اعظم بننے کے لیے بے تاب ہے۔ قومی جماعت مسلم لیگ کی حالت اس سے مختلف نہیں۔ ہر شخص جو فکرِ معاش سے آزاد ہے، اپنے محلّے، اپنے شہر یا اپنے علاقے کی ایک کا عہدیدار بننے کی فکر میں ہے۔ قوم کی آدھی توجّہ وزارت کے اکھاڑے میں نکلنے والے پہلوانوں اور آدھی مسلم لیگ کے عہدوں کے لیے کبڈی کھیلنے والوں کی طرف مبذول ہے۔

آج مغربی پنجاب کا مسئلہ لاکھوں پناہ گزینوں کو آباد کرنا نہیں، بھوکوں کے لیے خوراک اور ننگوں کے لیے کپڑا مہیّا کرنا نہیں، دُشمن کے جارحانہ ارادوں کے پیشِ نظر عوام کو منظّم اور مسلّح کرنا نہیں۔ بلکہ مسئلہ یہ ہے کی وزیر کسی کو ہونا چاہیے اور اگر فلاں شخص وزیر بن جائے تو فلاں گروپ کیا کرے گا؟ لیڈروں کی فلاں فلاں پارٹیوں کے درمیان کبڈی کا جو میچ ہو رہا ہے اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

پاکستان کی حکومت گزشتہ واقعات کی روشنی میں پاکستان کے جمہور سے شکایت نہیں کر سکتی کہ ان میں اجتماعی زندگی کے لیے تڑپ نہیں۔ حالات نے عوام کو بہت حد تک بیدار کر دیا ہے۔ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے خونیں حوادث کے بعد وہ اپنے حال اور مستقبل کے خطرات کو گہری نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اب انہیں بار بار یہ کہہ کر جھنجھوڑنے کی ضرورت نہیں کہ کشمیر میں ہندوستان کا اقدام جارحانہ ہے۔ وہ اس جارحانہ اقدام کا مقابلہ کرنے کے لیے تیّار ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں منظّم اور مسلّح کر دیا جائے۔ نہرو اور

پٹیل کا چیلنج صرف پاکستان کی حکومت کے لیے نہیں۔ یہ ساری قوم کے لیے ہے اور قوم ہی اس کا جواب دے سکتی ہے۔ ہندوستان پاکستان کے خلاف جو فیصلہ کُن جنگ لڑنے کی تیّاری کر رہا ہے وہ اس براعظم میں کفر اور اسلام کا آخری معرکہ ہو گا۔ اس جنگ میں پاکستان کی فتح، فرزندانِ توحید کی آزادی اور بقا کی ضامن ہو گی اور اگر خدانخواستہ ہم اپنے اس آخری دفاعی حصار کو ئی نہ بچا سکے تو ہمیں مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پاکستان کا دفاع ہمارا سب سے بڑا اور سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں باقی مسائل نظر انداز کر دینے چاہیں لیکن جو گھر سیلاب کی زد میں کھڑا ہو اور اس کے مکین یا محافظ سیلاب کے سامنے بند لگانے کی بجائے اپنی ساری توجّہ اندرونی صفائی اور آرائش کی طرف مبذول کر دیں تو انہیں کیا کہا جائے گا؟ اور پاکستان کی ابھی یہ حالت ہے کہ ہم تباہیوں اور بربادیوں کے طوفانوں سے گزرنے کے بعد ایک خطۂ زمین پر آ کر بیٹھ گئے اور تم نے گھر بنانے کے لیے بنیادیں کھودنا شروع کر دیں۔ مکان کی ابھی دیواریں بھی استوار نہیں ہوئیں اور ہمارے دُشمن

نے اس کی طرف سیلاب کا رُخ پھیر دیا لیکن ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو سیلاب سے آنکھیں بند کر کے اس بحث میں مصروف ہو گئے ہیں کہ مکان کی چھت اس طرح کی ہونی چاہے، کھڑکیاں یوں ہونی چاہئیں، دروازوں کی لمبائی اور چوڑائی اتنی ہونی چاہیے۔۔۔۔ یہ نقشہ جس کے مطابق بنیادیں کھودی جارہی ہیں، غلط ہے۔

☆☆☆☆☆☆

اے قوم! انسانوں کا وہ گروہ جو بھیڑیوں کی زندگی اختیار کرتا ہے، بھیڑیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے۔ ہم میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو صرف چرواہے کہلانے کے شوق میں جمہور کو بھیڑوں کی زندگی اختیار کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ لیڈری کے بعض خواہش مندوں کو اندیشہ ہے کہ جب قوم متحد ہو کر جدوجہد کے میدان میں نکل آئے گی تو ان کی منفی اور تخریبی صلاحیتوں کی قیمت گھٹ جائے گی۔ اس لیے وہ قوم کے شیرازے کو ہر قیمت پر منتشر رکھنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں نے گزشتہ صدیوں میں بارہا ملّت کی چٹان کو خود غرضی کے

تیشوں سے پاش پاش کیا ہے۔ اسلام ایک تھا لیکن انہوں نے اس کی وحدت کو فرقوں، گروہوں، نسلوں اور خطوں میں تقسیم کیا۔ آلام و مصائب کے ادوار میں بھی جب مسلمانوں میں اتحاد تنظیم کی روح بیدار ہوتی تھی، لوگ میدان میں نکل آتے تھے۔ جب اہلِ غرناطہ پر مصائب کی گھٹائیں نازل ہو رہی تھیں، یہ لوگ انہیں عربی، اندلسی اور بربری کے نام پر لڑا رہے تھے۔ جب بغداد پر تاتاری یورش کر رہے تھے، یہ لوگ مناقشوں میں منافرت پھیلانے میں مصروف تھے۔

آج پاکستان میں اسی قسم کا گروہ صوبائی عصبیت کا بیج بونے کی فکر میں ہے۔ ہم ایک ہیں۔ ہمارے مسائل بھی ایک ہیں۔ اگر اسلام عرب میں عربی اور عجمی، قریش اور حبشی کی تفریق کے خلاف تھا تو پاکستان میں بھی پنجابی، سندھی، سرحدی، بلوچستانی اور بنگالی کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دے سکتا۔ پاکستان کے انعامات اور پاکستان کے مصائب میں ہم سب یکساں حصّے دار ہیں۔ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پاکستان میں صوبوں کی تقسیم کو ایک وحدتِ ملّی کے اندر جذب کر دیں۔ اجنبی

سامراج نے صوبائی حد بندیوں سے پنجابی کے لیے سندھی، سندھی کے لیے سرحدی اور سرحدی کے لیے بلوچستانی کو اجنبی بنا دیا تھا لیکن پاکستان کی بقا اور استحکام کا راز ان حد بندیوں کو ختم کر دینے میں ہے۔ قوم کو ان غرض کے بندوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے جو محسوس کرتے ہیں کہ اگر تمام مسلمان ایک ہو گئے تو ہمارے لیے زندہ باد کے نعرے کون لگائے گا۔

ایک کچھوا ایک گدلے پانی کے جوہڑ سے مچھلیاں شکار کیا کرتا تھا۔ جب برسات کے دِن آئے اور آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ مل کر ایک بڑی جھیل میں تبدیل ہونے لگی تو کچھوے کو خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اگر اس کا جوہڑ بھی جھیل کے ساتھ مل گیا تو جھیل کے وسیع رقبے اور گہرے پانی میں مچھلیوں کا شکار مُشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے مچھلیوں سے کہا۔ ”تم جوہڑ کے کناروں پر بند لگا دو، ورنہ تمہاری عزّت اور آزادی بہت بڑے خطرے کا سامنا کر رہی ہے۔ تم چھوٹی چھوٹی لہروں سے دل بہلانے کے عادی ہو اور جھیل میں تمہیں بڑی بڑی لہریں پریشان کیا کریں گی۔“

پاکستان کے صوبوں میں اس قماش کے معتبرین کی کمی نہیں۔ جب یہ لوگ صوبوں کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا نعرہ لگاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہیں لوٹ مار کی پوری آزادی ہو اور مرکز اس قدر کمزور ہو کہ وہ مدافعت نہ کر سکے۔ صوبوں کا درد اُن کے دل میں نہیں، پیٹ میں اُٹھتا ہے لیکن چند آدمیوں کی خوشنودی کے لیے قوم کا اجتماعی مفاد قربان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ قوم جو ہندوستان کے اژدھوں اور نہنگوں کا مُقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے، اسے ان کچھوؤں کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے، جو قربانیاں قوم نے پاکستان کے لیے دی ہیں، وہ خدا اور رسول کے نام پر تھیں۔ ہمارے بھائی اور قومی شعور کی اساس ہی دینِ اسلام پر ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ جب بھی ہم نے دینِ الٰہی کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑا ہے، ہم ہر مصیبت اور ہر ابتلا کے دور سے سر خرو ہو کر نکلے ہیں۔ جب بھی ہم نے ذوقِ یقین سے لبریز ہو کر اسلام کی شاہراہ پر

قدم رکھا، ہمارے سامنے پہاڑوں نے سر جھکا دیے اور جب بھی ہم نے اپنے سینوں میں عشقِ محمدؐ کی قندیلیں روشن کیں، آلام و مصائب کی تاریکیاں ہمارے پاؤں متزلزل نہ کر سکیں۔

اسلام ہمارے لیے وہ ڈھال ہے جو کفر کے ہر تیر کو روک سکتی ہے۔ اسلام ہمارے ہاتھ میں تلوار دیتا ہے۔ جو ہر تلوار کو کاٹتی ہے۔ اسلام ظلمت کی گھٹاؤں میں ہمارے سامنے روشنی کا وہ مینار ہے جو بار بار ہمارے سفینے کو ساحلِ مقصود تک پہنچا چکا ہے۔ آج ہم موت کے منہ سے نکل کر زندگی کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور اسلام وہ چشمہ ہے، جس سے قیامت تک زندگی کے دھارے پھوٹتے رہیں گے۔ کفر کی آندھیوں کے سامنے ہم اپنے منتشر شیرازے کو صرف اسلام کی رسّی سے باندھ سکتے ہیں۔ اسلام ہی ہماری راکھ کے انبار سے بجلیاں پیدا کر سکتا ہے۔

اگر ہم خلوصِ نیّت سے پاکستان کی نیام میں اسلام کی تلوار کو جگہ دیں تو وحشت اور بربریت کا طوفان جس تندی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی رفتار سے سمٹتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ زمین جو ہمارے شہیدوں

کے خون سے لالہ زار ہوئی ہے ہمارے سپاہیوں کے پاؤں کو بوسے دے گی۔ جس آسمان نے قوم کی بیٹیوں اور بچّوں کی جگر دوز چیخیں سُنی ہیں، وہ ہمارے غازیوں کے نعرے سُنے گا۔ جو مساجد، مندروں اور گردواروں میں تبدیل کر دی گئی ہیں، وہاں پھر ایک بار اللہ اکبر کی صدائیں گونجیں گی۔

اے قوم! میں تجھے عافیت پسندوں کے اس گروہ سے خبردار کرتا ہوں جو یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کی صلح جوئی اور امن پسندی ہندوستان کے جارحانہ عزائم بدل دے گی۔ گزشتہ واقعات بار بار اس حقیقت کا ثبوت دے چکے ہیں کہ ہندو فاشزم صرف تلوار کی زبان سمجھ سکتا ہے۔

بھارت میں اس تہذیب و تمدّن کا احیا ہو رہا ہے جس کی بنیاد نفرت اور حقارت کے جذبے پر رکھی گئی ہے۔ ہندو طاقتور کا احترام کرتا ہے، نہیں بلکہ اس کی پوجا کرتا ہے اور کمزور کو اچھوت کا درجہ دے کر کچل ڈالتا ہے۔ خاندانِ مُغلیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کے انتشار اور کمزوریوں نے ہندو کی اچھوت دُشمنی کو اسلام دُشمنی میں تبدیل کر دیا اور جس قدر

اسلام، ہندو مذہب کی ضد ہے، اسی قدر ہندو کے لیے مسلمان کا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔ ہماری شرافت، ہماری صداقت، امن پسندی اور نیکی اس وقت تک اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک ہم زورِ بازو اس سے زندہ رہنے کا حق نہیں منواتے۔

ہندوستان کے صنم خانوں سے جو آگ نمودار ہو رہی ہے وہ دس کروڑ فرزندانِ توحید کو بھسم کرنا چاہتی ہے۔ یہ آگ ہمیشہ کسی محمد بن قاسم اور کسی محمود غزنوی کی منتظر رہے گی۔

گزشتہ واقعات میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے ہاتھوں میں امن و آشتی کے پھول دیکھ کر یہ آگ خود بخود ٹھنڈی ہو جائے۔ ہمیں اس تلخ حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہندوستان میں قتلِ عام کے ساتھ کفر اور اسلام کا فیصلہ کُن معرکہ شروع ہو چکا ہے اور ہمیں صرف ایک ناقابلِ تسخیر عزم ہی برہمنی استبداد کے غلبہ سے بچا سکتا ہے۔

پاکستان فقط آٹھ کروڑ مسلمانوں کا دفاعی حصار نہیں بلکہ اس کی بقا اور

استحکام ہمارے ان تین کروڑ بھائیوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے جو انگریز کے بعد ہندو استبداد کی چکّی میں پِس رہے ہیں۔۔۔ آج ان کے دروازوں پر موت کا پہرا ہے۔ آج ان کی بے بسی اُس لڑکی کی مظلومیت سے کہیں زیادہ ہے، جس کی فریاد نے محمد بن قاسم کی تلوار کو بے نیام کیا تھا۔ آج یہ تین کروڑ انسان اس تلوار کو اپنی شاہ رگ کے قریب دیکھ رہے ہیں جس نے مشرقی پنجاب کے لاکھوں انسانوں کو قتل کیا ہے۔ آج ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اگر پاکستان جاہ پسندوں اور وزارتوں اور عہدوں کی کرسیوں کے بھوکوں کا اکھاڑا بنا رہا تو اس کا انجام کیا ہو گا۔

اگر پاکستان ہندوستان کے تین یا ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کے تحفّظ کے لیے کوئی مؤثر قدم نہ اٹھا سکا تو ان کے لیے موت، جلاوطنی، یا ترکِ اسلام کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہو گا۔

ہندوستان کا حکمران طبقہ جس قدر اسلام دُشمنی کا مظاہرہ کرے گا اسی قدر اسے ہندو عوام میں مقبولیت حاصل ہو گی۔ صفِ اوّل کے کانگرسی لیڈروں میں پٹیل نے اپنے آپ کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دُشمن ثابت

کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندو عوام پر اس کا اثر و اقتدار گاندھی اور نہرو کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے لیڈر پٹیل کے مقابلے میں کہیں زیادہ انتہا پسند ہیں اور واقعات کے پیشِ نظر ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ آنے والے دور میں ہندوستان کی قسمت ان جنونیوں کے ہاتھ میں ہو گی جو ہندو رائے عامہ کے سامنے یہ ثابت کر سکیں گے کہ ہندوستان میں مسلمانوں سے متعلّق ان کے عزائم پٹیل اور نہرو کی نسبت کہیں زیادہ بھیانک ہیں۔ وہ دِن دور نہیں جب نہرو اور پٹیل کی کرسیوں پر ہمیں سیوا سنگھی اور مہا سبھائی نظر آئیں گے اور ہندوستان کے کونے کونے میں مشرقی پنجاب کی تاریخ دہرائی جائے گی اور اگر پاکستان کے مسلمانوں نے محض تماشائیوں کی حیثیت میں اپنے کروڑوں بھائیوں کا قتلِ عام دیکھا تو یہ ان کا ایک ایسا جرم ہو گا جو شاید قدرت معاف نہ کرے۔

وحشت اور بربریت کے سیلاب سے جو لوگ بچ کر نکلیں گے، ان کی آخری جائے پناہ پاکستان ہو گی۔ لیکن پاکستان میں ان کروڑوں نئے

مہاجرین کے لیے جائے پناہ تلاش کرنا ناممکن ہو گا۔

کسی دِن اچانک ہم سنیں گے کہ آج ہندوستان کی عنانِ اقتدار کسی مہا سبھائی یا سیوا سنگھی نے سنبھال لی ہے اور جس تندی اور تیزی سے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا تھا، اس سے ہندوستان کے باقی صوبوں میں ان کا قتلِ عام شروع ہو چکا ہے۔ اس وقت کائنات کا ضمیر پاکستان کے ہر بچّے اور بوڑھے سے بھی اس سوال کا جواب پوچھے گا۔ ”کیا تم صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیّار ہو۔۔۔؟“

ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں سوشلزم یا کمیونزم کی تحریکیں ہندو عوام کے تخریبی رجحانات بدل دیں گی۔ جب تک برہمن ازم کے عَلَم برداروں کے سامنے مسلمانوں کا ہدف موجود ہے، وہ کسی دقّت کا سامنا کیے بغیر بھارت کے ترکش کے ہر تیر کو اُن کے خلاف استعمال کرتے رہیں گے۔ ہندوستان میں جب بھی کوئی عوامی تحریک اُٹھے گی، اس کا رُخ مسلمان کی طرف پھیر دیا جائے گا۔

قوم کے سپاہیو!

تمہارے لیے میرے پاس تشکّر کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ جب قوم کی کشتی گرداب میں تھی، تم روشنی کا مینار تھے۔ جب قوم کے رہنماؤں کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے تم اپنی جبکہ فولاد کی چٹانوں کی طرح کھڑے تھے۔ جب قوم کی رگوں کا خون منجمد ہو چکا تھا، تمہارے سینوں میں زندگی کے ولولے کروٹیں لے رہے تھے۔ تم وہ خوش نصیب ہو جنہیں قدرت نے عالمِ اسلام کے سب سے بڑے حصار کی حفاظت پر مامور کیا ہے۔

بھارت میں کفر اپنے تمام تخریبی عناصر کو متّحد اور منظّم کر چکا ہے اور تم اسلام کے ترکش کے آخری تیر ہو۔ کفر کو آج بھی اپنی تعداد، اپنے اسلحہ اور اپنے خزانوں پر ناز ہے لیکن اگر تم اپنے دِلوں میں مردِ مومن کا ایمان زندہ کر سکے تو اس زمین پر پھر ایک بار پھر بدر و حنین کی داستانیں دہرائی جائیں گی۔

اگر تم زندگی کے امتحان میں اسلام کی کسوٹی پر پورے اُتر سکے تو پاکستان تمہارا ہے۔ کشمیر تمہارا ہے۔۔۔۔۔۔ خدا کی زمین تمہاری ہے۔ عزّت،

آزادی، فتح اور کامرانی سب تمہارے لیے ہیں۔ تم ہندوستان میں اپنے تین کروڑ مجبور اور بے بس بھائیوں کو وہی پیغام دے سکو گے جو عرب کے کمسن سالار نے راجہ داہر کے قیدیوں کو دیا تھا۔۔۔ ریڈ کلف ایوارڈ ہماری رگِ جان پر ایک رستا ہوا ناسور ہے لیکن ماضی کی تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ دنیا کے نقشے پر ٹیڑھے نقوش ہمیشہ نوک شمشیر سے درست کیے گئے ہیں۔

قوم کے نوجوانوں اور پاکستان کے معمارو!

یہ کبھی نہ بھولو کہ پاکستان تمہیں ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ پاکستان کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے قدم قدم پر لاشوں کے انبار چھوڑ کر آئے ہو اور اس کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے مزید قربانیوں کی ضرورت ہے۔

جب تک نہرو کی افواج کشمیر میں ہیں، جب تک قوم کی پچاس ہزار بہو بیٹیاں پنجۂ اغیار میں ہیں اور جب تک تمہاری قوم کے تین کروڑ فرزند انسانیت کے بدترین دُشمن کے رحم و کرم پر ہیں اور تم ان کے حق میں

کوئی مؤثر آواز بُلند نہیں کر سکتے تو یہ سمجھو کہ جس مقصد کے لیے پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی، وہ ابھی تک پورا نہیں ہوا۔

دنیا میں صلح و امن بہت بڑی نعمت ہے لیکن صلح و امن فقط ان کے لیے ہے جو شر کا مُقابلہ کرنے کے لیے تیّار رہتے ہیں۔ جب تک پاکستان بیرونی خطرات سے پاک نہیں ہوتا تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اس دفاعی حصار کی تعمیر میں تمہارے حصّے کا کام باقی ہے۔۔۔ تمہارے ہاتھ زخمی ہیں لیکن قوموں کی عظمت کے تاج محل ہمیشہ ان معماروں نے کھڑے کیے ہیں جن کے ہاتھ زخمی تھے۔

☆☆☆☆☆

ستمبر ۱۹۴۸ء میں قوم اس رجلِ عظیم کی رہنمائی سے محروم ہو گئی جس نے اسے آندھیوں اور تاریکیوں میں پاکستان کی منزل دِکھائی تھی۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ قوم کی کشتی کے وہ ناخدا تھے جنھوں نے قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد تک تاریخِ انسانی سے مہیب ترین طوفان کا مقابلہ کیا تھا۔ ان کی وفات کی خبر قوم کے ہوش و حواس پر بجلی بن گری اور اس کے

بعد یہ خبر آئی کہ ہندوستان کی وحشت اور بربریت کا سیلاب حیدر آباد کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ جواہر لال نہرو کی افواج کے ٹینک نہتے رضا کاروں کی لاشوں پر سے گزر رہے ہیں۔ ایسے نازک مرحلے میں قوم جس آواز کا انتظار کیا کرتی تھی، وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔

بھارتی حکومت مدّت سے حیدر آباد دکن پر چڑھائی کی تیّاریاں کر رہی تھی۔۔۔۔ لیکن جارحانہ اقدام سے پہلے بھارت کو اس اطمینان کی ضرورت تھی کہ حیدر آباد اس کے لیے ایک اور کشمیر ثابت نہیں ہو گا اور یہ اطمینان انہیں نظام حیدر آباد سے زیادہ اور کوئی نہیں دلا سکتا تھا۔

رضا کار سر پر کفن باندھ کر میدان میں آئے۔ ان کے قائد سید قاسم رضوی نے پھر ایک بار ٹیپو کا یہ نعرہ بُلند کیا کہ شیر کی ایک دِن کی زندگی گیڈر کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ لیکن وہ غیوّر انسان جو صرف دیسی رائفلوں، برچھیوں سے مسلح ہونے کے باوجود ہندوستان کے ٹینکوں، طیاروں اور توپوں کا چیلنج قبول کر چکے تھے، نظام کی غدّاری اور بُزدلی کی تاب نہ لا سکے۔ حیدر آباد دکن کی جنگ لاکھوں مسلمانوں کے لیے زندگی

اور موت کی جنگ تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ہندو فسطائیت کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ان کا کیا انجام ہو گا۔

بے سر و سامان رضا کار اس اُمّید پر ہندوستان کی توپوں اور ٹینکوں کے سامنے کھڑے ہو گئے کہ نظام کی فوج بقا کی جنگ میں قوم کا ساتھ دے گی لیکن نظام نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اس کے اسلاف کے خون کا رنگ نہیں بدلا۔ جب دکن کے رضا کار دُشمن کے ٹینکوں کے سامنے لیٹ رہے تھے، نظام کی فوج سکندر آباد میں حملہ آوروں کے استقبال کی تیّاریاں کر رہی تھی۔

حیدر آباد جنوبی ہند میں مسلمانوں کا آخری دفاعی حصار تھا۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل و غارت کا طوفان شروع ہوا تھا، مدارس، بمبئی اور سی پی سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے حیدر آباد میں پناہ لے چکے تھے۔ حیدر آباد کی تباہی کی داستان بغداد اور غرناطہ کی تباہی کی داستانوں سے مختلف نہ تھی۔ وہ زمین جس نے صدیوں تک مسلمانوں کا جاہ و جلال دیکھا تھا، اب بے گناہوں کے خون اور بے کسوں کے آنسوؤں

سے سیر اب ہو رہی تھی۔ حیدر آباد میں مسلمانوں کی صدیوں کی آزادی اور حکومت کی تاریخ ان الفاظ کے ساتھ ختم ہوئی کہ قوموں کی دُشمنی کے لیے پٹیل اور نہرو کی نسبت گھر کے غدّار زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ وہ گھر جس کا پاسبان چوروں اور ڈاکوؤں کے ساتھ مل جائے، ہمیشہ تباہی کا سامنا کرتا ہے۔

حیدر آباد میں خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بنیے کی سفّاکی اپنے اوجِ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ یو این او کی خاموشی نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ بین الاقوامی مجلسیں تلوار کے فیصلے رد نہیں کرتیں۔ حیدر آباد کی تسخیر کے ساتھ ہی ہندوستان کی حکومت کشمیر پر ایک فیصلہ کُن حملہ کر چکی تھی۔ ایک طرف بے سر وسامان مجاہدین کا عزم واستقلال تھا اور دوسری طرف وحشیوں کے ریوڑ ہندوستانی حکومت کے تمام وسائل کے ساتھ میدان میں آچکے تھے۔ ہندوستان کی توپیں اور ٹینک آگ اُگلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔۔۔۔ جنگ کے شعلے پاکستان کی حدود کے پاس پہنچ چکے تھے۔

کیا پاکستان ہندوستان کو دکن کی طرح کشمیر میں بھی تلوار کا فیصلہ منوانے

کی اجازت دے گا۔ کیا پاکستان یہ گوارا کرے گا کہ پینتیس لاکھ انسان مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔۔۔؟ پاکستان کے سپاہی نے ان سوالات کا جواب دینے کے لیے اپنی سنگین اُٹھائی اور دشمن کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

سلیم تین ہفتوں سے میر پور کے ہسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ جہادِ کشمیر میں وہ دوسری بار زخمی ہوا تھا۔ پہلی بار اس کا زخم معمولی تھا لیکن دوسری بار دُشمن کے ایک اہم مورچے پر حملہ کرتے ہوئے وہ بُری طرح زخمی ہوا۔ اسے علاج کے لئے میر پور کے ہسپتال میں بھیجا گیا۔

آپریشن کے بعد جب اسے ہوش آیا تو ایک بوڑھا ڈاکٹر اس کے قریب کھڑا پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ ڈاکٹر شوکت تھا۔

سلیم کا پہلا سوال یہ تھا۔ ”میں دوبارہ کب محاذ پر جا سکوں گا؟“ ڈاکٹر شوکت نے قدرے فکر مند نگاہوں سے سلیم کو دیکھا اور جواب دیا۔ ”بیٹا

تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بازو کا زخم تو بہت جلد اچھا ہو جائے گا، لیکن تمہاری ٹانگ۔۔۔۔۔“

سلیم نے چونک کر کہا۔ ”ہاں میری ٹانگ سے متعلّق۔“

ڈاکٹر شوکت نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”تشویش کی کوئی بات نہیں، لیکن تمہیں کافی دیر آرام کرنا پڑے گا۔“

”آرام“ سلیم نے اپنے چہرے پر مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”آرام میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ مجھے اس خاموشی سے وحشت ہوتی ہے۔“

ڈاکٹر شوکت ایک اسٹول گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور بولا۔ ”بیٹا گھبراؤ نہیں، انشا اللہ تمہیں بہت جلد آرام آ جائے گا۔“

سلیم نے کہا۔ ”آپریشن سے پہلے آپ میری ٹانگ کے متعلّق بہت پریشان تھے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں کب تک میدان میں جانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ گھٹنے سے نیچے پاؤں تک میری ٹانگ بالکل بے حس ہو

چکی ہے۔"

ڈاکٹر شوکت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دور سے ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ آواز قریب آتی گئی۔ مریض ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر سے کسی نے بُلند آواز میں کہا۔ "لیٹ جاؤ! وہ اِسی طرف آ رہے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی ہسپتال سے کچھ دور بموں کے دھماکوں اور مشین گنوں کی تڑتڑ سنائی دینے لگی۔ ایک بم ہسپتال کے ایک کونے کے قریب پھٹا اور ایک روشن دان اور کھڑکی کے چند شیشے اُڑ گئے۔ ایک مریض اچانک اپنے بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بُلند آواز میں چلّایا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو؟ تم اپنی توپیں اور مشین گنیں کیوں نہیں چلتے۔ انہیں اُڑادو۔ خدا کی قسم یہ کھلونے ہیں۔ پاکستان کے ہوابازوں سے کہہ دو کہ یہ جس قدر ظالم ہیں، اسی قدر بزدل ہیں۔"

ڈاکٹر شوکت جلدی سے اُٹھ کر آگے بڑھا اور اسے زبردستی بستر پر لِٹا کر بولا۔ "آپ آرام سے لیٹے رہیں، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

مریض نے اپنے آپ کو ڈاکٹر کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے

ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے رائفل دے دو، میں ان سب کو گرا دوں گا۔ خدا کی قسم میں ان سے نہیں ڈرتا، نہیں ڈرتا۔“

ہوائی جہاز ہسپتال کے آس پاس چند بم گرانے اور اندھا دُھند گولیوں کی بارش کرنے کے بعد جا چکے تھے۔ اور مریض کا جوش و خروش کسی حد تک ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ڈاکٹر صاحب مجھے چھوڑ دو، میں ٹھیک ہوں۔“

ڈاکٹر شوکت نے دوبارہ سلیم کے پاس آ کر کہا۔ ”کل شام اسے محاذ سے یہاں لایا گیا ہے۔ پچھلے دِنوں میں مظفّر آباد میں تھا تو وہاں بھی یہ زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی بہادری کی بہت تعریف کرتے تھے۔“

سلیم نے سوال کیا۔ ”ڈاکٹر صاحب اب وہ کیسا ہے؟“

”اس کے زخم تو معمولی ہیں مگر نمونیہ کا حملہ بہت شدید ہے۔ اب بھی وہ بخار کی حالت میں چلّا رہا تھا۔ لیکن پہلے کی نسبت اب اس کی حالت بہتر

ہے۔ انشاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔" سلیم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب اگر تکلیف نہ ہو تو اس کا بستر میرے قریب کروا دیجئے، لیکن ابھی نہیں۔ اس وقت مجھے دیکھ کر وہ پریشان ہو گا۔"

"تم اسے جانتے ہو؟"

"وہ میرا ہم جماعت تھا۔ اس وقت ہم ایک دوسرے سے لڑا کرتے تھے۔ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا کسی دِن ہم ایک محاذ پر اکٹھے ہو جائیں گے۔۔۔"

یہ نوجوان الطاف تھا۔ نیشنلسٹ اور وطن پرست الطاف، جسے طالبِ علمی کے زمانے میں پاکستان کے نام سے چڑ تھی۔ اور اب ایک مدّت سے پاکستان کے ایک گمنام رضا کار کی حیثیت میں جہادِ کشمیر میں حصّہ لے رہا تھا۔

تیسرے دِن الطاف کا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ اور وہ سلیم کے قریب بستر پر لیٹا اپنی سر گزشت سُنا رہا تھا۔۔ الطاف کی سر گزشت سلیم کے لئے نئ نہ

تھی۔ وہ ایسی سینکڑوں داستانیں سُن چکا تھا۔ الطاف اُن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے آخری دم تک ہندوؤں اور سکھوں پر اعتماد کیا تھا۔ اس کے شہر میں ڈسٹرکٹ کانگریس کا صدر اس کا دوست تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور فوج کے افسر اس کے والد کو اطمینان دِلا چکے تھے، کہ آپ کے خاندان کی حفاظت کے لیے دہلی سے نہرو حکومت نے ہمیں سخت ہدایات بھیجی ہیں، چنانچہ جب بلوے شروع ہوئے اور محلّے کے کئی خاندانوں نے الطاف کے گھر کو محفوظ سمجھ کر اپنی بہو بیٹیوں کو یہاں بھیج دیا۔

اس کے بعد ان کے مکان پر حملہ کیا گیا۔ کانگریس کے عہدے دار اور پولیس کے افسر حملہ آوروں کے رہنما تھے۔ حملے کے وقت، الطاف کا والد دروازے سے باہر نکل کر چلّایا۔ 'ظالمو ہم نے ہمیشہ کانگرس کا ساتھ دیا۔ ہم نے ہمیشہ پاکستان کی مخالفت کی ہے۔ نہرو اور پٹیل ہمیں جانتے ہیں۔ میرے پاس مہاتما گاندھی کے خطوط موجود ہیں۔' اور وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک سکھ اسے داڑھی سے پکڑتا ہو گلی میں لے گیا۔ اور بلوائی بھوکے کتّوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ الطاف دوسری گلی کے راستے

نکل کر ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی طرف بھاگا لیکن پولیس کے سپاہیوں نے اسے بنگلے سے باہر ہی روک دیا۔ الطاف چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ میں ڈپٹی کمشنر کا دوست ہوں۔ مجھے اس کے پاس جانے دو۔ میرے مکان پر حملہ ہو چکا ہے۔ مجھے نہرو اور پٹیل جانتے ہیں، اور سپاہی اس کے جواب میں کہہ رہے تھے کہ اِسے اُلٹا لٹکا دو!

ڈپٹی کمشنر کار پر اپنے بنگلے سے باہر نکلا۔ سپاہی راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے کار سے باہر جھانکتے ہوئے الطاف کی طرف دیکھا اور ڈرائیور سے کہا، روکو نہیں چلو۔

الطاف نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو سپاہی کی گرفت سے آزاد کیا اور بھاگ کر کار کے پائیدان پر پاؤں رکھتے ہوئے چلّایا۔ ’ڈپٹی صاحب کار روکیے، میں الطاف ہوں، میرے مکان پر حملہ ہو چکا ہے۔ آپ انہیں روک سکتے ہیں۔‘

الطاف کھڑکی کے رستے اندر گھُسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سپاہی چند قدم دور اس کے تعاقب میں آ رہے تھے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے پہلے اسے

ہاتھوں سے نیچے دھکیل کر پھینکنے کی کوشش کی اور اس کے بعد پستول نکال کر فائر کر دیا۔ پستول کی گولی الطاف کے شانے کے پاس لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈپٹی کمشنر نے اسے دھکا دیا اور وہ سڑک پر گر پڑا۔ ڈرائیور نے دوبارہ کار روکنے کی کوشش کی۔ لیکن ڈپٹی کمشنر نے پھر کہا ہمیں پانچ منٹ میں ہوائی اڈّے پہنچنا ہے۔ تیز چلو۔

کار کے قریب سے گزرتے ہی ایک فوجی ٹرک گزر رہا تھا۔ الطاف کے نیچے گرتے ہی ڈرائیور نے ٹرک روکا۔ بلوچ رجمنٹ کا ایک افسر اور پانچ سپاہی نیچے اترے۔ پولیس کے سپاہی جو الطاف کے تعاقب میں آ رہے تھے، اُنہیں دیکھ کر رُک گئے۔ اس ٹرک کے پیچھے بلوچ رجمنٹ کے دس اور ٹرک آ رہے تھے۔ افسر کے اشارے پر وہ بھی رُک گئے۔ پولیس کے سپاہی ایک ثانیہ توقّف کے بغیر اُلٹے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ افسر کے حکم پر سپاہیوں نے الطاف کو بے ہوشی کی حالت میں ایک ٹرک پر لِٹا دیا۔ اس کے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ لاہور کے ہسپتال میں تھا۔

تندرست ہونے کے بعد الطاف کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے خاندان کا کیا

حشر ہووا؟

ایک دن والٹن کیمپ لاہور میں اسے اپنے محلّے کے چند آدمی مل گئے اور اُنہوں نے بتایا کہ اس کی بیوی نے حملے کے وقت مکان کی تیسری منزل سے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کے خاندان اور اس کے گھر میں پناہ لینے والی عورتوں کو ننگا کر کے ان کا جلوس نکالا گیا تھا۔ اس کے بعد دو ماہ کے عرصے میں الطاف فوجی کنوائے کے ساتھ تین مرتبہ مشرقی پنجاب گیا لیکن اسے اپنے خاندان کی کسی عورت کا پتا نہ ملا۔ اس کا ایک بہنوئی لاہور میں تھا۔ ایک دِن اسے معلوم ہوا کہ جالندھر کے آس پاس سے عورتیں بر آمد کی گئی ہیں اور شام تک بذریعہ ریل لاہور پہنچنے والی ہیں۔ الطاف اپنے بہنوئی کے ساتھ اسٹیشن پہنچا۔ ان عورتوں میں ان کے خاندان کی صرف ایک لڑکی تھی۔ اور یہ اس کی بہن تھی۔ اور جب الطاف سلیم کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا تھا تو سلیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ الطاف اچانک خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر وہ گہری سوچ میں چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ اور بالآخر گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ منظر بڑا دل گداز

تھا سلیم! میں اپنی بہن کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا۔ پھر اچانک اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'تم کون ہو؟ اور میری طرف کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہو؟' میں نے آگے بڑھ کر اس کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ 'فہمیدہ میری طرف دیکھو، میں تمہارا بھائی ہوں۔ اور دیکھو یہ حامد ہے۔ یہ تمہیں لینے آیا ہے۔' اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی میری طرف اور کبھی اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور پلیٹ فارم پر ایک طرف بھاگ نکلی۔ میں نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا اور ہم اسے گھر لے آئے۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے چند دِن اپنے بہنوئی کے ہاں قیام کیا۔ فہمیدہ کبھی ہنستی اور کبھی روتی تھی لیکن اس کی زندگی کے تلخ ترین لمحات وہ تھے جب وہ ہوش میں ہوا کرتی تھی۔ اس کا خُسر، ساس اور شوہر اسے تسلّی دینے کی کوشش کرتے لیکن اس کی نگاہیں اوپر نہ اُٹھتی تھیں۔ عالمِ ہوش میں اس کے لیے یہ حقیقت ناقابلِ برداشت تھی کہ وہ کسی کی بیوی کسی کی بہن اور کسی کی بہو ہے۔ اس کا خاوند قسمیں کھاتا کہ فہمیدہ تم میری نگاہ میں پاک

دامن ہو۔ وہ کبھی خاموشی سے اُس کی باتیں سُنتی اور کبھی چلا اُٹھتی۔ ’نہیں، نہیں۔ آپ مجھے جھوٹی تسلّیاں نہ دیں۔ آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ مجھے ذلیل سمجھتے ہیں۔ آپ نے مجھے زندہ کیوں رہنے دیا۔ آپ نے مجھے دیکھتے ہی میرا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔‘ اور پھر وہ جنون کی حالت میں اپنے بال اور چہرہ نوچ ڈالتی۔ ایک دِن وہ ہوش میں تھی اور میرے منہ سے نکل گیا فہمیدہ میں تمہاراانتقام لوں گا۔۔۔ وہ مجھ پر برس پڑی۔ تم میراانتقام کس طرح لوگے؟ تم نہرو، پٹیل اور تاراسنگھ کے پاس فریاد لے کر جاؤ گے کہ تمہارے سورماؤں نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ میرے خاندان کی عورتوں کو ننگا کر کے جلوس نکالا ہے۔ تم اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔ لیکن میں تنہا نہیں۔ قوم کی ہزاروں بیٹیاں ابھی تک سکھوں اور ہندوؤں کے قبضے میں ہیں۔ پاکستان سے کسی نہ کسی دِن قوم کا کوئی غیّور بیٹا ان کی فریاد ضرور سُنے گا۔ وہ تمہاری طرح یہاں بیٹھ کر احتجاج نہیں کرے گا بلکہ مشرقی پنجاب کے کونے کونے میں جا کر یہ پیغام دے گا کہ اس خاک پر جن شہیدوں کا خون گرا ہے وہ میرے بھائی تھے۔ اس زمین پر جن عورتوں کی عصمت لوٹی گئی، وہ میری بہنیں تھیں۔ بھٹکتی ہوئی روح کی

فریاد سُنے گا۔ مشرقی پنجاب میں بجلیاں اور زلزلے اس کے ہم رکاب ہوں گے۔ کاش مجھے مشرقی پنجاب میں موت آجاتی۔ اور میری روح اپنے اس بھائی کا خیر مقدم کرتی۔۔۔

مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ فہمیدہ کو سب سے زیادہ نفرت میری ذات سے ہے۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ میں حملے کے وقت اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ آیا تھا۔ تقسیم سے قبل وہ اپنے کالج کی لڑکیوں کی مجالس میں پاکستان کے حق میں تقریریں کیا کرتی تھی۔ اس کے خیالات میرے اور ابّا جان کے خیالات سے مختلف تھے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ ہندوؤں کے جارحانہ نظام کے خلاف مدافعت کے لیے پاکستان مسلمانوں کا آخری مورچہ ہے۔ خاندان کی بہت سی لڑکیوں کو اس نے اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔ خیر یہ باتیں تمہارے لیے دل چسپ نہ ہوں گی۔ میں تمہیں بتارہا تھا کہ کبھی کبھی اس کی باتیں سنجیدہ ہوا کرتی تھیں لیکن حقیقتاً وہ زندگی کے ساتھ اپنے تمام ناطے توڑ چکی تھی اور ہم تمام کوششوں کے باوجود اس کے چہرے پر کھوئی ہوئی مُسکراہٹیں دوبارہ نہ دیکھ سکے۔ اس کی صحت آئے

دِن گزر رہی تھی۔

کشمیر کی جنگ شروع ہوئی تو میں رضاکاروں کی ایک جماعت کے ساتھ یہاں پہنچ گیا۔ دو ماہ بعد اُوڑی کے محاذ پر ایک دِن اچانک مجھے حامد ملا۔ وہ بھی آزاد فوج میں شامل ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ فہمیدہ میری آمد کے بیس دِن بعد فوت ہو گئی تھی۔

مرتے وقت اس نے حامد سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جہادِ کشمیر میں شریک ہو گا۔ اور وہ اپنا یہ وعدہ پورا کرنے آیا تھا۔ حامد شہید ہو چکا تھا۔ وہ اُوڑی کے پاس دیودار کے ایک درخت کے نیچے دفن ہے۔ مرتے وقت حامد نے مجھ سے کہا تھا، الطاف، اگلے سال میری قبر پر جنگلی پھول کھلیں گے۔ اگر تم یہاں آسکو تو یہاں سے چند پھول لے جانا اور فہمیدہ کی قبر پر چڑھا دینا۔" کچھ دیر الطاف اور سلیم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اچانک الطاف نے کہا۔ "سلیم تمہیں اختر کے متعلّق کچھ معلوم ہے۔"

اختر کا نام سن کر سلیم چونک پڑا۔ "پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مجھے کوئی

اِطّلاع نہیں ملی۔"

الطاف نے کہا۔ "وہ شہید ہو چکا ہے۔ میں پہلی بار اپنے خاندان کی عورتوں کی تلاش میں گیا تھا تو جلندھر کے کیمپ میں مجھے اختر کا ایک دوست ملا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اختر نے عہد کیا تھا کہ جب تک شہر کے تمام مسلمان پاکستان نہیں پہنچ جاتے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اس کا ایک چچا فوج میں میجر تھا۔ وہ خاندان کے باقی افراد کو نکال کر لے آیا۔ لیکن اختر وہیں رہا۔ ایک دِن وہ جالندھر کے پاس ایک گاؤں کے مسلمانوں کو نکال کر پناہ گزینوں کی گاڑی پر سوار کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن کی طرف لا رہا تھا کہ راستے میں سکھوں نے حملہ کر دیا۔ چند آدمی بھاگ کر کیمپ میں پہنچے اور اُنہوں نے بتایا کہ اختر شہید ہو چکا ہے۔

☆☆☆☆☆

الطاف ایک ہفتے کے بعد تندرست ہو کر دوبارہ محاذ پر چلا گیا اور سلیم ہسپتال کی تنہائی اور خاموشی کو زیادہ شدّت کے ساتھ محسوس کرنے لگا۔ تین ہفتوں کے بعد اس کے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ

ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کی بائیں ٹانگ پنڈلی کی بعض رگوں کے کٹ جانے کے باعث ناکارہ ہو چکی ہے۔ اور وہ ایک غیر معیّن عرصے تک لکڑیوں کے سہارے کے بغیر چل نہیں سکے گا۔ ڈاکٹر شوکت سے بار بار یہ کہہ کر تسلّی دیتا کہ تمہاری یہ تکلیف عارضی ہے۔ کچھ عرصے بعد تمہیں لکڑی کے سہارے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن ہسپتال کے ایک اور ڈاکٹر نے سلیم کو یہ کہ کر بہت مایوس کر دیا کہ تمہارے متعلّق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ تم چند ماہ تک لکڑی کے سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ لیکن مستقبل قریب میں اس کی اُمّید بہت کم ہے کہ لڑائی میں حصّہ لے سکو۔

ایک دِن ڈاکٹر شوکت نے سلیم کو بتایا کہ ارشد کا خط آیا ہے اور وہ تمہیں پرسوں یہاں پہنچ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ میں نے بھی ایک ہفتے کی چھٹّی لے لی ہے۔ اگر اچانک کسی مصروفیت کے باعث مجھے اپنی چھٹی منسوخ نہ کرانا پڑی تو میں بھی تمہارے ساتھ جا سکوں گا۔ ہاں ارشد نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجید تبدیل ہو کر راولپنڈی آ گیا ہے۔ اگر اسے چھٹّی مل

گئی تو شاید وہ بھی ارشد کے ساتھ آ جائے۔ سلیم نے مغموم ہو کر کہا۔
”ڈاکٹر صاحب! آپ میرا راولپنڈی جانا ضروری سمجھتے ہیں؟“

ڈاکٹر صاحب نے پریشان ہو کر جواب دیا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم ہسپتال کی زندگی سے تنگ آ چکے ہو گے۔“

”ہسپتال کی زندگی سے میں واقعی تنگ آ چکا ہوں۔ اور جب سے مجھے معلوم ہوا کہ میں اب سپاہیانہ زندگی کے قابل نہیں رہا، اس چار دیواری میں میرا دم گھٹتا ہے۔ لیکن راولپنڈی جا کر میں کیا کروں گا۔“

”وہاں تم بے کار نہیں بیٹھو گے۔ سلیم! تمہارے لیے ہر جگہ کام ہے۔ اور یہ تمہیں کسی نے بتایا کہ تم سپاہیانہ زندگی کے قابل نہیں رہے۔ بیٹا میں تمہیں جانتا ہوں، کہ جب تک تمہارے دل کی دھڑکنیں خاموش نہیں ہو جاتیں تمہیں کوئی طاقت سپاہیانہ زندگی سے محروم نہیں کر سکتی۔ اور مجھے یہ بھی اُمّید ہے کہ تمہاری ٹانگ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ میں لاہور اور کراچی کے تجربہ کار ڈاکٹر صاحبان سے تمہارے لیے مشورہ کروں گا لیکن جب تک تم بندوق اٹھا کر دوبارہ میدانِ جنگ میں جانے کے قابل نہیں

ہوتے، اس وقت تک محاذِ جنگ سے دور رہ کر بھی وطن کی خدمت کر سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہارا قلم بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اور قوم کو اس کی ضرورت ہے۔ تم خود کہا کرتے تھے کہ کشمیر کی جنگ پاکستان کی جنگ ہے۔ اور پاکستان کی جنگ ساری قوم کی جنگ ہے۔ سلیم! اسے قوم کی جنگ بنانے کے لیے تمہارے جیسے ادیبوں کی پُکار کی ضرورت ہے۔ تم راکھ کے انبار سے بجلیاں پیدا کر سکتے ہو۔"

☆☆☆☆☆

شام کے چار بجے ارشد کے مکان کے سامنے ایک جیپ رُکی۔ راحت نے کمرے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپا جان! آپا جان! وہ آ گئے۔"

ایک لمحہ کے لیے عصمت محسوسات کے اس عالم میں تھی جہاں جسم اور روح کے درمیان ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انسان کا دماغ ان

رنگینیوں، دل فریبیوں کا احاطہ نہیں کر سکتا جو اس خلا کی وسعتوں میں رقص کرتی ہیں۔ جہاں انسان کی روح زندگی کی ان رفعتوں اور گہرائیوں سے آشنا ہوتی ہے جو دماغ میں نہیں سما سکتیں۔

عصمت کتاب میز پر رکھے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ راحت نے برآمدے سے پھر آواز دی۔ ”آپا جان! سلیم بھائی آ گئے۔“ اور عصمت جیسے خواب سے بیدار ہو رہی تھی۔ جسم اور روح کے درمیان ایک عارضی خلا کی وسعتیں سمٹ کر ایک مختصر سے لفظ میں سما گئیں۔ سلیم، سلیم، سلیم۔ عصمت کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا دوپٹہ درست کیا۔ برآمدے کی طرف کھلنے والے دروازے کے پاس پہنچی۔ جھجکی، رُکی، اور پھر اچانک برآمدے میں آ گئی۔ ڈاکٹر شوکت صاحب، ارشد، مجید اور سلیم جیپ سے اُتر کر صحن میں داخل ہو چکے تھے۔ سلیم، مجید کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔

”بھائی جان!“ راحت نے اچانک آگے بڑھ کر سلیم کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ سلیم کے ہونٹوں پر ایک مغموم سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ برآمدے میں

پاؤں رکھتے ہوئے سلیم نے عصمت کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ محبّت کے آنسو جو ایک عورت کی آنکھوں کو شبنم آلود کلیوں سے کہیں زیادہ پاکیزگی، دلفریبی اور رعنائی عطا کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں میز کے گرد بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور عصمت دوسرے کمرے میں بیٹھی اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔ اچانک اس نے اُٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں پڑا ہوا چمڑے کا چھوٹا سا بکس کھولا اور کاغذ کے ایک پرزے میں لپٹی ہوئی سنہری انگوٹھی نکال کر انگلی میں پہن لی۔ اور پھر اچانک کوئی خیال آیا اور اس نے انگوٹھی اُتار کر پھر بکس میں رکھ دی۔ راحت نے کمرے میں پاؤں رکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپا جان!“ عصمت نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ ”کیا ہے راحت؟“

راحت سہارا لے کر چلنے والی بیساکھیاں اُٹھائے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے اور وہ سِسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”آپا جان۔ یہ سلیم بھائی کی ہیں۔“

"پگلی، تم کیوں رو رہی ہو۔" عصمت نے اُس کے ہاتھ سے بیساکھیاں لے کر دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"آپا جان۔" راحت اچانک سنبھل کر بولی۔ "مجھے ڈر تھا کہ آپ کو یہ دیکھ کر تکلیف ہو گی۔"

عصمت نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ چڑیل کہیں کی، یہ ایک سپاہی کا زیور ہیں۔"

راحت نے کہا۔ "وہ بہت مغموم ہیں آپا۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ کے آنسوؤں سے انہیں غلط فہمی ہو گی۔ اور میں اس لیے پریشان تھی کہ آپ نے کوئی بات بھی تو نہیں کی ان سے۔"

"میں ان سے کیا بات کر سکتی ہوں۔"

"کیا کہو گی؟" راحت نے آنکھوں میں شرارت آمیز تبسّم لاتے ہوئے کہا۔

"جو جی میں آئے کہہ دوں گی۔"

چائے ختم کرنے کے بعد مجید نے اگلے دِن دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے ان سے رخصت لی۔ ارشد اور سلیم سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے ڈاکٹر شوکت سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب آیئے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر شوکت اس کے ساتھ باہر نکل آئے۔ مجید نے صحن میں پہنچ کر قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ”ڈاکٹر شوکت صاحب۔۔۔ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری خواہش یہ ہے کہ سلیم کی شادی کر دی جائے۔ مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ وہ بے حد حساس ہے۔ وہ ایک مہمان کی حیثیت سے آپ کے ہاں چند دِن سے زیادہ قیام کرنا پسند نہیں کرے گا۔ شادی کے بعد آپ اس کے لیے کوئی ایسا کام سوچیں کہ وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہ کرے۔ کشمیر کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ اچانک ہمیں کسی دِن پیش قدمی کا حکم مل جائے اور میں محاذ پر جانے سے پہلے سلیم کے متعلّق مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر شوکت نے مجید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت شفقت آمیز

لہجے میں کہا۔ ”بیٹا! اگر تم ابتدا نہ کرتے تو میں شاید کل تم سے یہ بات کرتا۔ میں اسی ارادے سے ایک ہفتے کی چھٹّی لے کر آیا ہوں۔ تم کل آؤ تو ہم سلیم سے پوچھ لیں گے۔“

”بہت اچھا! میں کل ایک بجے کے قریب پہنچ جاؤں گا۔“

چار دِن بعد عصمت اور سلیم کی شادی ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

دو دن بعد ایک دِن سلیم میز کے سامنے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ عصمت کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ”ناشتہ تیّار ہے اور بھائی جان آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”بہت اچھا۔ چلو!“ سلیم نے یہ کہتے ہوئے قلم رکھ دیا اور کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

”چلیے!“ عصمت نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"میری بیساکھیاں آج صبح سے غائب ہیں۔" سلیم نے پریشان ہو کر کہا۔

عصمت نے آگے بڑھ کر سلیم کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ "وہ میں نے غائب کر دی ہیں۔ یہاں میری موجودگی میں آپ کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف باہر جانے کے لیے آپ کو اُن کے استعمال کی اجازت دے سکتی ہوں۔"

"اور اگر میں تمہارے سہارے چلتا ہوا گر پڑا تو؟"

"ہم دونوں ایک ساتھ گریں گے اور ہنستے ہوئے اُٹھیں گے۔"

سلیم نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "نہیں عصمت۔ میں اپنے ساتھ تمہیں نہیں گِرنے دوں گا۔ ہاں دیکھو میرے تکیے کے نیچے گھڑی پڑی ہوئی ہے، وہ اُٹھا لاؤ۔"

"ابھی لاتی ہوں۔" عصمت یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

سلیم نہ جھجکتے جھجکتے دوسرے دروازے کی طرف چند قدم اُٹھائے۔ پنڈلی کی بعض رگوں میں کھنچاؤ پیدا ہونے سے اُس کے لیے ایڑی زمین سے لگانا

مشکل تھا تاہم اُسے اطمینان تھا کہ وہ ایک معمولی تکلیف سے سہارے کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ عصمت گھڑی لے کر باہر آئی تو سلیم دوسرے دروازے سے نکل رہا تھا۔ عصمت نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”ابھی نہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلدی سہارے کے بغیر چل سکیں گے لیکن جلدی نہ کیجیے۔“

”میں چل سکتا ہوں عصمت۔ اب تو میں ایڑی پر بھی تھوڑا تھوڑا بوجھ ڈال سکتا ہوں۔“

”مجھے معلوم تھا۔ مجھے آج ہی خواب نظر آیا تھا، ایک فوج کو پریڈ کروا رہے تھے۔“

”سچ کہو عصمت؟“

”راحت سے پوچھ لیجیے۔ میں نے اُٹھتے ہی اِسے بتایا تھا۔“

”اچھا ذرا مجھے چھوڑ دو۔ میں ارشد کو پریشان کرتا ہوں۔“

عصمت نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ”ارشد پریشان نہیں ہو گا، آپ کی

بیساکھیاں غائب کرنے کا مشورہ بھی اُسی نے دیا تھا۔"

ارشد نے ساتھ والے کمرے سے آواز دی۔ "سلیم صاحب آیئے!"

سلیم اور عصمت دوسرے کمرے میں جا کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ راحت ناشتہ اور چائے لے آئی۔ چائے پیتے وقت ارشد نے کہا۔ "سلیم رات میں تمہیں ایک خوش خبری سُنانا چاہتا تھا لیکن تم اس وقت کچھ لکھ رہے تھے۔ ہماری فوج کے چند دستے کشمیر میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور کئی محاذوں پر دشمن کی پیش قدمی روک دی گئی ہے۔" سلیم کی آنکھیں مسرّت سے چمک اُٹھیں۔ اور اس نے کہا "پرسوں مجید بھی مجھ سے یہی کہتا تھا کہ تم کشمیر کے متعلّق جلد کوئی اچھی خبر سُنو گے۔"

ارشد نے کہا۔ "ہندوستان کئی مہینوں سے واویلا کر رہا تھا کہ کشمیر میں پاکستان کی فوج لڑ رہی ہے۔ پاکستان کو آخر کار اس کی یہ خواہش پوری کرنی ہی پڑی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے سلیم؟ ہندوستان ہمارے اس اقدام کے بعد پاکستان کے ساتھ جنگ مول لینے کی جرأت کرے گا؟"

سلیم نے جواب دیا۔ ''ہندو قوم کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ صلح کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اور اگر انہیں یقین ہو جائے کہ مدِّ مقابل ہار ماننے والا نہیں تو وہ خود ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہماری طرف سے صلح جوئی اور امن پسندی کے مظاہروں نے ہمیشہ اس کے جارحانہ عزائم کو تقویت دی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ہوائی جہاز کشمیر کی حدود سے گزر کر ہمارے سرحدی علاقوں پر بھی بمباری کرتے رہے۔ اب اگر پاکستانی سپاہی کشمیر میں داخل ہو چکے ہیں تو تم دیکھو گے ہندوستان جنگ کی بجائے صلح کو زیادہ ترجیح دے گا لیکن یہ اس کا ایک اور فریب ہو گا۔ اس کے سیاست دان مصالحانہ بات چیت کا لامتناہی سلسلہ جاری رکھیں گے اور اس کے سپاہی نئے مورچے بناتے رہیں گے۔ ہمارے لیے کشمیر کا صرف وہ فیصلہ صحیح ہو گا جو پاکستانی سپاہی کی سنگین کی نوک سے لکھا جائے گا۔ میں اس دِن سے اسی طرح سوچتا ہوں جب کہ کشمیر کی جنگ شروع ہوئی تھی۔ اور تم دیکھو گے کہ پاکستان کا ہر فرد اسی طرح سوچے گا۔۔۔ ہندو صرف ایک زبان سمجھتا ہے، اور وہ تلوار کی زبان ہے۔

باہر سڑک پر لوگ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور ان نعروں کے ساتھ ٹرکوں اور جیپوں کی آہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ راحت اچانک باہر نکل آئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولی۔ ”بھائی جان فوج جا رہی ہے۔“

سلیم نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”عصمت میری بیساکھیاں لا دو، میں باہر نکل کر انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

عصمت دوسرے کمرے سے بیساکھیاں اُٹھا لائی۔ جب وہ باہر نکل رہا تھا تو ارشد نے اُٹھ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”سلیم! ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ان بیساکھیوں کو کسی دِن ہمیشہ کے لئے غائب کر دیا جائے۔“

سلیم نے جواب دیا۔ ”اگر عصمت مجھے سہارا دینے پر مصر رہی تو میں انہیں خود ہی کسی دِن غائب کر دوں گا۔ آج میں پہلی بار ان کے بغیر چند قدم چلا ہوں۔“

”تم بہت جلد اِن کے بغیر چلنے لگو گے۔ پاؤں پر آہستہ آہستہ بوجھ ڈالنے کی

کوشش کیا کرو۔"

☆☆☆☆☆

سڑک پر پہنچ کر وہ کافی دیر تک فوجی لاریوں، ٹرکوں اور جیپ کاروں کا قافلہ دیکھتے رہے۔

"بھائی جان! آپ تھک جائیں گے۔ میں کرسی لاتی ہوں۔" راحت یہ کہہ کر اندر سے بید کی کرسی اُٹھا لائی۔ سلیم پھاٹک سے ایک قدم آگے سڑک کے کنارے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ارشد اس کے قریب کھڑا تھا اور راحت اور عصمت صحن کے کنارے پودوں کی باڑ کی اوٹ میں کھڑی سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

سڑک کے کنارے لوگ سپاہیوں کو دیکھ کر خوشی کے نعرے لگا رہے تھے۔ ٹرک اور لاریاں گزر گئیں۔ ارشد ہسپتال جانے کی تیّاری کرنے کے لیے اندر جا چکا تھا۔ سلیم اُٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ سڑک پر کچھ دور پیادہ سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آہٹ سنائی دی اور وہ غیر شعوری طور پر اپنے

منہ میں لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ دُہرانے لگا۔

سپاہی قریب آ گئے۔ عصمت اور راحت نے جلدی جلد صحن میں اُگے ہوئے پودوں سے چند پھول توڑے اور سپاہیوں کے راستے میں پھینک دیے۔ سپاہیوں کے چند دستے گزر گئے۔ آخری دستہ دروازے کے قریب پہنچا تو ساتھ آنے والے افسر نے اچانک گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہالٹ۔“ سپاہی رُک گئے۔

”رائٹ ٹرن۔۔۔۔“ سپاہیوں نے دائیں طرف مُنہ پھیر لیے۔ افسر اسٹینڈ ایٹ ایز کہہ کر سلیم کی طرف بڑھا۔ سلیم اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مجید تھا۔

اس نے آتے ہی کہا۔ ”سلیم! یہ وہ بجلیاں ہیں جن کی تمہیں تلاش تھی۔ ہم وہاں جا رہے ہیں جہاں سے تم آئے ہو۔ تم لوگوں نے کشمیر میں جو کام شروع کیا تھا وہ ان کے ہاتھوں پورا ہو گا۔“

”تم ابھی جا رہے ہو؟“

"ہاں کوئی ایک گھنٹہ تک ہماری بٹالین روانہ ہو جائے گی۔ بھابھی جان کہاں ہیں؟"

سلیم نے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اُدھر کھڑی تمہیں دیکھ رہی ہے۔"

مجید نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "بھابھی جان کل امینہ کا خط آیا تھا۔ شاید ایک ہفتے تک وہ آپ کو دیکھنے کے لیے آجائے۔"

عصمت نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بھی خط لکھا ہے۔"

"میں اس کے خط کا جواب نہیں لکھ سکا اور اب تو شاید مجھے فرصت بھی نہ ملے۔ آپ اسے لکھ دیں کہ میں یہاں سے جا چکا ہوں اور آپ کی وہ کتابیں جو میں اس دِن یہاں سے لے گیا تھا گم ہو گئی ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے بغیر لے گیا ہے۔ ان کے بدلے میں میں آپ کو مہاراجہ کشمیر کے باغ کے سیب بھیج دوں گا۔"

"ہاں اور کشمیر کی فتح کی خوشخبری بھی۔"

”ہاں وہ بھی۔“

عصمت نے کہا۔ ”بھائی جان! آپ اس کے بدلے میں میری ساری کتابیں لے جائیں۔“ راحت جو اب تک خاموش کھڑی تھی بولی۔ ”آپ میرے لیے کشمیر سے کیا لائیں گے؟“

”تمہارے لیے۔“ مجید نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”تمہارے لیے میں زعفران کے پھول لاؤں گا۔“

مجید عصمت اور راحت کو خدا حافظ کہہ کر پھر سلیم کے قریب آ گیا اور بولا۔ ”سلیم میری کمپنی تمہیں سلامی دینا چاہتی ہے۔“

”نہیں نہیں!!“ سلیم نے چونک کر کہا۔

مجید نے کہا۔ ”یہ اس لیے نہیں کہ تم میرے بھائی ہو بلکہ اس لیے کہ تم قوم کے وہ سپاہی ہو جس نے ہزاروں انسانوں کی جان بچائی ہے۔ یہ سپاہی اس شخص کو سلامی دینا چاہتے ہیں جو راوی کے کنارے بخار سے نڈھال اور زخموں سے چور ہونے کے باوجود بھی لڑ رہا تھا۔ یہ سلامی اُن زخموں کے

لیے جو تم نے جہادِ کشمیر میں کھائے ہیں۔ سلیم! یہ سب تمہیں جانتے ہیں۔ میں ان سب کو تمہارا پیغام پڑھ کر سنایا کرتا ہوں۔“

اور جب سلیم کھڑا ہو کر ان جانبازوں کی سلامی لے رہا تھا، ان کے چوڑے چکلے سینوں پر ایک قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

مجید نے مارچ کرنے کا حکم دیا۔ سڑک پر سپاہیوں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ سپاہیوں کا دستہ گُزر گیا۔ آہستہ آہستہ ان کے قدموں کی آہٹ کم سے کم ہوتی گئی، سلیم کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں: ”بڑھے چلو۔۔۔ بڑھے چلو۔۔۔ بڑھے چلو۔۔۔“ اس کی آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو۔ تشکّر کے آنسو۔۔۔ یہ ایک شاعر، ایک ادیب، ایک سپاہی، اور ایک انسان کی آخری پونجی تھی، جسے وہ اپنی قوم کے نوجوانوں پر نچھاور کر رہا تھا۔۔۔

نسیم حجازی

ایبٹ آباد (۱۲ مئی ۱۹۴۹ء)